The ZAMANA, July 193

جلد ۷۱ نمبر ۱ | مرتبہ دیا نرائن نگم بی۔اے۔ | جولائی ۱۹۳

فہرست

تصویر رائے بہادر لالہ سیتا رام آنجہانی

۱۔ وعدہ اور اُس کا ایفا
پروفیسر مقصود الرحمٰن ایم۔اے جامعہ عثمانیہ ۱
۲۔ آفتاب تازہ (نظم)
حضرت ... دانش کاندھلوی ۱۱
۳۔ ملک کی موجودہ فضا اور غزل گوئی
سید ... ۱۳
۴۔ نذر میر (نظم)
حضرت نجم آفندی ۲۰
۵۔ اعتراف (نظم)
جناب عبداللطیف شوق جیپوری ۲۰
۶۔ رائے بہادر لالہ سیتا رام آنجہانی
سید ظہیر الدین احمد ... بی۔اے ۲۸
۷۔ شاعر کی رات (نظم)
جناب خلیل احمد خاں سلطانپوری ۳۹
۸۔ گوپال اور چرواہا (قصہ)
پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم۔اے ۴۰
۹۔ آخری سبق (قصہ)
مسٹر ڈی۔پی جھٹناگر ستہ ۴۶
۱۰۔ ساون کا ایک منظر (نظم) ۴۹
حضرت نسیم خوبیانوالی
۱۱۔ جذبات شائق ۵۱
از حضرت شائق ہمدم
۱۲۔ تنقید کتب (ہندوستان کا نیا دستور حکومت ۵۲
تجلی۔ تابعین۔
دبدبہ امیری۔
۱۳۔ رفتار زمانہ ۵۸
۱۴۔ علمی خبریں اور نوٹ ۶۰

کوئلہ

ویلز کے کان کنوں کو جب کبھی کسی تکلیف سے سامنا ہوتا ہے تو اقتصادی ہلچل سے کہیں خطرناک مصیبت آجاتی ہے۔ تیل سے چلنے والے جہازوں اور ریلوے انجنوں کی بدولت برّاعظم یوروپ میں سستا کوئلہ مہیا ہوتا رہتا ہے۔ جس سے کوئلہ کے کانکن مزدوروں کو ہفتوں اور مہینوں بیکار رہنا پڑتا ہے۔ آپ اُن کی ہڑتال کرنے کا رحجان دیگر بیکار لوگوں کی طرح مشکلات میں مبتلا ہوجانے کی عادت کا اضافہ کیجئے تو اُن کی تباہی کا نقشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے گا۔

منجملہ دیگر مصیبتوں کے غذا کی کمی اور اُس کی وجہ سے انفلوئنزا کا مقابلہ کرنے کی قوت میں کچھ کم خطرناک نہیں ہوتی۔ یہ مرض نہ صرف خوشحال طبقہ کے لئے ایک قہر آلہی کے بمنزلہ ہے بلکہ کم غذا پانے والے بچّوں اور عورتوں کی تو زندگی ہی وبال کردیتا ہے اور اگر کونین دستیاب نہ ہو تو پھر صورت حال بد سے بدتر ہوجائے۔

لیکن بہت انگریز اور یوروپین ڈاکٹر جانتے ہیں کہ تین گرین کونین روزانہ کھالی جائے، تو بہت سے آدمی انفلوئنزا سے محفوظ رہیں۔ خواہ یہ مرض اُس علاقے میں وبا کی شکل بھی اختیار کرے۔

امدادی اداروں اور کوئلہ کی کانوں کے رحمدل مالکان کا فرض ہے کہ انفلوئنزا کے موسم میں اُن بیچاروں کو کم از کم تین گرین کونین روزانہ بہم پہونچاتے

ویلز کے کان کنوں کو جب کبھی کسی تکلیف سے سامنا ہوتا ہے تو اقتصادی ہلچل سے کہیں خطرناک مصیبت آجاتی ہے۔ تیل سے چلنے والے جہازوں اور ریلوے انجنوں کی بدولت برّاعظم یورپ میں سستا کوئلہ مہیا ہوتا رہتا ہے۔ جس سے کوئلہ کے کانکن مزدوروں کو ہفتوں اور مہینوں بیکار رہنا پڑتا ہے۔ آپ اُن کی ہڑتال کرنے کا رجحان دیگر بیکار لوگوں کی طرح مشکلات میں مبتلا ہوجانے کی عادت کا اضافہ کیجئے تو اُن کی تباہی کا نقشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے گا۔

منجملہ دیگر مصیبتوں کے غذا کی کمی اور اُس کی وجہ سے انفلوئنزا کا مقابلہ کرنے کی قوت میں کچھ کم خطرناک نہیں ہوتی۔ یہ مرض نہ صرف خوشحال طبقہ کے لئے ایک قہرِ الٰہی کے بمنزلہ ہے بلکہ کم غذا پانے والے بچوں اور عورتوں کی تو زندگی ہی وبال کردیتا ہے اور اگر کونین دستیاب نہ ہو تو پھر صورت حال بد سے بدتر ہوجائے۔

لیکن بہت انگریز اور یوروپین ڈاکٹر جانتے ہیں کہ تین گرین کونین روزانہ کھالی جائے، تو بہت سے آدمی انفلوئنزا سے محفوظ رہیں۔ خواہ یہ مرض اُس علاقے میں وبا کی شکل بھی اختیار کرے۔

امدادی اداروں اور کوئلہ کی کانوں کے رحمدل مالکان کا فرض ہے کہ انفلوئنزا کے موسم میں اُن بیچاروں کو کم از کم تین گرین کونین روزانہ بہم پہونچاتے رہیں۔

Gr. E. No 51.

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بے مثل کتابیں

پریم بتیسی - یعنی اُردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند بی-اے مرحوم کے بہترین قصوں کا مجموعہ ہے - قیمت حصہ دوئم، آٹھ آنہ

نصائح چانکیہ - یعنی نامور ہندو چانکیہ کے مشہور و معروف نیتی کا ترجمہ از پنڈت ہنمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام - قیمت ۶ ر

ہندو تیوہاروں کی اصلیت - اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی-اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول نے - ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور اُنکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے - اُس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی نظام اور ہندوؤں تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے - اُردو ایڈیشن کی قیمت ۹ ر، اور ہندی ایڈیشن جسمیں اُردو کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دیگئی ہے - عمہ ر

راماین مسدس - مصنفہ جناب راجی مل کپور، مصنف سری رام چندر جی کے چرتر کو عجیب و غریب انداز میں بیان کیا ہے - ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے - لطف محاکات و بلند پروازی تخیل قابل تحسین ہے - قیمت مجلد بالتصویر ۱۲ ر مجلد بلاتصویر ۱۲ ر - غیر مجلد بلاتصویر عہ ر -

شریمد بھاگوت گیتا - یعنی کرم یوگ شاستر المعروف بہ غذائے روح، مترجمہ پنڈت پربھودیال مصر عاشق لکھنوی - قیمت عہ ر

محمد بہادر شاہ ظفر - خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور اُنکی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ - از منشی محمد امیر احمد علوی بی-اے - اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں جس سے کتاب اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے - قیمت عمہ ر

نقش و نگار - شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی کیف آور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے - نہایت خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور - قیمت ۱۲ ر

فکر و نشاط - حضرت جوش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے جو حال ہی میں جامعہ ملیہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے - عمدہ لکھائی چھپائی، بہترین جلد غیر مطبوعہ نظمیں - قیمت مجلد عہ ر

انتخاب حسرت - مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا سیر حاصل انتخاب اور اُس پر حضرت جلیل قدوائی کے قلم کا لکھا ہوا فاضلانہ مقدمہ قیمت ۱۲ ر

نقش و نگار - مسٹر جلیل قدوائی کی دلآویز و پر لطف نظموں کا مجموعہ جو ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے - قیمت عہ

خیالات عزیز - مجموعہ مضامین مولوی عزیز احمد صاحب جنکی با ضابطہ رجسٹری کی گئی ہے - حجم دو سو صفحات - ٹائیٹل خوشنما رنگین - لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف - قیمت مجلد عہ ر - غیر مجلد عہ ر

ملنے کا پتہ - زمانہ بک ایجنسی کانپور

طریق دولتمندی ۔ دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔ اِس کتاب میں دولت حاصل کرنے کے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں، ہر شخص کیلئے قابل خرید ہے۔ قیمت ۵ر

مرقع ادب ۔ حصہ اول دوم، مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری۔ اسمیں ہندوستان کے مشہور انشاپرداز و شعراء کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو اُنھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں قیمت حصہ اول ۱۲ر حصہ دوم ۶ر

اُردو مضمون نویسی ۔ مضمون لکھنے کے متعلق پروفیسر نانک پرشاد بی۔ اے مرحوم کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اِس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ قیمت ۸ر

خیالات مہاتما گاندھی ۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے جسمیں مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کے مذہبی، سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کرکے دُنیا پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ قیمت حصہ اول ۱۲ر ۔ حصہ دوم ۱۲ر

ترجمہ راماین منظوم ۔ بال کانڈ کے اصلی دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اُردو اشعار میں۔ مترجمہ منشی سورج پرشاد تصور۔ قیمت ۱۲ر

بزم احباب ۔ اخلاقی کہانیوں کا نایاب گنجینہ، قیمت ۴ر

سیرگل ۔ یعنی مسٹر جلیل قدوائی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ وہ کتاب جس نے مصنف کو دورِ حاضرہ کے اہلِ قلم کی صفِ اول میں جگہ دلائی ہے۔ آج روسی کہانیوں کو عموماً اور چیخوف کی کہانیوں کو خصوصاً اردو ادب میں ایک عام شہرت حاصل ہے۔ اُنکے اولین پیش کرنیوالے کی تحریر کا اعجاز دیکھنا ہو تو "سیرگل" ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت صرف ۱۲ر

دنیائے راز ۔ مولانا ابوالفاضل راز چاندپوری کی قدیم و جدید طرز دلکش نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے۔ قیمت ۱۰ر

حدیثِ حسن ۔ حضرت شمیم احمد صاحب فطرت کی دلکش و دلآویز نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ قیمت مجلد ۲ر

جدید اُردو شاعری مصنفہ جناب پروفیسر عبدالقادر سروری جس میں غدر کے بعد سے موجودہ زمانہ تک اُردو شاعری کے تغیرات۔ رجحانات خصوصیات اور ارتقائی تاریخ پر تفصیلی بحث پیش کیگئی ہے اس موضوع پر اُردو میں پہلی کتاب ہے جو چار سو صفحوں پر ضخیم اور تصویروں، انڈکس نفیس جلد کے ساتھ شایع ہوئی ہے قیمت ۲ر

سرمایہ تسکین ۔ حضرت تسکین سہارنپوری کے کلام کا دلکش مجموعہ، جو عام طور پر مقبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ قیمت ۲ر

فلسفہ جنگ ۔ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفہ جنگ پر نظر ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

ملنے کا پتہ ۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

ایک 100000 لاکھ طلبہ کے ہاتھ میں جانے والے رسالہ
"رتن" کی چند خصوصیات
(۱) "رتن" ریاست جموں و کشمیر کا واحد تعلیمی ادبی اور اخلاقی رسالہ ہے۔
(۲) "رتن" میں ہر ماہ بچوں کے دیگر رسالوں کی نسبت بہتر مضامین شائع ہوتے ہیں
(۳) "رتن" اپنے خریداروں کو اپنی قیمت کی نسبت کئی گنا زیادہ قیمت کا مضمون مہیا کرتا ہے
(۴) "رتن" کے مطالعے سے ہندوستانی بچے اپنا اخلاق بلند تر اور معلومات وسیع تر کر سکتے ہیں
(۵) "رتن" میں ہر ماہ دلچسپ باتیں، نئے نئے چٹکلے اور انعامی معمے شائع کئے جاتے ہیں
(۶) "رتن" میں اچھے اچھے مضمون لکھنے والے بچوں کی تصویریں دی جاتی ہیں۔
(۷) "رتن" میں بلاک کی دلچسپ تصاویر ہر ماہ شائع کی جاتی ہیں۔
(۸) "رتن" "رتن" نے خاص طور دنیائے صحافت میں نمایاں شہرت حاصل کر چکے ہیں
(۹) "رتن" کے مضمون نگاروں میں ہندوستان کے اکثر نامور ادیب ہیں۔
(۱۰) "رتن" ہر ماہ پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔
ان خوبیوں کے باوجود "رتن" جموں کی قیمت صرف دو روپے سالانہ ہے
چندہ اردو حصہ دو روپے سالانہ
پھر
چندہ اردو ہندی حصہ ڈھائی روپے سالانہ
آپ کیوں نہ خود بھی اس کے خریدار بنیں اور اپنے دوستوں کو بھی بنائیں۔
"رتن" کے چھ سالانہ خریدار بنانے والے کو ایک سال کے لئے رتن مفت دیا جاتا ہے۔
مینیجر رسالہ "رتن" دربار گڑھ روڈ - جموں (کشمیر)

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ، نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بینظیر کتاب ہے۔ نوجوانوں کے قائد اعظم نے ہماری تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت تقریباً گیارہ سو صفحات ہے لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ بہت سی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت مجلد صرف چار روپیہ (للعہ)

ملنے کا پتہ:

زمانہ بک ایجنسی، کانپور

میدانِ عمل

منشی پریم چند آنجہانی کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اسمیں ملک کی موجودہ بیدار و بے چین روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ اور دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے۔ بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے۔ صفحات پانسو۔ کتابت اعلیٰ، کاغذ نفیس، روشن طباعت و خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب مصور ڈسٹ کور۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

ملنے کا پتہ:

زمانہ بک ایجنسی کانپور

شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی پرجوش اور پرکیف نظموں کا بہترین مجموعہ ہے جو آپکو بادۂ سرجوشش کی سرمستیوں اور گلبانگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا۔

شاعر اعظم کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے۔ کتاب مجلد، نہایت خوشنما گردپوش سے آراستہ ہے۔ قیمت صرف تین روپیہ (سے ر)

ملنے کا پتہ:

زمانہ بک ایجنسی کانپور

یادگار حالی

مشہور رسالہ زمانہ کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلماء مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کی یادگار میں خاص حالی نمبر کی حیثیت سے شائع کیا گیا ہے۔ جسمیں مولانا مرحوم کے سوانحی حالات کے علاوہ اُنکی نثر اور نظم پر متعدد تنقیدی مضامین درج ہیں۔ موجودہ زمانے کے کئی نامور شاعروں اور انشاپردازوں نے اِس نمبر کے لئے خاص مضامین لکھے ہیں۔ جشن پانی پت کا بھی تذکرہ ہے۔ کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ پرچہ یادگار حالی کہلانیکا مستحق ہے۔ قیمت بارہ آنہ (۱۲؍)

ملنے کا پتہ:- **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

جلد ۷۱ | جولائی ۱۹۳۸ء | نمبر ۱

وعدہ اور اُس کا ایفا

(پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن ایم۔اے، پروفیسر نفسیات جامعہ عثمانیہ)

دنیا میں بہت بڑی تعداد ایسی چیزوں کی ہے، جو بظاہر بالکل صاف، سادہ اور سلجھی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن اگر ان پر غور کیا جائے یا اُن کو سائنس یا فلسفے کی خوردبین کے نیچے رکھکر دیکھا جائے تو اُن میں بیسیوں پیچیدگیاں، سینکڑوں ترکیبی اجزاء اور ہزاروں اُلجھنیں نظر آتی ہیں۔ جتنا زیادہ غور کیا جاتا ہے اور جتنی زیادہ طاقتور یہ خوردبین ہوتی ہے، اتنا ہی اضافہ ان تمام پیچیدگیوں وغیرہ میں ہو جاتا ہے۔ انھیں پیچیدگیوں کا انکشاف اور اُنھی کی توجیہ فلسفہ اور سائنس کی غایت ہے جس روشنی میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اُسی کو لیجئے۔ عام شخص اس کو سفید اور اس لئے سادہ سمجھتا ہے، لیکن طبعیات کا ماہر اس کے کتنے ہی ترکیبی اجزا کے نام گنوا دیتا ہے۔ ہم نے یہاں صرف مادّی یا خارجی چیز کی مثال دی ہے، مگر ذہنی چیزوں کا بھی یہی حالت ہے۔ مثال کے طور پر ہم آج "وعدے اور اس کے ایفا" پر غور کریں گے۔

یہ بیان کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ وعدہ کسے کہتے ہیں اور اس کے ایفا سے کیا مراد ہے

● یہ مضمون نشرگاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا تھا۔ اب ڈائرکٹر صاحب اسٹیشن مذکور کی اجازت سے ہدیہ ناظرین زمانہ کیا جاتا ہے۔

یہ ہماری روزمرہ عملی زندگی کا ایسا عام اور معمولی واقعہ ہے کہ بعض حضرات تو اس گفتگو کو فلسفیوں کی مخصوص پریشان خیالی سمجھ کر شاید سننا بھی پسند نہ فرمائیں، مگر نفسیاتی حیثیت سے وعدہ ایک توقع ہے جو ایک فریق تحریر، تقریر، اشارے، یا کنایہ سے کسی دوسرے فریق میں پیدا کرتا ہے۔ اس طرح پیدا ہونے والی توقعات بہت سی قسموں اور صورتوں کی ہوتی ہیں۔ مثلاً بیٹھے بیٹھے مجھ میں بظاہر بغیر کسی وجہ کے توقع پیدا ہو کہ آج شام کو میرا دوست زید مجھ سے ملنے آئیگا : نیک والدین کے بیٹے سے ہم میں توقع پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی نیک ہوگا۔ اور بدی سے بچے گا : نیک شخص سے توقع ہوتی ہے کہ وہ آئندہ بھی نیک رہے گا : کوئی شرابخوار ہفتہ بھر تک شراب نہ پیئے تو توقع ہوتی ہے کہ وہ اب بالکل شراب نہ پیئے گا : ایک شخص کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شراب چھوڑ دے گا، گو وہ صاف طور پر اس کو بیان نہیں کرتا۔ ایک شخص صاف کہتا ہے کہ وہ شراب چھوڑ دے گا، ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ ایسا ہی کریگا۔ ایک شخص وعدہ کرتا ہے کہ وہ آئندہ کبھی شراب نہ پیئے گا : ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنا وعدہ پورا کریگا۔ پہلی مثال میں جو توقع پیدا ہوئی ہے وہ کسی نے بھی پیدا نہیں کی۔ بیٹے کے متعلق ہماری توقعات اس کے والدین کی سیرت پر مبنی ہیں۔ تیسری مثال میں یہ توقع اس شخص کی گزشتہ سیرت کا نتیجہ ہے۔ چوتھی مثال میں ہماری توقع اس شخص کے موجودہ کردار سے حاصل ہوئی۔ پانچویں توقع اس شخص کے صریحی بیان کی نہیں بلکہ ضمنی اشارے کی پیدا کردہ ہے۔ اور چھٹی صورت اس کے صریحی بیان کی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی وعدہ نہیں۔ وعدہ تو صرف وہ توقع کہلاتی ہے جو ان میں سے آخری صورت ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے ان سب میں کوئی فرق نہیں۔ وعدہ اور باقی تمام توقعات میں منطقی فرق اگر ہو سکتا [illegible] تو نفسیاتی نہیں بلکہ اخلاقی ہے۔ یعنی وعدہ ہم صرف اس توقع کو کہتے ہیں جس کا پورا کرنا توقع [illegible] کرنے والے پر لازمی ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اس کو پورا نہ کرے تو وہ اخلاقی گناہ کا مرتکب ہوتا [illegible] توقعات کی اور صورتوں میں یہ بات نہیں ہوتی۔

اس تمام بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ وعدہ کے لئے دو فریق کا ہونا لازمی ہے۔ ایک وعدہ کرنے والا، دوسرا جس سے وعدہ کیا جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں فریق ایک ہی ذات میں جمع ہو جائیں۔ یہ دونوں افراد بھی ہو سکتے ہیں اور جماعتیں بھی۔ یہ صورت بھی ممکن ہے کہ ایک فریق ایک فرد اور دوسرا پوری جماعت یا قوم ہو۔ لیکن اس اختلاف سے وعدے کی ماہیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وعدے کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ فریق ثانی سے

یعنی جس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ تعلق رکھتا ہے نہ کہ فریق اول، یعنی وعدہ کرنے والے سے فریق ثانی ہی فریق اول کو وعدے سے بری کر سکتا ہے۔ اور وہی زیادہ تر فیصلہ کرتا ہے کہ وعدہ پورا ہوا یا نہیں۔

قانونی نقطۂ نظر سے وعدہ ایک معاہدہ ہے جو دو فریقوں کے درمیان ہوتا ہے۔ فریق اول پر فرض ہوتا ہے کہ وہ اس معاہدے کو پورا کرے۔ اور فریق ثانی فریق اول سے اس کو پورا کرنے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اور اگر فریق اول اس سے انکار کرے یا ایفا میں سستی کرے تو وہ قانون کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ معاہدہ ہونے کی حیثیت سے وعدہ سیاسی پہلو بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس طرح تمام اصول کا اس پر اطلاق ہو سکتا ہے۔

اس مختصر سی بحث سے واضح ہوا ہو گا کہ وعدہ کی ماہیت پر نفسیاتی، اخلاقی، قانونی سیاسی، مذہبی وغیرہ مختلف پہلوؤں سے بحث ہو سکتی ہے، مگر یہاں ہم صرف اخلاقی پہلو پر غور کرینگے

بعض معلمین اخلاق نے وعدہ کے پورا کرنے کے فرض کو سچ بولنے کے فرض کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک لحاظ سے ان دونوں میں بہت مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ یعنی ہم بیانات اور واقعات کی مطابقت کو باقی رکھکر ان دونوں فرضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایک صورت میں تو ہم واقعہ کو بیان کے مطابق اور دوسری میں بیان کو واقعہ کے مطابق بناتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ مشابہت سطحی اور نامکمل ہے۔ کیونکہ ہم اپنے کاموں کو اپنے تمام بیانات کے مطابق بنانے پر مجبور نہیں۔ ہم اگر مجبور ہیں تو صرف اس پر کہ اپنے کاموں کو اپنے وعدوں کے مطابق بنائیں اگر میں سال بھر شراب نوشی چھوڑ دینے کا ارادہ ظاہر کردوں، لیکن ہفتے بھر ہی کے بعد پھر پینا شروع کردوں تو زائد سے زائد کہا جائیگا کہ میرا ارادہ پختہ نہ تھا۔ لیکن اگر میں نے ترک شراب نوشی کا وعدہ کیا تھا، تب تو مجھے ناقابلِ اعتماد کہا جا سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وعدے کے فرض کو ادا کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ میں اپنے کاموں کو اپنے بیانات کے مطابق ثابت کردوں، بلکہ لازمی یہ ہے کہ میرا کام اُن توقعات کے مطابق ہو جو میں نے جان بوجھ کر دوسروں میں پیدا اکی ہیں۔

لیکن اگر یہ صحیح ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میرے وعدے کا وہ مفہوم لیا گیا ہے جو میرے ذہن میں نہ تھا، اور اس طرح جو توقعات دوسروں میں پیدا ہوئیں ان کو فی الواقع میں نے پیدا نہیں کیا۔ تو کیا تب بھی اپنے وعدے کو پورا کرنا میرا فرض ہے؟ اس کا جواب یہ ہے

کہ اگر یہ مفہوم یا دوسرے لفظوں میں یہ توقعات طبعی ہیں، اور ایسی ہیں جو ان حالات میں عام طور پر اکثر اشخاص میں پیدا ہوتی ہیں، تب تو وعدے کو پُورا کرنا فرض ہے لیکن یہ وعدہ پُورا کرنا فرض نہیں رہتا۔ بلکہ یہ انصاف کرنے کے غیر متعین فرائض میں شامل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ درصل میں نے کوئی وعدہ کیا ہی نہیں۔ زبان کا عام اور معمولی کام یہ ہے کہ بولنے والے کی بات سننے والے تک پہونچ جائے۔ موجودہ بحث کے لئے اسی کو یوں بیان کیا جائے گا کہ وعدہ کرنے والے کے مفہوم سے وہ شخص مطلع ہو جائے جس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ جب ہم وعدے کا ذکر کرتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا ہو گیا۔ اب اگر کسی وجہ سے زبان کا یہ کام پُورا نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی قسم کا وعدہ ہوا ہی نہیں تھا، یا یہ کہ جو وعدہ ہوا وہ نامکمل اور ناقص تھا۔

مطلب یہ ہے کہ وعدہ پُورا کرنے کا اخلاقی فرض اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب دونوں فریق اس کے ایک ہی معنی لیں۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ وعدے میں ہم صرف الفاظ ہی کو شامل نہیں سمجھتے۔ ہر قسم کے اشارے اور تمام وہ چیزیں وعدے کی ترکیب میں داخل ہوتی ہیں جن سے یہ توقعات معمولاً پیدا ہو سکتی ہیں۔ وعدہ کرنے والا اُن تمام توقعات کو پُورا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، جو خود اس میں اور اس شخص میں پیدا ہوئی ہیں، جس سے وعدہ کیا گیا ہے۔

گزشتہ بیان کو پیش نظر رکھکر عام طور پر وعدہ پُورا کرنے کے فرض کو بہت آسان اور سادہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن ذرا سا ہی غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اتنا آسان اور سادہ نہیں۔ اس میں بہت سی پیچیدگیاں ہوتی ہیں، جن میں سے بعض تو بالکل واضح اور متعین ہوتی ہیں اور بعض غیر واضح اور غیر معیّن۔

چنانچہ ہر سمجھدار شخص سمجھ سکتا ہے کہ وعدہ اس شخص سے تعلق رکھتا ہے، جس سے وعدہ کیا گیا ہے اور اگر وہ چاہے تو وعدے کو ختم کر سکتا ہے۔ لہذا اگر یہ شخص مر چکا ہے یا اُس تک پہونچ نہیں ہو سکتی، یا وہ وعدہ کرنے والے کو وعدہ سے بری نہیں کر سکتا، تو ایک استثنائی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے، جس کا حل آسان نہیں۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ بُرا کام کرنے کے وعدے کو پُورا کرنا فرض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کام کی بُرائی کی وجہ سے اس کو نہ کرنے کا فرض مقدم ہے۔ اس کی شکل بالکل ایسی ہی ہے، جیسی کہ قانون میں ایک ایسے کام کرنے کا معاہدہ کالعدم ہوا کرتا ہے جس کو معاہدہ کرنے والا قانوناً آزادی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ اگر صورت یہ نہ ہو تو پھر ہر شخص اخلاقی فرائض سے

اِس طرح بہ آسانی بچ سکتا ہے کہ ان کو پُورا نہ کرنے کا وعدہ کرلے۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت اخلاقیات
کے لئے مہلک ہے۔ اسی اصول کا اطلاق بُرے کام کو نہ کرنے یا اس سے بچنے پر بھی ہوتا ہے۔
لیکن یہاں دقت یہ پڑتی ہے کہ ہم مختلف فرضوں کو فرضیت کے مختلف درجوں یا ان کی قسموں کی تمیز
نہیں کرسکتے۔ ظاہر ہے کہ بعض اوقات ہم اپنے وعدے کے باعث ایک ایسے کام سے بچنے پر مجبور ہوجاتے
ہیں جس کا کرنا اس وعدے کی غیر موجودگی میں ہم پر فرض ہوتا۔ میں اپنے ایک فضول خرچ اور غیر مستحق
دوست سے وعدہ کرچکا ہوں کہ میری آمدنی میں سے جو کچھ بچے گا وہ میں اس کو دونگا۔ اب میں
اس بچت کو اور اچھے کام کے لئے صرف نہیں کرسکتا، حالانکہ اگر میں نے اپنے دوست سے یہ وعدہ نہ کیا
ہوتا تو یہ کار خیر اس بچت کا بہترین مصرف تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ فرائض کے حدود کی قطعی تعیین اکثر صورتوں
میں مشکل ہوتی ہے۔ چنانچہ اپنے دوست کی مدد کے وعدے کو پُورا کرنا بڑا فرض ہے۔ یا خود اپنے بچوں
کی ضروریات کو پُورا کرنے کا فرض۔ مختصر یہ کہ نہیں کہا جاسکتا کہ وعدے کو پُورا کرنے کا فرض دیگر واجبات
کے پُورا کرنے کو کہاں تک باطل ٹھیراتا ہے۔

وعدہ پُورا کرنے کے راستے میں اور بہت سی مشکلات اس وقت رونما ہوتی ہیں، جب ہم اُن
حالات پر زیادہ گہری نگاہ ڈالتے ہیں، جن میں وعدہ کیا گیا تھا، اور اُن نتائج کی پڑتال کرتے ہیں جو اس
کو پُورا کرنے سے پیدا ہوں گے۔ چنانچہ جو وعدہ دھوکے یا زبردستی سے لیا گیا ہے، اُس کو پُورا کرنا کہاں تک
فرض ہے؟ پہلے ہم دھوکے کو لیتے ہیں، اگر یہ وعدہ کسی ایسے بیان کی شرائط پر مشروط تھا جو بعد میں
غلط ثابت ہوا، تب تو ظاہر ہے کہ اس کو پُورا کرنا فرض نہیں۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ وعدہ اس غلط بیانی
کی وجہ سے کیا گیا ہو اور اس پر مشروط نہ ہو۔ ایسی صورت میں اگرچہ بالکل ظاہر ہو کہ اس غلط بیانی
کے نہ ہونے کی حالت میں یہ وعدہ نہ کیا جاتا تب اکثر اشخاص اس کے پُورا کرنے کو فرض نہ کہیں گے
لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ جن باتوں کی بنا پر یہ وعدہ کیا گیا ہے، اُن میں سے یہ غلط بیان فقط ایک
بات ہو، اور بہت زیادہ وزنی نہ ہو۔ اب یہ مشتبہ امر ہے کہ ہم اپنے وعدے کو توڑنے کے مجاز ہیں؛
محض اس وجہ سے کہ یہ غلط بیان منجملہ اُن باتوں کے ہے جن کی وجہ سے یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ یا یہ کہ
وعدہ لینے والے شخص نے اس کو صراحۃً بیان نہ کیا، بلکہ اس کی طرف محض اشارہ کیا تھا، یا یہ کہ
صراحۃً یا کنایۃً کوئی غلط بیانی کی ہی نہیں گئی۔ بلکہ بعض ضروری اور اہم باتوں کو چھپا لیا گیا تھا۔ ہمیں
معلوم ہے کہ اس طرح چھپا لینے کی بعض صورتوں کو قانون میں بھی جائز تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ چیزوں
کو بیچنے کے وقت بیچنے والا اگر اپنی چیزوں کے عیبوں اور نقائص کو چھپا لیتا ہے تو قانون اس فروخت

کو کالعدم قرار نہیں دیتا، بشرطیکہ اس نے اشارے کنایہ یا کسی حرکت سے خریدنے والے کے دل میں یہ خیال پیدا نہ کیا ہو کہ یہ چیز عیب اور نقص سے پاک ہے۔ لیکن اس سے یہ اخلاقی مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ اگر وعدہ لیتے وقت کسی اہم بات کو چھپا لیا گیا ہے، تو وعدہ کرنے والا اس وعدے کو پورا کرنے پر کہاں تک مجبور ہے۔ پھر ہم کو اس صورت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جس میں کوئی غلط خیال جان بوجھ کر پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ خیال یا تو اس شخص کے دل میں پیدا ہوا جس سے وعدہ کیا گیا ہے یا کسی طرح بغیر سمجھے بوجھے پیدا ہوا۔ اس آخری صورت میں اکثر اشخاص کی رائے یہ ہوگی کہ اس سے وعدے کو پورا کرنے کے فرض پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان تمام صورتوں میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وعدے کو پورا کرنا، وعدہ کرنے والے کے لئے کہاں تک فرض ہے۔ تقریباً یہی حالت اُن وعدوں کی ہے۔ جو غیر قانونی جبر کا نتیجہ ہوں۔

فرض کرو کہ وعدہ "بلا جبر و اکراہ" اور بلا حیص و فریب کیا گیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ قبل اس کے کہ وعدہ پُورا کرنے کا وقت آئے، حالات اس قدر بدل جائیں کہ اس کو پُورا کرنے کے نتائج اُن نتائج سے مختلف ہوں جو وعدہ کرنے کے وقت دونوں فریقوں کے ذہن میں تھے۔ ایسی صورت میں سب اتفاق کریں گے کہ فریق ثانی کو چاہیئے کہ فریق اول کو اس کے وعدہ سے بری کردے لیکن اگر وہ بری کرنے سے انکار کردے، تب یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وعدہ کرنے والا وعدہ پُورا کرنے پر کس حد تک مجبور ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ بہر حال مجبور ہے۔ لیکن بعض کا خیال ہے کہ حالات کے اس قدر بدل جانے کی وجہ سے اب اس کا پُورا کرنا فرض نہیں رہا۔ اِن کے نزدیک ہر معاہدے کے وقت یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ معاہدہ اہم حالات کے غیر متغیر رہنے کی صورت میں برقرار رہے گا۔ لیکن اس اصول سے فرائض کی قطعی تعیین ناممکن ہو جاتی ہے۔

اِسی دشواری کی ایک اور شکل یہ ہے کہ جس شخص سے وعدہ کیا گیا تھا، وہ مر چکا ہے۔ وعدہ کرنے والے کی دسترس سے عارضی طور پر باہر ہو چکا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وعدے سے برأت حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب اس کو پُورا کرنا اِن دونوں فریقوں کی خواہشوں کے منافی ہو۔ اس وقت پر بعض اوقات یہ کہہ کر پردہ ڈال دیا جاتا ہے کہ وعدے کے "مطلب" کو پُورا کر دیا جائے۔ لیکن یہاں "مطلب" کے دو معنی ہو سکتے ہیں، اول جن الفاظ میں وعدہ کیا گیا تھا اُن کے وہ معنی جو اُس شخص کے ذہن میں تھے جس سے وعدہ کیا گیا تھا، دوم وہ غایت جو اس شخص کے نزدیک اس وعدے کو پُورا کرنے سے حاصل ہوتی۔ اب عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ وعدہ کرنے والے کو "مطلب"

کے مؤخر الذکر معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ وعدہ کرنے والا اُس غایت کو پیش نظر نہیں رکھتا جو اُس شخص کے سامنے ہوتی ہے جس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کو اس غایت کے وسائل سے سروکار ہوتا ہے، اگر اس کو معلوم ہو جائے کہ ان وسائل سے یہ غایت حاصل نہیں ہو سکتی تو عام حالتوں میں وہ اپنے وعدے سے بری نہیں ہو جاتا۔ لیکن فرض کیجئے مثال میں حالات بہت بدل چکے ہیں اور وعدے پر نظر ثانی نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں اکثر لوگ یہی کہیں گے کہ وعدہ کرنے والے کو اس شخص کی غایت پیش نظر رکھنی چاہیئے جس سے وعدہ کیا گیا تھا لیکن اس طرح یہ فرض بہت مبہم ہو جاتا ہے، کیونکہ بعض خاص حالات میں ایک شخص کی خواہشات کو دیکھ کر بتانا مشکل ہوتا ہے کہ دوسرے حالات میں اس کی خواہش کیا ہوتی۔ وعدے کے واجب ہونے کے اس خیال پر بہت سی مختلف رائیں ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایسی صورتوں میں بھی وعدے کے لفظی معنی لیے جائیں۔ اس کے برخلاف بعضوں کے نزدیک ایسی حالت میں وعدہ ختم ہو جاتا ہے۔

اور یہ کہا گیا ہے کہ وعدہ کسی ایسی بات کو کالعدم نہیں کر سکتا، جو پہلے ہی سے واجب ہے۔ لہٰذا اس اصول کے مطابق ہر شخص اتفاق کرے گا کہ دوسرے کو ضرر پہونچانے کا کوئی وعدہ جائز نہیں ہو سکتا لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تحدید میں وعدے کے دونوں فریق کس حد تک شامل ہیں۔ اول تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عام طور پر یہ تسلیم نہیں کیا جاتا کہ خود اپنے آپ کو ضرر نہ پہونچانا ویسا ہی فرض ہے جیسا کہ کسی دوسرے کو۔ لہٰذا عام خیال یہ ہے کہ کسی وعدے کو پورا کرنا محض اس وجہ سے غیر لازمی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ یہ احمقانہ تھا، اور یہ کہ اس کو پورا کرنے سے وعدہ کرنے والے کو اتنی تکلیف ہوگی، یا اس پر اتنا بار پڑے گا، جو اس شخص کے نفع سے کوئی نسبت نہ رکھے گا جس سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر ہم ایک انتہائی مثال اس صورت کی لیں جس میں وعدہ کرنے والے کا ایثار فریق ثانی کے نفع کے بالکل غیر متناسب تھا، تو اکثر صاحب ضمیر اشخاص رائے دیں گے کہ ایسے وعدے کو توڑنا اس کے پورا کرنے سے بہتر ہے۔ [illegible] وعدے کے پورا ہونے سے فریق ثانی کو پہنچے گا تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص کو نقصان پہنچانے کو بُرا کام کہتے ہیں نقصان سے ہماری مراد وہ نقصان نہیں جس کو وہ شخص نقصان سمجھتا ہے، بلکہ وہ نقصان ہے جو درحقیقت نقصان ہے۔ اگرچہ وہ خود اس کو نفع سمجھتا ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک نقصان کو میں نقصان نہ سمجھتا ہوں، لیکن تمام دنیا اس کو نقصان ہی کہتی اور سمجھتی ہو۔ سعدی شیرازی کا فلسفہ :-

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است اگر خاموش بنشینم گناہ است

اِسی اصول پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شخص زہر کو نہایت عمدہ خوراک سمجھکر مانگے اور میں دے دوں، تو میں ایک بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہونگا۔ لیکن اب فرض کرو کہ میں نے زید سے وعدہ کیا کہ میں اس کے لئے ایک کام کرونگا، لیکن قبل اس کے کہ وعدہ پُورا ہو حالات اتنے بدل جاتے ہیں کہ اب اس کو پُورا کرنے سے زید کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ ممکن ہے کہ حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی ہو بلکہ میرے خیال کی غلطی ہو۔ اب اگر زید ان حالات کے متعلق مختلف رائے رکھتا ہے، اور اس بنا پر وہ مجھ سے اُس وعدے کو پُورا کرنے کو کہتا ہے تو کیا مجھے اس کا حکم ماننا چاہیئے؟ یہ اتنی انتہائی صورت نہیں جتنی کہ زہر کی تھی۔ لیکن اگر اس اصول کا اطلاق ایک انتہائی مثال پر نہیں ہوتا تو ہم حدِ فاصل کہاں قائم کریں گے؟ کن حالات میں اور کس وقت میں اپنے خیالات کو ترک کرکے زید کی رائے کو اختیار کروں؟ اس سوال کا جواب بھی بہت مشکل ہے۔

اوپر یہ بھی کہا گیا ہے کہ وعدے کی پابندی صرف اس وقت ہوتی ہے جب دونوں فریق نے اس کے ایک ہی معنی لئے ہوں۔ یہ صرف اس طرح ہوسکتا ہے کہ اس وعدے میں جو الفاظ یا اشارے* استعمال ہوئے ہیں وہ بالکل صاف اور واضح ہوں، لیکن یہاں بھی بعض اوقات ابہام اور غلط فہمی پیدا ہو ہی جاتی ہے، پھر اکثر وعدوں میں صریح باتوں کے ساتھ ضمنی باتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں وعدے کی وضاحت اور تعیین میں کمی واقع ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اس سوال کے جواب کی کوشش علمی اہمیت اختیار کرلیتی ہے، جو اس سے قبل اُٹھایا گیا تھا یعنی وعدہ کرنے والا کہاں تک ان توقعات کو پورا کرنے پر مجبور ہے جن کو اس نے اپنی طرف سے پیدا نہیں کیا؟ ہم نے وہاں اس کو انصاف کرنے کا فرض کہا ہے، نہ کہ وعدہ پُورا کرنے کا فرض، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معمولی توقعات کو معیّن کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ بالعموم جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔ ہم ایک معمولی یا ایک اوسط انسان کا تصوّر قائم کرتے ہیں، اور معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ معلومہ حالات میں وہ کن توقعات کو پیدا کرے گا۔ ان توقعات کو ہم ان عقیدوں اور توقعات سے بہ طور نتیجہ اخذ کرتے ہیں، جو عام طور پر ایسے ہی حالات میں پیدا ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم لفظوں کے رواجی معنوں کی طرف مرافعہ کرتے ہیں، اور ان رواجی ضمنی باتوں کو ذہن میں لاتے ہیں جو ان حالات میں بالعموم پیدا ہوتی ہیں جن میں وعدے کے موجودہ دونوں فریق پائے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ معاہدہ کرنے والے فریق ان عام معنوں اور باتوں کے پابند نہیں، لیکن یہ ایک معیار ہیں، جس سے ہمارے

خیال میں ہر شخص واقف ہے، اور جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ بشرطیکہ صراحتہً ان کو رد نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر معاہدے کے دونوں فریق میں سے کوئی ایک اس عام طور پر مسلّمہ معیار سے صریحی اطلاع کے بغیر منحرف ہو گیا ہے تو پھر اس کو وہ تمام نقصان برداشت کرنا پڑے گا جو اس غلط فہمی سے پیدا ہو۔ مختصر یہ کہ یہ معیار عام طور پر قابل استعمال ہے۔ لیکن اگر رسم و رواج واضح نہ ہو یا ہر دم بدلنے والا ہو، تو یہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں فریقین کے دعوے ایک ایسا مسئلہ بن جاتے ہیں جس کا حل دشوار ہے۔

اب تک ہم نے فرض کیا ہے کہ وعدہ کرنے والا اپنے لفظوں کا انتخاب کر سکتا ہے، اور اگر دوسرا فریق ان لفظوں کو مبہم سمجھتا ہے تو وہ ان کو بدلوا سکتا ہے۔ یا ان کی تشریح کروا سکتا ہے۔ اب ہم کو ان وعدوں پر غور کرنا ہے۔ جو ایک پوری کی پوری قوم سے کئے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایسے لفظ استعمال کئے جاتے ہیں، جن کے معنی بدلے نہیں جا سکتے۔ لیکن یہاں اخلاقی تعبیر کے راستے میں اور زیادہ مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اس وعدے کے وہی معنے لئے جانے چاہئیں۔ جو وہ قوم اس کے الفاظ کے لیتی ہے۔ اب اگر یہ معنی بالکل واضح اور غیر مبہم ہیں۔ تب تو تعبیر کا یہ اصول بالکل صاف اور سادہ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک ہی قوم کے مختلف افراد ایک ہی لفظ کو مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو وعدہ پوری قوم سے کیا گیا ہے وہ ایک ہی معنوں میں سمجھا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وعدہ کرنے والا اپنے وعدے کے ان معنوں کے مطابق پورا کرے، جو سب سے زیادہ افراد سمجھے ہیں۔ یا وہ آزاد ہے کہ ان تمام امکانی معنوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرکے اس وعدے کو پورا کرے۔ اگر وعدے کے لفظ قدیم ہیں، تو پھر ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے وہ معنی لئے جائیں، جو اس وقت رائج تھے، جب وعدہ کیا گیا تھا، یا اگر یہ اس وقت مبہم تھے، تو اس کے وہ معنی لئے جائیں۔ جو اس حکومت نے ان کے لئے تھے جس نے یہ وعدہ کیا تھا؟ ان تمام باتوں کا فیصلہ بہت دشوار ہے، یہ دشواری اس واقعہ سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ کہ عام طور پر قومی محرکات اس بات کے موجود ہوتے ہیں کہ ان معاہدوں کو رسمی صورت دی جائے اور ان رسمی معاہدوں کی صاحبانِ ضمیر بھی بالکل غیر طبعی معنوں میں تعبیر کرتے ہیں۔ جب ایسے معاہدے کی یہ غیر طبعی تعبیر عرصے تک جاری رہتی ہے تو پھر ان معاہدوں کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کو محض "خاکہ" کہا جاتا ہے، یا اگر یہ اس درجۂ تنزل کو نہیں پہنچتے تو ان کے وہ معنی تو ضرور ہو جاتے ہیں۔ جو ان کے اصلی معنوں سے بے انتہا مختلف ہوتے ہیں۔ اب سوا

پیدا ہوتا ہے کہ تعبیر کا یہ تدریجی غیر مباح فساد یا ابتذال کس حد تک ایک ایماندار شخص کے لئے
وعدے کے اخلاقی وجوب میں ترمیم کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ عمل مکمل ہوتا ہے تو وعدہ پورا کرنے
کی خاطر ہم نئے معنوں کو اختیار کرنے میں حق بجانب ہونگے، خواہ یہ معنی اصلی معنوں سے کسی قدر مختلف
ہی ہوں۔ اگرچہ ایسی صورتوں میں ہمیشہ یہ ہونا چاہیئے کہ معنوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ معاہدے
کے لفظوں میں بھی تبدیلی کردی جائے۔ لیکن ابتذال کا مذکورہ بالا عمل اکثر نامکمل ہوتا ہے، کیونکہ
عوام کا ایک حصہ اس معاہدے کو اصلی معنوں ہی میں سمجھتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے وجوب
کی تعیین مشکل ہو جاتی ہے اور دیانت دار شخص کی اس کے متعلق رائیں متبائن اور پریشان کن
ہو جاتی ہیں۔

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اصولاً ہر وعدے کی پابندی لازمی ہے۔ یہ وعدہ صریحی ہو
یا ضمنی۔ اس اصول پر اتفاق صرف اس وقت ہو سکتا ہے۔ جب وعدے کی چند شرائط پوری ہوں
یہ شرطیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) وعدہ کرنے والے کو اُن معنوں کا یقین ہونا چاہیئے۔ جو دوسرے فریق نے اس کے لئے ہوں

(۲) دوسرا فریق وعدہ کرنے والے کو اس وعدے سے بری کرنے کے قابل ہو، لیکن بری نہ
کرنا چاہتا ہو۔

(۳) وعدہ زبردستی یا دھوکے سے نہ لیا گیا ہو۔

(۴) وعدہ واجبات و فرائض کے خلاف نہ ہو۔

(۵) ہم کو یقین ہو کہ اس کے پورا کرنے سے دوسرے فریق کو نقصان نہ پہنچے گا۔ یا اس کی وجہ
سے وعدہ کرنے والے کو ایک غیر مناسب ایثار نہ کرنا پڑے گا۔

(۶) جن حالات میں یہ وعدہ ابتدائً کیا گیا تھا، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوئی ہو۔

اگر ان چھ شرطوں میں سے ایک شرط بھی پوری نہیں ہوتی، تو پھر اتفاق غائب ہو جاتا ہے، اور
سمجھ دار شخصوں کے لئے اخلاقی حکم غیر واضح اور متناقض ہو جاتے ہیں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ کیا یہ ممکن
ہے کہ یہ تمام شرطیں پوری ہوں؟ دوسرے لفظوں میں کیا وعدے کا ایفا اتنا ہی آسان ہے، جتنا کہ
عام طور پر سمجھا جاتا ہے؟ کتنی سچی بات کہی ہے کسی کہنے والے نے:۔

وعدہ آسان ہے وعدے کی وفا مشکل ہے۔

—

ـــــــــــــــــــــ

”آفتاب تازہ“

(از حضرت احسان دانش کاندھلوی)

پہلی کرن جبینِ اُفق پر ہے آشکار　　مشرق کی ظلمتوں کا گریباں ہے تار تار
گلشن میں محوِ ناز ہے رعنائیٔ بہار　　غنچوں پہ اک شباب ہے پھولوں پہ اک نکھار
مستی لٹا رہا ہے چمن جھوم جھوم کر
نظریں اُتر رہی ہیں ستاروں کو چوم کر

جاگی ہے نوجوان بہاروں کی انجمن　　بھیگے ہوئے حسین نظاروں کی انجمن
رخصت ہے آسماں سے ستاروں کی انجمن　　آزردہ دل ہے نغمہ شعاروں کی انجمن
باسی نجوم تازہ تجلی میں بہہ گئے
انوارِ بے ثبات پہ شرما کے رہ گئے

تابندہ ہیں دماغ دلوں میں ہے موجِ نور　　روشن خیالیوں سے طبیعت کو ہے سرور
ذوقِ طلب کو شمع دکھانے لگا شعور　　بیداریوں سے خواب کے شیشے ہیں چور چور
افسردگی سے موجِ تبسم رواں ہوئی
خاموشیوں سے جوئے تکلم رواں ہوئی

مہکی ہوئی فضا ہے چمن لالہ فام ہے　　تعمیرِ زندگی کا نیا اہتمام ہے
سورج کی جو کرن ہے سنہری پیام ہے　　دورِ عمل ہے کارِ مغنّی تمام ہے
محفل میں شمع تازہ جلاتا نہیں کوئی
پروانہ ہنس کے جان گنواتا نہیں کوئی

ذرے نئے، زمیں نئی، آسماں نیا　　نکہت نئی، بہار نئی، گلستاں نیا
جلوے نئے، کلیم نئے، امتحاں نیا　　بزمِ جہاں نئی ہے نظامِ جہاں نیا
گونگی فضا میں بولتے انوار بڑھ گئے
سائے سمٹ کے درختوں پہ چڑھ گئے

سیلابِ وقت چال قیامت کی چل گیا / ٹھنڈی ہوا کے ساتھ زمانہ بدل گیا
شب کا دلِ سیاہ یہاں تک پگھل گیا / عالم تمام نور کے سانچے میں ڈھل گیا
ہر شاخ گنگنائی چمن بولنے لگے
تنکے ہوائیں لگتے ہی پر تولنے لگے

شب کے سرو و گنگ ہوئے، روشنی بڑھی / جاگے طیورِ نغمہ سرا، نغمگی بڑھی
افسردگی کا رنگ کٹا، دلکشی بڑھی / رفتارِ نبض تیز ہوئی، زندگی بڑھی
طاؤس اُٹھے، شعلہ نوا ساز آگئے
ذروں میں آفتاب کے انداز آگئے

باغوں میں عندلیب غزلخواں کا دور ہے / پھولوں میں جوشِ فصلِ بہاراں کا دور ہے
آنکھوں میں جلوہ ہائے فروزاں کا دور ہے / جلووں میں بے حجابیِ یزداں کا دور ہے
جام و سبو نگوں ہیں، خرابات بند ہیں
سینوں میں بے قرار دلِ دردمند ہیں

اے مطربانِ پست نوا دیکھنا! خموش / خاموش! اب یہ پست نوائی ہے بارِ گوش
اُٹھ جائیں بزمِ شعر و سخن سے گلو فروش / یارو سنو! کہ جوش پہ ہے نعرۂ سروش
بیداریِ حیات کا سامان آگیا
عہدِ نوا طرازیِ احسان آگیا

نمودِ صبح

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ اُفق سے آشکار / صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر / کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمون صبح / جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار
ہے تہِ دامانِ بادِ اختلاط انگیزِ صبح / شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہم کنار
ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل / ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب / نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب

اقبال

ملک کی موجودہ فضا اور غزل گوئی

از سید علی جواد صاحب زیدی صاحب سکریٹری انجمن ادب اُردو لکھنؤ

موجودہ سیاسی بیداری کے دوش بدوش، جس نے طول و عرض ملک میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑادی ہے، علمی اور ادبی حلقوں میں بھی زندگی کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ ادب و شاعری ایک انقلابی دور سے گذر رہے ہیں۔ اُردو شاعری نئے انداز سے بن سنور رہی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اب تک ہماری شاعری میں سچی زندگی کا عکس بہت کم نظر آتا ہے۔ اِن حالات میں ہماری خاموشی گناہ عظیم ہے جسے علم و ادب کی دیوی کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ یہ ضرور ہے کہ ابھی ہمارے پروں میں دُور تک اُڑنے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے، لیکن ہمیں اس آزمایش اور مشق سے غافل نہ رہنا چاہیئے۔ جو قوتِ پرواز پیدا کرسکتی اور جو ہمیں ثریائے مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔

میں نے جس انقلابی دور کا ذکر کیا ہے وہ آج سے نہیں بلکہ کئی برس پہلے سے شروع ہوچکا ہے۔ اگر ہم اس کی تاریخ لکھنا چاہیں تو ہمیں اُن ہنگامہ خیز ایام سے بھی قبل کے واقعات پر نظر ڈالنی ہوگی جب مغلوں کی شوکت شاہنشاہی چراغِ سحری کی طرح جھلملا رہی تھی۔ اُس نے ہندوستان کی امن پسند آبادی کو ہمیشہ سے غلام بنا رکھا تھا۔ مگر وہ انھیں اب اس سے بھی زیادہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر (خدا نخواستہ) ایک ابدی قید خانے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرنے کے لئے حکومت برطانیہ کے سپرد کر رہی تھی۔ گو اِن غلاموں کے لئے مغل اور انگریز دونوں یکساں تھے۔

وفا کیسی کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

لیکن پھر بھی انھیں "ملکی آزادی" کے نام پر بیوقوف بنایا گیا اور وہ بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ مغل ہوں یا انگریز دونوں کی شہنشاہیت کا مفہوم اُن کی غلامی ہے' اپنے وطن کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہانے کے لئے تیار ہوگئے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد غدر سے ہے۔ بہرکیف اسی زمانے میں جب تاریخ ہندوستان نے نیا ورق اُلٹا تھا، ادب اُردو نے بھی ایک انقلابی کروٹ لی تھی۔ یہ انقلاب یکایک رونما نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کے لئے غدر کے بھی پہلے سے مواد جمع ہو رہا تھا۔

جب مسلمان فاتحین کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ فارسی زبان بھی لائے تھے۔ "بلبل ہزار داستاں" کے "شیریں نغمے" اُن کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "سروِ شمشاد" کے "قد بالا" کا نقشہ اُن کی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ "نرگس" کی نیم باز آنکھیں" ہنو کے دے رہی تھیں۔ اُن کے فضائے خیال میں "سنبل" کے "گیسوے دراز" لہرا رہے تھے۔ "پھول وسیجوں" کی "ترنم ریز روانی" اُنھیں فراموش نہیں ہوئی تھی۔ "کوئل کی کوک" "پپیہے کی پی کہاں" اور "گنگا جی کی روانی" آتے ہی آتے اُن کے لئے جاذبِ توجہ نہیں بن سکتی تھی۔ جب یہ غیر ملکی شعرا اردو میں غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے تو اُنھیں فطرتاً فارسی غزل ہی کو مشعلِ راہ بنانا پڑا۔

لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ دکن کے ابتدائی غزل گو شعراء کے کلام میں اکثر و بیشتر مقامی رنگ پایا جاتا ہے۔ اُردو کی غزلیں ہندی شاعری کا تتبع کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُن میں عشق کے ایک بلند معیار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ہندی کے اثر سے عموماً محبّت کے ایسے جذبات نظم کئے گئے ہیں جو فارسی شاعری کا اہم عنصر اور جزو لطیف خیال کئے جاتے ہیں۔ جذباتِ عشق عورت کی زبان سے ادا کئے گئے ہیں۔ زبان کی نرمی اور شیرینی نے اِن لطیف جذبات سے مل کر اُردو غزل کے اس ابتدائی نقش کو اتنا حسین بنا دیا ہے کہ چشمِ بینا محوِ نظارہ رہ جاتی ہے۔ مثال کے لئے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

پیا باج پیالا پیا جائے نا　　پیا باج یکتل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن جوری کروں　　کھیا جائے اما کیا جائے نا

اِسی طرح سلطان محمد قطب شاہ جو قلی قطب شاہ کا بھتیجہ تھا، اپنی غزلوں میں قدم قدم پر ملکی اثرات کے جلوے دکھاتا ہے۔ اُس کے بھی دو شعر اس ضمن میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

پیا سانو لا من ہمارا بھولایا　　نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا
سکھی توں ہر گھڑی مجھ پر نہ کر غیظ　　محبت پر نظر رکھ کر لبسر غیظ

گو اِن دونوں شعروں میں فارسی کا ہلکا سا اثر موجود ہے لیکن وہ نظری ہے۔ عورت کی زبان سے ادا ہو کر ان الفاظ میں جان پڑ گئی ہے۔ یونہی عبداللہ قطب شاہ جو محمد قطب شاہ کا بیٹا تھا اپنے کلام میں شاعری کے ایسے ہی جذبات کو جگہ دیتا ہے۔ بطورِ مثال ایک شعر کافی ہو گا:۔

تری پیشانی پہ ٹیکا جھمکتا　　تماشا ہے اُجالے میں اُجالا

کچھ عرصہ کے بعد زمانہ کی ہوا کچھ ایسی بدلی کہ فارسی کے بڑھتے ہوئے اثر نے دکن کے شعرا

کو بھی مجبور کردیا کہ وہ اس راستہ کو ترک کردیں۔ چنانچہ عارف الدین عاجز ہی کے زمانے میں اردو غزل فارسی غزل کے خیالات و اسالیب بیان سے گرانبار نظر آنے لگی، مثالاً عاجز ہی کے تین شعر سُنیئے :۔

نہیں باور تو ظالم خُوک مت، جڑ دے کٹار اپنا نہیں چھوڑا لہو کا نام مجھ دل میں ترے غم نے

بڑھایا ہے بڑی محنت سے زاہد نے وقار اپنا بڑا پگڑا، بڑا شملہ، بڑا کلّہ، بڑا دھاڑا

کہ مجنوں آہ کر میرا قدم پکڑا کہا بس بس کیا کاٹوں کو یوں پامال میں پھر پھر کے صحرا میں

اس کے بعد یہ اثر ترقی ہی کرتا گیا۔ جب ہم آج کے "فلسفی شعرا" کا کلام دیکھتے ہیں تو ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ اردو کے سبدِ گل میں قاموس و صراح کے روڑے بھرنے والے آخر کیا چاہتے ہیں، مگر وہ کیا کریں ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

جہاں تک غزل کی معنوی اور صوری حیثیت کا تعلق ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے مکمل طریقہ سے فارسی غزل کی تقلید کی ہے۔ چند تبدیلیاں جو ہمیں بادی النظر میں دکھائی دیتی ہیں وہ اولاً تو کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، دوسرے انھیں بھی غیر ملکی حملہ آوروں کے معاشرتی رسوم نے پیدا کیا ہے۔ ورنہ مطلع سے مقطع تک یہ ہوبہو فارسی غزل کی نقل ہے۔

ابتدائی ادوار میں غزل مسلسل کا رواج تھا۔ اس میں ایک ہی جذبہ بالتسلسل نظم ہوتا تھا۔ غزل مسلسل موجودہ نظموں سے بہت کچھ ملتی جلتی تھی، لیکن سوسائٹی کی بد مذاقی کی وجہ سے یہ طریقہ مقبول نہ ہوسکا۔ جب سے مشاعروں کی بنیاد پڑی اور مصرع طرح دیا جانے لگا اُس وقت سے غزل پر آورد کا رنگ تیز ہوتا گیا۔ ہر شاعر اپنی عظمتِ شاعری کا سکہ عوام کے دلوں پر بٹھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ اشعار کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو غزلہ اور سہ غزلہ کا رواج ہوا جس میں زیادہ تر بھرتی کے اشعار ہوا کرتے تھے۔ اب یہ رسمیں تو بہت کچھ ترک ہو چکی ہیں لیکن بھرتی کے اشعار کی اب بھی کمی نہیں ہے۔ دکنی غزلوں کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہونچاتا ہے کہ دکن کے قدیم غزل گو شعرا نے چند ہندی کی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں لیکن ان بحروں کو بھی اردو نے خلعت قبول نہیں بخشا۔ یہ اُس خیال کی عملی مخالفت تھی جس نے زبان اُردو کی بنیاد ڈالی تھی۔ ادھر کچھ عرصہ سے ہندی، ہندوستانی اور اُردو کے قضیئے کا ایک خوش گوار اثر یہ ضرور ہوا ہے کہ اکثر ہندی کی بحروں میں اور خالص بھاشا میں چند غزلیں، کہی گئی ہیں۔ لیکن اُن کو بھی کوئی اہمیت نہیں

دی جا سکتی۔

اُن مضامین کے متعلق جو غزل نے اپنی حدود میں داخل کر لیے ہیں علیحدہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اُردو کے تمام تر غزل گو شعرا ایسے تھے جو اس خبط میں مبتلا رہے کہ سوسائٹی صیغہ ہائے تانیث کے استعمال کو غزل کے لئے یا کسی اور صنفِ شاعری کے لئے جائز قرار نہ دے گی۔ کیونکہ پردے کا رواج بہت سخت تھا۔ اور اس زمانے کی تہذیب شاعری میں صنفِ نازک کے تذکرے کو پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتی تھی۔ یہ وہ خیال ہے جو کئی مرتبہ موئدین غزل کی طرف سے پیش کیا گیا ہے اور اپنے خیال میں اس اعتراض کا مسکت جواب دیا گیا ہے۔ کہ غزلوں میں معشوق کے لئے صیغۂ تذکیر کے استعمال نے حقیقی جذبات میں تصنّع کا پہلو پیدا کر دیا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین صاحب رضوی ادیب اپنی کتاب "ہماری شاعری" میں تحریر فرماتے ہیں :-

"ہمارے شاعروں نے ایشیائی حیا کے تقاضے سے معشوق کے چہرے پر رازداری کی نقاب ڈال دی ہے کہ دیکھنے والے اُسے پہچان نہ لیں"

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں :-

صدہا ناٹک، واسوخت، مثنویاں عشق کی مفصل اور طولانی داستانیں سُنا رہی ہیں۔ مگر کیا ان میں ایک قصہ بھی ایسا ہے جس میں عاشق و معشوق دونوں مرد ہوں"

دونوں اقتباسات کو سامنے رکھکر غور کیجئے تو فوراً پتہ لگ جائیگا کہ یہ منطقی دلائل کہاں تک قابلِ قبول ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو سوسائٹی غزل میں عورت کے تذکرے کو ناپسند کرتی ہے وہ مثنویوں ناٹکوں اور داستانوں میں اسے کیونکر پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھ سکتی ہے۔ ہر زمانے میں سوسائٹی یونہی موردِ الزام بنائی گئی ہے۔ جب کسی رسم و رواج میں اصلاح کی کوشش کی گئی یا کسی خلافِ عقل رسم کے متعلق بازپرس ہوئی تو سوسائٹی کی گردن ناپی گئی۔ اور شعراء کو چھوڑیئے دوسرے تذکروں کو جانے دیجئے۔ مُلا جامی علیہ الرحمہ کی "یوسف زلیخا" اُٹھا لیجئے، ایک مذہبی شخص ایک مذہبی داستان نظم کرتا ہے لیکن اس میں بے تکلف عریاں مناظر کی تصویر کشی کرتا ہے، مگر سوسائٹی اس پر وجد کرتی ہے، اس کی رگِ حمیت نہیں پھڑکتی۔ جوش اُس وقت آتا ہے جب غزل میں مؤنث افعال کے استعمال کا موقع آتا ہے۔ یہ بات صرف اُنھیں لوگوں کی سمجھ میں آ سکتی ہے جن کی آنکھوں پر مجدّدین کے خلاف تعصب کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس کا اصلی سبب میں بتاتا ہوں۔ اس کے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ کس پوشیدہ قوت نے تمام صنفِ نازک

کو دنیائے غزل میں لانے کے بعد صنف قوی میں تبدیل کر دیا ہے۔

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی شعر الہند میں رقمطراز ہیں :-

"ایشیا کے تمام علوم و فنون نے اگرچہ سلطنت ہی کے دامن میں نشو و نما پائی، بالخصوص فارسی شاعری تو ہمیشہ امرا و سلاطین کے درباروں سے وابستہ رہی لیکن یہ اُردو شاعری کی خوش قسمتی تھی کہ جب تک دلّی میں نشو و نما پائی ...... فقراء کے دائروں اور صوفیوں کی خانقاہوں سے باہر بہت کم قدم رکھا۔"

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ تقریباً اُردو کے تمام ابتدائی شعراء صوفی تھے۔ امیر خسرو جو عموماً اُردو شاعری کے بانی کہے جاتے ہیں ایک مشہور صوفی اور خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمۃ کے مُرید تھے۔ اسی طرح ولّی بھی صوفی اور شاہ سعد اللہ گلشنؒ کے مرید تھے۔ شاہ مبارک آبرو بھی صوفی تھے اور اُن کا سلسلۂ ارادت شاہ محمد غوث گوالیاری تک پہونچتا تھا۔ شیخ شرف الدین مضمون پہلے ایک پُرجوش سپاہی تھے لیکن بعد میں وہ صوفیانہ خیالات میں ڈوب گئے۔ شاہ حاتم ایک فقیر منش بزرگ تھے اور جان جاناں مظہر ایک بزرگ صوفی، میر بھی صوفی منش تھے، درد خواجہ بہاء الدین نقشبند سے سلسلۂ ارادت رکھتے تھے۔

صوفیائے کرام "ہمہ اوست" اور "ہمہ جا اوست" کا دم بھرتے تھے۔ عشق مجازی عشق حقیقی کا آئینہ دار تھا۔ اُن کے نزدیک صنف قوی اور صنف نازک میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ ہر حسین چیز سے محبت کرتے تھے، اُنھیں اس دنیاوی حُسن کے پردے میں کوئی اور ہی جلوہ فرما نظر آتا تھا۔ اس لئے انھوں نے شماتتِ دنیا سے بچنے کے لئے عورتوں کے تذکرے سے پرہیز کیا۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اُنھیں بوالہوس سمجھنے لگیں، اسی خوف سے انھوں نے صنفِ نازک کا تذکرہ نہ کیا۔ وہ لوگ جو فلسفۂ صوفیت سے واقفیت نہ رکھتے تھے یا جنھیں صوفیوں کی بلند خیالیوں میں شریک ہونے کا موقع حاصل نہ تھا اُنھوں نے اس حقیقت پر غور کئے بغیر صیغوں کو برقرار رکھا، مگر اشعار ایسے ایسے کہے جن سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ معشوق مرد نہیں عورت ہے۔ مثلاً :-

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

غرض صیغے عموماً مذکر ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ عشق و محبت کی داستانیں اور صوفیانہ خیالات اس طرح تذکیر کا لباس پہنکر غزل کی محفلوں میں جلوہ افروز ہوئے۔

فلسفیانہ مضامین نے بھی غزل کے دامن میں جگہ پائی ہے لیکن تمام فلسفیانہ خیالات بجز معدودے چند انسان کو یاس وقنوطیت میں مبتلا کرتے ہیں۔ شراب وساقی کی داستانیں جو کبھی کبھی سننے میں آتی ہیں وہ غیر ملکی معلوم ہونے کے باوجود دل کے اس بوجھ کو کم ضرور کر دیتی ہیں جس کا بڑھانا غزل کا اصل اصول ہے۔

اِس سلسلہ میں لکھنؤ اسکول فراموش نہیں کیا جا سکتا جس نے معاملہ بندی پر خاص زور دیا اور صنائع وبدائع میں اُلجھ کر نفس شعر کو بالائے طاق رکھدیا۔ یہ تنگیِ تمدن وتہذیب مضمون کچھ دنوں سوسائٹی کی بد مذاقی کی بدولت لکھنؤ کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ضرور بنا رہا لیکن اب لکھنؤ میدانِ غزل گوئی میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

اُردو کی موجودہ غزلیات نے گو کہ باعتبار تنوع مضامین بہت کافی ترقی کر لی ہے لیکن پھر بھی غزل کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ اب اس کی ضرورت ہمیں نہیں۔ غالب کو اس کا احساس غدر کے پہلے ہی ہو گیا تھا کہ غزل کی محدود دنیا میں مقید رہنا شاعرانہ آزادی کے منافی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے ایک شعر میں اس کا اظہار بھی کیا کہ

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

صرف یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی غالب نے اپنے دیوان فارسی کے دیباچے میں اپنی شاعری کے متعلق بہت سے فخریہ اشعار لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ

> در ہوائے کہ بالِ بالا خوانی زدہ، ودر ادائے کہ خود را بہ شگرفی ستودہ ام (یعنی جس دیوان پر میں نے اس قدر فخر کیا ہے) نیمہ ازاں شاہد بازی است یعنی ہوا پرستی (اس سے مراد غزل گوئی ہے) ونیمہ دیگر تو نگر ستاں است یعنی باد خوانی۔ (اس سے مراد قصیدہ گوئی ہے۔)

اِن مثالوں سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جس غزل کو سوسائٹی اس طرح کلیجے سے لگائے ہوئے تھی، غالب اس کو ادائے خیالات کا محدود ذریعہ اور ہوا پرستی کے مرادف سمجھتے تھے۔ رسالہ "ادبی دنیا لاہور" کے سالنامہ ۱۹۳۶ء میں راشد وحیدی صاحب "اُردو ادبیات پر غالب کا اثر" میں لکھتے ہیں کہ:۔

> "غالب کی شاعری ہر چند حالی اور آزاد کی تحریکوں کی طرح شعوری طور پر نہیں، مگر بے شبہ اُردو غزل میں بالکل نئی تحریک تھی جس کا احساس آج تک نہیں کیا گیا۔ غالب کے زمانے تک ...... اردو غزل سکہ کر زبان کی شاعری رہ گئی تھی۔ لیکن غالب کی ذات اس رسمی شاعری کے خلاف ایک بہت بڑی بغاوت

تھی جس نے حالی کی نئی تحریک کے لئے راستہ صاف کیا تھا۔"

تقریباً اسی زمانے میں میر انیس لکھنؤ میں دادِ سخنوری دے رہے تھے۔ انیس کے مرثیے اس بات کا غیر فانی ثبوت ہیں کہ وہ جادۂ عام سے الگ ہٹ کر چل رہے تھے اور اردو میں جدید شاعری کا سنگِ بنیاد رکھ رہے تھے۔ مولوی امیر احمد صاحب علوی "یادگار انیس" میں لکھتے ہیں کہ:-

"میر صاحب نے صنائع لفظی پر زیادہ توجہ نہیں کی، مراعات النظیر کی مثالیں، اُن کے کلام میں بعض جگہ پائی جاتی ہیں، اس کو بھی وہ عیب سمجھتے تھے۔ کسی شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ "آپ صنعت لفظی کو پسند کرتے ہیں؟" تو ارشاد ہوا کہ "کیا کروں لکھنؤ میں رہنا ہے۔"

اور جیسا کہ انیس نے رشید سے کہا تھا وہ سلام اور مرثیے ہی کو اپنی غزل سمجھتے تھے۔ گو غزل سے یہ نفرت مذہبی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ لیکن بہر کیف وہ غزل گوئی سے گریزاں تھے۔ اور اس انقلاب ادب کے بانی۔ (حامد اللہ افسر صاحب کا خیال ہے کہ انیس جدید اردو شاعری کے بانی تھے) لیکن ہم اس جگہ نظیر اکبر آبادی کو بھول نہیں سکتے۔ اُن کے کلام میں بھی اس قسم کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غدر سے پہلے ہی شاعری کے قدیم اور فرسودہ طریقہ کے خلاف ایک غیر محسوس بغاوت کی ابتدا ہو رہی تھی۔

اس کے بعد غدر کا پُر ہول اور ہیبت ناک ہنگامہ برپا ہوا، امن و امان، جان و مال سب کچھ خطرے میں پڑ گیا، قدیم سلطنتیں تباہ و برباد ہو گئیں، اور ہندوستان ایک مغربی طاقت کے سایۂ عاطفت میں زندگی کی سانسیں لینے لگا۔ غدر کی تباہ کاریوں کا اثر نہ صرف ہندوستان کے سیاسی و معاشرتی حالات پر پڑا بلکہ علمی اور ادبی دنیا میں بھی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ جب اس قومی مصیبت (غدر) کا آغاز ہوا تھا اُس وقت اُردو شاعری کی ادبی ذہنیت غلامانہ اور پست ہو چکی تھی۔ اُنھوں نے مضامین کی مسلسل تکرار، صنائع و بدائع کے استعمال، مبالغہ کی بے اعتدالی، تشبیہ و استعارہ کی بھرمار اور اسالیب بیان کی پیچیدگی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اگر غدر کے بعد حالات نہ تبدیل ہو گئے ہوتے تو اُردو غزل کا خدا حافظ تھا۔

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے اتحاد کا سب سے زیادہ خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری اور ادب پر مغربی ادبیات کا اثر پڑنے لگا جس طرح جدید نثر اُردو کے بانیوں میں سب سے نمایاں حیثیت ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ہے۔ اسی طرح جدید نظم اُردو کا حقیقی بانی بھی کرنل ہالرائڈ ایک انگریز ہی ہے۔ اس نے آزاد کو جدید طرز کے مشاعروں کی بنیاد ڈالنے پر مجبور کیا۔ آزاد و حالی نے

مشعلِ ہدایت دکھائی اور سب سے پہلے عملی حیثیت سے میدانِ اصلاح میں کود پڑے۔ ان کے ذاتی خیالات کیا تھے اس کا کچھ اندازہ "مقدمۂ شعر و شاعری" اور "آبِ حیات" کے دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ ہاں تو پنجاب میں ایک ایسی بزم مشاعرہ کی بنیاد ڈالی گئی جس میں مصرعۂ طرح کی جگہ عنوانِ نظم دیا جاتا تھا اور غزلوں کی جگہ نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ یہ اُردو غزل کی سب سے پہلی عملی مخالفت تھی۔ حالیؔ اور آزادؔ اس انجمن کے روحِ رواں تھے۔ "حبِّ وطن" اور "برکھا رُت" وغیرہ مشہور نظمیں یہیں پڑھی گئیں۔ اس انقلابِ عظیم نے اُردو شاعری کو اُس نیند سے چونکایا جس میں وہ مدّتوں سے سرشار تھی۔

گو اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ "غزل" کی حکومت کا زوال شروع ہو چکا ہے لیکن ع

"بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے"

نزع کے عالم میں غزل سنبھالا لے رہی ہے، آرزو، اقبال، حسرتؔ موہانی، جگرؔ مرادآبادی، اور فانیؔ بدایونی وغیرہ تاثیر، ترنّم، داخلی پہلو، جذبات میں ہمواری اور یکرنگی پر زور دے رہے ہیں۔ اِس قلبِ ذہنیت کا اثر آرزو کے مقدمۂ "جہانِ آرزو" سے ظاہر ہوتا ہے، وہ تحریر کرتے ہیں کہ:۔

"کلام تو نثر و نظم دونوں میں عام ہے، مگر اسے تعریفِ شعر میں لانے والی دو ہی چیزیں ہیں، (۱) مفہوم کی تاثیر، (۲) الفاظ کا ترنّم، اور چونکہ ترنّم خود بھی تاثیر کا عامل ہوتا ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ معنی سے تاثیر پیدا ہو یا لفظ سے، شاعری کی بنیاد اثر آفرینی پر ہے، یہی روحِ شعر ہے، یہی غایتِ شعر ہے اور یہی شعر و غیر شعر میں تنہا امتیازی جوہر شاعر کو ساحر بنا دیتی ہے۔"

لیکن ہندوستان کی آبادی کی طرح موضوعاتِ شاعری کا دائرہ بھی بڑھتا جاتا ہے، اور اُردو شاعری کو ترقی اور عروج کی شاہراہیں اپنی جانب بُلا رہی ہیں۔ مستقل نظموں کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے اور سائنس کی ترقی، فنونِ لطیفہ میں اہم تبدیلیاں کرتی جا رہی ہے۔ اس لئے یہ پیشین گوئی کرنا بہت دشوار نہیں کہ نظم بہت جلد غزل کی جگہ لے لیگی۔ جو لوگ اس وقت بھی غزل کی حمایت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اُنھوں نے "نوجوان ہندوستان" کا نفسیاتی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اگر غزل غزل کی صدائیں ہی کچھ دنوں اور بلند رہی تو خطرہ ہے کہ اس کا ردِّ عمل ملکی ادبیات کے لئے بالکل تباہ کن ثابت ہو کر رہے گا۔

غزل کے مؤیدین اور مخالفین:۔ مصنف "ہماری شاعری" مولوی امداد امام صاحب اثرؔ کے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کہ صنف (غزل) کا یہی تقاضا ہے کہ اُمورِ داخلی کے سوا اُمورِ خارجی قلمبند نہ ہوں لکھتے ہیں کہ واقعہ نگاری اور منظر نگاری غزل کے احاطے سے خارج ہیں۔ لیکن ایک ہی سانس میں

جب غزل کا جوش حمایت انھیں مجبور کرتا ہے تو وہ منشی جگت موہن لال رواں مرحوم کا یہ شعر پیش کر دیتے ہیں کہ:-

اللہ اللہ رے یہ وسعتِ دامانِ غزل بلبل و گل ہی پہ موقوف نہیں شانِ غزل

ختم پہنائے دو عالم پہ ہے پایانِ غزل پوچھیے حافظِ شیراز سے امکانِ غزل

منبط ہے آئینۂ رازِ حقیقت اِس میں

یہ وہ کوزہ ہے کہ دریا کی ہے وسعت اِس میں

مصنف کا بیان اپنی تردید آپ کر رہا ہے۔ اُن سے کون پوچھے کہ کیا منظر نگاری اور واقعہ نگاری پہنائے دو عالم سے علیحدہ ہیں۔ اس جگہ نامناسب نہ ہوگا اگر میں جناب آرزو کی ایک نظم سے چند ایسے اشعار نقل کر دوں جو اُنھوں نے غزل کی حمایت میں ارشاد فرمائے ہیں:-

سُن لے اے ناواقفِ رازِ غزل رکھتا ہے اسرار کیا سازِ غزل

ظاہرا اک صنف ہے محدود سی جس سے ہیں منسوب عشق و عاشقی

باطناً دنیائے لامحدود ہے کُل کا کُل اِس جزو میں موجود ہے

تہ جو اس کے فرد کی بھی پا گیا جملہ اصنافِ سخن پر چھا گیا

ہے اگر حاصل غزل میں دستگاہ سامنے ہے ہر سخن کی دستگاہ

گُل جو ہو جائے غزل ہی کا چراغ

سب ستارے بن کے رہ جائیں گے داغ (جہانِ آرزو مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ)

یہ وہ کچھ نئے دلائل ہیں جو غزل کی حمایت میں پیش کئے جاتے ہیں اور اس لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ اسی سہارے غزل کچھ دنوں اور زندہ رہ سکے۔ اس میں شک نہیں کہ جناب آرزو نے غزل کی ہمدردی میں جو دلیل پیش کی ہے وہ بہت کچھ صحیح ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ جب تک کسی شاعر کو غزل گوئی میں کمال حاصل نہ ہو وہ کامیاب شاعر نہیں ہو سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غزل کے ایک ہی شعر میں ایک پورے خیال کو ادا کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے طبیعت اختصار پسند ہو جاتی ہے اور جو شاعر جتنے ہی کم الفاظ میں کسی خیال کو ادا کر دیتا ہے وہ اتنا ہی زبردست شاعر ہے۔ اُسے گویا زبان پر حاکمانہ قوت حاصل ہے۔ لیکن موصوف نے تصویر کا دوسرا رُخ ملاحظہ نہیں فرمایا ہمارا تجربہ تو ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اچھا غزل گو اچھا ناظم اور اچھا ناظم اچھا غزل گو نہیں ہوتا۔ اقبال و جوش کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں اور یہ واقعہ بھی ہمیں معلوم ہے کہ جب غالب کو انیس کا مرثیہ دکھا کر

اُن سے فرمائش کی گئی کہ آپ بھی ایسا ہی مرثیہ کہئیے تو انھوں نے مرثیہ کے بارہ بند لکھکر چاک کر ڈالے کہ یہ کام انیس ہی کا ہے مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ مولانا صفی کو بھی جو مرتبہ مرثیہ گوئی میں حاصل ہے وہ غزل گوئی میں حاصل نہیں ہوسکا۔ اس کا بھی ایک سبب ہے۔ غزل گو اس بات کا عادی ہوجاتا ہے کہ وہ کسی جذبہ یا حالت کے ایک ہی پہلو پر نگاہ ڈالے۔ وہ باریک سے باریک پہلوؤں اور تمام ضمنی باتوں پر نہ تو غور کرتا ہے اور نہ غور کرسکتا ہے جب وہ نظم کہنے بیٹھتا ہے تو اُس کی یہ انتہائی اختصار پسندی جو کثرت غزل گوئی سے اس کی فطرت ثانوی بن جاتی ہے، اُسے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ ایک نظم گو ایک چیز کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اپنی تصویر میں ہر ممکن رنگ بھرتا ہے۔ لیکن غزل گو کی تصویر سیاہ پنسل کی بنائی ہوئی تصویر کی طرح ایک ہی رنگ سے رنگی ہوتی ہے۔ ایک ہی جذبہ کے مختلف پہلو ہماری نگاہوں کے سامنے کبھی نہیں آتے۔ اس عبارت کا مقصد یہ ہوا کہ "غزل" اور نظم دو مختلف چیزیں ہیں۔ مختلف خصوصیات کی حامل ہیں اور مخصوص صلاحیتوں کی طالب ہیں۔

اس کے علاوہ اہل نظر جانتے ہیں کہ غزل کی اس خصوصیت پر زیادہ زور دینا مناسب بھی نہیں ہے کہ وہ شاعر کو اختصار پسند بنا دیتی ہے۔ شاعری اصل میں جذبات کا اضطراری طور پر ادا ہوجانا ہے۔ ایک خیال کی مسلسل قطع و برید اور الفاظ کی کاٹ چھانٹ کے بعد کوئی شعر کہنا شعر کو ذلیل کرنا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ وہ جذبہ شاعر کا حقیقی جذبہ نہیں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی گوشے سے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے۔ خود کوئی اثر نہیں لیتا۔ بلکہ اُن واقعات کی ایک تفصیل ہمارے سامنے مختصر اور کم سے کم الفاظ میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ صرف ایک جذبہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے یوں آئے کہ اُس کے تمام دوسرے پہلو پوشیدہ رہیں۔ شاعری اس قتل و غارت کا نام نہیں ہے۔ شاعر کا یہ فرض ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرے اسے بے کم و کاست دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرے کہ وہ شاعر کے دلی جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور خود بھی اپنے دل میں انھیں جذبات کو کارفرما دیکھے۔

اب یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ غزل میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ایک غزل گو کامیابی سے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرسکتا ہے اُن کا حقیقی اور اصلی منشا کیا ہے وہ دراصل اس پہلو کو روشن کرکے اس لئے دکھاتے ہیں کہ یہ سوال ہی نہ پیدا ہونے پائے کہ آج کل ملک کو غزل کی زیادہ ضرورت ہے یا نظم کی۔ اور غزل کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ لیکن میرا مقصد کسی غلط فہمی کا پیدا کرنا نہیں ہے۔ میں نہ تو غزل کے محاسن سے انکار کرتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ غزل نے ادب اُردو کی گراں بہا خدمتیں انجام نہیں دی ہیں۔ لیکن [illegible]

معاشرتی حالات بالکل ہی نہیں رہے۔ جن میں اُردو غزل کی نشوونما ہوئی تھی۔ اب غزل گوئی پر اصرار کرنا ادبِ اُردو کی راہِ ترقی میں روڑے اٹکانا نہیں۔ حالت یہاں تک پہنچی ہے کہ جب اُردو شاعری اپنے سرمایۂ عمر یعنی غزل کو مہذب دنیا کے سامنے فخر کے ساتھ پیش کرتی ہے تو وہ اس میں سوائے عیوب کے خوبیاں پاتے ہی نہیں۔ چنانچہ سر چارلس لائل (Sir Charles Lyall) لکھتے ہیں:-

> اُردو شاعری ہر نوعیت سے فارسی شاعری کی تقلید کرتی ہے۔ زیادہ تر وہی مضامین ہوتے ہیں جو فارسی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ابتدا سے آخر تک ہمیں اسلوب بیان اور خیالات میں جدت کی جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی۔ ...... اور جب جو کچھ شاعر کہنا چاہتا ہے اُس کے لئے وہی مواد ہو جس پر سیکڑوں نہیں ہزاروں شعرا خامہ فرسائی کر چکے ہیں تو شاعر کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اُسے ایک انفرادی حیثیت سے ادا کرے۔ اس وجہ سے اُردو شاعری کی نمایاں خصوصیت شاعرانہ جذبات نہیں بلکہ صنائع و بدائع تھے۔

میں سر چارلس لائل کے خیالات سے کچھ اختلاف محض اسی بنا پر ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اولاً تو اُردو شاعری کا بنظرِ غائر مطالعہ نہیں کیا دوسرے وہ سوسائٹی اور ماحول کے اثر کو بالکل ہی نظر انداز کر گئے ورنہ اُن کے خیالات ہمارے غور و فکر کے لئے بالکل کافی ہیں:

اگر اب بھی شاعری سوسائٹی کے مذاق کا تتبع نہیں کر سکتی تو اس کی زندگی محالات سے ہے۔ یہ محض عبارت آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے، اور ہم سب کے لئے غور و خوض کی دعوت بھی۔ یہ ضرور ہے کہ ہر مصلح کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ہمیں اُمید کو ہاتھوں سے جانے نہ دینا چاہیئے۔ ہمارے ملک کے بدلتے ہوئے خیالات کی رو بتاتی ہے کہ یہ سب ہو کے رہیگا۔

یاس کی محفل میں ارمانوں کو جانے ہی نہ دے ۔۔۔ اپنی صورت نااُمیدی کو دکھانے ہی نہ دے
آتشِ دل آبِ حسرت سے بجھانے ہی نہ دے ۔۔۔ کچھ بھی ہو چتون پہ لیکن میل آنے ہی نہ دے

نالۂ غم میں بھی اندازِ ترنم ہی رہے
مثلِ گُل دل خون ہو لب پر تبسم ہی رہے

آج کی دنیا گذشتہ عہدوں کی بھولی بھالی دنیا نہیں ہے، بلکہ اب زمانہ حریتِ فکر کا فدائی ہو رہا ہے اب ہر شخص کچھ نہ کچھ ضرور سوچتا ہے اور اپنے افکار کو جامۂ عمل پہنانے کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ خواہش آگے چلکر عملی صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔ پھر نااُمیدی کا کونسا محل موجودہ غزل پر بھی بہت سے اعتراضات کئے جاتے ہیں جن میں سے کم از کم دو بہت اہمیت

رکھتے ہیں:-

(۱) غزل کے ہر شعر میں ایک ہی جذبہ نظم کیا جاتا ہے اور ہر شعر کا مضمون دوسرے شعر کے مضمون سے بالکل بے تعلق ہوتا ہے۔ پہلے تو ہموزن قافیہ، ایک ردیف اور ایک ہی بحر کی قیدیں اتنی سخت ہیں کہ کسی جذبہ کا آزادی سے ادا ہو جانا صرف اتفاق ہی پر ممکن ہے ورنہ عموماً بہت دشوار ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی کچھ عجیب و غریب ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک شاعر پر مختلف کیفیتیں کس طرح طاری ہوتی ہیں۔ ابھی وہ موت پر اشکبار ہے، ابھی شراب کے نشے میں چور ہے، ابھی زاہد کی پگڑی اچھال رہا ہے، ابھی بلبلوں کے نغمے سن کر خوش ہو رہا ہے۔ آخر یہ ہنگامہ کیا ہے۔ کسی وقت میں ایک ہی جذبہ طاری ہو سکتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ جذبات کا اظہار ہو رہا ہے تو وہ حیرت انگیز ہے۔ ابھی ایران اور تھوڑی دیر کے بعد نہیں بلکہ فوراً ہی توران کی سوچنے لگنا پریشان خیالی کا ثبوت بن سکتی ہے، مگر یہ قابل قبول نہیں کہ شاعر روتے روتے یکایک ہنسنے لگے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ شاعر سب کچھ بیان کرے اور خود اس کے دل پر اس بیان کا کوئی خاص اثر نہ ہو۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قافیہ دیکھتے ہی گذشتہ واقعات یاد آجاتے ہیں، لیکن اولاً تو گذشتہ واقعات اتنے اثر انگیز طریقہ پر بیان نہیں ہو سکتے جتنے تاثیر خیز انداز میں اس وقت بیان ہو سکتے تھے۔ جب اُن کا اثر دل پر تازہ تھا۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو ہر قافیہ کے ساتھ جذبات اور حسیات کا الکدم تبدیل ہو جانا یعنی چہ؟ وہ جذبہ ہی کیا جو تھوڑی دیر شاعر کو بیخود بنا کر اس عالم میں نہ پہنچا دے جہاں کے لئے غالب نے کہا ہے کہ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

جناب آرزو کی کامیابی کا موجودہ دَور میں یہی راز ہے کہ وہ کسی مخصوص جذبہ میں ڈوب جاتے ہیں اور اشعار کہتے ہیں اس لئے عموماً ایک ہی جذبہ پوری غزل پر چھایا ہوتا ہے لیکن ایسی ہستیاں نادر الوجود ہیں اور ایسے لوگ کم ہوتے ہی چلے جائیں گے۔ آئندہ زمانہ میں ایسے افراد کے پیدا ہونے کی اُمید بالکل ہی نہیں ہے کیونکہ نوجوان طبقہ غزل گوئی سے بالعموم بدظن ہوتا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض غزل گوئی پر یہ ہے کہ اُس نے زیادہ تر ہم کو حسرت و یاس و حرمان کے درد انگیز اور عبرتناک افسانے اس پیرائے میں سنائے ہیں کہ ہمارے جذبات پست ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ اعتراض ملک کی سیاسی زندگی کا نتیجہ ہے۔ اب ہائے وائے کا وقت نہیں ہے، اب زمانہ اُس مسرت کا متلاشی ہے جو رنگین اُمیدوں کے دامن میں پرورش پاتی ہے۔ جو حیات کو اپنا نصب العین بنانا چاہتی ہے، اب

ہم کو ایسے منظومات کی ضرورت ہے جو قومی، ملکی، سیاسی، معاشرتی مسائل سے متعلق ہوں۔ مناظر قدرت، نفسیات، فلسفۂ حیات اور کامرانی و شادمانی کا اظہار جن کی منزلِ مقصود ہو۔ اس کا احساس غزل کے زبردست موئدین کو بھی ہو چلا ہے۔ چنانچہ مصنف "ہماری شاعری" کا قول ہے کہ:۔

"اگر ہر شاعر آہ و زاری، اضطراب و بے قراری ہی کو موضوع شاعری سمجھ لے تو ضرور قوم کا دل افسردہ اور طبیعت مردہ ہو کر قومی اخلاق میں پستی آ جائے گی۔۔۔۔۔۔۔۔ اب ضرورت ہے ایسے شاعروں کی جو دلیری اور جانبازی کے جذبات کو بھڑکائیں، جو ہمدردی اور رواداری کے خیالات کو اُبھاریں اور ملک میں حبِ وطن اور قوم پرستی کی روح پھونکیں۔"

اگر ہمیں اُردو شاعری سے محبت ہے اور اگر ہم اس کے بقا کی صورتیں مہیا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اب زیادہ خوابِ غفلت میں پڑا نہ رہنا چاہیئے۔

ورڈس ورتھ نے لیرکل بیلڈس (Lyrical Ballads) کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "شعر انسان اور فطرت کا عکس اور شدید جذبات کے از خود چھلکنے کا دوسرا نام ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ اگر شاعر نے کائنات، فطرت اور نفسیات کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے اور اگر اس کے قلم میں اس کی قوت نہیں ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں کے ہیجان احساسات اور دماغ کی بلند پروازیوں کو صحیح طور سے اور بہترین عکاس کی طرح ہر ہر پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے ناظر کے سامنے پیش کر سکے تو وہ مکمل شاعر نہیں کہلا سکتا۔ شاعری حسیات کی مصوری کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اور حیات کی وسیع سلطنت میں ہر وہ چیز شامل ہے جو آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر، بلکہ آسمان سے بھی اوپر اور زمین سے بھی نیچے موجود ہے حیات محض آمد و رفت نفس کا نام نہیں ہے، بلکہ حیات وجود کائنات ہے، مسلسل حرکت اور انقلاب کا بحر بے پایاں ہے۔ ہم جو کچھ سنتے، دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں اُن سب کا تعلق حیات سے بہت گہرا ہے، حیات قدرتِ خدا کی مظہر ہے، اور ماسوا اللہ جو کچھ ہے وہ حیات کے سہارے موجود ہے۔ مگر ہمارے غزل گو شعرا نے اس حیات کو اتنا محدود کر دیا ہے کہ اس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک حیات ایک قید ہے، مصیبت ہے، آفت ہے۔ وہ قید سے آزاد ہو جانا چاہتے ہیں۔ خدا اُنھیں زندہ رکھے، وہ غلطی پر ہیں۔ ہم حیات ہی کے طالب ہیں، لیکن غزل کی دنیا میں اس کا کہیں وجود نہیں۔

ہمارے شعرا کے لئے اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ وہ اپنے تخیل کے عالی شان محل کی بنیادیں مشاہدات پر قائم کریں۔ اور زندگی کے دل فریب نقش و نگار سے اس محل کی زینت بڑھائیں۔ اب تک ہمارے شاعروں نے روزانہ گذرنے والے واقعات کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا ہے۔ اس کا نتیجہ

یہ ہے کہ اُن کی تخئیل تقلید کے تاریک اور گھنے جنگلوں میں ادھر اُدھر دیوانہ وار بھٹکتی پھرتی ہے نہ صحیح راستہ کا پتہ چلتا ہے اور نہ اُمید کے درخشاں سورج کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے شعرا ظنیات اور مفروضات کا ایک ٹمٹماتا ہوا دیا لیکر اس خوفناک قید سے باہر آنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہر قدم پر اس جنگل کی مسموم ہوا اُسے گل کردیتی ہے۔ کاش اُن کے پاس "مصوری حیات" کی سرچ لائٹ ہوتی تو وہ اس خوفناک جنگل سے بآسانی باہر آسکتے جس میں تصنع اور بناوٹ کے خونخوار جانور گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی سرچ لائٹ کی روشنی تو اِن خونخوار جانوروں کی آنکھوں میں بھی چکاچوند ھ پیدا کر کے اُنھیں اندھا بنا سکتی ہے۔

ہم کو اِس فضا میں جس شاعری کی ضرورت ہوگی اس کے عناصر ضروری کیا ہوں گے ؟ سُنیئے :-

(۱) شریف جذبات ،

(۲) صداقت شعاری ،

(۳) حسنِ ادا اور صفائی بیان

(۴) تناسب الفاظ

(۵) سادگی بقدر ضرورت

(۶) حقائق و معارف

(۷) تخئیل کی رنگینی، جدّت اور بلند پروازی۔

(۸) قومیت اور وطنیت کا صحیح احساس۔

(۹) اسرار کائنات اور فطرت کی حقیقت۔

(۱۰) قنوطیت[1] سے زیادہ رجائیت[2]۔

بہرکیف اِن تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آج نہیں کچھ دنوں بعد سہی مگر وہ دن دُور نہیں جب غزل کی کشتی ساحلِ عدم سے ٹکرا کر پاش پاش ہوجائیگی اس وقت کشتی میں بیٹھنے والوں کو احساسِ غفلت ہوگا،

ناؤ ٹکر کھا کے جب ٹوٹی تو آنکھیں کھُل گئیں
بے خبر دل جانتا تھا دُور ہے ساحل ابھی (آرزو)

---

[1] Optimism. [2] Pessimism.

نذرِ میر

(از حضرت نجم آفندی اکبر آبادی)
(حضرت نجم نے یہ غزل میر کے رنگ میں کہی ہے اور خوب کہی ہے)

میرے ہونٹوں پر تبسم میرے دل میں ہائے ہے — مجھ سے اپنا حال جانے کیسے دیکھا جائے ہے
وہ خفا ہیں دل سے دنیا دور میں خاموش ہوں — دل کا یہ کیا حال ہے جیسے کوئی بہکائے ہے
ہو نہ ہو صبحِ قیامت جانے والے ہم بھی ہیں — بڑھ رہی ہے شامِ غم دیکھیں کہاں تک جائے ہے
جان لب تک آ چکی ہے اب گئی اور اب گئی — دیکھئے کب تک ہمارا آنے والا آئے ہے
شاید اُن کے درد کی سب منزلیں طے ہو گئیں — دل ہے اب ٹھہرا ہوا سینہ میں دم گھبرائے ہے
اے شہیدِ عشق ہو تیری طرح سب کو نصیب — موت کیسی موت جس سے زندگی شرمائے ہے

آپ دو اک اشکِ غم بھی نجم پی سکتے نہیں
پینے والا ڈگڈگا کر زہر بھی پی جائے ہے

اعترافات

(از جناب عبد اللطیف شمیم بھیروی)

دل کو پھر بے قرار کر ہی دیا — چشم کو اشکبار کر ہی دیا
ذکرِ عہدِ وفا کیا تم نے — اور مجھے شرمسار کر ہی دیا
دے کے پھر دعوتِ نظر تم نے — اُف مجھے آشکار کر ہی دیا
عشق سودائے بے مآل سہی — ہم نے سب کچھ نثار کر ہی دیا
اُن کی ارزانیٔ کرم نے شمیم — لغزشوں کا شمار کر ہی دیا

رائے بہادر لالہ سیتارام آنجہانی

از سید ظہیر الدین احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی جونپوری

ہندی کے مشہور و معروف مصنف رائے بہادر لالہ سیتارام صاحب ڈپٹی کلکٹر پنشنر صوبہ متحدہ کے انتقال پُرملال کو ڈیڑھ سال کے قریب ہوگیا مگر ان کے جاننے والے کے دلوں سے اُن کی یاد کبھی محو نہ ہوگی۔ دوسرے اگلے بزرگوں کی طرح ان کی زندگی کا دار و مدار بھی پریم و محبت پر تھا۔ نجی زندگی میں وہ اعلیٰ درجے کے گرہست تھے جو ہر حالت میں مطمئن اور مستقل مزاج رہتے ہیں۔ اور گو بعض اوقات انتظامی ضرورتوں سے مجبور ہو کر اُن کو سختی کا اظہار بھی کرنا پڑتا تھا ورنہ وہ اپنے تمام کاموں کی تکمیل کے لئے ہمیشہ پریم بھرے الفاظ ہی استعمال کرتے تھے۔ مصنف کی حیثیت سے بھی اُن کی تمام تصانیف میں یہی رنگ جھلکتا ہے۔ سرکاری افسر کے حیثیت سے بھی ان کا رویہ ہمیشہ ہر دلعزیز رہا۔

خاندانی حالات | جس خاندان سے موصوف تعلق رکھتے تھے وہ اجودھیا جی کا نہایت قدیم خاندان ہے۔ جو کسی زمانہ میں "سرا و سوی پانڈے" کے نام سے مشہور تھا۔ مگر شاہانِ اسلام کے زمانہ میں "رائے زادگان کر اماتک پوری" کے نام سے موسوم ہوا۔ شیر شاہ سوری کے زمانہ میں اِس خاندان کے مورثِ اعلیٰ عارضی طور پر کڑا ضلع الہ آباد میں منتقل ہو کر آ گئے تھے۔ چنانچہ مرحوم کے "نبسا دلی" کا مندرجۂ ذیل مصرع اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

" رائے نروتم کے پرسوتم ہے تنکے گوند رائے کڑے کے"

اس خاندانی روایت کے بموجب یہ لوگ "سمنت جی" کی اولاد میں ہیں جو راجہ دشرتھ کے وزیر شیر خاص تھے۔ موجودہ شجرۂ خاندان میں جو نام وثوق کے ساتھ معلوم ہے وہ راجہ رگھوناتھ سہائے کا ہے جو شہنشاہ فرخ سیر کے زمانہ میں دہلی میں آباد ہوئے دوسرا ممتاز نام راجہ امرت لال کا ہے جو غازی الدین شاہ اودھ کے راجگان میں تھے۔

پیدائش و تعلیم | لالہ سیتارام صاحب ۱۸۶۱ء میں بمقام اجودھیا پیدا ہوئے۔ آپکی طالب علمانہ زندگی نہایت کامیاب تھی۔ اسکولی تعلیم مڈل اسکول اجودھیا میں شروع ہوئی اور ہائی اسکول کا امتحان فیض آباد سے پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کننگ کالج لکھنؤ میں ہوئی۔ آپ ہمیشہ اسکول و کالج اور یونیورسٹی کے امتحانات میں اول

پاس ہوئے۔ بجز ایک مرتبہ کے جس کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ کیونکہ اسی واقعہ نے موصوف کے خیالات کو علمیت کی طرف راغب کردیا۔ اُس زمانہ میں میٹرکولیشن کے سلسلے میں دو امتحانات ہوا کرتے تھے۔ اور طلباء کو اختیار تھا کہ وہ ایک خواہ دونوں میں شریک ہوں۔ ایک امتحان کا تعلق صیغۂ تعلیم صوبہ متحدہ سے تھا (جو اُس وقت ممالک مغربی و شمالی کہلاتا تھا) اور دوسرے کا کلکتہ یونیورسٹی سے۔ آپ صوبہ کے امتحان میں اول آئے۔ چونکہ صغرسنی ہی سے عقائد مذہبی کے سختی سے پابند تھے۔ آپ نے اول پاس ہونے کی خوشخبری سُنکر بطور شکرگذاری اجودھیا جی کی پکرما کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ طواف ۲۸ میل کا تھا جسے آپ نے صرف آٹھ گھنٹہ میں طے کیا۔ اِس محنت شاقہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو بخار آگیا جو پورے پندرہ دن تک رہا اور اُس کے بعد ہی آپ کی آنکھیں دُکھنے آگئیں اور متورم ہوگئیں۔ یونیورسٹی کے امتحان کو اب صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ یہ امتحان لکھنؤ میں ہوا۔ آشوب چشم کی وجہ سے آپکی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اسی حالت میں آپ نے امتحان دیا اور پٹی باندھے باندھے جوابات لکھے کبھی کبھی پٹی کھسکا کر دیکھ لیا کرتے تھے کہ جو کچھ لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی مجبوریوں میں امتحان کا وہ نتیجہ ہونا جس کے آپ بدرجہ اتم مستحق تھے بہت مشکل تھا۔ چنانچہ آپ کو وظیفہ تو مل گیا لیکن ایک دوسرا طالب علم جو گونڈہ ہائی اسکول کا تھا امتحان میں اول آگیا۔ وہ لڑکا اور آپ کیننگ کالج میں داخل ہوئے۔ اُس طالب علم نے فیض آباد ہائی اسکول پر یہ الزام لگایا کہ وہ اسکول بدعنوانیوں کیلئے مشہور ہے۔ آپ نے اُسے خاموشی سے برداشت کیا لیکن دیگر طلباء نے بہت بُرا مانا۔ چنانچہ دو پارٹیاں قائم ہوگئیں۔ جس پارٹی سے آپ تعلق رکھتے تھے اُس کے اڈیٹر سجاد حسین مرحوم تھے اور گونڈہ کے طلباء کے سرغنہ پنڈت تربھون ناتھ ہجر تھے جو آگے چل کر ایک مشہور مصنف اور شاعر ہوئے۔ روزآنہ ان گھنٹوں میں جو خالی رہا کرتے تھے ہر دو پارٹیوں کی زرخیز ذہنیتیں ایک دوسرے پر مضامین نظم و نثر لکھنے میں مصروف کار رہتیں اور ایک دوسرے پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ لالہ سیتارام بھی گونڈہ والوں کی ہجو ملیح لکھا کرتے جو فریقین میں نہایت مقبول ہوتیں۔ سال کے آخر میں جب سالانہ امتحان ہوا تو آپ ہی اول آئے جس کے بعد اس فرقہ بندی کا خودبخود خاتمہ ہوگیا۔

۱۸۷۹ء میں آپ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان بی۔ اے میں بھی اول آئے اور پریسیڈنسی کالج کلکتہ جہاں یونیورسٹی کے قیام سے اب تک کوئی بیرونی اُمیدوار اول نہ آیا تھا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اُس وقت آپ کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ یہ خبر لکھنؤ میں ایک خاص مسرت سے سنی گئی اور مرزا عباس بیگ صاحب جو وہاں کے معزز رؤسا میں تھے آپ کی ذات سے ایک خاص

[illegible] بارہ دری میں مسٹر صاحب اودھ نے آپ کو بر سر دربار [illegible]

ملازمت ان دنوں ایسے قابل اور لائق شخص کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ سول یا ایگزیکیٹو ملازمت [illegible] کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی لیکن موصوف نے اپنے پدر بزرگوار کے مشورے جو بابا رگھوناتھ داس [illegible] اجودھیا کے ہمعصر تھے اسکول ماسٹر ہونا پسند کیا چنانچہ پہلے پہل آپ کا تقرر بطور ہیڈ ماسٹر سیتاپور ہوا۔ اس وقت آپکی عمر صرف اُنیس سال کی تھی اور اکثر ایسے طلبا پڑھانا پڑتے [illegible] سے عمر میں زیادہ تھے۔ اُس کے بعد آپ میرٹھ، کانپور، بنارس و فیض آباد کے گورنمنٹ [illegible]

۱۸۹۴ء میں آپ ڈپٹی کلکٹری پر فائز ہوئے اور اسی عہدہ سے پنشن لی۔ جس [illegible] تک سر رشتہ تعلیم کی مختلف کمیٹیوں کے ممبر کی خدمات انجام دیں۔ چالیس [illegible] ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر یا پریسیڈنٹ بھی رہے۔

صحت و عادات آپ کی تندرستی نہایت اچھی تھی کیونکہ آپ اپنے معمولات کے بیحد پابند تھے۔ غالباً اسی وجہ سے آپ کبھی کسی شدید مرض میں مبتلا نہیں ہوئے۔ خانگی زندگی میں آپکی شکل سے نیک [illegible] ہمیشہ صبر و سکون دل جمعی سے کام لیتے تھے حتیٰ کہ سخت سے سخت موقعوں پر بھی آپ نے ان اوصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ آپ کی طبیعت پر مہربانی اور محبت کا عنصر ہمیشہ غالب رہا در اصل آپکو کبھی سختی کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی کیونکہ آپ اپنا ہر کام محبت کے بل بوتے پر پورا کرا لیا کرتے تھے۔ اور اگر کبھی ضرورت پر سختی کرنا پڑی تو صرف اس قدر سختی روا رکھتے جو موقع کے متقاضی ہو۔ بزرگوں کے مقولہ کے مطابق آپ کا بھی خیال تھا کہ زندگی کی علت غائی محبت اور صرف محبت ہی ہو سکتی ہے "یک دانہ است باقی ہمہ کاہ" یہی آپ کا بھی اصول تھا۔

بحیثیت مصنف بھی آپ نے ہمیشہ فطری محبت کے مضامین کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ غصہ آپ [illegible] مطلق نہ تھا۔ بحیثیت عہدہ دار بھی آپ نے کبھی درشت کلامی روا نہ رکھی۔

صدمہ آپ کو زندگی میں سب سے بڑا صدمہ ۱۹۳۴ء میں پہونچا جب سب سے بڑے صاحبزادے بابو [illegible] کشور کی موت سے پہونچا وہ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں تھے اور محکمہ آبکاری کے اسسٹنٹ کمشنر [illegible] تھے۔ وہ بھی موصوف کی طرح علم ریاضی کے ایک بہت کامیاب طالب علم تھے۔ اور انکے ذاتی اخلاق کا معیار بھی بہت اونچا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں شادی کے چند ہی ماہ بعد انکی بیوی کا انتقال ہو گیا [illegible] [illegible] دل میں نہ لائے۔ گو جوانی [illegible] تمام عمر بیوی کی یاد میں گزار دی اور دوسری شادی کا خیال تک محکمہ آبکاری کے ان معدودے چند نیک نام افسروں میں تھے جن کے لیاقت و دیانتداری کا [illegible]

[illegible] ـاحب کی کمر توڑ دی ورنہ آپ کی تندرستی ایسی اچھی تھی کہ شاید
[illegible] ـرحال اس غم میں ۲۲ جنوری ۱۹۳۷ء کو ۷۶ سال کی عمر میں [illegible]
[illegible] واقعی اُسے بیماری کہا جائے جس میں آپ نے وفات پائی
[illegible] نے اپنے شعار زندگی کے مطابق دم آخر تک سکون و اطمینان کو قائم رکھا
[illegible] کے بعد ایک سال تک آپ لکھنو میں مقیم رہے۔ شعر و شاعری کا
[illegible] پختہ ہو چکا تھا۔ مرزا عباس بیگ صاحب آپ کا کلام بے حد
[illegible] نے آپ کا تعارف جناب غلام حسین صاحب قدر بلگرامی سے کرا دیا
[illegible] ـرد ہوگئے اور [illegible] تخلص رکھا۔ ان دنوں شعرائے اردو کی دلچسپی صرف غزل گوئی
[illegible] محدود ہوگئی تھی۔ آپ نے بھی اس صنف میں خوب خوب طبع آرائی کی لیکن اس وقت کا کلام
آپ نے سررشتۂ تعلیم میں داخل ہوتے ہی آگ کے نذر کر دیا۔ صرف دو شعر اُس وقت کے یادگار
باقی رہ گئے ہیں۔ جو بطور مُشت نمونہ ہدیہ ناظرین ہیں:۔

"چڑھا دینا ضرور اس کو چمن میں میری تربت پر
جو اِک گل بھی کہیں بلبل تیری منقار میں آئے"

مندرجہ بالا شعر ایک پُرانی کتاب کے مسودہ کے حاشیہ پر آپ کے دستِ مُبارک کا لکھا ہوا موجود ہے۔ دوسرا شعر حسبِ ذیل ہے جو شیکسپیر کے مشہور ڈرامے (*Much Ado about Nothing*) کے ترجمہ میں درج ہے جس کا آپ نے ترجمہ کیا تھا۔

"دورِ دزہ حُسن پر اے جانِ جاں جن جن کو غرہ تھا
جھکائے سر وہی اِس عشق کی سرکار میں آئے"

ان اشعار سے یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ آپ غزل گوئی میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔

نثر نگاری | سجاد حسین صاحب نے جو آپ کے ہم سبق تھے ایف۔ اے میں ناکامیاب ہو کر تعلیم کو خیرباد کہا اور اپنے احباب کے مشورے سے اخبار "اودھ پنچ" جاری کیا جس کا مقصد اُمرا و حکام سرکار کے گندے کارناموں کو ظریفانہ [illegible] کرنا تھا۔ لالہ سیتا رام بھی اس اخبار میں اکثر مضامین لکھا کرتے تھے۔ مگر آپ کا پہلا ادبی کارنامہ [illegible] کی مشہور کتاب موسومہ *Friends in Council.* کا ترجمہ [illegible]

دلچسپی لینے لگے۔ سفید بارہ دری میں کمشنر صاحب اودھ نے آپ کو بر سر دربار سند عطا کی۔

ملازمت | اُن دنوں ایسے قابل اور لائق شخص کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ سول یا ایگزیکیٹو ملازمت حاصل کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی لیکن موصوف نے اپنے پدر بزرگوار کے مشورے جو بابا رگھوناتھ داس ساکن اجودھیا کے ہمعصر تھے اسکول ماسٹر ہونا پسند کیا چنانچہ پہلے پہل آپ کا تقرر بطور ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول سیتاپور ہوا۔ اُس وقت آپکی عمر صرف اُنیس سال کی تھی اور اکثر ایسے طلباء پڑھانا پڑتے تھے جو آپ سے عمر میں زیادہ تھے۔ اُس کے بعد آپ میرٹھ۔ کانپور۔ بنارس۔ فیض آباد کے گورنمنٹ اسکولوں کی ہیڈ ماسٹری میں

۱۸۹۴ء میں آپ ڈپٹی کلکٹری پر فائز ہوئے اور اسی عہدہ سے پنشن لی۔ جس کے بعد آپ عرصہ تک سررشتہ تعلیم کی مختلف کمیٹیوں کے ممبری کی خدمات انجام دیں۔ چالیس سال سے زائد آپ ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر یا پریسیڈنٹ بھی رہے۔

صحت و عادات | آپ کی تندرستی نہایت اچھی تھی کیونکہ آپ اپنے معمولات کے بیحد پابند تھے۔ غالباً اسی وجہ سے آپ کبھی کسی شدید مرض میں مبتلا نہیں ہوئے۔ خانگی زندگی میں آپکی شکل سے نظر ملیگی۔ ہمیشہ صبر و سکون اور دل جمعی سے کام لیتے تھے حتیٰ کہ سخت سے سخت موقعوں پر بھی آپ نے ان اوصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ آپ کی طبیعت پر مہربانی اور محبت کا عنصر ہمیشہ غالب رہا دراصل آپکو کبھی سختی کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی کیونکہ آپ اپنا ہر کام محبت کے بل بوتے پر پورا کرا لیا کرتے تھے۔ اور اگر کبھی ضرورت پر سختی کرنا پڑی تو صرف اس قدر سختی روا رکھتے جو موقع کے متقاضی ہو۔ بزرگوں کے مقولہ کے مطابق آپ کا بھی خیال تھا کہ زندگی کی علت غائی محبت اور صرف محبت ہی ہو سکتی ہے۔ "یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ"۔ یہی آپ کا بھی اصول تھا۔

بحیثیت مصنف بھی آپ نے ہمیشہ فطری محبت کے مضامین کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ غصہ آپ میں مطلق نہ تھا۔ بحیثیت عہدہ دار بھی آپ نے کبھی درشت کلامی روا نہ رکھی۔

ایک صدمہ | آپ کو زندگی میں سب سے بڑا صدمہ ۱۹۲۴ء میں اپنے سب سے بڑے صاحبزادے بابو گرجا کشور کی موت سے پہونچا وہ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں تھے اور محکمہ آبکاری کے اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ وہ بھی موصوف کی طرح علم ریاضی کے ایک بہت کامیاب طالب علم تھے۔ اور اُنکے ذاتی اخلاق کا معیار بھی بہت اونچا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں شادی کے چند ہی ماہ بعد اُنکی بیوی کا انتقال ہوگیا لیکن اُنہوں نے تمام عمر بیوی کی یاد میں گذار دی اور دوسری شادی کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ گرجا کشور صاحب محکمہ آبکاری کے ان معدودے چند نیک نام افسروں میں تھے جن کے لیاقت و دیانتداری کا صوبہ بھر میں

سکہ بیٹھا ہوا ہے۔

اس حادثۂ عظیم نے رائے بہادر صاحب کی کمر توڑ دی ورنہ آپ کی تندرستی ایسی اچھی تھی کہ شاید ابھی بیس سال تک آپ اور زندہ رہتے۔ بہر حال اس غم میں ۷ ، ۲ر جنوری ۱۹۳۷ء کو ۷۶ سال کی عمر میں الہ آباد میں آپ انتقال ہو گیا۔ آخری بیماری اگر واقعی اُسے بیماری کہا جائے جس میں آپ نے وفات پائی مشکل سے چند گھنٹہ رہی ہوگی۔ آپ نے اپنے شعار زندگی کے مطابق دم آخر تک سکون و اطمینان کو قائم رکھا

شعروشاعری | بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ایک سال تک آپ لکھنؤ میں مقیم رہے۔ شعروشاعری کا جذبہ اوائل عمری ہی سے تھا جو اب پختہ ہو چکا تھا۔ مرزا عباس بیگ صاحب آپ کا کلام بے حد پسند فرماتے تھے چنانچہ انھوں نے آپ کا تعارف جناب غلام حسین صاحب قدر بلگرامی سے کرادیا اور آپ اُنھیں کے شاگرد ہو گئے اور عزم تخلص رکھا۔ ان دنوں شعرا اُردو کی دلچسپی صرف غزل گوئی تک محدود ہو گئی تھی۔ آپ نے بھی اس صنف میں خوب خوب طبع آرائی کی لیکن اس وقت کا کلام آپ نے سررشتۂ تعلیم میں داخل ہوتے ہی آگ کے نذر کر دیا۔ صرف دو شعر اُس وقت کے یادگار باقی رہ گئے ہیں۔ جو بطور مُشت نمونہ ہدیہ ناظرین ہیں :-

" چڑھا دینا ضرور اس کو چمن میں میری تربت پر
جو اک گل بھی کہیں بلبل تیری منقار میں آئے "

مندرجہ بالا شعر ایک پرانی کتاب کے مسودہ کے حاشیہ پر آپ کے دست مُبارک کا لکھا ہوا موجود ہے۔ دوسرا شعر حسب ذیل ہے جو شیکسپیر کے مشہور ڈرامے (*Much Ado about Nothing*) کے ترجمہ میں درج ہے جس کا آپ نے ترجمہ کیا تھا۔

" دوروزہ حسن پر اے جانِ جاں جن جن کو غرہ تھا
جھکائے سر وہی اس عشق کی سرکار میں آئے "

ان اشعار سے یہ بات ضرور ظاہر ہوتی ہے کہ آپ غزل گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

نثر نگاری | سجاد حسین صاحب نے جو آپ کے ہم سبق تھے ایف۔ اے میں ناکامیاب ہو کر تعلیم کو خیرباد کہا اور اپنے احباب کے مشورے سے اخبار "اودھ پنچ" جاری کیا جس کا مقصد اُمراء و حکام سرکار کے گندے کارناموں کو عریاں کرنا تھا۔ لالہ سیتارام بھی اس اخبار میں اکثر مضامین لکھا کرتے تھے۔ مگر آپ کا پہلا ادبی کارنامہ ہیلپ کی مشہور کتاب موسومہ (*Friends in Council.*) کا ترجمہ تھا جو منشی سجاد حسین صاحب کے امداد و توجہ سے شائع ہوا۔ اس کے بعد آپ کی مضمون نگاری کا چرچا

پھیلا اور منشی نولکشور سی۔ آئی۔ ای مالک مطبع نولکشور لکھنؤ نے آپ کو "اودھ اخبار" کی مضمون نگاری کے لئے منتخب کیا۔ طالب علمی میں آپ کا دلچسپ مضمون ریاضی تھا چنانچہ آپنے بہت سے مضامین ہندوستان اور دیگر ممالک کی تاریخ اور تدریجی ترقی پر لکھے۔

اُردو تصانیف | ہیڈ ماسٹری کے زمانہ میں آپنے شیکسپیر کے مندرجہ ذیل ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ کیا:۔

(۱) شاہ لیر (*King Lear.*)

(۲) دام محبت (*Comedy of Errors.*)

(۳) بھول بھلیاں (*Much Ado about Nothing.*)

(۴) دریائے طلسم (*The Tempest.*)

تبصرہ | ان میں سے دو ترجمے تو اس وقت پیش نظر ہیں ایک "بھول بھلیاں" دوسرا "شاہ لیر"۔ جن حضرات نے مصنف کے قلمی شاہکاروں کو انگریزی زبان میں مطالعہ کیا ہے انھیں لائق مترجم کے قلم کی سحر کاریوں کا لطف آئے گا۔ ترجمہ کی پابندی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان اور ادب کا پُورا لحاظ کیا گیا ہے۔ دونوں ڈراموں کی زبان نہایت صاف سُتھری سلیس اور عام فہم ہے۔ لائق مترجم نے تاشقندی یا سمرقندی اُردو سے دامن بچا کر اپنی مادری زبان کی کماحقہ خدمت کی ہے۔ اور غالباً یہی ذوقِ خدمت تھا جس نے شیکسپیر کے ڈراموں کو اُردو کا جامہ پہنا کر اپنی ادبی محفل کو وسعت دینے پر آمادہ کیا۔ بہر حال ان ترجموں کو دیکھنے سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ لائق مترجم نے قصہ گوئی اور قصہ خوانی کے گرے ہوئے مذاق کو ادبی حیثیت سے بلند و بالا کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے۔ ایک اچھے مترجم کا فرض بھی یہی ہے کہ جب وہ کسی عبارت کا ترجمہ کرے تو الفاظ کے ساتھ ساتھ جذبات کی ترجمانی بھی پیش نظر رکھے ورنہ ترجمہ کی حیثیت لغتِ غیر مرتب سے زیادہ نہ ہوگی۔

لالہ سیتارام نے شیکسپیر کے ڈراموں کا ترجمہ کرنے میں اُس کے تاثرات کو اسطرح زندہ رکھا، کہ اصل کتاب اور ترجمہ کے مابین صرف زبان کا فرق رہ گیا ہے۔ گویا شیکسپیر مشرقی پوشش میں بھی شیکسپیر ہی ہے۔ اور گو الفاظ بدل گئے لیکن آواز کی طاقت اور جذبات کی ہنگامہ آرائی بدستور قائم ہے۔

"بھول بھلیاں" میں شیکسپیر ایک عورت کے غم و غصہ کا وہ نقشہ کھینچتا ہے جب وہ اپنے شوہر سے بدگمان ہوکر جذبۂ بے اختیار کا اظہار کر رہی ہے۔ اس کیفیت کی تصویر کشی ترجمہ میں ان الفاظ کیساتھ کیجاتی ہے:۔

"میں صبر کروں۔ مجھ سے صبر نہیں ہوگا۔ میرا دل نہیں مانتا ہے۔ میں کیا کروں۔ زبان پر جو آئیگا کہوں گی وہ ہیں کیا؟ کس غرور میں پھولے ہیں۔ بدصورت پرلے سرے کے۔ ٹیڑھا جسم عمر میں زیادہ۔ چہرہ

بیہودہ ٹُٹا ہوا جسم اس سے بھی بدتر کوئی حصّہ درست نہیں۔ بیوقوف۔ بے ایمان۔ بے لہر اور بدکار۔ صورت میں خراب۔ سیرت اُس سے بدتر"

عورت کے برافروختہ جذبات۔ بتیابانہ خیالات کے اظہار کی ابتدا اُسی کی زبان اور اُسی کے خاص محاورے میں کی گئی ہے۔ "وہ ہیں کیا"۔ "کس غرور میں بھولے ہیں"۔ یہ وہ جامع و مانع فقرے ہیں جو اپنے مختصر اشاروں میں جذبات کے دریا بہا رہے ہیں۔ دونوں فقرے اپنی جگہ پر اتنے کافی معانی و مطالب رکھتے ہیں کہ اگر ان کے بعد کچھ بھی نہ کہا جاتا تو بھی سب کچھ ظاہر تھا۔ بعد کے تمام الفاظ یا تشریح ہیں یا بے قابو طبیعت کی رو میں زبان کی حرکت جس سے غم و غصّہ کا زیادہ سے زیادہ اظہار منظور ہے بالخصوص "صنفِ نازک" کے لئے نظم ہو یا نثر الفاظ کا برمحل استعمال ہی ایک چیز ہے اور اسی چیز کا نام قادرالکلامی ہے۔

افسوس ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں طوالت کی گنجائش نہیں ورنہ پیش نظر کتاب میں بیشتر ایسے مقامات ہیں جس سے نقد و تبصرہ کی ادبی لذتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

دوسرا ڈرامہ "شاہ لیر" ہے۔ اس کا ترجمہ بھی نہایت قابلیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ چند سطور اُس موقع سے نقل کی جاتی ہیں جبکہ ڈرامے کا ہیرو یعنی شاہ لیر سلطنت سے دست برداری کے بعد اپنی لڑکیوں کی بیوفائی اور دغابازی سے مخبوط الحواس ہو کر ایک اندھیری رات میں طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتا ہے:-

"اے ہوا تو خوب زور سے چل جتنی تجھ میں طاقت ہے سب اسی وقت صرف کر طوفان اور آبشار اتنی زور سے پانی برسائیں کہ مکان کے مینار تک ڈوب جائیں اور بادبان نظر آئیں۔ بجلی تو آگ برسا اور ایسی چنگاریاں گرا جو مضبوط شاہ بلوط کو ایک آن میں خاک کر ڈالیں اور میرے سفید سر کو جلا دیں۔ بجلی تو اس کُرہ زمین کو دبا کر چپٹا کر دے اور کل سامان جس سے محسن کش آدمی بنتا ہو غارت ہو"

اس ترجمہ میں مترجم کے قلم کا وہی زور ہے جو مصنّف کے قلم میں ہے۔ پُرزور الفاظ۔ نشست کہیں بھی ایسی نہیں ہونے پائی جس سے عبارت ڈھیلی ہو سکتی ہو جیسی روانی اصل عبارت میں ہے ویسی ہی ترجمے میں۔ اسی سلسلہ کی چند سطریں اور بھی ہدیہ ناظرین ہیں:-

"خوب جی بھر کر گھڑ گھڑا آگ برسا۔ موسلا دھار پانی برسا۔ پانی۔ ہوا۔ بجلی۔ گرج۔ کوئی میری لڑکی نہیں ہیں میں کسی کی نامہربانی کا شاکی نہیں ہوں۔ میں نے تم کو کبھی کوئی سلطنت

نہیں دی اولاد کہکر نہیں پکارا۔ میری فرمانبرداری کرنا تمہارا فرض نہیں۔ اب جو تمہاری مرضی ہو اسی طرح مجھ سے پیش آؤ۔ غریب کمزور بوڑھا آدمی۔ میں تمہارا ملازم ہوں تاہم میں تم کو اپنی لڑکیوں کا خوشامدی غلام سمجھتا ہوں ان سے بلکر مجھ ایسے بوڑھے شخص پر اپنا زور دکھلا رہے ہو۔ یہ بات اچھی نہیں"

اس اقتباس کے ہر ہر لفظ سے جذبات کے بے پناہ طوفان میں طرز ادا کی بے ساختگی ظاہر ہوتی ہے۔ مترجم کے قلم کا جوش و خروش مصنف کی خاموش رُوح سے داد طلب ہے۔ سچ یہ ہے کہ دونوں ڈراموں میں یہی عالم شروع سے آخر تک موجود ہے۔

آپ کے یہ تراجم انگریزی کتابوں کی طرح عمدہ کاغذ اور کراؤن آکٹیو سائز پر طبع ہوئے۔ نئے سائز میں یہ پہلی کتابیں چھپی ہیں ورنہ اسوقت تک اردو کتابیں وہی پرانے وقتوں کے لمبے سائز اور بادامی کاغذ پر طبع ہوتی تھیں۔

سنسکرت اور ہندی تصانیف

گو سنسکرت آپ کے خاندان میں ہمیشہ سے پڑھائی جاتی تھی اور آپ نے اس زبان کو الیف۔ اے۔ میں لیا تھا لیکن ابتک آپ کو ہندی زبان سے کوئی خاص رغبت پیدا نہ ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۸۳ء میں جب آپکا تبادلہ بنارس ہوا تو آپ کو معلوم ہوا کہ آپ ایک دوسرے ماحولِ زندگی میں آگئے ہیں۔ آپکی ریاضی دانی کی شہرت نے آپکا تعارف پنڈت بابو دیو صاحب شاستری۔ سی۔ آئی۔ ای۔ سے کرا دیا اور اُن کے ذریعہ آپکا تعارف سنسکرت کالج کے دیگر پنڈتوں سے ہوگیا۔ اُس وقت بنارس کے پنڈتوں میں بہت سے مختلف فیہ مسائل سرگرمی سے چل رہے تھے۔ اور پنڈت رام مصر شاستری اُن اختلافات میں نہایت سرگرم رہتے تھے۔ انہوں نے آپ کو اپنی پارٹی میں شامل کیا آپ بھی پارٹی میں کچھ ایسے پُرجوش طریقہ سے شامل ہوگئے کہ چند ہی دنوں میں آپ پنڈت جی کے دستِ راست بن گئے۔ اس پارٹی میں آپ ہی ایسے شخص تھے جو انگریزی اور سنسکرت دونوں زبانوں پر کافی عبور رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ ہی اس پارٹی کی طرف سے غیر ملکی زبانوں سے مثلاً پروفیسر میکس مُلر و ڈاکٹر تھیبو وغیرہ سے خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ اسی سلسلہ میں سوامی دیانند جی سے آپکا ربط ضبط بڑھ گیا کیونکہ وہ بھی اکثر اُن اختلافات کو رفع کرنے کی غرض سے بنارس آیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ حقیقتاً سوامی جی اور بنارس کے پنڈتوں کے درمیان مصالحت کا ذریعہ بن گئے۔ ابتک ایسے مسودہ جات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اختلافات کے سُلجھانے میں آپکا کسقدر حصہ تھا۔

آپ پنڈت رام مصر شاستری کے کہنے سے سنسکرت میں ایم۔ اے کے امتحان کیلئے

تیار ہوئے۔ پنڈت جی نے آپ کو پنڈت کلاپشا شونی شاستری سے ملا دیا جنہوں نے آپکو ویدِ مقدس کی تعلیم دی۔ آپ نے امتحان کی پوری تیاری کرلی تھی کہ یکایک والد بزرگوار کی علالت کی اطلاع پاکر آپ نے اپنا تبادلہ فیض آباد کرالیا جہاں کچھ عرصہ بعد آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔

دورانِ قیام بنارس میں ان مشاغل کے علاوہ ہندی کے مشاغل بھی جاری رہے۔ منشی بالیشور پرشاد ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول بنارس نے ایک رسالہ "کاشی پتر کا" نکالا تھا جو اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ آپ بھی اس رسالہ میں مضمون نگاری کرنے لگے۔ ہندی زبان میں آپکا یہ پہلا کارنامہ تھا۔ نظم میں آپکا پہلا کارنامہ کالیداس کے مشہور نظم "میگھ دوت" کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس کے بعد "رگھوبنس" کے چند اجزا کا ترجمہ "شری رام چرتر امرت" کے نام سے شائع ہوا۔ اس پر اخبارات و رسائل نے نہایت عمدہ تبصرے کئے۔ اُس کے چند ماہ بعد ہی آپ نے "نگا نندہ" کا ترجمہ کیا جس سے آپ پر یہ بات بخوبی روشن ہوگئی کہ آپ ہندی کے اچھے مصنف ہو سکتے ہیں۔

بنارس ہی میں آپ نے یہ اسکیم تیار کی کہ سنسکرت کی تمام قدیم کتابوں کا ترجمہ ہندی زبان میں ہوکر ہر ہندو گھر میں موجود رہے۔ تاکہ سب کو یہ معلوم ہو سکے کہ ہمارے علوم کے مختلف شعبہ جات میں اس ملک میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں۔ آپ کی توجہ اُردو سے ہندی کی طرف صرف اس وجہ سے ہوگئی کہ آپنے خیال کیا کہ ہندی عوام کی زبان ہے اس لئے اسی کے ذریعہ سے آپ کا دلی مقصد پورا ہو سکتا ہے بہرحال آپ نے مندرجہ ذیل عنوانات میں سے ہر ایک پر چھ چھ کتابیں مدوّن کرنے کا ارادہ کرلیا۔

(۱) قدیم رزمیات (۲) قدیم تھیٹر (۳) قدیم ریاضی (۴) قدیم فلسفہ

آپ نے بنارس میں ہر ایک عنوان پر تصنیف شروع کردی تھی اور دو دو جلدیں قریب قریب تکمیل کو پہونچ گئی تھی کہ آپ کا تبادلہ فیض آباد کو ہوگیا۔ یہاں آکر ہندی اور سنسکرت کا ماحول بالکل تبدیل ہوگیا۔ لیکن سر پرتاب نرائن سنگھ مہاراجہ اجودھیا کی سرپرستی سے جو آپ کے ہم جماعت ہونے کے علاوہ ہندی اور سنسکرت کے بڑے عالم و قدردان تھے۔ اس ماحول میں زیادہ فرق نہ آیا۔ ایک بہت ضخیم کتاب موسومہ "رس کسماکر" جو قدیم رسالوں کے متعلق ہے اور جسے مہاراجہ صاحب خود تالیف کر رہے تھے اُسمیں آپ کی خدمات بھی شامل کرلی گئیں۔ اس قسم کی دوسری کتاب ہندوستان میں ابتک شائع نہیں ہوئی ہے۔ آپ نے اس کتاب کی تکمیل میں بہت کچھ امداد دی۔ آپنے "رگھوبنس" کا ترجمہ بھی فیض آباد ہی میں مکمل کرکے مہاراجہ صاحب کے نام نامی سے معنون کیا۔ مہاراجہ صاحب کو آپ کی وہ نظم جو آپ نے بسلسلہ انتساب لکھی تھی اس قدر پسند ہوئی کہ انھوں نے اُس کتاب

کی اشاعت کے کُل اخراجات اپنے ذمہ لے لئے۔ اُس وقت آپ کی قوتِ نظم گوئی انتہائے کمال کو پہونچ چکی تھی۔ آپ نے مہاراجہ صاحب کے روبرو ایک نظم "تنکر وپنا چنہہ" جس میں ڈیڑھ سو اشعار کے قریب تھے دو گھنٹہ میں فی البدیہہ کہہ کر تیار کر دی۔ "...ت سنگھا" کا ترجمہ بھی آپنے چار دن میں کیا۔

فیض آباد کے چار سال قیام کا زمانہ آپ کی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ جس میں تمام اطراف ملک میں آپ کا اعزاز ہوا۔ آپ فیض آباد انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آپ کے شاگرد سال بہ سال امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے تھے چنانچہ ڈاکٹر جے۔ سی۔ نسفیلڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبہ نے اپنی رپورٹ میں آپ کے متعلق یہ لکھا کہ "ہندوستان میں آپ بہترین تعلیم یافتہ شخص ہیں"۔ غالباً اُسی زمانہ میں آپ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو بھی منتخب ہوئے۔ بہر حال انھیں دنوں آپ کا نام نامی بطور سنسکرت اور ہندی اسکالر دنیا میں روشن ہوگیا۔

کانپور میں جب آپ بسلسلہ ڈپٹی کلکٹری تشریف لائے تو فرائض منصبی کی مصروفیتوں کی وجہ سے آپ کو علمی انہماک کا موقع کم ملا۔ تاہم آپ نے یہاں بھی "ہمارے قدیم تھیٹر" کے سلسلہ کی تکمیل کی اور "قدیم ریاضی" کے متعلق دو جلدیں شائع کیں۔ اس کے بعد آپ نے اس سلسلہ کی بقیہ جلدوں کی تکمیل کا خیال چھوڑ دیا کیونکہ اس سلسلہ کی تصنیف کی اوّل دو جلدیں جس نگاہ سے دیکھی گئیں اُس سے یہ پتہ چلا کہ اُنکی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اب علم ریاضی کا علم صرف اسکول کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم تک ہی محدود ہو گیا ہے۔ آپ نے "کرتیار جنہہ" کے پہلے چھ حصوں کا منظوم ترجمہ بھی شائع کیا جس کے سلسلہ کی "رگھوبنس" اور "کمار سمبھو" کے ترجمے پہلے ہی شائع ہو چکے تھے۔

غرض آپ کو ریاضی اور لٹریچر میں یکساں دلچسپی تھی حالانکہ یہ خصوصیت ہزاروں میں دو ایک ہی کے حصہ میں آتی ہے۔

مادری زبان کی خدمات

آپ کے تصانیف کی مجموعہ تعداد چھیالیس ۴۶ ہے۔ اُن میں سے زیادہ مشہور "منتخبات ہندی لٹریچر" ہے جو آپ نے کلکتہ یونیورسٹی کے فرمائش پر مرتب کی اور جو یونیورسٹی مذکور کی طرف سے سات جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ آپ کی تاریخ اجودھیا اور تاریخ سروہی راج (جو انگریزی میں ہے) ایسی کتابیں ہیں جن سے آپ کی شوق تحقیق اور علمی جد وجہد کا پتہ چلتا ہے

آپ نے دیگر ذرائع سے بھی علم وفن کی بیحد خدمت کی۔ ۱۹۱۲ء میں جب مرحوم سر آشوتوش مہا مہوپادھیا الہ آباد تشریف لا کر ایک ماہ مقیم رہے آپ اُن سے اکثر ملاقات کرتے تھے اور اُن کو اس امر کی ترغیب دیتے تھے کہ وہ ہندی زبان کو کلکتہ یونیورسٹی کے ڈگری کے امتحانات کے لئے

ایک مضمون قرار دے دیں۔ موصوف آپ کے مشوروں کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور آخر کار ہندی زبان بھی "ڈگری امتحانات کے لئے ایک مضمون مقرر ہو گئی۔ سر ممدوح کی فرمائش پر آپ نے میٹرک۔ ایف۔ اے۔ بی۔ اے اور ایم اے کورس بھی بلا معاوضہ تیار کر دیے۔ اس کے چند سال بعد ملک کی دوسری یونیورسٹیوں نے بھی کلکتہ یونیورسٹی کی تقلید کی۔ باوجودیکہ آپکے پاس کافی سرمایہ نہ تھا لیکن درسی کتب لکھنے سے آپ ہمیشہ پرہیز کرتے رہے حالانکہ سر رشتہ تعلیم کا آپ کو سولہ سال کا عملی تجربہ تھا اور بچوں کی ذہنیت سے بھی آپ بخوبی واقف تھے ایسی صورت میں اگر آپ نے درسی کتابیں لکھی ہوتیں تو یقیناً نہایت کامیاب اور مفید ثابت ہوتیں لیکن آپ اپنے تہیہ میں پورے اترے اور گو مختلف مطابع نے آپکی درسی تالیفات کے لئے بیش بہا رقوم دینے کا وعدہ کیا مگر صرف اس خیال سے کہ لوگ یہ شبہ نہ کریں کہ آپ اپنے رسوخ سے جو آپ کو محکمہ میں حاصل ہو گیا تھا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ انکار کیا۔ آپکی جو درسی کتب ابھی تک رائج ہیں وہ آپ نے محکمہ تعلیم کی فرمائش پر لکھیں اور ان کا جو معاوضہ آپ کو ملا وہ نہ ملنے کے برابر تھا۔

آپ کا قلم اردو ہندی یا انگریزی زبانوں میں یکساں رواں تھا لیکن آپکی زیادہ تر شہرت ہندی لٹریچر میں ہوئی۔ ہندی کے سلسلہ میں ہی چند ہندی مصنفین نے آپ پر نکتہ چینیاں بھی کیں لیکن ان نکتہ چینیوں میں ذاتی اغراض مضمر تھے مگر آپ نے نکتہ چینیوں کی کبھی پرواہ نہ کی اور نہ انکی وجہ سے آپ کی کاوش اور جوش میں کبھی فرق آیا اور آپ کا دلی مقصد کہ عوام کو سنسکرت ادب سے واقفیت ہو جائے پورا ہو کر رہا۔ آپ نے نظم و نثر میں بحد امکان سہل زبان استعمال کی تاکہ معمولی لوگ بھی آسانی سے سمجھ سکیں۔ البتہ کہیں کہیں صرف الفاظ پر جلا کر دیتے تھے جس سے بول چال کے علاوہ ادبی رنگ بھی پیدا ہو جاتا تھا۔

آپ کی دلچسپیاں زیادہ تر ہندی زبان سے تھیں لیکن اردو زبان سے بھی آپکو کافی دلچسپی تھی۔ آپ اس کے قائل نہ تھے کہ ایک زبان کی ترقی دوسری زبان کی تنزلی ہے۔ اردو کا آخری کارنامہ آپ کی تصنیف موسومہ "اخلاق افسر اطیسی" ہے جو "تعلیمات ایکٹاٹس" کا ترجمہ معہ حاشیہ ہے۔ آپ کو امید تھی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب ممالک متحدہ کی مروجہ زبانیں صاف ستھری اور منجھ کر اپنا لٹریچر خود بخود پیدا کر لیں گی۔

غرض رائے بہادر لالہ سیتارام نے اپنی تمام عمر نہایت سرگرمی اور بے لوثی سے ملک کی ادبی خدمت میں بسر کر دی۔

ایک محب نے لالہ سیتارام صاحب مرحوم کے سال رحلت کے متعلق مندرجہ قطعہ کہا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

قطعہ تاریخ بابو سیتارام صاحب

ناگفتنیست گردش ایام فتنہ زا　　کز سوز جور ساخت دل خلق راگداز
برہم فگند شوکت شاہی و دلبری　　با غزنوی چہ کرد و چہ آورد بر ایاز
بر جا نماند کلبۂ احزان با صفا　　سر در نشیب رفت بسے کوشک فراز
غرّہ بر ایں حیات مشو گر کشد بطول　　آخر بہ عرصہ گاہِ فنا پا کنی دراز
ہر چہ بکار خیر ترا دسترس دہند　　ایں ہم غنیمت ست بدنیا و دیں بساز

ہاتف بگفت سال وفاتش کہ سیتارام
بنمود جا بعیش و طرب در حریم ناز

۱۹۳۷ء

زمانہ تیس سال پہلے

جولائی ۱۹۰۷ء کے زمانہ میں "روحوں کی بارش" کے عنوان سے ایک چھوٹا سا تمثیلی مضمون شائع ہوا تھا جس کا ابتدائی حصہ ناظرین رسالہ کے تفنن طبع کے خاطر درج ذیل ہے :-

جب زمین اپنی لٹی ہوئی اور چھینی ہوئی دولت آسمان سے اور اُسمیں رہنے والے سورج سے طلب کرتی ہے اور فریاد کرتی ہے کہ سورج نے مجھ پر پچھلے گرمی کے موسم میں بڑا ستم ڈھایا ہے۔ میری گود میں بہنے والے دریاؤں کا پانی جذب کر لیا درختوں کی سرسبزی چوس لی۔ پھولوں کی رنگت اور تر و تازگی چھین لی۔ انسان و حیوان تمام جانداروں کو اپنی تیز تپش سے بے چین و بے کل رکھا کروڑوں ننی ننی جانوں کو تڑپا تڑپا کر مار ڈالا تو ابر رحمت و انصاف جوش میں آتا ہے۔ سورج بادلوں کی کالی کوٹھری میں قید کیا جاتا ہے۔ بجلی کوند کوند کر اس پر پہرہ دیتی اور رعد کڑک کڑک کر ہوشیار باش کی آوازیں لگاتا اور حراست آفتاب کو مستحکم کرتا ہے۔

پھر زمین کو اُس کی مظلومیت اور صبر و شکر کا بدلہ ملتا ہے۔ اور امر رب عالم وحدت سے شان کثرت اختیار کر کے مینھ کی بوندوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اب پانی کا ہر قطرہ روح کا تخت گاہ ہے روحیں ان ہوائی اور آبی تختوں پر سوار ہو کر زمین پر اُترتی ہیں اُن کے نازل ہوتے ہی مردہ درخت زندہ ہو جاتے ہیں۔ دریاؤں میں جوش روانی اور طغیانی پیدا ہوتا ہے۔ کملائے ہوئے پھول ترو تازہ ہوتے ہیں اور انسان و حیوان کی جان میں جان آجاتی ہے۔

شاعر کی رات

(از جناب طفیل احمد خاں سلطانپوری پٹنہ کالج)

شبِ مہتاب میں گردوں سے جب صہبا برستی ہے ۔۔۔ تصور میں مرے رومانیت جب آ کے بستی ہے
برستا ہے ستاروں کا لہو جب ریگ زاروں پر ۔۔۔ تڑپتی ہے حیاتِ جاوداں خاکی شراروں پر
نسیمِ سرد کے جھونکے مسرت خیز ہوتے ہیں ۔۔۔ کٹورے پھول کے شبنم سے سب لبریز ہوتے ہیں
تمناؤں کی دُنیا خواب سے بیدار ہوتی ہے
نگاہِ حُسن کی برچھی جگر کے پار ہوتی ہے

چمن کا پتہ پتہ جب متاعِ ہوش کھوتا ہے ۔۔۔ صبا کی نرم و نازک گود میں مدہوش ہوتا ہے
فضا جب گونج اٹھتی ہے حزیں کوئل کے نالوں سے ۔۔۔ دبے جذبے عمل کا کام لیتے ہیں خیالوں سے
میں فرشِ سبزہ پر لیٹا جنوں بردوش ہوتا ہوں
جوانی کے حسیں ساغر سے صہبا نوش ہوتا ہوں

تصور کی حسین دیوی تبسم ریز ہوتی ہے ۔۔۔ مرے شانے پہ اس کی زلفِ عنبر بیز ہوتی ہے
سحر کی مستیاں اس کے حسیں عارض میں آتی ہیں ۔۔۔ بہارِ حُسن سے اس کی فضائیں مست ہوتی ہیں
کبھی ارماں بھری باتوں سے دل کو گدگداتی ہے ۔۔۔ کبھی سرشار ہو کر زیرِ لب کچھ گنگناتی ہے
باندازِ خودی میں اس قدر مسحور ہوتا ہوں
خدا کو بھول جانے کے لئے مجبور ہوتا ہوں

محبت کے تھپیڑے دل کا ساحل چوم جاتے ہیں ۔۔۔ گھٹاؤں کے حسیں ٹکڑے فلک پر جھوم جاتے ہیں
خمار آلودہ نظروں سے وہ دل کا جام بھرتی ہے
میں اس کو پیار کرتا ہوں وہ مجھ کو پیار کرتی ہے

مستی کا نشان ہے نہ سرشاری ہے ۔۔۔ اِنسان پر اک خوابِ گراں طاری ہے
اور اس پہ یہ طرّہ کہ نہیں یہ بھی خبر ۔۔۔ خود موت بھی خواب ہے کہ بیداری ہے

گوپال اور چرواہا

مسٹر نویدتا کا ایک قصہ

(ترجمہ پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق (گورکھپوری) ایم۔ اے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی)

گوپال ایک لڑکا تھا جس کی ماں نہایت شریف دل عورت تھی اس کا باپ بھی بہت نیک آدمی تھا جب تک وہ جیتا رہا روپے پیسے کے لالچ کو دل میں نہ آنے دیا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ لوگوں کے ساتھ بھلائی کرے، مقدس کتابیں پڑھے اور جہاں تک ہوسکے اچھی اچھی باتیں سیکھے اور سمجھے اور لوگوں کو بتائے اور سمجھائے۔ گاؤں والے اُسے اپنے گروہ کا عالم اور پنڈت سمجھتے تھے۔ گاؤں والوں نے اُسے کچھ زمین دے رکھی تھی جس میں وہ کھانے بھر کو غلہ پیدا کرلیتا تھا اور اُس کے گھر کے پاس کچھ تھوڑی سی زمین تھی جس میں کچھ پھل اور ترکاریاں پیدا ہوجاتی تھیں جو سال بھر اس کے گھر بھر کے لئے کافی ہوتی تھیں۔ جب وہ مرنے لگا تو اپنی بیوی سے کہا پیاری مجھے تمہارے اور گوپال کے لئے کچھ زیادہ گھبراہٹ نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ بھگوان تمہاری سرپرستی کریں گے۔ اس کے علاوہ کھیت سے تمہارے لئے اناج ہوجایا کریگا اور ہمارے مہربان پڑوسی باغیچے کی کاشت تمہارے لئے کردیا کریں گے۔ اور یہ تمہاری پرورش کے لئے کافی ہوگا۔ گوپال کی ماں نے کہا۔ تم سچ کہتے ہو، ہماری چنتا نہ کرو، ہم لوگ اچھی طرح بسر کرلیں گے۔ ان باتوں سے اُس مرنے والے شوہر کی دلدہی کی تاکہ مرتے وقت اُسے اطمینان اور سکون رہے اور وہ خدا کا دھیان کرسکے۔

جب گوپال کا باپ مرگیا پڑوسیوں نے آکر اس کی نعش اُٹھائی اور مرگھٹ پر لے جاکر چتا پر رکھ کے اُسے آگ کے شعلوں کے سپرد کردیا۔ نعش جلنے لگی اور جب آگ بجھ گئی تو دو مٹھی راکھ بچ رہی جسے اُن لوگوں نے اُٹھا کر دریا کو سونپ دیا اور یوں گوپال کے باپ کا خاتمہ ہوا۔

اب ماں بیٹے اکیلے رہنے لگے۔ ماں کو صرف اس دن کا انتظار تھا جب اسکی آنکھیں بند ہوجائینگی اور وہ اپنے شوہر سے جا ملیگی۔ اس آرزو کو پورا کرنے کے لئے کہ مرنے کے بعد وہ اپنے شوہر سے ضرور ملے اُس نے کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی۔ وہ بار بار سچے دل سے دعائیں مانگتی تھی اور دن میں تین بار نہاتی تھی اور پہلے سے بھی زیادہ نیک اور محنتی بننے کی کوشش کرتی تھی۔ ہمسائے بھی اسے اس طرح

پیش آتے تھے۔ اس کا کھیت گاؤں والے اپنی کاشت کے ساتھ بو دیتے اور کاٹ دیتے تھے اور باغیچے کے کام میں بھی اس کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ماں بیٹے کو کھانے بھر کو اچھی طرح مل جاتا۔

کچھ دنوں کے بعد جب گوپال چار پانچ سال کا ہوا تو اس کی ماں کو خیال پیدا ہوا کہ اُسے پاٹھ شالہ میں جانا چاہیئے۔ لیکن اس کے پہلے یہ ضروری تھا کہ اس کے لئے نئے کپڑے آئیں۔ اور کُش کی ایک چھوٹی سی چٹائی کی بھی ضرورت تھی جسے گوپال اپنی بغل میں لے جایا کرے اور اسکول میں اپنی جگہ پر بچھا کر بیٹھا کرے اور کاغذ یا کاپی کی جگہ تاڑ کے کچھ پتوں کی ضرورت تھی جسے کُش کی چٹائی میں لپیٹ کر لیجایا کرے اور ایک قلمدان، نرکٹ کے قلم اور دوات کی بھی ضرورت تھی۔ سلیٹ کی ضرورت ابھی نہیں تھی کیونکہ بہت چھوٹے بچوں کے لئے زمین پر راکھ یا بالو بچھا دیا جاتا ہے اور اس پر وہ اپنی انگلیوں سے حرف اور عدد لکھتے ہیں۔

گوپال کو کچھ نئے کپڑوں کی بھی ضرورت تھی۔ پیارا گوپال بیچارہ صرف پانچ برس کا بچہ تھا۔ ہندوستان گرم ملک ہے۔ ایک بچے کے لئے سوتی کپڑے کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کافی ہیں۔ ایک ٹکڑا جسے چادر کہتے ہیں بائیں کاندھے پر ڈال لیا جاتا ہے اور دوسرا ٹکڑا جسے دھوتی کہتے ہیں کمر سے باندھ کر نیچے تک چُن دی جاتی ہے۔ بس ایسے چار ٹکڑوں کی ضرورت تھی۔ دو آج کے لئے اور دو کل کے لئے جب آج کا کپڑا پاس بہنے والے نالے میں دھوکر گھاس یا الگنی پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیا جائے گا۔

یہ سچ ہے کہ ان کل چیزوں کی قیمت بہت کم تھی۔ لیکن غریب ماں کے لئے یہ بار بہت تھا اور اتنے پیسے پیدا کرنے کے لئے اس نے کئی روز تک بہت محنت سے چرخہ چلایا۔

آخرکار سب تیاری ہوگئی اور بہت سوچ سمجھ کر ایک نیک ساعت مقرر کرکے اُس نے بیٹے کو آشیرباد دی اور جھونپڑے کے دروازے پر کھڑی وہ ودیا آرمبھ (پہلا سبق شروع کرنے) کے لئے جنگل کی طرف اس کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

ادھر گوپال چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھتا جاتا تھا۔ راہ بہت لمبی معلوم ہوتی تھی اور اُسے یہ خیال بھی ہونے لگا کہ کہیں میں راہ تو نہیں بھول گیا۔ آخرکار گرو کا آشرم دور سے دکھائی دیا اور بہت سے دوسرے لڑکے بھی اس طرف جاتے ہوئے نظر آئے۔ یہ دیکھکر وہ یہ بات بھول گیا کہ ابھی دیر پہلے اُسے کچھ ڈر معلوم ہوا تھا۔ وہ تیزی سے دوسرے لڑکوں کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا اپنے درجے میں حاضر ہوگیا۔

آج کا دن بہت سہانا تھا۔ پڑھائی لکھائی ہو چکی تو لڑکے آپسمیں کھیلنے لگے۔ جب گوپال آخر کار گھر کو روانہ ہوا تو دن ڈوب چکا تھا اور جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ جنگل سے اکیلے پہلے پہل گزرنا گوپال کو بہت دنوں تک یاد رہا۔ اندھیرا بڑھتا جاتا تھا اور رہ رہکر جنگلی جانوروں کی ڈراؤنی آوازیں سُنائی دیتی تھیں۔ اخیر میں وہ اس قدر ڈر گیا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور اسلئے اس نے زور سے دوڑنا شروع کیا اور ماں کی گود میں پہونچنے سے پہلے اُس نے دم نہیں لیا۔

دوسرے دن صبح کو وہ پاٹھ شالہ جانے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ اس کی ماں نے کہا بیٹا کل تو تم بہت خوش تھے اور بہت سی اچھی باتیں سیکھیں۔ تم تو کہتے تھے کہ اسکول کا پڑھنا ہمکو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پھر آج کیوں تم جانا نہیں چاہتے۔

گوپال نے جواب دیا اماں اسکول تو بہت اچھا ہے لیکن جنگل میں اکیلے جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

گوپال نے یہ کہکر شرم سے سر جھکا لیا۔ لیکن ماں کے دل کی جو حالت ہوئی کیا اس کا اندازہ بھی کوئی کر سکتا ہے۔ اُسے ایک چوٹ سی لگی کیونکہ وہ اتنی غریب تھی کہ کوئی آدمی اپنے بچے کے ساتھ اسکول جانے کے لئے نہیں رکھ سکتی تھی۔ لیکن اس کی یہ حالت صرف ایک منٹ تک رہی۔ اُسے کرشن بھگوان کا دھیان آیا۔ وہ کرشن کو بحیثیت ایک چھوٹے بچے کے پوجتی تھی اور کرشن کے بچپن کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اپنے بچے گوپال کا نام بھی اس نے کرشن ہی کے نام پر رکھا تھا۔ کیونکہ گوپال کے معنی بھی گائے چرانے والے کے ہیں۔

اس نے اپنے پیارے بچے کو ایک کہانی سنائی۔ اس نے کہا بیٹا تم کو معلوم نہیں کہ میرے ایک دوسرا بچہ بھی ہے جو اسی جنگل میں رہتا ہے اور اس کا نام بھی گوپال ہے۔ وہ جنگل میں گائیں چرایا کرتا ہے۔ اور وہ برابر راستے کے آس پاس کہیں نہ کہیں رہتا ہے اور اگر تم اُسے یہ کہکر پکارو گے کہ بھائی گوپال میرے ساتھ اسکول چلو تو وہ ضرور آئیگا اور تمہارے ساتھ ہو لیگا۔ تب تو تم نہیں ڈرو گے ؟

گوپال نے کہا کیا یہ سچ ہے کہ میرا بھائی جنگل سے نکل کر میرے ساتھ چلیگا۔ اس کی ماں نے کہا۔ ہاں سچ ہے۔ اتنا ہی سچ ہے کہ تم بھگوان کے بچے ہو اور بھگوان تم کو پیار کرتے ہیں۔

گوپال نے جھٹ کہا اماں، نمسکار میں خوشی سے اسکول جاؤنگا۔ مجھے اسکول جانا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔

ننھا گوپال جی کڑا کر کے چل کھڑا ہوا۔ بن بہت گھنا اور تاریک تھا۔ کچھ دور اسمین جانیکے بعد گوپال ڈرنے لگا اور اس کو اپنے دل کی دھڑکن سُنائی دینے لگی۔ اس لئے وہ چیخ چیخ کر

پکارنے لگا۔ بھائی گوپال۔ بھائی گوپال آو میرے ساتھ کھیلو۔

جھاڑیوں کے پتّے کھڑکے۔ اس کے بعد جھاڑیوں کے بیچ سے ایک لڑکے نے سر اُٹھایا اس سَر پر ایک سونے کا تاج تھا اور تاج میں مور کا پَر لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک لڑکا جھاڑیوں میں سے نکلا اور اس نے گوپال کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسکول تک دونوں راستے میں کھیلتے ہوئے گئے۔

جب اسکول کے پاس دونوں آ گئے تو گائے چرانے والے لڑکے نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ گھر پلٹتے وقت مجھے پھر پکارنا اور یہ کہکر وہ پھر گھنے جنگل میں غائب ہوگیا جہاں اس کی گائیں چر رہی تھیں۔ یہ چرواہا اتنا پیارا تھا اور اتنا ہنس مکھ اور خوش دل تھا اور اس کے ساتھ ہی اتنا نیک نرم دل اور ہٹا کٹا تھا کہ گوپال کو اس سے گہری محبت ہوگئی۔ گوپال نے اسکے پہلے کسی کو اتنا پیار نہیں کیا تھا۔

جب ہر روز وہ اپنی ماں سے اس دوستی و محبت اور اس طرح ساتھ کھیلنے کا حال کہتا تو اس کی ماں کی آنکھیں پیار سے بھر آتیں اور وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ لیکن اس کو کچھ بھی تعجب نہ ہوتا تھا۔ اسکو یہ بات معمولی معلوم ہوتی تھی کہ کرشن ایک بچّہ کی صُورت میں ایک ماں کا دل رکھ لیں اور اسکو تسلی دیں۔

اس طرح کچھ دن بیتے۔ اُس کے بعد ایک نیا واقعہ ہوا۔ پاٹھ شالہ کے گرو نے لڑکوں کو اطلاع دی کہ وہ ایک یگیہ کریں گے جس میں ہزاروں آدمیوں کو کھانا کھلایا جائے گا۔

اس دیش میں یہ بات شروع سے چلی آتی ہے کہ جو گرو پاٹھ شالہ کھولے اس کو کوئی تنخواہ دیجائے۔ لیکن گرو کو کھانے پینے کی تکلیف کبھی نہیں ہوتی تھی۔ گاؤں کے لوگ ملکر اُسے کھیت دے دیتے تھے اور سب ملکر اُسے جوت بو دیتے تھے۔ اس کی پیداوار گرو کو دے دی جاتی تھی۔ لیکن خاص موقعوں جیسے یگیہ، بھنڈارہ۔ دعوت وغیرہ جب لڑکوں کو تقریب کی خبر دے دی جاتی تھی تو ہر لڑکا گھر پر جاکر اپنے والدین سے کہتا کہ گرو دیو ایک دعوت دینے والے ہیں۔ میں گرو دیو کو کیا دوں۔

پھر کچھ لڑکوں کی مائیں بہت سی کھانے کی چیزیں اور پھلوں کے تھال لگا کر بھیجتی تھیں۔ بہت سی عورتیں پوجا کے موقع پر پہننے کے لئے ریشمی دھوتیاں اور چادریں یا روز کے پہننے کیلئے ململ کے تھان بھیجتی تھیں اور اسطرح گرو اور اُنکی بیوی کا کام ایسے موقعوں پر بہت اچھی طرح انجام پاتا تھا۔

گوپال نے بھی اور لڑکوں کی طرح اس دن رات کو اپنی ماں سے کہا اماں کل گرو جی کے یہاں بھنڈارہ ہے۔ میں اُن کے پاس کیا لیجاؤں۔

بچّے کی بات سُنکر ماں کا دل تھوڑی دیر کے لئے اُداس ہوگیا۔ وہ غریب جانتی تھی کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے بچّے کو گرو جی کو دینے کے لئے دے۔ لیکن اس کی یہ اُداسی کچھ ہی دیر

کے لئے تھی۔ اور جب ایک بچے کی صورت میں اُسے کرشن کا دھیان آیا تو اس کا چہرہ پھر کھل گیا اور اُمید کی جھلک اسکے چہرے پر دکھائی دینے لگی۔

اس نے گوپال سے کہا بیٹا میں تو گرو جی کو دینے کے لئے کوئی چیز نہیں دے سکتی لیکن بنوں میں پھرنے والے اپنے بھائی سے صبح کو اسکول جاتے ہوئے کچھ مانگ لینا۔

دوسرے دن گوپال اور وہ چھوٹا چرواہا راستے بھر کھیلتے ہوئے اسکول تک گئے۔ لیکن جب چرواہا پلٹنے لگا تو گوپال نے چونک کر کہا۔ بھائی میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کیا آج میرے گرو جی کے لئے تم مجھے کچھ دوگے۔ آج گرو جی کے یہاں بھنڈارا ہے۔

چھوٹے چرواہے نے جواب دیا بھلا میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں۔ میں ایک غریب چرواہا ہوں میرے پاس کیا ہے۔ لیکن ٹھہرو ....

یہ کہتا ہوا وہ تھوڑی دور تک دوڑ کر گیا اور جب پلٹا تو مٹی کے ایک چھوٹے سے برتن میں کچھ دہی لایا۔ اور اُس نے گوپال کو وہ برتن دے دیا اور کہا کہ میرے پاس تو بس یہی ہے۔ ایک غریب چرواہے کے پاس اور کیا ہے۔ لیکن اُسے تم اپنے گرو جی کو دے دینا۔

گوپال نے سمجھا کہ یہ تحفہ بہت اچھا ہے۔ خاصکر اس وجہ سے کہ جنگل میں رہنے والے بھائی نے اسے دیا تھا۔ وہ دوڑ کر گرو جی کے آشرم میں پہونچا۔ اور لڑکوں کے گروہ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ لڑکے طرح طرح کی اچھی اچھی اور قیمتی چیزیں گرو جی کو دے رہے تھے۔ اس بھیڑ میں کسی نے بے باپ کے اس لڑکے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

جب گوپال کی طرف کسی نے نہ دیکھا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن خوش قسمتی سے گرو جی کی آنکھ اس پر پڑ گئی۔ اُنہوں نے دہی کا وہ چھوٹا برتن اس کے ہاتھ سے لے لیا اور جا کر ایک بڑے برتن میں اُسے انڈیل دیا۔ لیکن یہ دیکھکر ان کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی کہ چھوٹا برتن پھر دہی سے بھر گیا۔ اُنہوں نے پھر انڈیلا اور پھر برتن جوں کا توں بھر گیا۔ پھر وہ انڈیلتے ہی گئے اور چھوٹا برتن بھرتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ وہ خالی بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پھر بھر جاتا تھا۔ لڑکے کہتے تھے کہ بات کیا ہے۔ گوپال جس کی حیرت کسی سے کم نہ تھی اب پہلی بار کچھ کچھ سمجھا کہ س کا دوست چھوٹا چرواہا کون تھا۔ اب تک اس کو گمان تک نہیں تھا۔ کہ لڑکے کی شکل میں ؤد کرشن بھگوان اس کے ساتھ روز کھیلا کرتے تھے اس لئے جب گرو نے اس سے پوچھا کہ یہ دہی تم ماں سے لائے تو اس نے نہایت ادب اور احترام سے کچھ کانپتی ہوئی آواز میں کہا یہ دہی بن

ہیں گائے چرانے والے میرے بھائی نے مجھے دیا ہے۔" وہ کون ہے؟" گوپال نے کہا وہ روز میرے ساتھ کھیلتے ہوئے اسکول تک آتے ہیں ان کے سر پر ایک تاج ہوتا ہے۔ جس میں مور کا پر لگا ہوتا ہے اور ہاتھ میں ایک بانسری ہوتی ہے۔ جب میں اسکول پہونچ جاتا ہوں تو وہ پلٹ جاتے ہیں۔ اور اپنی گائیں چراتے ہیں اور جب میں گھر جانے لگتا ہوں تو پھر آکر میرے ساتھ کھیلتے ہیں۔

"کیا تم جنگل میں رہنے والے اپنے اس بھائی کو مجھے دکھا سکتے ہو؟" "گروجی اگر آپ آئیں تو میں انکو پکار سکتا ہوں" گروجی اور گوپال ساتھ ساتھ اس راہ پر گئے۔ جب اس خاص جگہ پر پہونچے تو لڑکے نے آواز دی "چرواہے بھائی۔ بھائی چرواہے، کیا نہ آوگے؟" لیکن جواب میں کوئی آواز نہیں آئی۔ گوپال کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اس نے گروجی کے چہرے پر شبہ کے بچھن دیکھے۔ اس لئے وہ ایک بار پھر پکارا "بھائی چرواہے اگر تم نہ آوگے تو لوگ مجھے جھوٹا سمجھیں گے۔"

تب ایک آواز آئی جیسے جنگل میں کہیں بڑی دور سے آرہی ہے۔ "نہیں پیارے بچے میں اپنا چہرہ نہیں دکھا سکتا۔ تمہارے گرو کو ابھی بہت زمانے تک انتظار کرنا ہے۔ تمہاری ماں کی طرح ماں بڑے ہی کسی لڑکے کو نصیب ہوتی ہے۔"

وہ زمانہ گذر گیا۔ جب مسجدوں سے ہی اہل ٹرکی کی سوشل ضروریات پورا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اب زمانۂ جدید کو کارخانوں۔ لائبریریوں۔ عجائب گھروں۔ ہسپتالوں۔ بچوں کی پرورش گاہوں نیز زنانہ اسکولوں۔ کالجوں۔ ورزش گاہوں وغیرہ کی اشد ضرورت ہے۔ جن کے ذریعے ٹرکی دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔ اور اس کا شمار بھی دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں ہو۔ (کمال پاشا)

تمام دنیا کی آنکھوں میں کچھ عرصہ کے لئے دھول جھونکی جا سکتی ہے۔ اور چند اشخاص کو ایک عرصہ دراز کے لئے بھی دھوکہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن تمام دنیا کو ہمیشہ کے لئے اندھیرے میں رکھ کر انہیں الو بنا ناممکن نہیں ہے۔ (ابراہیم لنکن)

آج تک جس قدر لٹریچر (ڈرامے۔ ناول۔ قصے۔ کہانیاں۔ مضامین وغیرہ) میری نظر سے گذرا۔ سب میں بنی نوع انسان کے دکھڑوں اور مصیبتوں کا رونا رویا گیا ہے کاش کوئی شخص انسانی

آخری سبق

از ڈی۔ پی بھٹناگر گشتہ

صبح کا وقت اور سہاونا اور دلفریب موسم تھا۔ نسیم سحری کے جھونکے خوشبو کا دریا انڈیل رہے تھے۔ دل و دماغ دونوں معطر ہو رہے تھے۔ اِسی سیر و تفریح میں آج مجھے اسکول جانے میں دیر ہوگئی۔ سبق بھی یاد نہ تھا۔ راستہ میں سوچتا جاتا تھا کہ آج ماسٹر صاحب گرامر کا سبق ضرور سُنیں گے تو خواہ مخواہ ناراض ہوں گے ایک بار جی میں آیا کہ کہیں بھاگ چلوں۔ دن بھی کتنا پُر لطف ہے۔ کہیں پھول کھلے ہیں، کہیں چڑیاں چہچہا رہی ہیں، کہیں سپاہی قواعد کر رہے ہیں کہیں بینڈ بج رہا ہے۔ اِتنی دلچسپیاں اور دلفریبیاں ہونے پر بھی میں رُک نہ سکا، میرے قدم آگے بڑھتے ہی گئے، معلوم نہیں کیوں؟

سڑک پر ایک نوٹس بورڈ لگا ہوا تھا۔ اُس کے گرد بڑی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ضرور کوئی خاص بات ہے جبھی اِتنے آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ پچھلے دو سال سے یہیں یہیں سے لڑائی اور ضبطی وغیرہ کی تمام چھوٹی بڑی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسی ہی خبر پھر ہو، یہی خیال کرکے میں بھی اُس طرف بڑھا۔ مگر راستے میں ہی جان پہچان کے ایک آدمی مل گئے۔ جنھوں نے ہنس کر طعن آمیز لہجہ میں کہا۔ "ابھی سے اسکول جا رہے ہو۔ ابھی تو بہت وقت ہے۔" میں شرمندہ ہو کر فوراً اسکول کی طرف بھاگا۔ سبق شروع ہونے سے پیشتر اسکول میں اکثر بڑا شور و غل رہتا ہے۔ کہیں لڑکے سبق دوہرا رہے ہیں۔ کہیں کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ کہیں ماسٹر صاحب بید لیے چکر لگا رہے ہیں۔ مگر آج وہاں کوئی بھی ایسی بات نظر نہ آئی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ تمام لڑکے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ماسٹر صاحب بھی اندر ہی تھے۔ مجھے سب کے سامنے کلاس کا دروازہ کھول کر اندر جاتے ہوئے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی ماسٹر صاحب نے بڑی شفقت سے کہا:۔ "اچھا تم آگئے، آؤ بیٹھو! ہم تو تمہارے بغیر ہی سبق شروع کرنے والے تھے"۔ میں فوراً اپنی جگہ جا بیٹھا اب میرا دھیان ماسٹر صاحب کی طرف راغب ہوا تو دیکھا کہ وہ خوب نفیس لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں، پھر میں نے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ گاؤں کے سبھی بڑے بڑے آدمی بیٹھے ہیں۔ میئر اور پوسٹ ماسٹر بھی ایک طرف تشریف فرما ہیں۔ میں بڑی حیرت میں تھا۔ سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے؟ اِتنے میں ماسٹر صاحب کرسی پر جا بیٹھے اور بولے "بچّو! آج میں تمہیں آخری سبق دے رہا ہوں"۔

برلن سے یہ حکم آیا ہے کہ ہمارے اِس مدرسہ میں جرمنی زبان کی تعلیم دی جائے۔ اِس لئے آج تمہارا یہ فرانسیسی زبان کا آخری سبق ہوگا۔ اور کل سے ماسٹر صاحب بھی کوئی دوسرے آئیں گے۔ پیارے بچّو، آج کا سبق ذرا دھیان سے سُننا۔"

برق زدہ کی طرح میں دم بخود رہ گیا۔ پسینہ سے میری پیشانی تر ہوگئی۔ وہ نوٹس بورڈ کی بات اب بخوبی میری سمجھ میں آگئی۔ آج فرانسیسی زبان کا میرا آخری سبق ہے۔ افسوس! ابھی تو میں بخوبی لکھ بھی نہیں سکتا۔ میں نے اپنا وقت کیوں اِس طرح ضائع کیا۔ کاش! میں اپنا روزانہ سبق یاد کرلیا کرتا۔ وہی گرامر جو کل تک وبالِ جان معلوم ہوتی تھی، آج پیاری معلوم ہونے لگی۔ میں دریائے فکر میں غرق ہوگیا۔ کہ اِتنے میں سبق سُنانے کا میرا نمبر آگیا۔ کاش آج میں سبق یاد کرکے آیا ہوتا۔ اگر آج اپنا سبق اچھی طرح سُنا سکتا تو مجھے کتنی خوشی حاصل ہوتی مگر میں خاموش تھا۔ بجز خاموشی اور چارہ ہی کیا تھا۔ شرم اور ندامت سے میری گردن اُٹھتی نہ تھی۔

"یہ کیا بات ہے۔ تم فرانسیسی بنتے ہو مگر اپنی مادری زبان سے اِسقدر بے بہرہ ہو، افسوس!" ماسٹر صاحب کہتے گئے "خیر، تمہارا اِسمیں کیا قصور! تمہارے والدین بھی تو اِدھر اُدھر کے دوسرے کاموں کو تعلیم پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور میں بھی تو کبھی کبھی مچھلی کے شکار میں جانے کیلئے مدرسہ میں تعطیل کردیا کرتا تھا۔" بچّو! مگر یہ دھیان رکھنا کہ ہماری فرانسیسی زبان سب سے عمدہ زبان ہے۔ ایسی پیاری، اتنی میٹھی اور خوبصورت زبان دُنیا کے پردے پر نہیں ہے۔ ہم تم آج غلام ہیں۔ مگر پیارے بچّو! اِس دولت کی حفاظت کرنا۔ اِس زبان کو نہ بھول جانا۔" یہ کہتے کہتے ماسٹر صاحب نے کتاب کھولی اور پڑھانا شروع کیا۔

آج کا سبق کتنا آسان معلوم ہو رہا تھا۔ ماسٹر صاحب اِس بات کے خواہشمند نظر آتے تھے کہ جس طرح بھی ہو آج ہی ساری فرانسیسی زبان کی تعلیم ختم کرادیں۔ بچّوں کو ایک ہی روز میں ساری قابلیت حاصل ہوجائے۔ اُن پر آج ایک محویت کا عالم طاری تھا۔

پڑھنا ختم ہونے کے بعد لکھنے کا نمبر آیا۔ آج ہم نے اپنی تمام کاپی "پیارا وطن فرانس"، "ہماری پیاری زبان فرینچ" لکھ لکھ کر سیاہ کرڈالی۔ کلاس روم میں بلا کی خاموشی تھی۔ غضب کا سکون تھا۔ ہر ایک کے لبوں پر مُہرِ سکوت لگی ہوئی تھی۔ البتہ کبھی کبھی قلم چلنے کی آواز سُنائی دے جاتی تھی۔ روشن دان میں ایک کبوتر بیٹھا تھا۔ جو آہستہ سے بول اُٹھا "غٹرغوں"۔ میں چونک اُٹھا۔ سوچنے لگا۔ شاید کل سے بیچارے کبوتر کو بھی جرمن زبان میں ہی غٹرغوں کرنا پڑے۔ اُف کتنی بے بسی کتنی بے چارگی۔ میں نے جتنی مرتبہ بھی سر اُٹھایا یہی دیکھا کہ ماسٹر صاحب کسی نہ کسی چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ آج اُن کے لئے

ہر چیز میں جاذبیت تھی۔ وہ آج ہر ایک چیز کو آنکھوں کی پُتلی بنانا چاہتے تھے۔ فرطِ جذبات سے اُن کی آنکھیں نم تھیں۔ دِل بیٹھا جارہا تھا۔ آہ! آج چالیس سال کے بعد انھیں ہر چیز کو الوداع کہنا پڑیگا۔ اسکول کے دروازہ پر خود اُنھیں کے ہاتھ سے لگائی بیلیں چاروں طرف پھیل کر خوبصورتی کو دوبالا کررہی ہیں۔ اُنھیں کے پرورش کردہ سیکڑوں بیل بوٹے، چھوٹے چھوٹے پودے اور پھول پتے اتنے عرصہ میں بڑھکر جوان اور ثمر دار ہوگئے ہیں۔ یہاں کی قریب قریب ہر چیز اُن کے سامنے کی ہے۔ کیا سب کو خیرباد کہنا پڑے گا؟ ہاں ضرور کہنا پڑے گا۔ اور چارہ ہی کیا ہے۔ وہ کرہی کیا سکتے ہیں؟ غلاموں کے اختیار میں بھی کبھی کوئی بات ہوئی ہے؟ ماسٹر صاحب کی ہمشیرہ اپنا سامان باندھ کر چلنے کی تیاری کرنے لگیں۔ سب کا دل بھر آیا۔ پھر سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ بوڑھے بوڑھے لوگ بھی ہل ہل کر سبق یاد کرنے میں مشغول تھے۔ کیونکہ سب کو یہی خیال تھا کہ آج ہماری زبان کا آخری سبق ہے۔ اتنے میں بارہ[12] کا گھنٹہ بجا۔ جرمن فوج کا بگل سُنائی دیا۔ ماسٹر صاحب کا رنگ فق ہوگیا۔ چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "دوستو اور بچّو! آج میں ..... میں ..... میں" اُن کا دِل بھر آیا۔ مُنھ سے الفاظ نہ نکل سکے۔ وہ بورڈ کی طرف مڑے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس پر موٹے موٹے الفاظ میں لکھا۔ "فرانس زندہ باد!" اُن کی آنکھیں اشک آلود تھیں۔ فرطِ غم سے سر جھک گیا تھا۔ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا "بچّو۔ جاؤ! سب اپنے اپنے گھر جاؤ!! مدرسہ توڑ دیا گیا ہے۔"

باہر نکلتے وقت سب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے[1]

(فرانسیسی افسانہ سے ماخوذ)

جس شخص کے اندر جذبۂ نفرت ہے وہ دوزخ میں ڈھکیلا جائے گا۔ (شکسپیر)

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے۔ میں اُسکا بندہ بنونگا جسکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا۔ (اقبال)

کسی پر زبردستی کرنا ظلم ہے۔ ایسا کرنے والوں کو پرماتما کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ (کبیر)

جو انسان لڑائی جھگڑا اور تکبر کرتے ہیں وہ پرماتما کو نہیں پاسکتے۔ صرف مذہبی کتابوں کے پڑھنے پر پرماتما نہیں ملتا۔

سچا دوست مصیبت کو بانٹ لیتا ہے۔ (بیکن)

غیر حاضر لوگوں کی بُرائی کرنا انصاف سے بعید ہے۔

قوتِ بازو کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اس کے لئے محنت کرنی چاہئے۔

---

[1] یہ افسانہ اُس وقت کا ہے جب جرمنی کا فرانس کے رائن لینڈ پر قبضہ ہو گیا تھا۔

ساون کا ایک منظر

(از حضرت تسنیم خوجیانوالی)

۱

سامنے ہیں درخت آموں کے — خوب صورت گھنے گھنیرے سے
کچھ لرزتے سے ہیں نظر آتے — سائے تاریک اور اندھیرے سے

۲

کچھ حسیں جھولتے ہیں جھولوں میں — نور و نغمہ سے ہے فضا لبریز
یہ نزاکت کہاں ہے پھولوں میں — ہائے یہ محفلِ جنوں انگیز!

۳

آسماں پر سحاب پارے ہیں — وحشی ، رقصیدہ اور آوارہ
اور زمیں پر یہ چاند تارے ہیں — کس قدر دلکشا ہے نظارہ!

۴

بوندیں رم جھم برس رہی ہیں وہ — پڑ رہی ہے پھوہار گردوں سے
بدلیاں کچھ بکھر گئی ہیں وہ — کھیلتی ہے بہار گردوں سے

۵

کتنی بدمستیوں کی ضامن ہے — مے میں بھیگی ہوئی فضائے دل
کتنی قاتل ہے جاں کی دشمن ہے — اُف یہ سرشاریِ ہوا اے دل

۶

پھر ہواؤں نے ساز چھیڑا ہے — ناچتی ہے بہار ساون میں
پھر فضاؤں میں حشر برپا ہے — جی ہے بے اختیار ساون میں

۷

پھر گھٹاؤں کی عنبریں زلفیں — رخِ ہستی پہ ہیں بکھرنے کو

یہ فضا، یہ سرور، یہ باتیں　　جی یہیں چاہتا ہے مرنے کو

۸

یہ نگاہیں، یہ گیسو، یہ آنچل　　ایک مستی فضا پہ چھائی ہے
آرزوؤں میں پڑ گئی ہلچل　　میرے مولا تری دُہائی ہے

۹

پھر گھٹا میں کسی نے چھیڑا ہے　　بزمِ ناہید کا حسیں نغمہ
یا کیوپڈ چرا کے لایا ہے　　کہکشاں کا یہ نازنیں نغمہ

۱۰

سرخیاں وہ اُفق میں لرزاں ہیں　　جا رہی ہے قطار بگلوں کی
شمعہائے حیات رخشاں ہیں　　دیدنی ہے بہار بگلوں کی

۱۱

تتلیوں کا یہ رقصِ سیمابی　　مست بھونروں کے بیخود افسانے
پھر تڑپتی ہے روحِ بیتابی　　زور سے تو دھڑک لے دیوانے

۱۲

کائنات ایک شعرِ رقصاں ہے　　کانپتی ہے بہار پھولوں میں
زندگی ایک خوابِ لرزاں ہے　　شعلے دہکے ہوئے ہیں جھولوں میں

۱۳

کاہشیں ہیں تڑپ ہے نغمہ ہے　　آسماں سے شراب گرتی ہے
حسن ہے رنگ ہے تماشا ہے　　زندگی بے نقاب پھرتی ہے

۱۴

جھومتا ہے نظامِ عالم کا　　کوئی کوئل جو کوک اُٹھتی ہے
دل چھلکتا ہے چشمِ پُرنم کا　　اور سینے میں ہوک اُٹھتی ہے

۱۵

تار دل کے لرز رہے ہیں پھر　　پھر اُبھرتی ہے چیخ سینے سے
یاد مجھ کو وہ آ گئے ہیں پھر　　باز آیا میں ایسے جینے سے

(۱۶)

وہ چمکتے ہیں نظم فطرت کے — کرمکِ شب چراغ شاخوں پر
نور سے بھر کے رکھ دیے کس نے — حسن کے یہ ایاغ شاخوں پر

(۱۷)

دیکھو دیکھو وہ شام آتی ہے — اڑ رہے ہیں طیور آوارہ
روح سینے میں پھڑپھڑاتی ہے — گا رہی ہے وہ ایک مہ پارہ

(۱۸)

اس دھندلکے میں رو رہا ہوں میں — اُف ترا انتظار ہے پیارے
آؤ آؤ کہ پھر ملیں نہ ملیں — چار دن کی بہار ہے پیارے

جذباتِ شایق

(از حضرت شایق ہندو)

اے خوشا جو مٹ جائے تیرا مبتلا ہوکر — دولتِ بقا پائے صرفۂ فنا ہوکر
طرزِ التفات اُن کا، مجھ سے چھپ نہیں سکتا — عشوہ و ادا بن کر، حیلہ و حیا ہوکر
قیدِ آب و گل میں بھی شانِ حسن عریاں ہے — رنگِ گل، فروغِ مل، جلوۂ حنا ہوکر
خوش ہو اے مذاقِ غم، ذوقِ جاودانی لے — عمرِ خضر آئی ہے وقفۂ قضا ہوکر
دل میں اب بجائے دل تم ہی تم ہو بس تنہا — عینِ مدعا بن کر حسنِ مدعا ہوکر

کثرتِ حوادث سے، ہوش گم ہیں کیا ہندو
ناخدا کا طالب ہے، مردِ با خدا ہوکر

تنقید کتب

ہندوستان کا نیا دستور حکومت[1]

جن حضرات نے تاریخ ہند کے برطانوی عہد کا مطالعہ کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کس طرح رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کے حقوق سلب کرکے قانون کے پردہ میں تسلط کی جد و جہد کی جسکی وجہ سے ہندوستانیوں کو شکایتیں ہوئیں۔ جن کا اظہار ۱۸۵۷ء کے "غدر" میں ہوا۔ انتزاع سلطنت اودھ و ریاست جھانسی کے بعد تمام شمالی ہندوستان خصوصاً صوبہ متحدہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ مگر جلد ہی ہندوستان پر پھر انگریزی تسلط قائم ہوگیا۔ اور پرانے انتظام میں یہ فرق نمودار ہوا کہ ہندوستان کی حکومت کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت ہوگئی۔ اس کے بعد حکومت اگرچہ قانون کے ذریعہ سے ہوئی۔ لیکن ۱۸۶۱ء تک درحقیقت بالکل مطلق العنان طرز کی حکومت رہی۔

اس دوران میں انگریزی تعلیم نے ترقی کی تو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے کروٹ لی اور ۱۸۷۰ء و ۱۸۸۰ء کے درمیان حقوق کے لئے آواز بلند ہونے لگی۔ گورنمنٹ بھی کچھ پسیجی اور ہندوستان میں لوکل سلف گورنمنٹ کا سلسلہ جاری کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ جس نے کونسلوں کی توسیع اور ان میں ہندوستانی نمایندوں کی شرکت کا مطالبہ پیش کیا۔ ۱۸۹۲ء میں یہ آرزو پوری ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے بعد حقوق طلبی کا شور زیادہ بلند ہوا۔ گو ۱۹۰۹ء میں حقوق کی پہلی قسط دی گئی، جسے تاریخ میں "منٹو مارلے اصلاحات" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان اصلاحات کی رو سے کونسلوں میں توسیع ہوئی۔ ہندوستانی نمایندے منتخب ہونے لگے۔ لیکن پھر بھی کونسلوں میں سرکاری نمایندوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انھیں اصلاحات کے سلسلہ میں وائسرائے اور صوبوں کے گورنروں کی اگزکٹو کونسلوں میں ہندوستانیوں کا تقرر ہونے لگا۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں ہندوستان نے دامے، درمے، قدمے ہر طرح سے برطانیہ کی مدد کی، اور انھیں دنوں ہوم رول کا ایجی ٹیشن بھی شروع ہوا۔ چنانچہ اصلاحات کی دوسری قسط دی گئی۔ جسے "چیمسفورڈ مانٹیگیو اصلاحات" کہتے ہیں۔ ان اصلاحات کے ماتحت کونسلوں میں مزید توسیع ہوگئی۔ اور

---

[1] ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۱۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ: ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد۔

سرکاری ممبروں کے بجائے منتخب شدہ ممبروں کی کثرت رکھی گئی۔ تمام محکمے دو حصوں میں تقسیم کئے گئے:۔ محفوظ و منتقلہ۔ دوسری قسم کے صیغوں کا انتظام ہندوستانی وزیروں کے سپرد کر دیا گیا۔ مگر کل نظم و نسق پر گورنروں کی نگرانی قائم رہی۔ اسے "دوعملی حکومت" کا عہد کہتے ہیں۔

اُس کے بعد اصلاحات کی تیسری قسط کا نمبر آیا جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں نمودار ہوا۔ چنانچہ آجکل اسی کا دور دورہ ہے۔ اِس نئے آئین کی رو سے ہندوستان کو کیا دیا گیا اور کیا نہیں دیا گیا؟ یہ معلوم کرنے کے لئے کتاب زیر نظر کا مطالعہ کیجئے۔ جسمیں فاضل مصنف پنڈت کشن پرشاد کول، ممبر انجمن خدام ہند نے آئین جدید کے دونوں حصوں یعنی صوبجاتی و مرکزی (فیڈریشن) پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس کے مطالعہ سے نئی اصلاحات کے تمام حسن و قبح پڑھنے والے کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس کے لئے دو باب مخصوص کئے گئے ہیں۔ تیسرا باب جسمیں "دیگر اہم مسائل" پر بحث کی گئی ہے۔ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ اِس باب میں (۱) مال اور خزانہ (۲) سروسیں (۳) عدل و انصاف (۴) تجارت میں قومی فرق (۵) وزیر ہند اور انڈیا کونسل (۶) ریزرو بنک وغیرہ کے متعلق پوری معلومات بہم پہونچائی گئی ہے کتاب کے آخری حصہ میں فاضل مصنف نے ان اصلاحات کی بھی تشریح کر دی ہے جو آئین جدید کے سلسلہ میں رائج ہو گئی ہیں۔

یہ کتاب محنت اور سوچ سمجھکر وسیع مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے۔ پنڈت کشن پرشاد کول پرانے اہل قلم ہیں، کتاب کی زبان بھی عام فہم اور سلیس ہے دراصل ہر اُردو دان شخص کو آئین جدید کی تفصیلات سمجھنے کے لئے اِس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔

تابعین[1]

اسلام کا ابتدائی دَور چار زمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ دورِ نبوتؐ، جب پیغمبر اسلامؐ زندہ تھے، دورِ صحابہؓ، جب رسول مقبولؐ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ نے مسلمانوں پر حکومت اور اُن کی رہنمائی کی، اسی زمانہ میں وہ بزرگ بھی ہیں۔ جنھیں محمد صاحبؐ کا دوست یا صحابی ہونے کا فخر حاصل تھا اور جو خود رسولؐ کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ تابعینؒ، وہ بزرگانِ دین ہیں۔ جنھیں رسولؐ کی مصاحبت کا شرف تو حاصل نہیں تھا۔ لیکن صحابہؓ سے علم دین حاصل کیا تھا۔ تبع تابعینؒ۔ یہ وہ بزرگ تھے جو تابعین کے بعد دینِ اسلام کے امین ہوئے پیشتر دار المصنفین اعظم گڈھ سے سیرۃ النبیؐ، خلفائے راشدین، سیر الصحابہؓ، سیر الصحابیات وغیرہ

---

[1] حجم ۵۲۸ صفحات۔ قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اب اس کتاب کے شائع کرنے سے اِس سلسلہ کی آخری کڑی بھی پوری ہوگئی ہے جس کے لئے شاہ معین الدین ندوی مستحق شکریہ ہیں۔

اِس کتاب میں حروف ابجد کی ترتیب سے چھیانوے اکابر تابعین کے حالات مختلف کتابوں سے تحقیق و تلاش کرکے درج کئے گئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے نہ صرف ہدایت حاصل ہوتی ہے، بلکہ بعض حالات کے پڑھنے سے ایک خاص قسم کی وجدانی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے۔ بعض تابعین کے حالات میں مروجہ روایات کی تصحیح بھی کی گئی ہے۔ مثلاً امام زین العابدینؒ کو عام طور پہ بی بی شہربانو دختر یزدجرد، شہنشاہ ایران کا بیٹا کہا جاتا ہے، مگر اس کتاب میں اس روایت کی تصحیح کی گئی ہے۔ البتہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ امام صاحب موصوف کی والدہ ماجدہ کوئی غیر عرب خاتون تھیں، جو ابن قتیبہ کے نزدیک سندھ کی رہنے والی تھیں۔

اِس کتاب میں اویس قرنیؒ، حضرت جعفر صادقؒ، حضرت حسن بن حسنؒ، حسن بصریؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت محمد بن حنفیہؒ وغیرہ کے حالات بہت کافی درج ہیں جو تحقیق کے ساتھ لکھے گئے ہیں مگر تعجب ہے کہ اِس کتاب میں امام اعظمؒ کا کوئی ذکر نہیں ہے، شاید آیندہ ایڈیشن میں یہ فروگذاشت رفع کردی جائے۔ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ نفیس ہے۔

دبدبۂ امیری[1]

منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی کے علم و فضل کا سکہ ہندوستان میں مدت تک رواں رہا۔ اُنکی وفات کو تقریباً ۴۰-۴۲ سال ہو گئے۔ اِس اثنا میں متعدد تنقیدی مضامین کے علاوہ کئی مستقل تصانیف بھی آپ کے متعلق شائع ہو چکی ہیں۔ مثلاً مولوی احسن اللہ خان صاحب ثاقب مرحوم نے خطوط "مکتوبات امیر" کے نام سے شائع کئے اور مولوی امیر احمد صاحب علوی کاکوری نے "طرۂ امیر" کے نام سے ایک مفصل سوانح عمری لکھی۔ اب سید محمد عبدالحکیم صاحب حکمت عالم گنجی عظیم آبادی نے، جو امیر مینائی کے فداکار شاگردوں میں ہیں۔ آپ کی سوانحعمری "دبدبۂ امیری" کے نام سے شائع کی ہے۔ جسمیں تمام سوانحی حالات بڑی تفصیل کے ساتھ دئے گئے ہیں، اور کلام پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ گو اسمیں عقیدتمندانہ عنصر کو بہت زیادہ دخل ہے یعنی حکمت صاحب نے بعض معمولی شعروں کو بھی اچھوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ مثلاً امیر مرحوم کے دو دیوانوں کی بارہ۱۲ منتخب و معیاری غزلیں کلام امیر کے نمونہ کے طور پہ پیش کی ہیں۔ اُن میں پہلی ہی غزل کا مطلع غلط اور عیب دار ہے

---

[1] قیمت دو روپیہ - ملنے کا پتہ:- منیجر حکمت بکڈپو، عالم گنج، ڈاکخانہ گلزار باغ (ضلع پٹنہ)

جب تلک بست تھے، دشوار تھا پانا تیرا	مٹ گئے ہم تو ملا مجھ کو ٹھکانا تیرا

شعر کے دوسرے مصرعہ میں "ہم" اور "مجھ" شتر گربہ ہیں۔ اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

اجل آجائیگی تو لے آئیگی ہمراہ ضرور	پیش جائیگا نہیں کوئی بہانا تیرا

شعر کا پہلا مصرعہ عروض سے خارج ہے۔ غالباً یوں ہوگا۔ " اجل آئیگی تو لیجائے گی ہمراہ ضرور"۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

لاتی کبھی ہمارے قفس تک بھی بوئے گل	ٹوٹا ہوا نہ پاؤں ترا اے نسیم تھا

اس شعر کا سنگِ بنیاد صرف "ٹوٹا ہوا پاؤں" ہے۔ ورنہ شعر بالکل عامیانہ ہے۔ تیسری غزل کا چوتھا شعر ملاحظہ ہو ؎

شبِ وصال غنیمت ہو پھر خدا جانے	کہ صبح کو وہ قمر مہربان رہے نہ رہے

نہ معلوم ایسے شعر کیوں منتخب کرلئے گئے۔ ورنہ حضرت امیر مینائی کے دیوان سے ہزاروں درخشاں جواہر پارے نقل کئے جاسکتے ہیں۔

فاضل مصنف نے ایک باب میں حضرتِ امیر مینائی کے شاگردوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اور کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ ایک علیحدہ باب میں اُن اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے جو معترضین نے کلام امیر پر کئے ہیں۔ لیکن سلسلہ میں بھی دلائل کی جگہ جذباتِ عقیدت کا زیادہ غلبہ ہے۔

اس کتاب کے ہر صفحہ سے مصنف کی اپنے ممدوح سے شیفتگی اور عقیدتمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ ہے لیکن کتابت کی غلطیاں معمول سے کسی قدر زائد ہیں۔ حجم ۲۷۶ صفحات۔

پنچھی[1]

ہندی میں انسانی روح کو بھی پنچھی یا اُڑنے والی چڑیا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ جب یہ اُڑ جاتی ہے تو جسم کا پنجرہ بیکار ہو جاتا ہے۔ اسی بات کو مدنظر رکھکر مسٹر کیدار شرما بی۔ اے نے یہ چھوٹی سی کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ اُنھوں نے اِنسان یا اُس کی روح کو "پنچھی" قرار دے کر انسانی زندگی کے تین مدارج یعنی بچپن، جوانی اور بڑھاپے پر چند دلچسپ اور پیارے گیت لکھے ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب انھیں گیتوں کا مجموعہ ہے۔

بچپن میں بچہ سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ ہر چیز کو دلچسپی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگرچہ اُس کی نظر

---

[1] قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ہمت رائے سارو ا نمبرا، رسہ روڈ۔ ٹالی گنج کلکتہ

محض سطحی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ؎

سُندر پھول کہیں ہیں پیلے لال بسنتی اودے نیلے
وہ کالے بھنوروں کی ٹولی کیسے کھیلی سب نے ہولی
نا ہے رنگ نہ ہے پچکاری
پنچھی دیکھی یہ پھلواری

جوانی میں دُور کی سوجھتی ہے بلکہ سوجھتی ہی نہیں اور انسان ایک طرح سے اندھا ہو جاتا ہے۔ اگر دیکھتا بھی ہے تو ہر چیز کو للچائی ہوئی نگاہوں سے بقول شرما جی ؎

کس نے چھیڑا راگ

جوبن کی بگیا میں پنچھی کیسی ہیرا پھیری پنچھی
کیسا تیر یہ تیرے پنچھی گھائل من کہتا ہے ہنس ہنس
جاگے ہمرے بھاگ پنچھی کس نے چھیڑا راگ

جب یہ آسیب سر سے اُتر جاتا ہے اور آدمی گرم و سرد دیکھ لیتا ہے تو دُنیا اپنے اصلی رنگ میں نظر آنے لگتی ہے۔ پنچھی کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ اور وہ اِس طرح پچھتانے لگتا ہے ؎

پنچھی نا کر یوا بھیمان

ٹھیک نہیں اتنی بدمستی تو کیا اور تری کیا ہستی
مٹھی بھر مٹی پر پیارے لگے ہوئے ہیں دو پر پیارے
دٗو دن کا مہمان پنچھی ناکر یوا بھیمان

غرض یہ چھوٹی سی خوبصورت کتاب انھیں جواہر پاروں کا خزانہ ہے۔ کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے اور جلد بھی بہت خوبصورت ہے۔

سب رس اقبال نمبر

ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن نے اپنے ماہوار رسالہ سب رس کا "اقبال نمبر" شائع کیا ہے۔ جسمیں علامہ سر محمد اقبال مرحوم کے متعلق ۳۶ مضامین نظم و نثر درج ہیں اور علامہ مرحوم کے کلام کی کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس پر مختلف فاضل مضمون نگاروں نے سیر حاصل بحث نہ کی ہو۔ مضمون نگاروں میں مردوں کے علاوہ بعض خواتین بھی شامل ہیں۔ مُلک کے اور بھی مشہور و مقبول رسالوں نے "اقبال" نکالے ہیں، لیکن جو تنوع اور عالمگیریت "سب رس" کے مضامین میں ہے وہ دوسروں میں کم نظر آئی ہے

رفتارِ زمانہ

جرمنی اور آیندہ جنگ

ہندوستان میں یہ خیال عام ہے کہ جرمنی جنگ کے لئے پوری طرح تیار ہے لیکن معلوم ہوا ہے کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ حال ہی میں جرمنی کے ایک مشہور فوجی ماہر و مورخ جنرل فان بیش نے، جنکی رائیں عام طور پر مستند سمجھی جاتی ہیں، ایک جرمن اخبار میں ایک مضمون کے دوران میں لکھدیا ہے کہ جرمنی کے لئے آیندہ لڑائی کوئی آسان بات نہ ہوگی۔ اسپین اور چین میں جو واقعات ہو رہے۔ اُن کی وضاحت کرتے ہوئے جنرل مذکور نے لکھا ہے کہ "جنگ علم حساب کا کوئی سوال نہیں ہے۔ جس کے ہندسے اور اعداد مقرر ہوتے ہیں، اور جس کا حل ہمیشہ مقررہ اصولوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اسلئے ہر لڑائی میں یہ پیشگوئی کرنا کہ فتح کس کی ہوگی اور کب ہوگی؟ بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ بعض اوقات واقعات کی رفتار بالکل خلاف توقع ہوتی ہے، جیسا کہ اسپین کی خانہ جنگی اور جنگ چین و جاپان میں دیکھنے میں آرہا ہے"۔

جرنیل موصوف کا خیال ہے کہ لڑائی میں کامیابی کے لئے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ استقلال و پامردی ہے۔ لیکن اگر یہ پامردی یا قوت اپنے جنگی تفوق پر قایم ہونیکے بجائے حُسنِ اعتقاد پر قائم ہے تو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ اِس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ نازی جرمنی میں بھی معقول پسند لوگ موجود ہیں اور غالباً انھیں کی بدولت ابتک کئی مرتبہ جنگ ٹل چکی ہے۔ باوجودیکہ جرمنی کی فوجی طاقت میں بڑا اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن ابھی اُسے اپنی کامیابی کی یقینی اُمید نہیں ہے، اور اگر خدانخواستہ اِس دفعہ بھی جرمنی کو شکست ہوگئی تو پھر جرمن سلطنت اور قوم کی دوبارہ شیرازہ بندی بہت ہی مشکل ہوگی۔ یہ خوف جرمنی کو یورپ کے امن و امان میں خلل ڈالنے سے روک رہا ہے۔

فرانس و اٹلی

فرانس اور اٹلی کے درمیان کشیدگی کا کیا حشر ہوگا؟ اُس کے بارہ میں یقین کے ساتھ کوئی پیشگوئی نہیں کیجا سکتی۔ بحالت موجودہ اٹلی کی حالت ایک درمیانی سلطنت کی ہے اور وہ تنہا کسی بڑی سلطنت سے لڑ نہیں سکتا۔ لیکن کسی دوسری سلطنت کا حلیف بن کر بہت فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ موسولینی خود جانتا ہے کہ اٹلی ایک تیسرے درجہ کی طاقت ہے۔ اِس لئے وہ اپنی قدیم روایتی چال چل رہا ہے یعنی جو فریق اُسے مال غنیمت میں زیادہ سے زیادہ حصہ دینے کا وعدہ کریگا، اسی کا وہ ساتھ دیگا۔ چنانچہ اُسنے "روم برلن" کا جو محور قائم کیا ہے۔ اس کا یہی مقصد ہے، کہ بظاہر جرمنی کا ساتھی بنکر، جو فرانس کا

نیشینی دشمن ہے، فرانس سے کچھ اینٹھا جائے۔" روم برلن محور" ہی کی بدولت فرانس و برطانیہ اسقدر وابستہ ہو رہے ہیں، اور اسی کی وجہ سے موسولینی کو "تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو" کے اصول پر عمل کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اسی لئے فرانس سے سمجھوتہ کی گفتگو کھٹائی میں پڑی ہوئی ہے۔"

ہسپانیہ

فرانس و اٹلی کے سمجھوتہ میں اسپین ہی کی لڑائی نے رکاوٹ ڈال رکھی ہے۔ اٹلی اور فرانس دونوں کو اِس بارے میں ضد ہے۔ موسولینی علانیہ جنرل فرانکو کی فتح کا خواہاں ہے۔ اور فرانس کے نزدیک جنرل فرانکو کی فتح کے ساتھ ہی اُس کے لئے ہسپانوی سرحد کا نیا جھگڑا پیدا ہو جائیگا۔ چنانچہ اسی اندیشہ سے فرانس در پردہ گورنمنٹ اسپین کی مدد کر رہا ہے۔ جسکی وجہ سے اٹلی اور جرمنی کی امداد کے باوجود ابھی تک جنرل فرانکو کو مکمل فتح حاصل نہیں ہوئی۔ جمہوریہ اسپین کی فوج کی اخلاقی حالت بھی بہت اچھی ہے، اُن کی ہمتیں بھی پست نہیں ہوتی ہیں اگرچہ باغیوں کے طیارے بیدردی سے جانوں کا نقصان کرتے ہیں، مگر وہ منزل مقصود سے ہنوز اتنے ہی دُور ہیں جیسے کہ اب سے چند ماہ بیشتر تھے بعض مبصرین کا خیال ہے کہ جمہوری حکومت ضرورت پڑا بھی دو برس تک اور لڑ سکتی ہے۔ بہرحال اسپین کے جلد فتح ہونے کا خیال بالکل خام ہے۔ موسولینی کیا کریگا؟ اٹلی اسپین کی خانہ جنگی میں پانی کی طرح اپنی دولت بہا چکا ہے اور اگر آخر میں جمہوری گورنمنٹ ہی کو فتح ہوئی تو اُس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر جائیگا۔ اور دُنیا میں ذلت و رسوائی علیحدہ ہوگی۔ یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ جنرل فرانکو کی فوج پر جسقدر جرمنی کا اثر ہے اُتنا خود فرانکو کا نہیں ہے۔ اِس لئے اگر باغیوں کو فتح کبھی حاصل ہوگئی تو یہ امر مشتبہ ہے کہ اسپین پر اٹلی کا تسلط قائم ہو جائے۔ کیونکہ اس صورت میں جرمنی بھی اسپین سے ہٹنا کبھی گوارا نہیں کریگا۔ ہر ہٹلر کے اشارہ سے جنرل فرانکو کے طیاروں نے فرانسیسی قصبات پر بمباری شروع کر دی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ فرانس کی توجہ وسطی یوروپ سے ہٹا دی جائے، اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ فرانس و برطانیہ اِن حرکتوں کے خلاف اب موثر تدابیر اختیار کرنیوالے ہیں بہرحال اسپین میں واقعات رفتار تیز ہے۔ دیکھئے دو چار ہفتوں کے اندر کیا ظہور میں آتا ہے؟

برطانیہ

جنگ کے مسئلہ میں برطانیہ میں اس وقت دو گروہ ہیں۔ ایک کے ترجمان مسٹر چرچل اور دوسرے کے لارڈ سیموئل ہیں۔ مسٹر چرچل کی جماعت کا خیال ہے کہ جنگ ضرور ہوگی۔ اِس لئے تمام صلح پسند قوموں کو چاہیئے کہ وہ پوری طرح کیل کانٹے سے درست ہو کر، باہمی تحفظ کے خیال سے اپنے گھرے

دوستانہ تعلقات قائم کرلیں۔ لارڈ سیموئیل والے گروہ کے خیال میں صلح و آشتی سے کام نکالنا چاہتے۔ لڑائی سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ اُن کا مشورہ ہے کہ جو زیادتیاں صلحنامہ وارسائی میں جرمنی اور اُسکے حلیفوں پر روا رکھی گئی ہیں، اُن کو رفع کر دینا چاہئے۔ یہ گروہ بین الاقوامی قانون اور عدل و انصاف کا معتقد ہے۔ اُس کو خوف ہے کہ مسلح جتھا بندی سے یورپ دو حریف جتھوں میں تقسیم ہوجائے گا۔ اور اُس کے بعد ایک نہ ایک دن لڑائی ضرور ہوگی۔ پہلے گروہ کے دلائل یہ ہیں کہ جرمنی، اٹلی اور جاپان تینوں زبردست طاقتیں لیگ اقوام سے الگ ہوچکی ہیں۔ اور یہ تینوں معاہدوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کررہی ہیں۔ اور حصولِ مقصد کے لئے طاقت استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتیں۔ اِس لئے اُن کی تمام حرکتیں تہذیب و تمدن کے حق میں تباہ کُن ہیں۔ جرمنی اِس گروہ کا سرغنہ ہے، جس کے نزدیک نہ مذہب کا کوئی تقدس اور نہ اخلاق کی کوئی وقعت باقی ہے بلکہ قومیت، نسل، طاقت اور سنگدلی ہی اُس کا دین و ایمان ہے۔ اِن ملکوں کے ڈکٹیٹروں کی حرص وہوس کی کوئی حد نہیں، اِس لئے اُن کے ساتھ رعائتیں کرنا، اُن کی فرعونیت میں اضافہ کرنا ہے۔ اور خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ اِسلئے صحیح راستہ یہی ہے کہ اِن ڈکٹیٹروں کے خلاف مسلح جتھا بندی کی جائے۔ دوسرے گروہ کے دلائل یہ ہیں کہ مسلح ہوکر جتھا بندی کرنے سے یورپ میں دو مخالف اکھاڑے قائم ہوجائیں گے۔ جس کا یقینی نتیجہ جنگ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اِس لئے پہلے مصالحت پسندانہ پالسی اختیار کی جائے اور اگر اسمیں کامیابی نہ ہو، تو صاف ضمیر اور پوری طاقت کیساتھ جنگ کی جائے۔ غرض جنگ سے بچنے کے لئے بھی جنگ کے قابل بنانیکی پالسی اِس وقت عام پسند پالسی ثابت ہورہی ہے۔

مصر میں آجکل تین سیاسی پارٹیاں ہیں۔ جنمیں محمود پاشا وزیر اعظم کی پارٹی اِسوقت برسرِ حکومت ہے۔ دوسری سعد پارٹی میں وہ لوگ شامل ہیں جو پہلے وفد پارٹی میں تھے، مگر بعد میں مصطفیٰ نحاس پاشا سے ٹوٹکر اِس پارٹی میں آگئے۔ تیسری وفد پارٹی ہے، جس کے لیڈر نحاس پاشا ہیں۔ محمد محمود پاشا وزیر اعظم نے فی الحال سعد پارٹی کے پانچ آدمی اپنی وزارت میں شامل کرلئے ہیں تاکہ اِن کی حکومت کو اُن کی پارٹی کی بھی ہمدردی حاصل رہے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد محمد محمود پاشا کی پارٹی میں پھوٹ پڑجانے کا خوف ہے۔

حال میں اہم واقعہ یہ ہوا ہے کہ شاہ مصر کی بہن کی نسبت ولیعہد ایران سے طے ہوئی ہے۔ مصر کا شاہی خاندان سُنّی ہے اور ایران کا شیعہ، مگر عقائد کے اِس اختلاف کے باوجود سیاسی لحاظ سے یہ شادی بہت مناسب خیال کیجاتی ہے، اور ایران و مصر کی تاریخ میں پہلا موقعہ ہوگا کہ جب مصری

شہزادی ایران کی ملکہ بنے گی۔

بعض لوگوں کی یہ کوشش ہے کہ شاہ فاروق کو مسلمانوں کا امیر المومنین اور خلیفہ مقرر کیا جائے، ممکن ہے کہ شمالی افریقہ کے اسلامی ممالک، فلسطین، شام، عراق، سواحل عرب کی حکومتیں اور افغانستان مصر کو خلیفہ تسلیم کرلیں۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ سلطان ابن سعود اور ایران انھیں خلیفہ تسلیم نہ کرینگے۔ کیونکہ خلیفہ کے لئے یہ بات لازمی ہے کہ وہ حرمین شریفین یعنی مکہ و مدینہ پر قابض ہو۔ اور یہ بات صرف سلطان ابن سعود کو حاصل ہے لیکن شاہ مصر کو حاصل نہیں۔ یوں بھی ایران کی شیعہ سلطنت کسی شخص کو خلیفۃ المسلمین تسلیم نہیں کرسکتی۔ بہرحال ابھی کوئی بات طے نہیں ہوئی ہے۔ دیکھئے آگے چلکر کیا ہوتا ہے؟

فلسطین

فلسطین میں تشدد و دہشت انگیزی کا نہ معلوم کب تک سلسلہ جاری رہیگا۔ گورنمنٹ ہر ممکن ذریعہ سے عربوں کی شورش کو فرو کرنا چاہتی ہے۔ مگر ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ انگریزی فوجیں اور مسلح پولس ہوائی جہازوں اور سراغرساں کتوں کی مدد سے قاتلوں کا استیصال کر رہی ہیں۔ فوجی عدالت بھی قائم ہے اور گو بظاہر مارشل لا نافذ نہیں لیکن ملٹری حکومت کا دور دورہ ہے مگر عربوں کی مزاحمت و مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اسوقت عرب لوگ بم اندازی، خنجر بازی اور آتشباری سے بھی کام لے رہے ہیں۔ کبھی کبھی ریلوے لائن بھی توڑ دیتے ہیں۔ ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کے تار کٹنا تو معمولی بات ہوگئی ہے۔ عربوں کے دو مطالبے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی آمد بند کی جائے، اور دوسرا یہ کہ فلسطین برطانوی اقتدار سے آزاد کردیا جائے۔ مگر گورنمنٹ برطانیہ اُن مطالبوں کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔ حکومت کی سختی کا یہ عالم ہے کہ یروشلم، حیفہ، یافہ اور تل ابیب میں بائیس گھنٹہ یومیہ کا کرفیو آرڈر جاری ہے یعنی چوبیس گھنٹہ میں صرف دو گھنٹے گھروں سے باہر نکلنے کی اجازت ہے۔ انھیں دو گھنٹوں میں لوگ اپنی ضرورتیں پوری کرسکتے ہیں۔ پیل کمیشن نے تقسیم فلسطین کی جو اسکیم تجویز کی تھی۔ اُس کا تو عربوں کی مزاحمت نے جنازہ نکال دیا ہے۔ اب ایک اور کمیشن بھیجا گیا ہے، جو غالباً کوئی دوسری اسکیم پیش کریگا۔ اسی سلسلہ میں ایک خبر یہ معلوم ہوئی ہے کہ سید امین الحسینی سابق مفتی اعظم فلسطین جو آجکل شام میں ہیں۔ حجاز میں آکر آباد ہونیوالے ہیں۔ مگر ابھی اس کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو مزید سیاسی گتھیاں پڑجانے کا اندیشہ ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ جس طرح اٹلی سے والنٹیر اسپین جاکر لڑرہے ہیں۔ اُسی طرح حجاز اور نجد کے لوگ بھی فلسطین پہونچ

جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو سلطان ابن سعود اور گورنمنٹ برطانیہ کے تعلقات میں بہت کچھ پیچیدگی پیدا ہو جائیگی۔

چین

چین و جاپان کی لڑائی کے شروع میں جاپان کا یہ خیال نہ تھا کہ یہ آگ تمام چین میں پھیل جائیگی۔ خود جاپانیوں کا مقصد بھی محدود تھا۔ یعنی وہ شمالی چین کے بعض ایسے صوبوں پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، جو معدنی دولت سے مالامال ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ پچاس ساٹھ ہزار فوج سے چین کی مزاحمت آسانی سے کچل دی جائیگی۔ لیکن بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ وہ آخری دم تک لڑنے مرنے کے لئے تیار ہے، تو جاپان کی آنکھیں کھلیں۔ اور اُس کا غیظ و غضب بھڑک اُٹھا۔ اور بڑے بڑے دعوے کئے گئے۔ مگر سال بھر سے زیادہ ہو گیا۔ جاپانیوں نے شمال کے چار صوبوں پر قبضہ کر کے وہاں اپنے زیر سایہ کٹھ پتلی حکومتیں قائم کر دی ہیں اور چار اور صوبوں میں جاپانی فوجیں گھس آئی ہیں۔ اور چینیوں کو ابھی تک جمکر کہیں فتح حاصل نہیں ہوئی لیکن جاپانیوں کو بھی کوئی فیصلہ کن فتح نصیب نہیں ہوئی۔ اسوقت تک چین کے ساڑھے تین لاکھ مربع میل رقبہ پر جاپانیوں کا قبضہ ہے مگر اس وقت بھی گیارہ لاکھ مربع میل کے قریب چین کے قبضہ میں باقی ہے اور فوجی نقطۂ نظر سے چین کمزوری نہیں دکھا رہا ہے۔ آدمیوں کی کمی نہیں ہے اور اگر روس سے سامان بہم پہونچتا رہا تو جاپان کے دانت کھٹے ہو جائیں گے، اور جاپان کا تمام امپیریلزم خاک میں مل جائے گا۔ اِس وقت بھی جاپان کی مالی و اقتصادی حالت نازک ہے۔ اُس کی تمام تجارت دوسروں کے ہاتھوں میں جاری ہے۔ اگر یہی حال رہا۔ تو یہ لڑائی جاپان کے لئے تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

آزاد

ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر جو آزاد قبائلی علاقہ واقع ہے، وہاں حسب معمول آجکل بھی کشت و خون اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے جسکا باعث یہ ہے کہ گورنمنٹ ہند اس علاقہ میں فوجی چوکیاں قائم کر کے اور فوجی نقل و حرکت کیلئے سڑکیں بنا کر آہستہ آہستہ اپنا تسلط جمانا چاہتی ہے۔ اور وزیرستان کے قبائل جو قدرتاً آزاد ہیں گورنمنٹ ہند کی مزاحمت کرتے ہیں۔ شمالی وزیرستان میں فقیر ایپی اور جنوبی وزیرستان میں ملا شیر علی قبائل کے سرغنہ ہیں۔ خیر یہ تنازعہ تو ہمیشہ کا ہے، لیکن حال میں وزیرستان کے اندر ایک نیا فتنہ یہ رونما ہوا کہ اپریل ۱۹۳۸ء میں ایک شخص سعدی نامی جسے دمشق کا رہنے والا بتایا جاتا ہے، ایک ہمراہی کے ساتھ ہندوستان آیا اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں مقیم ہوا۔ یہاں اُس کے پاس ایک موٹر کار اور تین لاریاں تھیں۔ اور وہ اُنہیں گشت کر کے قبائل کو موجودہ حکومت افغانستان کے

خلاف بھڑکانے اور روپیہ تقسیم کرنے لگا۔ بالآخر سلیمان خیل کا ایک لشکر فراہم کرلیا جس نے افغانی حدود میں گھس کر بعض مقامات پر قبضہ کرلیا۔ لیکن اسی اثنار میں یہ خبر آئی کہ اس پیر شامی نے دانہ جاکر خود کو انگریزی حکام کے حوالہ کردیا۔ جسے دہلی لایا گیا اور وہاں سے ہوائی جہاز میں سوار کرکے براہ کراچی بصرہ میں لایا گیا۔ غزنی کی افغانی فوج نے آکر ہوائی جہازوں کی مدد سے سلیمان خیل کے لشکر کا قلع قمع کردیا۔ اور ۲۴ جون کو جو جنگ ہوئی اُس میں سیکڑوں آدمی قتل و قید ہوکر لشکر منتشر ہوگیا۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ پیر شامی خود کو اُن ملوک کا طلب کا کردہ بتاتا تھا جو حکومت ہند کے وظیفہ خوار ہیں۔ مسلیم نے اخبار "اصلاح" کا یہ بھی بیان ہے کہ پیر شامی کے اشارہ سے بعض ہوائی جہازوں نے افغانی علاقہ پر بمباری بھی کی تھی، جس سے انیس[19] آدمی ہلاک و زخمی ہوگئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مفسد ہندوستان آئے اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں بیٹھ کر ایک ہمسایہ سلطنت کے خلاف لشکر جمع کرے، قبائل میں روپیہ تقسیم کرے، لیکن گورنمنٹ ہند کے محکمہ سراغرسانی کو کوئی خبر نہ ہو؟ یہ سوال بھی حل طلب ہے کہ اُس کے پاس موٹر کار، ہوائی جہاز اور روپیہ کہاں سے آیا؟ بہرحال ابھی تک یہ تمام باتیں معمہ ہیں۔ "اصلاح" کابل کو یہ شکایت ہے کہ پیر شامی کو گرفتار کرکے یا تو حکومت ہند خود عبرتناک سزا دیتی یا اُسے حکومت افغانستان کے حوالہ کردیتی۔ مگر حکومت ہند نے اُس کو اپنے خرچ سے بصرہ پہونچادیا۔ غرض یہ سارا واقعہ ایک راز سربستہ ہے، جسکا انکشاف شاید کبھی نہ ہو۔

ہندوستان

ہندوستان میں پچھلے ماہ لیگ و کانگریس کے درمیان مصالحت کی بات چیت رہی۔ مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کی ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جناح سے طولانی خط و کتابت رہی۔ نہرو صاحب نے نواب محمد اسمٰعیل صاحب سے بھی اس بارے میں تبادلہ خیالات کیا تھا۔ مگر ان سب کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ تمام خط و کتابت شائع ہوچکی ہے۔ اس کو پڑھکر ہم کو تو یہی مترشح ہوا کہ خداوندان لیگ کو سب بڑی فکر اس بات کی ہے کہ اُنکی جماعت تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت تسلیم کرلیجائے، اور کانگریس کے لیڈران خود کانگریس کیلئے ہندو مہاسبھا کی حیثیت قبول کریں۔

مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں کے ساتھ خط و کتابت میں مسٹر جناح کے لب و لہجہ سے تنک مزاجی ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض مسلم مدبرین نے بھی اس رائے کا علانیہ اظہار کیا ہے، مثال کے طور پر ہم اپنے معصر شاہکار لاہور کی رائے پیش کرتے ہیں۔ جس کے جوائنٹ ایڈیٹر نے اپنے رسالہ کے جولائی نمبر میں لکھا ہے:۔

"کہ اس خط وکتابت کو پڑھکر ہر شخص یہ اندازہ کریگا کہ رعونت و تدبر کے درمیان جنگ ہو رہی ہے، مسٹر جناح کا انداز مراسلت حد درجہ قابل اعتراض ہے اور پنڈت نہرو کا اسلوب تخاطب ضبط، سیرچشمی اور تدبر پر مبنی ہے .... پیش کردہ مطالبات میں اکثر مطالبات اصول حق رسانی کے پیش نظر اہم، ضروری اور حقیقی طور پر واجبی ہیں۔ لیکن جس زبان اور انداز بیان میں یہ مطالبات پیش کئے گئے ہیں وہ یقیناً رعونت آمیز ہے۔ معاصرانہ رواداری کے خلاف ہے اور اسلامی طرز عمل سے متصادم۔

دوسری بات جو اس خط وکتابت سے مترشح ہوتی ہے، یہ ہے کہ مسلم نمایندہ "مفاہمت مفاہمت" پکارتا ہے۔ مگر عملی طور پر مفاہمت سے دُور دُور رہتا ہے۔ اُس کے خلاف پنڈت نہرو مطالبات سے کوئی ہمدردی نہ رکھتے ہوئے بھی مفاہمت سے خلوص کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے جوابات کے کسی جملے، جملے کے کسی لفظ سے یہ مترشح نہیں ہوتا ہے کہ وہ مفاہمت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے جان چراتے ہیں، بلکہ اُن کا انداز نگارش ظاہر کر رہا ہے کہ وہ حریف کے غیر معاصرانہ طرز عمل کو نظر انداز کرکے بھی صلح باہمی کے لئے ساعی ہیں۔

تیسری رونما کیفیت مسلم نمایندے کی سیماب وشی ہے۔ اس کی گفتگو سے اضطراب، لاامکانیت اور اپنے آپ سے بے اعتمادی کا اظہار ہو رہا ہے۔"

مہاتما گاندھی کے لفظ لفظ سے اُن کا طبعی عجز و انکسار اور خلوص ثابت ہوتا ہے۔ علالت کی حالت میں بھی وہ مسٹر جناح کی طلبی پر اُن کے در دولت پر حاضری دینے میں کبھی عذر نہیں کرتے ہیں، غالباً مسٹر جناح نے شروع سے آخر تک محض مسلم لیگ کے وکیل کی حیثیت اختیار کی، جس کو معاملہ کی نیکی بدی سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ صرف اپنے موکل کے مقدمہ کی پیروی سے کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی مسٹر جناح سے بار بار پوچھتے ہیں کہ آپ کی اگلی حب الوطنی کہاں ہے؟ مگر درشت وکرخت جواب کے علاوہ انھیں کچھ نہیں ملتا۔ بہرحال اتنے دنوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد کانگریس کے لئے اپنے کو صرف ہندوں کی نمایندہ قرار دیدینا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اس کے لئے یہ وعدہ کرنا بھی خودکشی کے مرادف ہوگا کہ عام مسلمانوں کے ساتھ وہ کوئی ربط پیدا نہیں کرسکتی اور جو مسلمان اسمیں شامل ہوچکے ہیں، آیندہ اُن کیساتھ اپنے تعلقات بھی قائم نہیں رکھ سکتی ہے۔

مسٹر جناح کے یہ دونوں مطالبات اِسقدر خلاف اصول ہیں کہ خود مسلمانوں نے جابجا اُن کی پُرزور مخالفت کی ہے۔ چنانچہ بمبئی میں قوم پرست مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا جسمیں مسلمانوں کثیر تعداد شریک تھی۔

دیگر اطراف ملک سے بھی مخالفانہ صدائیں بلند ہوئیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اِس تمام سلسلۂ جنبانی پر ابھی تک اپنا کوئی باضابطہ ریزولیوشن پاس نہیں کیا ہے۔ لیکن عام طور پر یہی خیال ہے کہ فی الحال اس بارے میں کوئی مزید کوشش فضول ہوگی۔ وقت بڑا مصلح ہے اور خود دونوں طبقوں کو متحد و متفق کرکے رہیگا۔ کانگریس کو عوام کی بہبودی کے لئے اپنا پروگرام جوش و استقلال سے جاری رکھنا چاہئے۔

ان تمام واقعات کے بعد بھی مہاتما گاندھی کا حوصلہ پست نہیں ہوا ہے بلکہ اُنھوں نے حال میں ہندو مسلم فسادات رفع کرنے کے متعلق ایک نئی اور انوکھی تجویز Peace Brigade یعنی "صلح جو رضاکاروں کی فوج" قائم کرنے کی پیش کی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ہر مقام میں صلح پسند نوجوانوں کی ایک جماعت اکٹھی کی جائے، جو ہر حالت میں امن و امان برقرار اور اتفاق باہمی قائم رکھنے کی کوشش کریں اور اس کے لئے اپنی جانیں تک قربان کردینے کو تیار رہیں۔ کراچی اور بعض دیگر مقامات میں اِس تجویز پر عملدرآمد کی کوشش بھی شروع ہوگئی ہے۔ تاہم ابھی ہم اُس کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دیسکتے ہیں۔

کچھ دنوں سے اکثر صوبوں کی وزارتوں میں ہلچل مچی ہوئی ہے مثلاً بنگال کی وزارت کو اپنے ایک رفیق کی سرکشی کی بدولت مستعفی ہونا پڑا، مگر گورنر بنگال نے فوراً ہی مسٹر مظہر الحق اور اُن کے رفقا کو دوبارہ قلمدان وزارت سپرد کردیا۔ ابھی قانونی اسمبلی کا اجلاس نہیں ہوا ہے۔ اِس لئے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس خانہ جنگی کا مسٹر حق کی وزارت پر بالآخر کیا اثر پڑے گا۔ آپسمیں بہت کچھ رد و کد ہو رہی ہے۔ مگر جب تک اسمبلی کا اجلاس منعقد نہ ہو، حقیقت حال صاف طور پر معلوم نہ ہوگی۔

بہار اور صوبہ متحدہ کی حکومتیں زمینداروں و کاشتکاروں کے باہمی تعلقات درست کرنیکے درپے ہیں۔ کسانوں کے بعض خود سر لیڈران کسان سبھائیں قائم کرکے کانگریس کے مصالحانہ رویہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

بہار میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کوشش سے کانگریسی گورنمنٹ کا زمینداروں سے سمجھوتہ ہوگیا ہے۔ صوبہ متحدہ میں بھی اسی قسم کی تجویزیں درپیش ہیں۔ زمیندار اور سرمایہ دار کانگریس گورنمنٹ کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقے کو حال ہی میں کانپور ہڑتال کے سلسلے میں بڑی دل شکن شکست مل چکی ہے۔ چنانچہ اس وقت وہ بہت بددل ہو رہے ہیں، اور زمینداروں سے مل کر کانگریس کے رفاہ عام کے پروگرام کا مقابلہ کرنے کی سر توڑ کوشش میں ہیں۔

زمیندار صاحبان بھی نئی تجاویز سے بہت دِل برداشتہ ہوگئے ہیں کیونکہ ابھی تک گورنمنٹ صوبہ انکی رائے، مشورہ بلکہ تحریک کے بغیر کسی معاملے میں قدم ہی نہ اُٹھاتی تھی۔ اور تمام معاملات اُنھیں کی مرضی کے مطابق طے ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب صوبے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ گورنمنٹ انھیں محض ایک فریق سمجھ رہی ہے۔ کانگریس کے مدبر خصوصاً وزیراعظم پنت کسانوں کے موجودہ افلاس و بیکسی سے اِس قدر متاثر ہیں کہ اِس وقت اُنکی فلاح و بہبود کی حفاظت کرنا ہی اپنا فرض مقدم سمجھ رہے ہیں، زمیندار صاحبان اِس سے خواہ مخواہ پریشان ہیں۔ اور بڑے بڑے جلسے منعقد کرکے اپنے طبقے کی تنظیم و اصلاح کی تدبیریں سوچ رہے ہیں۔ ہزارہا والنیٹر بھرتی کرنے کی تجویز بھی درپیش ہے۔ اور گورنمنٹ کے مجوزہ قوانین کو کسانوں کے مفاد کے خلاف بتایا جارہا ہے اور جلسوں میں زمیندار صاحبان کاشتکاروں کیساتھ اپنی دِلی ہمدردی کا جوش و خروش کیساتھ اعلان کررہے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسوقت بھی اگر وہ اپنی آمدنی کا کوئی خاص حصہ کاشتکاروں کی اصلاح و ترقی پر صرف کرنے کو تیار ہوں تو دُنیا کی کوئی طاقت کاشتکاروں کو اُن سے جدا نہیں کرسکتی ہے، مگر کیا ہمارے زمیندار واقعی اِس ایثار کے لئے تیار ہیں؟ اب بھی اُنھیں اِسکا موقعہ ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ گورنمنٹ کے سپرد کردیں اور اِس رقم کو اہلِ دیہات کے نفع کیلئے خرچ ہونے دیں۔

سندھ میں تشویش انگیز حالت پیدا ہوگئی ہے۔ چونکہ وہ ایک غریب صوبہ ہے اِس لئے اِن سرکاری آمدنی میں فوری اضافہ کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ وزارت نے سکھر بند سے آبپاشی ٹیکس بڑھانے کی تجویز کی ہے لیکن سندھ کی متحدہ پارٹی اپنے لیڈر اور وزیراعظم اللہ بخش کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ کانگریس پارٹی بھی اضافۂ ٹیکس کے خلاف ہے۔ بہرحال اس کشمکش میں سندھ کی وزارت ڈانواں ڈول ہو رہی ہے آیندہ اجلاس اسمبلی ہو تو اصلی کیفیت واضح ہو۔

صوبۂ سرحد میں وزیراعظم ڈاکٹر خاں صاحب بعض مروجہ قانون مثلاً پریس ایکٹ۔ قانون اسلحہ اور تعزیرات ہند اور ضابطہ فوجداری کی بعض دفعات کی منسوخ کرنیکے درپے ہیں۔ مگر گورنر صوبہ اس پر رضامند نہیں ہیں۔ چنانچہ اسوقت ان دونوں میں کشمکش ہورہی ہے۔

پنجاب میں سر سکندر حیات کی گورنمنٹ اپنے زوروں پر ہے۔ اسمبلی کے پچھلے اجلاس شملہ میں کئی قانون ایسے پیش ہوئے جنکی بابت پنجاب کی متعدد جماعتوں کو سخت اختلاف ہے۔ وزارت پریس ایکٹ کو بھی ترمیم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن صاحب وزیراعظم نے پریس کی استدعا پر مجوزہ ترمیمی قانون کو فی الحال

کچھ ماہ کیلئے ملتوی کردیا ہے۔ ساہوکاروں کے حلقے میں اسوقت بڑی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اور زمینداروں کے متعلق بھی جو نئے قوانین پاس ہورہے ہیں، اُن سے ہندو اور سکھ بہت مشکوک ہیں مگر سر سکندر حیات خان مخالفت کی چنداں پروا نہ کرتے ہوئے استقلال و مستعدی کے ساتھ اپنے پروگرام کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

صوبہ متوسط کی وزارت ایک عرصے سے متزلزل حالت میں تھی۔ وزیروں میں آپسمیں سخت اختلاف رائے تھا۔ مسٹر شریف کے استعفاء کے بعد معلوم ہوا کہ بقیہ وزراء میں صلح و صفائی ہوگئی ہے، مگر چند ہی دنوں کے بعد نئے جھگڑے پیدا ہوگئے اور وزراء میں اندر ہی اندر دو پارٹیاں بن گئیں۔ مسٹر پٹیل وغیرہ کے درمیان میں پڑنے سے بیچ منڈھی میں باہمی تصفیہ ہوا۔ مگر یہ بھی قائم نہ رہ سکا، اور ماتحت وزیروں اور ڈاکٹر کھرے وزیراعظم کے تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ جب وزیراعظم اپنی حسب مرضی وزارت میں کوئی رد و بدل نہ کرسکے، تو وہ اپنے بعض رفیقوں کے ساتھ اپنے عہدے سے مستعفی ہوگئے۔ اس پر گورنر صوبہ نے بقیہ وزراء سے بھی استعفے طلب کئے لیکن اُنھوں نے ورکنگ کمیٹی کی اجازت کے بغیر اپنی ذمہ واریوں سے دست بردار ہونیسے انکار کیا۔ جس پر ناچار گورنر نے اُن حضرات کو برخاست کرکے ڈاکٹر کھرے کو از سرِ نو وزارت مرتب کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ موصوف نے ایک نئی مجلسِ وزارت مرتب کی، جسمیں سابق کے وہ تینوں وزرا بھی شامل تھے جنھوں نے استعفاء میں اُن کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس کارروائی کو جو جمہوری آئین کے مغربی تصور کے عین مطابق تھی۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے پسند نہ کیا۔ بلکہ اس کے لئے وزیراعظم ڈاکٹر کھرے کو ہر طرح سے موردِ الزام ٹھہرا کر اُنھیں صوبہ کی پارلیمنٹری پارٹی کی لیڈری سے بھی معزول کردیا۔ مہاتما گاندھی نے بھی ڈاکٹر کھرے کے طرزِ عمل پر علانیہ اظہارِ ناپسندیدگی کیا اور گورنر صوبہ پر بھی اتہام لگایا کہ اُنھوں نے یہ کارروائی کانگریس کے وقار کو صدمہ پہونچانے کی غرض کی۔ حالانکہ گورنر نے جو کچھ کیا وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے عین مطابق اور بالکل درست تھا۔ بہرحال ڈاکٹر کھرے اِس فیصلے سے قدرتاً ملولِ خاطر ہوئے لیکن اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنیکے سوا انھیں اور کوئی تدبیر نظر نہ آئی۔ چنانچہ وزارت اور پارٹی کی لیڈری دونوں سے وہ علیحدہ ہوگئے اور اب اُن کی جگہ پنڈت روی شنکر شُکل کثرت رائے سے لیڈر منتخب ہوئے ہیں۔ وہی اب صوبہ متوسط کے وزیراعظم بھی ہوں گے۔ اُنکے ساتھی وزراء کے جو نام شائع ہوئے ہیں۔ اُنمیں وہ تین اصحاب بھی ہیں جنھوں نے ڈاکٹر کھرے کے کہنے سے استعفے داخل کرنیسے انکار کردیا تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ مجلسِ وزارت بالکل نئے سرے سے مرتب کیجاتی۔ اور پچھلے وزیروں کو اسمیں کوئی دخل نہ دیا جاتا بلکہ اکثر اہل الرائے اصحاب کی یہ رائے ہے کہ اِس موقعہ پر کانگریس کو مسٹر آپٹے کو وزارت کا بار سنبھالنے کی دعوت دینا چاہتے تھی لیکن ورکنگ کمیٹی نے کسی وجہ سے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ غیر کانگریسی حلقوں میں اِس فیصلے پر خوب لے دے ہورہی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ کانگریس کمیٹی نے ڈاکٹر کھرے کیساتھ بڑی زیادتی کی ہے، جسکا خمیازہ آگے چلکر بھگتنا پڑیگا۔ بہرحال آیندہ جو واقعات رونما ہوں گے وہ بھی سامنے آتے رہیں گے۔

علمی خبریں اور نوٹ

ریاست حیدرآباد دکن کے سررشتہ تالیف وترجمہ کے زیراہتمام ابتک قدیم وجدید علوم وفنوں کی تقریباً ڈھائی سو اُردو کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جوزیادہ تر ترجمے ہیں۔ اُن کے علاوہ بعض اور کتابیں بھی زیرتیاری ہیں۔ شائقین مفصل فہرست مسٹر محمد الیاس برنی ناظم سررشتہ تالیف وترجمہ حیدرآباد دکن سے طلب کرسکتے ہیں۔ سرکار دکن اب تک اِس محکمے پر تقریباً تیس لاکھ روپیہ خرچ کرچکی ہے۔

ریاست جے پور میں بھی لوگوں کو اُردو ادب سے خاصی دلچسپی ہے۔ پچھلے سال وہاں کے قدردانانِ ادب نے ڈاکٹر نذیر احمد کی صدسالہ سالگرہ کا جشن منایا تھا۔ اب ڈاکٹر اقبال مرحوم کی یادگار میں جے پور سے "اقبال" نامی ایک ہفتہ وار پرچہ جاری ہونے والا ہے۔ اُس کا پہلا نمبر خاص نمبر ہوگا جسمیں ڈاکٹر اقبال کی سوانحعمری اور شاعری پر خاص مضامین شائع کئے جائیں گے۔

آجکل حضرت سیماب اکبرآبادی کی تازہ ترین سیاسی اور قومی نظموں کا ایک قابل قدر مجموعہ "ساز وآہنگ" کے نام سے زیرطبع ہے۔ اُس کا حجم تقریباً دوسو صفحات ہے اور قیمت تین روپیہ تجویز کی گئی ہے۔

گراموفون کمپنی لیمٹیڈ ڈم ڈم نے حال میں ایک قابل قدر ادبی خدمت یہ انجام دی ہے کہ حضرت جوش، حضرت سیماب، حضرت تجود اور حضرت تاجور کے کلام کا خود اُنکی زبانی ایک قابل قدر ریکارڈ تیار کیا ہے۔ ہم نے اِس ریکارڈ کو سُنا ہے، واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جوش اپنا مشہور ومعروف پروگرام جو سب سے پہلے رسالہ زمانہ میں شائع ہوا تھا، سامنے کھڑے ہوئے خود اپنی زبان مبارک سے سُنا رہے ہیں۔ اِسی طرح حضرت سیماب، حضرت تجود اور حضرت تاجور کے شائقین کلام بھی اُنکی زبانی اشعار سُنکر لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ اِس ریکارڈ کا نمبر 9132. O M C ہے اور معمولی قیمت پر ہر گراموفون ریکارڈوں کے سوداگر سے مل سکتا ہے۔

پنجاب کے مایۂ ناز شاعر حضرت احسان بن دانش آجکل اپنی دلکش نظموں اور غزلوں کے دو مجموعے "نفیر فطرت" اور "نوائے کارگر" کے نام سے مرتب کررہے ہیں جو عنقریب ذیشان بکڈپو مزنگ لاہور کے اہتمام سے شائع ہوں گے۔ اُن کی مجموعی قیمت چھ روپیہ مقرر کی گئی ہے لیکن پیشگی رقم ارسال کرنیوالوں کو یہ قابل قدر مجموعے صرف پانچ روپے میں ملینگے۔

منشی ہرگوبند دیال صاحب نشتر ہنگامی کا مجموعۂ کلام "نشتر کدہ" کے نام سے دفتر "شاعر آگرہ" سے شائع ہوا ہے۔ اسکا مقدمہ مولانا سیماب اکبرآبادی نے لکھا ہے۔ حجم سوا تین سو صفحات اور قیمت ۲ روپیہ ہے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن صاحب شیروانی رئیس علیگڈھ نے انجمن ترقی اُردو کو ایک سال کیلئے پچاس ۵۰ روپیہ ماہوار اور مدراس کے مشہور ساہوکار سیٹھ جمال محمد صاحب نے انجمن مذکور کو گذشتہ اکتوبر سے پچھتر روپیہ ماہوار دینا منظور فرمایا ہے۔

اِس سال کی اوّل سہ ماہی میں پنجاب میں اُردو کی ایکسو نوے ۱۹۰ اور ہندی کی ۴۰۵ کتابیں شائع ہوئیں۔ صوبۂ متحدہ میں ہندی کے مقابلے میں اُردو مطبوعات کی تعداد عرصہ سے کم ہوتی چلی آرہی ہے چنانچہ یہاں جنوری لغایت مارچ ۱۹۳۶ء اُردو میں ۳۰۰ کتابیں اور ہندی کی ۵۳۶ کتابیں شائع ہوئیں۔ اُردو کتابیں زیادہ تر محض معمولی تالیفات یا اسکولی مطبوعات ہیں۔ بہرحال مذہب پر ۳۰ ، شاعری پر ۷ ، افسانہ و ڈراما کی پانچ ۵ ، زبان کی چوبیس ۲۴ ، قانون کی چار ۴ ، پالیٹکس کی تیس ۳۰ کتابیں چھپی ہیں پنجاب میں سات ۷ سوانح عمریاں ، چالیس ۴۰ افسانے ، پندرہ ۱۵ شعر و سخن کی کتابیں ، چار ۴ طب کی ، تیئس ۲۳ زبان کی اور چار ۴ پالیٹکس کی کتابیں شائع ہوئیں۔

زمانہ کی مالی حالت کا مفصل ذکر کرکے ہم اپنے ناظرین کو بے لطف کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن یہ ایک دل شکن حقیقت ہے کہ اتنے دنوں کی خدمتگذاری کے بعد بھی زمانہ کی آمدنی سے اُسکے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ چنانچہ پچھلے ڈیڑھ برس کا حساب یہ ہے کہ دو سال یعنی ۱۹۳۳ء و ۱۹۳۴ء میں رسالہ پر دو ہزار چار سو چھ روپیہ تیرہ آنہ کا خسارہ آیا۔ جو قریب قریب سب اخبار آزاد کی آمدنی سے پورا ہوا۔ لیکن اِس سال صوبے میں اشتہارات کی آمدنی میں عام طور سے کمی ہو رہی ہے جس سے کسیقدر تشویش ہے۔ رسالہ پر پچھلے نقصانات کا بار اِس کے علاوہ ہے اور ہم نے اُس کو کسی نہ کسی طرح روزمرہ حسابات سے علیحدہ کر دیا ہے مگر اس کے خمیازہ سے مفر نہیں ہے۔ بہرحال گذشتہ نقصانات سے قطع نظر زمانہ کی روزمرہ ضروریات اُسکی آمدنی ہی سے پوری ہونا چاہیئے۔ جس کے لئے تین چار سو نئے خریداروں کی اشد ضرورت ہے۔ اِس لئے ہم اپنے قدرشناس ناظرین سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں اُس کی توسیع اشاعت کی کوشش کرکے ہماری امداد کریں۔ ہم کو اُمید ہے کہ ہمارے قدردان اپنے علم دوست احباب سے زمانہ کی خریداری کی سفارش کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ زمانہ کی امداد کی ایک اور آسان صورت یہ ہے کہ ہمارے بہت سے احباب جنکی خدمت میں عرصہ سے رسالہ بلا قیمت حاضر ہو رہا ہے اور جو اُسے پسندیدہ نگاہوں سے بھی دیکھتے ہیں۔ از راہِ ہمدردی و ادب نوازی خود اُسکی خریداری منظور فرماکر کارخانہ کو شکریہ کا موقع دیں۔ اُن کو سال میں صرف ایک چھوٹی سی رقم دینا ہوگی لیکن زمانہ کے استحکام و تقویت میں اُن کی امداد بڑی کارآمد ہوگی۔

...مانہ کے پرانے فائل

...فتر ہذا میں ١٩٢٦ء سے پرانے فائل موجود ہیں۔
...کے تشنگانِ ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا
...دیم ترین اور مشہور رسالہ پینتیس ۳۵ سال سے اُردو زبان و
...کی کس قدر انہماک سے خدمت انجام دے رہا ہے۔
...کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے
...بڑے نقا... سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں
...انہ کے پرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے
...ل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی ہیں۔ خریدارو...
...ساتھ حسب ذیل رعایت کی جائے گی:۔

گیارہ سال کے مکمل کے خریدار سے ۲۵ روپیہ
چار سال کے خریدار سے فی فائل بحساب ۳ روپیہ
ایک سال کے خریدار سے ۳ روپیہ

...ٹ:۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہئے
١٩٢٦ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے اور ١٩٣٤ء
...نمبر کا پرچہ موجود نہیں ہے۔ ١٩٠٧ء سے ١٩٢٥ء
...مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں۔

...زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

واردات

...پریم چند کے تیرہ ١٣ افسانوں کا مجموعہ نہایت محدود
...میں شائع ہوا ہے۔ قیمت ایک روپیہ محصول علاوہ
...پتہ:۔ زمانہ بُک ایجنسی کان پور

یادگارِ پریم چند

(یعنی)

مشہور رسالہ زمانہ کانپور
کا
"پریم چند نمبر"

(جسمیں)

منشی پریم چند کی مفید زندگی اور اُنکی قابلِ قدر
تصانیف پر ہر ممکن پہلو سے
روشنی ڈالی گئی ہے

یادگارِ پریم چند میں چونتیس ۳۴ مضامین نثر اور تیرہ ۱۳
نظمیں ہیں۔ جو ملک کے ۴۵ مسلّم قابلیت کے منتخب
انشاپردازوں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

سوانحی حالات منشی پریم چند کے پرانے دوستوں اور
واقف کاروں نے لکھے ہیں۔ اور تنقیدی مضامین
اُردو کے منتخب انشاپردازوں نے تحریر کئے ہیں

خالص مضامین کا حجم ۲۵۶ صفحات ہے، ہاف ٹون عکسی تصاویر علاوہ
قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ محصول ڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ:۔ **منیجر زمانہ کان پور**

چند نئی کتابیں
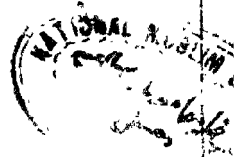
دِلّی کا سنبھالا:- از خواجہ محمد شفیع (دہلوی) مرحوم، دلّی کے ایام عروج کی مرقع نگاری، دِلّی کی اُس ٹکسالی زبان میں کی گئی ہے جواب نابُود ہے۔ انداز بیان ایسا مؤثر ہے کہ دل بے اختیار ہوجاتا ہے۔ قیمت مجلد عہ

لطائفِ غالب:- مسز ایم۔ اے شاہ، مرزا اسد اللہ خان غالب کی شوخیٔ بیان، خوش طبعی اور ظرافت سے محظوظ ہونے کے لئے اِسے ضرور پڑھئے قیمت ۱۳ر

شعلۂ طور (طبع ثانی) حضرت جگر مرادآبادی کے کلام کا مجموعہ بالکل نئی ترتیب۔ بہت کچھ تازہ کلام کا اضافہ قیمت بھی کم کردی گئی ہے یعنی [illegible]

سبدِ چین:- مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نایاب فارسی کلام کا مجموعہ جس میں اُن کے وہ فارسی قطعات ترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں، نظمیں، غزلیں اور رباعیات شامل ہیں جو اُنکی کلیات میں موجود نہیں ہیں مع مکمل سوانح حیات، قیمت ۸ر

[illegible] غالب:- مرزا غالب کی مختصر اور جامع لیکن مکمل اور مستند [illegible] سوانح عمری جس میں بہت سی نئی باتیں پیش کی گئی ہیں اور جو طلباء کیلئے خاص طور سے بہت مفید ہے۔ قیمت ۸ر

قرآن کیا ہے، اور اُس نے کیا کر دکھایا؟ از عبد الواحد سندھی اُستاد مدرسہ جامعہ، بچّوں کی نفسیات شعور اور استعداد کو مدِ نظر رکھکر تیار کی گئی ہے۔ مسلمان بچّوں کے لئے ابتک کوئی ایسی کتاب نہیں چھپی ہے قیمت [illegible]

دِلّی:- بچّوں کے لئے دِلّی کی خاص خاص عمارتوں کا دلچسپ بیان جن کے پردے میں دہلی کی مختصر تاریخ بتا دی گئی ہے۔ بلاک کی چھ تصاویر، دو نقشے۔ قیمت صرف ۴ر

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جامعہ دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور

جلد ۷۱ نمبر ۲ | مرتبہ دیا نراین نگم بی۔ اے۔ | اگست ۱۹۳۸ء

فہرست

(۱) تھانیسر کی لڑائی
از ایڈیٹر ۶۹
(۲) فطرت (زر) نظم
حضرت احسان دانش کاندھلوی ۷۶
(۳) ہماری زبان
جناب سہیل عظیم آبادی ۸۰
(۴) ہندوستان سے خطاب (نظم)
حضرت محمود اسرائیلی ۸۴
(۵) مضارع فارسی
مسٹر سلیم جعفر ۸۵
(۶) کلام فراق (نظم)
پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے ... ۸۶
(۷) شاعری میں وزن کی اہمیت
کسری منہاس صاحب ایڈیٹر "ساربان" ۹۱
(۸) ہلدی گھاٹ (نظم)
پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم۔ اے ۹۵
(۹) امیر مینائی
منشی دیبی پرشاد سرویا ستو منشی فاضل ... ۹۶
(۱۰) اندر دیوتا (نظم)
ترجمہ سید مقبول حسین احمد پوری بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی ۱۰۴
(۱۱) پس پردہ (قصہ)
ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ ۱۰۷
(۱۲) حقیقت دل (نظم)
منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی ۱۱۲
(۱۳) سر تیج بہادر سپرو / سر لبھیشور ناتھ سریواستوا مرحوم ۱۱۸
(۱۴) تنقید کتب
(اسٹینڈرڈ ڈکشنری۔ ناول الور۔ دہلی) ۱۲۳
(۱۵) رفتار زمانہ ۱۲۹
(۱۶) علمی خبریں اور نوٹ ۱۳۲

فی پرچہ سات آنہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | قیمت سالانہ پانچ روپیہ

زمانہ کے پُرانے فائل

دفتر ہٰذا میں ۱۹۲۶ء سے پُرانے فائل موجود ہیں، زمانہ کے تشنگانِ ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ پینتیس ۳۵ سال سے اُردو زبان و ادب کی کسقدر انہماک و سرگرمی سے خدمت کر رہا ہے۔ اِس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں، ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پُرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں کیساتھ حسب ذیل رعایت کی جائیگی:-

۱۔ گیارہ ۱۱ سال کے سٹ کے خریدار سے مبلغ ۲۵ روپیہ

۲۔ چار ۴ سال کے خریدار سے تین روپیہ فی فائل سالانہ

۳۔ ایک سال کے خریدار سے ۳ علاوہ محصول

نوٹ:- آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہیئے۔ فائل ۱۹۲۸ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے ۱۹۳۲ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے

مینجر زمانہ کانپور سے طلب فرمائیے

واردات

منشی پریم چند مرحوم کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ نہایت محدود تعداد میں شائع ہوا ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصول

ملنے کا پتہ:- **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

FEVER AND QUININE, YESTERDAY AND TODAY.

بخار اور کونین کا ماضی و حال

قرنہا قرن سے بخار انسان کیلئے ہمیشہ ایک عذاب رہا ہے۔ چنانچہ عہد نامہ قدیم وجدید دونوں کے مختلف نسخوں میں "بخار" کا لفظ آتا ہے۔ اگر ہم اس واقعہ کو ملک کی قدرتی حالت سے ملاکر دیکھیں، جہاں دلدلوں اور مچھروں کی کثرت ہے اور آب وہوا بھی گرم ہے، تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان مقدس کتابوں میں جہاں جہاں "بخار" کا لفظ آیا ہے، وہاں زیادہ تر اس سے "ملیریا" ہی مراد ہے۔

اور ہم یہ بات بھی وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں بہت سے ملکوں میں ملیریا موجود تھا کیونکہ بہت سے مشہور آدمیوں نے جو اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے، اس واقعہ کا کسی نہ کسی صورت میں ذکر کیا ہے۔

جرمنی کے مشہور ومعروف مصور Albrecht Dürer (1471-1528) کو جب وہ ہالینڈ کے صوبہ زیلینڈ میں مقیم تھا، ملیریا ہوگیا تھا۔

شہر برمین کے عجائب خانہ میں خود اس مصور اعظم کے ہاتھ کا موقلم اور سیاہی سے کھنچا ہوا اپنا ایک ذاتی خاکہ موجود ہے۔ جسمیں وہ ایک دست وسر بریدہ اور برہنہ انسانی بت کی طرف اس جگہ اشارہ کر رہا ہے جہاں تلی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسمیں درد کا مقام ایک زرد نقطہ سے دکھایا گیا ہے۔ اس خاکہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"جس جگہ زرد نقطہ ہے یہی وہ مقام ہے جہاں میرے بھی درد ہوتا ہے۔"

وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ ۱۴ اپریل سے ۲۱ اپریل ۱۵۲۱ء تک مجھے بخار کا سخت دورہ پڑا جس کا نتیجہ دردسر، سخت کمزوری اور سستی کی صورت میں نمودار ہوا۔ اپنے ایک خط مورخہ ۴ ستمبر ۱۵۲۵ء میں وہ شہزادہ البرٹ شہر مینس کے الکٹر کو لکھتا ہے کہ "امسال میں اپنا پارسل ہز ہائنس کی خدمت میں قبل از وقت بھیجنے کا انتظام کر رہا ہوں، تاکہ میری بیماری کہیں پھر عود نہ کر آئے۔"

مندرجہ بالا عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ Dürer کو پہلے ہی بیمار ہوجانے کا خوف تھا۔ اور اس کا وہ بخار خاص فصل میں ہوا کرتا تھا۔ پس بخار کے بعد اسے لاغری لاحق ہوئی، اور اس مشہور مصور کی موت بھی قبل از وقت واقع ہوئی۔ یہ سب باتیں ملیریا کا قدرتی نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

مشہور اور ہردلعزیز ولندیزی شاعر "فادر" کیٹس نے (جو ۱۵۷۷ء - ۱۶۶۰ء میں تھا) اپنی کتاب "ایک بیاسی برس کے بوڑھے کی سوانحعمری" میں بخار کی شکایت لکھی ہے (یہ بھی غالباً ملیریا ہی تھا) اگر اسے کونین کا حال معلوم ہوتا تو وہ یقیناً ذیل کے شکایت نامہ کے بجائے شکریہ کا قصیدہ لکھتا۔ بحالت موجودہ وہ لکھتا ہے کہ

"یہاں مجھے بخار نے غیر متوقع آ دبوچا ہے،
بخار ہے کہ ایک عذاب شدید، جس نے تین دن میں مجھے پھر صاحب فراش بنادیا ہے اور میرے قلب تک پہونچ گیا ہے۔
میں نے ایک فاضل بزرگ کو بلایا جو میرے خیال میں جڑی بوٹیوں کے خواص سے بخوبی واقف تھا۔
اس نے سات ماہ تک پینے کے لئے جوشاندہ تجویز کیا۔
مگر افسوس! کہ پُر عذاب مرض اپنا اثر دکھاتا رہا۔
ڈاکٹر نے ہرچند کوشش کی اور مختلف دوائیں آزماکر دیکھیں،
مگر وہ بیچارہ بیماری پہ غالب نہ آسکا۔ معلوم ہوتا تھا کہ
مرض اس سے اور اس کی دواؤں کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔"

اس زمانہ سے اب تین صدیاں گذر چکی ہیں۔ اور اب ہم اس قابل ہوگئے ہیں کہ پوری ذمہ داری کے ساتھ واضح طور پر بتا سکیں کہ اس بلائے عظیم پر کس طرح غالب آیا جاسکتا ہے۔

لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن نے سفارش کی ہے کہ جس شخص کو ملیریا ہوجائے وہ پانچ سات روز تک پندرہ بیس گرین کونین روز استعمال کرے۔ اس کے بعد پھر کسی دوا کھانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر مرض عود کر آئے تو پھر وہی علاج کیا جائے

زمانہ بک ایجنسی کی قابلِ دید بے مثل کتابیں

محمد بہادر شاہ ظفر۔ خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ، از منشی محمد امیر احمد علوی بی۔اے۔ اِس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں، جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ مجلد عہ

کمالِ داغ۔ حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب مع مقدمہ تنقیدی، مرتبہ مولانا حامد حسن صاحب قادری۔ اُردو غزل گوئی پر جدید زاویۂ نگاہ سے تنقید کرکے تغزل کے قدیم و جدید محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اِس کتاب میں داغ مرحوم کے دیوان گلزارِ داغ، آفتابِ داغ، مہتابِ داغ اور یادگارِ داغ کا بہترین انتخاب ہے۔ قیمت مجلد عہ

نقش و نگار۔ شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی کیف آور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ نہایت خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور۔ قیمت ۲؎

فکر و نشاط۔ حضرت جوش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے جو حال ہی میں جامعہ ملیہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ عمدہ لکھائی چھپائی۔ بہترین جلد۔ قیمت مجلد عہ

انتخابِ حسرت۔ مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا سیر حاصل انتخاب اور اُس پر حضرت جلیل قدوائی کے قلم کا لکھا ہوا فاضلانہ مقدمہ۔ قیمت عہ

رامائن مسدس۔ مصنفہ جناب منشی راجی مل کپور۔ مصنف نے سری رامچندر کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز میں بیان کیا ہے۔ ہر شعر چلتا ہوا جادو ہے۔ لطفِ محاکات و بلند پروازیٔ تخیل قابلِ تحسین ہے۔ قیمت مجلد باتصویر ۱۲؎۔ مجلد بلاتصویر ۱۲؎۔ غیر مجلد بلا تصویر عہ

نقش و نگار۔ مسٹر جلیل قدوائی کی دلآویز اور پُرلطف نظموں کا مجموعہ، جو ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے۔ قیمت عہ

خیالاتِ عزیز۔ مجموعہ مضامین مولوی عزیز احمد صاحب، جسکی باضابطہ رجسٹری کی گئی ہے۔ حجم دو سَو صفحات۔ ٹائٹل خوشنما رنگین، لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویرِ مصنف۔ قیمت مجلد عہ۔ غیر مجلد عہ

ہندو تیوہاروں کی اصلیت۔ اِس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور اُنکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اُس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی نظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اُردو ایڈیشن کی قیمت ۹ اور ہندی ایڈیشن کی قیمت جسمیں اُردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔ عہ

فلسفۂ جنگ۔ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفۂ جنگ پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے، ۱۲؎

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

بہارِ سخن - پانسو چھیاسٹھ ہند و شعراء ماضی و حال کا نفیس تذکرہ ہے جسمیں ۵۶۶ شعراء کے حالات، انتخاب کلام بترتیب حرف تہجی درج کیا گیا ہے۔ قیمت عمار

نصائح چانکیہ - یعنی ناموَر ہند چانکیہ کے مشہور و معروف نیتی کا ترجمہ از پنڈت ہنمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام - قیمت ۶ر

طریقِ دولتمندی - دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں، اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں۔ ہر شخص کیلئے قابل خرید ہے۔ قیمت ۵ر

ترجمہ رامائن منظوم - بال کانڈ کے اصلی دوہے اور چوپائیاں ہندی، ترجمہ اُردو اشعار میں، مترجمہ منشی سورج پرشاد تصور - قیمت عہ

پریم بتیسی - یعنی اُردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند بی - اے مرحوم کے بہترین قصوں کا مجموعہ عہ

دُنیائے راز - مولانا ابوالفضل آزؔ چاندپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف - ۱۰ر

خیالاتِ مہاتما گاندھی - یہ وہ لاجواب کتاب ہے جسمیں مسٹر سی - ایف اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کے مذہبی سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کے ساتھ درج کرکے دُنیا پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ قیمت حصہ اول ۱۲ر حصہ دوم عہ

اثرستان - ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی کا دیوان، جس کا ہر مصرع تیر و نشتر ہے - قیمت عہ

حسن بن صباح - ملک کے شہرہ آفاق مصنف، مولانا شررؔ مرحوم کی تصنیف ہے، اسمیں حسن بن صباح (جو فرقہ اسمٰعیلیہ کا زبردست رکن تھا) کے دلچسپ حالات درج ہیں۔

سرمایۂ تسکین - حضرت تسکین سہارنپوری کے کلام کا دلکش مجموعہ ہے، جو عام طور پر مقبول عام کی سند حاصل کرچکا ہے - قیمت ۴ر

حدیثِ حسن - جواں سال ادیب حضرت شمیم احمد فطرت کی دلکش و دلآویز نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے قیمت عہ

شریمد بھاگوت گیتا - یعنی کرم یوگ شاستر المعروف بہ غذائے روح باتصویر، مترجمہ پنڈت پربھو دیال مصر عاشق لکھنوی - قیمت عہ

اُردو مضمون نویسی - مضمون لکھنے کے متعلق پروفیسر نانک پرشاد بی - اے مرحوم کی نہایت عمدہ کتاب ہے - اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے - قیمت صرف ۸ر

مثنوی سحر - یعنی شکنتلا اور دشینت کا اُردو ترجمہ حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز، دوسرا ایڈیشن جسکی مصنف نے نظرثانی کی ہے - قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ :- زمانہ بک ایجنسی کانپور

سدھا سندھو
فہرست مفت
کف کھانسی۔ ہیضہ۔
دمہ پیچش بات قے وغیرہ امراض
کی بہترین اور خوش ذائقہ دوا ہے
سکھ سنچارک کمپنی متھرا

زمانہ

جلد ۷۱ اگست ۱۹۳۸ء نمبر ۲

تھانیسر کی لڑائی اور اُس کے اثرات[1]

(از ایڈیٹر)

دنیا میں ہمیشہ سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن بعض ایسی اہم اور زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں جن کی بدولت ملکوں اور قوموں کی قسمت ہی پلٹ گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اِسی قسم کی لڑائی بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں تھانیسر میں ہوئی تھی جس نے اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت کا چراغ سدا کے لئے گُل کر دیا۔ اور مسلمانوں کے قدم صدیوں کے لئے یہاں مضبوطی سے جما دیئے۔ یوں تو ہندوستان کی دولت اور جہاد کے شوق نے ساتویں صدی کے وسط ہی سے مسلمانوں کو ہندوستان میں دعوتِ عمل دے رکھی تھی۔ اور ایران کی فتح نے اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لئے راستہ بھی کھول دیا تھا۔ لیکن تھانیسر کی لڑائی کے پہلے صرف دو ہی واقعات ایسے قابل ذکر ہوئے جن کا اثر اس ملک کے تاریخ پر پڑا۔ ان میں پہلا محمد بن قاسم کا حملہ ہے جس نے ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے ہندوستان میں پہلی مسلمان حکومت قائم کی۔ لیکن اس حملہ کا اثر فقط سندھ تک محدود رہا اور ہندوستان خاص پر کچھ اثر محسوس نہ ہوا۔ دوسرا واقعہ محمود غزنوی کے پے در پے حملوں کا ہے۔ مگر یہ بھی بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں کی طرح آئے اور نکل گئے اور ان کا اثر صرف پنجاب تک محدود رہا۔ کیونکہ محمود کی وفات کے بعد چند ہی سال بعد ہندوؤں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا اور دلّی میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی۔ مگر محمود غزنوی نے درۂ خیبر کا راستہ از سرِ نو کھول کر آئندہ مسلمان حملہ آوروں کے لئے اِس ملک میں داخل

[1] [illegible]

ہونے کی یقینی راہ دکھادی دراصل یہی ہندوستان کا پہلا پھاٹک ہے۔

محمد بن قاسم غلط راستے سے ہندوستان آیا اور سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستانوں نے اُسے ہندوستان خاص تک پہونچنے نہ دیا۔ محمود غزنوی درۂ خیبر سے آیا جس کی بدولت آسانی سے پنجاب میں داخل ہوکر سرہند تک پہونچ گیا۔ جو ہندوستان کے اندرونی قلعہ کا اصلی پھاٹک ہے۔ ہندوستان کی تمام فیصلہ کن اور تاریخی لڑائیاں اسی سرزمین میں ہوئی ہیں۔ دہلی کی تاریخی اہمیت کی بھی یہی وجہ ہے۔ جس کے بدولت اکثر سلطنتوں نے اُسے اپنا پایہ تخت بنایا۔

تھانیسر اسی علاقہ کا ایک تاریخی مقام ہے جو راجہ ہرش کے باپ راجہ پربھاکر وردھن کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ ہرش کے لاولد وجوانمرگ بھنوئی کے بعد جب اس کی بہن شوہر کے غم میں اپنا راج پاٹ چھوڑ کر بودھ مت کی بھکشنی ہوگئی، اور قنوج کی رعایا نے ہرش کو اپنا راجہ انتخاب کیا تو اس نے بھی تھانیسر چھوڑ کر قنوج کو اپنا دارالسلطنت بنالیا۔ مگر تھانیسر کی جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ پر قائم رہی اور آگے چلکر اُس نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ ہمیشہ کے لئے پلٹ دیا۔

تھانیسر کی لڑائی ۱۱۹۱ء میں محمد غوری اور پرتھی راج کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد ملک میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہوگئی اور وہ مستقل طور پر ہندوستان میں آباد ہوگئے۔ اس لڑائی کے بعد پھر ہندوؤں کو ہندوستان میں حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔

دکن میں وجے نگر کی سلطنت ایک بجھنے والے شعلہ کی آخری بھڑک تھی اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں کا عروج بھی محض چندروزہ تھا۔ جسے ایک طرف احمد شاہ ابدالی نے اور دوسری طرف انگریزوں نے کچل دیا۔ سیاسی حیثیت سے قطع نظر تھانیسر کی لڑائی کا ملک کے مذہب۔ معاشرت اور کلچر پر دائمی اثر پڑا۔ اور اسکا پولیٹیکل اثر لگ بھگ سات صدی تک باقی رہا۔

اُس وقت ہندوستان میں کئی طاقتور راجپوت خاندانوں کی حکومت قائم تھی، جن میں قنوج کے راٹھور اور دہلی کے چوہان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوہان دہلی اور اجمیر کے حکمران تھے۔ راٹھوروں کی حکومت قنوج کے گرد و نواح میں تھی۔ مگر چوہانوں کا عروج سب سے بڑھا ہوا تھا اور پرتھی راج کی بہادری کا سکہ ہندوستان بھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھانیسر کے متصل ہی ترائن کی پہلی لڑائی میں پرتھی راج محمد غوری کو شکست فاش دے چکا تھا جس سے اس کا رتبہ تمام ہندو راجوں میں اونچا ہوگیا تھا۔ لیکن غوری کے دل میں شکست کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔ اور ۱۱۹۲ء میں وہ اسی میدان میں

ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ جس میں ترک افغان اور دیگر دلاور جنگجو شامل تھے، اپنی شکست کا بدلہ لینے آیا۔ اُس وقت پنجاب میں ترکوں کی حکومت قائم تھی اور لاہور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اس لئے عرب راجپوتوں پر تھانیسر ہی کے میدان میں حملہ کر سکتے تھے۔ پرتھی راج متعدد راجاؤں اور بیشمار بہادروں کے ہمراہ تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی لیکر تراین کے میدان میں تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر مقابلہ کے لئے آ ڈٹا۔ مگر اس بار راجپوتوں کی بہادری کام نہ آئی اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی۔ راجپوت بہادری اور چال بازی میں کسی سے کم نہ تھے، مگر اُنھوں نے پچھلے تجربہ سے کچھ فائدہ نہ اُٹھایا، اور وہ تمام غلطیاں دُہرائیں جن کی وجہ سے وہ پہلے بھی مسلمان حملہ آوروں کے مقابلہ میں ہار چکے تھے۔ ان دنوں فریقین کا دارومدار سواروں پر تھا، لیکن ہندو سرداروں کو یہ گر معلوم نہ تھا کہ تیزی سے نقل وحرکت کرنے والے سواروں کے پے در پے حملے ایک جگہ پر کھڑی ہوئی کثیر فوج کو پراگندہ کر سکتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتے پر جب ہندو سواروں نے مسلمان سواروں کے پہلے حملے کو کامیابی سے روک لیا تو محمد غوری یہ ترکیب چلا کہ اُس نے اپنی فوج کے درمیانی حصے کو چھوڑ کر بقیہ فوج کے چار حصے کرکے چاروں طرف سے راجپوتوں پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ یہ سوار راجپوتوں پر حملہ کرکے فوراً پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اس طرح تمام دن میدان کارزار گرم رہا۔ آخر کار جب راجپوت لڑتے لڑتے تھک گئے تو خود محمد غوری بارہ ہزار چیدہ اور تازہ دم سواروں و تیراندازوں کو ساتھ لے کر اُن پر ٹوٹ پڑا۔ راجپوت دل کھول کر لڑے مگر وہ تھکے ہوئے تھے آخر اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ پرتھی راج میدان سے بھاگ کھڑا ہوا لیکن قلعہ سرستی کے قریب گرفتار ہوکر قتل کر دیا گیا۔

یہ خیال صحیح ہے کہ اگرچہ چندوالی قنوج اس لڑائی میں پرتھی راج کا ساتھ دیتا جو اس وقت صرف اپنی ہی نہیں بلکہ تمام راجپوتوں کی طرف سے لڑ رہا تھا تو راجپوتوں کو یہ روز بد دکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات جے چند کے ماتھے پر ہمیشہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ بنی رہیگی کہ اُس نے ذاتی عداوت یا پولیٹیکل رقابت سے متاثر ہوکر اس کڑی مصیبت کے وقت اپنے ملکی یا قومی آن کا کوئی خیال نہ کیا اور گو اُس کی سلطنت پرتھی راج کی حکومت سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقتور تھی لیکن اُس نے ملک کی حفاظت کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اگر وہ پوری قوت سے پرتھی راج کا ساتھ دیتا تو ترک اس قدر آسانی کے ساتھ ہندوستان پر قبضہ نہ کر سکتے۔ مگر شدنی اٹل ہے۔ شروع سے لیکر ابتک ہندوستان اپنی پھوٹ ہی کی وجہ سے برباد ہوتا چلا آیا ہے۔ جے چند بھی اس قومی غداری کے بعد بہت دنوں تک چین سے نہ بیٹھنے پایا پرتھی راج کی شکست کے دو ہی سال بعد اُس کی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد راجپوت وقتاً فوقتاً

مسلمانوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن دہلی اور قنوج کی ریاستوں کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان میں ترکوں کے سیلاب کو روکنے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی۔ ہانسی اور اجمیر کی ریاستیں بھی آسانی سے فتح ہوگئیں، اور سلطان محمد غوری قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا نائب مقرر کرکے غزنی واپس چلا گیا۔

یہاں پر اُس زمانہ کے سماجک حالات کا مختصر بیان بیجا نہ ہوگا۔ ذات پات کی بندشوں نے اُس وقت کے ہندوؤں کو پوری مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ برہمن سب سے اونچے مانے جاتے تھے، حتیٰ کہ وہ موت کی سزا سے بھی مستثنیٰ تھے۔ راجپوتوں کا درجہ بھی چنداں کم نہ تھا۔ اُن کی بہادری بے نظیر تھی، اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کر جان بچانے سے وہیں جان دیدینا کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن مصائب و حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا اُن میں مادّہ نہ تھا۔ ذاتی شان اور خاندانی آن کے لئے وہ ہر وقت مرمٹنے کو تیار رہتے تھے لیکن مجموعی حیثیت سے دیس یا دھرم کی حفاظت و ترقی کا اُنھیں چنداں خیال نہ تھا۔ اور جتنا اُنھیں اپنی بات کا لحاظ اور اپنی عزت کا پاس تھا، اُس کا آٹھواں دسواں حصّہ بھی ملک کی شان یا قوم کی حفاظت کا لحاظ نہ تھا۔ عورتوں کی حالت محکومیت کی تھی۔ بیواؤں کو دوبارہ شادی کا اختیار نہ تھا، ستی اور جوہر کا عام رواج تھا۔ دختر کُشی بھی عیب نہ تھی، کم سنی میں شادی کردی جاتی تھی۔

ملک کی مالی حالت اچھی اور تجارت ترقی پر تھی۔ علم و ادب کا عام چرچا تھا اور راجپوت راجوں رئیسوں کو اس سے بڑی دلچسپی تھی، اور وہ پنڈتوں اور ودوانوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کئی حکمران خود بھی شاعر و مصنف تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ملک میں کوئی نظام یا سنگٹھن نہ تھا اور نہ عوام کی منتشر طاقتوں کے شیرازہ بندی کی کوئی صورت تھی۔ باہمی رقابتوں اور روزمرہ خانہ جنگیوں نے ملک کو کمزور کردیا تھا۔

تھانیسر کی لڑائی کے پہلے ہی سے بودھ مت کی جگہ شیومت اور وشنو دھرم نے لے لی تھی جس کو بھگتی کی مذہبی تحریک سے بڑی تقویت پہونچ چکی تھی۔ ملک میں ہزاروں مندر اور شوالے بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی فتوحات نے اس سوشل نظام کو تہ و بالا کردیا اور ہندو مذہب، ہندو لٹریچر اور ہندو کلچر سب کو ان سے بڑا دھکّا پہونچا۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے مندر توڑ کر مسجدیں بن گئیں اور بیشمار ہندو مسلمان ہوگئے۔ لیکن یہ سب تبدیلیاں سطحی تھیں۔ ملک کے نظم و نسق کے لئے مسلمان حکمرانوں کو ہندو ملازموں ہی کو رکھنا پڑتا تھا۔ اس لئے سلطنت میں انقلاب

ہو جانے کے باوجود، مال گذاری کی تحصیل وصول اور عدالتوں کا کام تعمیرات اور دیگر سول محکمے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے جو عمارتیں بنوائیں اُن میں ہندو کاریگر ہی کام کرتے تھے، ہندو سُنار اُن کے سکّے ڈھالتے اور ہندو پنڈت دھرم شاستر کے متعلق انھیں مشورے دیتے تھے۔

تھانیسر کی لڑائی کے بعد مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہو گئے جس کا ملک کی تاریخ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایک جگہ سکونت رکھنے کے بعد ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے سے کیسے بے اثر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا یہ اثر ہوا کہ دونوں نے ایسا طریق زندگی اختیار کر لیا جو نہ خالص ہندو تھا اور نہ خالص مسلم۔ بلکہ جو دونوں کا مشترکہ اور مجموعی کلچر تھا جسے ہم "ہندو مسلم کلچر" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں اور جس میں ہندو مسلمان دونوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

اس نئے طرز معاشرت میں ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو لٹریچر اور سائینس نے مسلم عناصر کو کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ خود ہندو کلچر کی ماہیت تبدیل ہو گئی۔ اسی طرح ہندو مسلم تصادم سے مسلم کلچر، مسلم آرٹ اور خود اسلام نے ہندوستان میں ایک نئی شکل اختیار کر لی۔

ہندو مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقائد میں توحید کا خیال جو عرصہ سے سُست پڑ گیا تھا پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزیں ہو گیا۔ پُورانک ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے، اور گو شروع ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادر مطلق پرمیشور کا خیال موجود ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کو کمزور کر کے اُسے بالکل پس پُشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان آ کر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا، جس کا عام خیالات پر بہت بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیمات میں اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقائد عمداً ترک کر دیے اور اُن کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا اُن کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے۔ اس مذہبی اصلاح کی سب سے نمایاں مثال کبیر اور گورو نانک کی تعلیمات میں ملتی ہے اسی سلسلہ میں ریداس، دادو، مُلوک داس، اور بہت سے دوسرے روحانی پیشواؤں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلم صوفیوں نے بھی جو محمد بن قاسم کے وقت سے سندھ آ کر ہندوستان کے بہت سے مقامات میں پہونچ گئے تھے بعض ہندو عقائد قبول کر لئے۔

اس وقت کی تعمیرات میں بھی اس مشترکہ کلچر کا اثر بخوبی نمایاں ہے۔ اس زمانہ کی ہندو عمارتیں بھی خالص ہندو طرز

کی نہیں ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نئے اسٹائل نے جو نہ خالص ہندو ہے اور نہ خالص مُسلم۔ پُرانے طرز کی جگہ لے لی ہے۔ اسی طرح مسلم تعمیرات میں صاف طور پر ہندو اثر نظر آرہا ہے یہ ضرور ہے کہ مسلم تعمیرات میں ایرانی اور عربی طرز تعمیرات کے چند پہلو اب بھی قائم رہے، لیکن جب یہ پہلو ہندو طرز تعمیر میں شامل ہو گئے تو ایک نیا اسٹائل پیدا ہو گیا جس میں ہندو تعمیر کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہے۔ اس نئے اور متحدہ اسٹائل میں اگر ایک طرف مسلم طرز تعمیر کی سادگی باقی نہ رہی تو دوسری طرف ہندوؤں کے شوقِ آرائش و سجاوٹ میں بھی بہت کمی ہو گئی۔ ہندو صناعی کی عام وضع قطع (جنرل ڈیزائن) اس کی سجاوٹ اور پُرکاری تو قائم رہی لیکن اس پر مخروطی محراب اور سادہ گنبد اور ہموار دیواروں کے جو پیوند لگ گئے وہ مسلم فنِ تعمیر کے خاص جزو تھے۔ اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس زمانہ کی ہندو مسلم تعمیرات دراصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن میں چند ظاہری اختلافات کے باوجود معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ہندو مسلم کلچر کا اثر تعمیرات سے کہیں زیادہ تصوری میں پایا جاتا ہے، چنانچہ مغل اور راجپوت مصوری ایک ہی آرٹ کے دو مختلف نمونے ہیں اور راجپوت مصوری اجنٹا کے فنِ تصویر سے بہت دُور مگر مغل مصوری کے بہت قریب ہے۔ دراصل مغل اور راجپوت مصوری کا فرق محض سطحی ہے۔ راجپوت آرٹ میں راگ راگنیوں اور ناٹکوں کی تصویروں میں جو عورتیں بنائی گئی ہیں وہ شکل و صورت سے تو راجپوت ہیں لیکن ان کا لباس اور ان کی نشست ایرانی ہے۔ اس طرح نیا آرٹ خالص ہندو یا خالص مسلم آرٹ سے بالکل جداگانہ ہے، اور اس کو فقط "ہندو مسلم آرٹ" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ نئے طرز میں اجنٹا کے آرٹ کے لوچ اور نرمی کے ساتھ ساتھ سمرقند اور ہرات کا تناسب اور وصل و فصل بھی موجود ہے، اور انواع و اقسام کے رنگوں کے حیرت انگیز شوخی اور اُن کی آمیزش نے باریک خطوط کے ساتھ ملکر ایک نیا حُسن پیدا کر دیا ہے۔

نئے ہندو مسلم کلچر کا اثر دیسی لٹریچر اور دیسی زبانوں پر بھی پڑا۔ مسلم فتوحات کے بعد سنسکرت کا زمانہ تو بالکل ختم ہو گیا، اور اس کی جگہ اظہار خیال کے لئے ہندی۔ مرہٹی۔ بنگالی، گجراتی زبانیں وجود میں آئیں مسلمانوں نے بھی ترکی۔ فارسی ترک کر کے دیسی زبان اختیار کی، اور اس طرح ایک نئی زبان یعنی اُردو یا ہندوستانی پیدا ہوئی۔ ہندی زبان پر بھی مسلم اثرات کے گہرے نقوش ہیں۔ الفاظ۔ گرامر۔ تشبیہات اور طرز تحریر سب پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ یہی بات مرہٹی۔ پنجابی اور سندھی وغیرہ زبانوں پر صادق آتی ہے۔ امیر خسرو کی خالق باری اسی اثر کا خوشگوار نتیجہ ہے۔ قطب الدین ایبک کا خطاب "لاکھ بخش" ان دونوں زبانوں کے میل جول کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اہلِ عرب بہت دنوں پہلے ہندو علم حساب اور ہندو فنِ طب کے مرہونِ منت ہو چکے تھے لیکن عربوں نے یونان سے بھی اپنے علم میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس لئے وہ ان صیغوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ اُن کی نئی معلومات سے ہندوؤں کو بہت فائدہ پہونچا۔ ہندو ریاضی دانوں نے کئی اصطلاحات مسلمانوں سے مستعار لئے اور کئی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ مثلاً علم ہیئت میں تاجک کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا۔ دوا سازی کی کئی خاص ترکیبیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں۔ فن کاغذ سازی بھی مسلمانوں نے چین سے حاصل کرکے ہندوستان میں رائج کیا۔

ہندو موسیقی پر بھی اس اتحاد کا غیر معمولی اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں کی قدیم راگ راگنیاں تو قبول کرلیں لیکن آلات موسیقی میں بہت کچھ ردّو بدل کیا جو آج تک رائج ہے۔ چنانچہ یہاں کے پکھاوج اور مردنگ کی جگہ طبلہ بن گیا اور بین کی جگہ ستار نے لے لی۔

لباس۔ رسمیات۔ آداب محفل۔ غذا۔ کھانا پکانا سب پر مسلمانی تہذیب و معاشرت کا گہرا اثر پڑا موجودہ حلوائی کی دُکان تو شروع سے آخر تک مسلمانوں کی رہینِ منت ہے۔ خود حلوائی کا لفظ اور اکثر مروجہ مٹھائیاں گلاب جامن۔ بالوشاہی۔ امرتی وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کا تحفہ ہیں۔ روٹی بھی ترکی زبان کا لفظ ہے۔ تمچہ۔ توا وغیرہ معمولی الفاظ بھی مسلمانوں کی بدولت رائج ہوئے ہیں۔ چاچا۔ چاچی۔ دادا۔ دادی۔ جیجا۔ ججی۔ سب غیر ملکی الفاظ ہیں جو اب ہماری روزمرہ زندگی کا ضروری جزو بن گئے ہیں۔ اماں کا لفظ بھی ہم کو ترکوں سے ملا ہے۔ ہمارا موجودہ درزی خانہ بھی مسلمانوں کا رہینِ منت ہے۔

غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ مسلم اثر سے خالی نہ رہا۔ اور ہندوؤں نے جن کی احتیاط اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ضرب المثل ہے دانستہ یا نادانستہ مسلمانوں کی معاشرت اور زندگی کے طور طریقوں کو بالکل اپنا لیا مسلمان بھی ہندو تہذیب و ہندو تمدن سے شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے۔ آجکل کے ناواقف مسلمان شاید یہ سنکر تعجب کریں کہ تھانیسر کے فاتح محمد غوری نے عرصہ تک پرتھی راج کے سکّوں کا سانچہ قائم رکھا۔ اس کے سکّوں کی پشت پر لکشمی جی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ بلبن پہلا ترک حکمران تھا جس نے عربی طرز کے سکّے رائج کئے۔

ہندوستان کو مسلمانوں کی آمد سے ایک اور بہت بڑا فائدہ یہ پہونچا کہ آٹھویں صدی عیسوی میں بدھ دھرم کے زوال کے بعد صدیوں تک اس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس تعلق کو از سرِ نو جاری کیا چنانچہ یورپ کی نئی ایجادات ترکوں ہی کے ذریعہ ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ بارود کو سب سے پہلے ہندوستان میں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی میں استعمال کیا۔ اس طرح تھانیسر کی لڑائی نے ہندوؤں کا عروج ختم کرنے کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی جو آج تک ہماری زندگی پر حاوی ہے اور آئندہ بھی عرصہ تک رہیگی

فطرتِ زر

(از حضرت احسان دانش کاندھلوی)

اِک دن کہ دوپہر کی جوانی تھی کامیاب — آتش فشانیوں میں تھا مصروف آفتاب
تھی بام و در پہ روحِ جہنم فسانہ خواں — جُھنجھلائی سی زمین، بھڑکتا سا آسماں
طیارہ دھوپ میں جو اُٹھے گل کے گر پڑے — طائر اُڑے فضا میں تو پَر جل کے گر پڑے

ایسے میں اک مریضِ ادب خستہ و زبوں
لیکر عقیدتوں کا اُبھارا ہوا جنوں

ہر سانس میں خلوص کی خوشبو لئے ہوئے — دل میں خیال خدمتِ اُردو لئے ہوئے
سودا رسوخ کا، نہ جنونِ مصاحبت — سرسام منتوں کا، نہ خبطِ ملازمت
خواہش نہ قرض کی نہ سفارش کی آرزو — شہرت کی اور نہ دادِ نگارش کی آرزو

ملنے کو اک محافظِ اُردو کے گھر گیا
روکا ہزار ذوقِ خودی نے مگر گیا

نیکی کا جس کی سارے زمانے میں شور ہے — اس میں بھی زور اُس کے قلم میں بھی زور ہے
ہے جس کے رنگِ رخ کا زر و سیم پر مدار — قرنوں سے کامگار ہے پشتوں سے مالدار

لیکن بغیر پوچھے کے آنے کا کیا سبب؟
اس دھوپ میں عذاب اُٹھانے کا سبب؟

باصد غرورِ جاہ و باندازِ پیچ و تاب — دولت کی بیخودی نے یہ بڑھکر دیا جواب

آرام کا یہ وقت ہے اس وقت جائیے
گر ہو سکے تو شام کو تشریف لائیے

ارماں بھری نگاہ کو چکر سا آگیا — دنیائے آرزو پہ اندھیرا سا چھا گیا
رنگیں بیانیوں کے قدم رُک کے رہ گئے — خودداریوں کے سبز علم جُھک کے رہ گئے

ثابت ہوا کہ فطرتِ زر میں غرور ہے

ہماری زبان

(از حضرت سہیل عظیم آبادی)

رکھیو غالب مجھے اِس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ملک میں جو بہت سے فرقہ وار مسئلے پیدا ہوکر آزادی کی راہ میں پہاڑ بنے کھڑے ہیں، اُن میں ایک بہت اہم مسئلہ زبان کا بھی ہے۔ اس مسئلہ نے شمالی ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں وہ کشیدگی پیدا کردی ہے جو بظاہر مٹتی نظر نہیں آتی۔ حالانکہ یہ مسئلہ محض عارضی ہے (ہماری غلامی اور غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے) جس دن ہندوستان سیاسی آزادی کے ساتھ فکر کی آزادی بھی حاصل کرے گا، یہ مسئلہ اتنا حقیر ثابت ہوگا کہ کوئی شخص بھی اس میں اُلجھ کر اپنا وقت خراب کرنا پسند نہ کرے گا۔

ہندو کہتے ہیں: ہندوستان کی قومی زبان صرف ہندی ہو سکتی ہے، اور رسم خط صرف دیوناگری ہو سکتا ہے، کیونکہ ہندی پراکرت سے اور دیوناگری برہمی رسم خط سے ماخوذ ہے، جس سے دوسرے صوبہ کی زبانیں اور رسم خط ماخوذ ہیں۔ اس لئے ہندی زبان اور دیوناگری رسم خط کو اختیار کر لینے کے بعد دوسری زبانیں ملک کی قومی زبان سے بہت ہی قریب ہو جائیں گی۔ ہندوؤں کا یہ دعویٰ بظاہر ایک علمی نظریہ ہے، لیکن ہندی کے سرپرستوں کی کارروائیاں اُن کے زہریلے ارادے کو منکشف کرتی ہیں۔

مسلمان کہتے ہیں: کہ اُردو ہندی سے زیادہ مکمل اور خوبصورت زبان ہے، اس لئے اب اُردو کو ترک کر کے ہندی کو اختیار کرنا غلطی ہے۔ حالانکہ مسلمان اُردو زبان اور رسم خط کو صرف اس لئے ترک کرنا نہیں چاہتے کہ اس زبان اور رسم خط میں اُن کی سات سو سال کی قومی روایتیں محفوظ ہیں، اور مسلمان اُن کی حفاظت کے ساتھ اشاعت کے بھی تمنائی ہیں۔ اور اس طرح یہ کشاکش جاری ہے۔

اُردو اور ہندی کا یہ ناگوار جھگڑا اس وقت تک باقی رہیگا جب تک ہماری سیاسی اور سماجی

زندگی میں وہ خوشگوار انقلاب پیدا نہ ہو جائے جس کا خواب نوجوان ہندوستان بے چینی کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ دراصل یہ سارے جھگڑے اونچے درجہ کے لوگوں کے پیدا کردہ ہیں، وہی اس زہریلی تحریک کو چلا رہے ہیں اور چلاتے رہیں گے، کیونکہ اس قسم کی بے معنی تحریکات کو وہ کبھی مذہبی کبھی معاشری بنا کر عوام کے سامنے پیش کر کے اپنی لیڈری قائم رکھنے کے عادی بن چکے ہیں۔ اور عوام کی موجودہ حالت اتنی پست ہے کہ ان کی فریب کاریوں کو سمجھنے کی اُن میں صلاحیت ہی نہیں۔

اس کشاکش کو ہمارے "بزرگوں" (بزرگ سے ہماری مراد ہندوستان کا غیر نوجوان طبقہ ہے جس میں بلاتخصیص مذہب وملت کے افراد شامل ہیں) نے اتنا بڑھا دیا ہے کہ اب اس کا حل اُن کے پاس نہیں، کیونکہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آزاد فکر ہونے کی ضرورت ہے۔ اور ان بزرگوں کے دماغوں میں آزاد فکری اور آزاد خیالی کا کوئی صحیح تصور نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُن کا سرمایۂ ناز وافتخار اُن کی تنگ نظری اور تنگ دلی ہے۔ اُن میں اکثر ایسے بھی ہیں جو آزاد فکری اور آزاد خیالی کے دعویدار ہیں، مگر کسی مسئلہ پر بھی آزاد خیالی اور وسعت نظری کے ساتھ سوچ نہیں سکتے۔ اُن کے چند مفروضات ہوتے ہیں جو کسی حال میں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ یہ تو چاہتے ہیں کہ ملک آزادی اور ترقی کی منزلیں طے کرے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے تنگ خیالات اور غلط مفروضات کو بھی نہیں چھوڑتے جو آزادی کی راہ میں پہاڑ سے اونچے اور سمندر سے زیادہ گہرے ہیں۔ بعض ہندوؤں کے دماغوں میں کھلم کھلا ہندو راج اور ہندو تمدن کے احیاء کا خبط سمایا ہوا ہے، اور مسلمانوں میں بھی بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے مفروضہ تمدن کو سب سے بہتر سمجھکر دوسروں کے گلے میں منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ انھیں دو متضاد اور زہریلی ذہنیتوں کی ٹکر کا نتیجہ ہے کہ بہت سے مسئلوں کی پیچیدگیوں کے ساتھ اُردو ہندی کا جھگڑا ابھی قائم ہے۔

زبان کے مسئلہ میں شمالی ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے درمیان جو کشاکش جاری ہے یہ اُس کا ایک دُھندلا سا نقشہ ہے۔ اب آئیے تاریخ کی روشنی میں دیکھیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے؛ ہماری زبان کیا تھی، کیا ہے اور کیا ہوگی؟

ہندوستان میں جب جنگلی اور وحشی قوم آباد تھی اُس وقت اس کی جو زبان ہو اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں، پھر جب ایک زمانہ کے بعد وسط ایشیا سے آکر آریوں نے انھیں مار بھگایا اُس وقت جنگلیوں کی زبان کی جگہ مہذب آریوں کی زبان نے لے لی۔

جب ہندوستان میں آریوں نے پوری طرح قدم جما لیا، تو ضرورت کے لحاظ سے ذاتوں کی تقسیم ہوئی اُسی وقت سے برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کی زبان سنسکرت اور ادنیٰ قوموں کی زبان پراکرت ٹھہری

پھر ان کی آبادی بڑھتی اور پھیلتی گئی، اُن کی زبان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی گئی۔ چنانچہ ان کی علمی زبان تو سنسکرت باقی رہی، کیونکہ ہندو تمدن کی باگ برہمنوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن ہر صوبہ کی عام زبان الگ ہوگئی۔ بلکہ اس سے بھی آگے جا کر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی صوبہ میں مختلف قسم کی زبانیں بولی جانے لگیں۔

اِس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب آریوں نے سماجی زندگی میں درجے قائم کئے تو زبانیں الگ ہوئیں، اور ایک زمانہ تک برہمنوں کی روحانی حکومت کے ساتھ سنسکرت کی علمی حکومت قائم رہی۔ مگر پھر ایک زمانہ کے بعد مہاتما بُدھ نے برہمنیت کے خلاف عَلَم جہاد بلند کیا، تو سنسکرت کو بھی ٹھکرا کر جو اُس وقت کی بلا شک و شبہ علمی زبان تھی اور علمی جواہرات سے معمور تھی اپنے مذہب کے پرچار کے لئے عوام کی زبان کو منتخب کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنوں کی طاقت کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان بھی اپنے قدم پیچھے ہٹاتی گئی، اور عوام کی زبان کے قدم آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ جب بدھ دھرم کو مگدھ کے راجاؤں کی سرپرستی حاصل ہوگئی تو یہ عوام کی "پالی" زبان مگدھ سے لے کر لنپا ور اور مہا راشٹر تک پھیل گئی۔ چنانچہ آج بھی پشاور اور مہاراشٹر وغیرہ میں پالی زبان کے بیشمار کُتبے جو اشوک اعظم کے زمانہ کی یادگار ہیں، ملتے ہیں۔

اس کے بعد جب مگدھ کے بدھ راجاؤں کی طاقت کم ہوگئی اور برہمنوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بُدھ دھرم کا مقابلہ اور ویدک دھرم کے احیاء کی کوشش کی تو اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگئے۔ بدھ دھرم کے قدم پیچھے ہٹتے گئے۔ اور اسی کے ساتھ "پالی" بھی رفتہ رفتہ بھولی بسری زبان ہوگئی۔ لیکن سنسکرت زبان کو بھی وہ اقتدار دوبارہ نصیب نہ ہوا جو اُسے پہلے حاصل ہوا تھا۔ کیونکہ عوام میں اپنی فطری زبان کی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ اور جب دوبارہ الگ الگ صوبوں اور علاقوں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوگئیں تو اُن کی زبانیں بھی دوسرے صوبوں یا دوسری حکومتوں کی زبانوں سے علیحدہ رہ کر ترقی کرنے لگیں۔

جس وقت مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا، اُس وقت سارا ہندوستان بہت سی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم تھا۔ اور زبان، معاشرت اور آپس کے بغض و عناد کی وجہ سے بہت سے ملکوں کے مجموعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ تمام چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا خاتمہ کر کے ہندوستان کو ایک ملک بنا دیا۔ جس وقت مسلمانوں نے دہلی میں حکومت قائم کی اور اُس کو استحکام حاصل ہوا اُس وقت دہلی کے آس پاس ہریانی، اودھ کی بولی، برج بھاشا اور مگدھی بھاشا تھی۔ جو انتہائی قربت کے باوجود علیحدہ علیحدہ زبانیں تھیں، ان میں برج بھاشا کو زیادہ وسعت حاصل تھی۔ بہرحال جب تک فاتحین اور مفتوحین میں جنگ جاری رہی سب زبانیں الگ الگ رہیں، لیکن جب مسلمانوں کی حکومت کو

استحکام حاصل ہوگیا اور دونوں قوموں کے دلوں میں دشمنی کی آگ ٹھنڈی ہوگئی، تو آپس میں لوگ ملنے جلنے لگے۔ اس طرح مرکزی ہندوستان میں سندھ کی طرح ہندوستان کی زبان کو غیر ملکی زبانوں سے ملنے کا موقع ملتا رہا۔ جیسے جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کا میل جول بڑھتا گیا، دونوں کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے قریب ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ اکبر اعظم نے اپنے عہد حکومت میں ہندوستان کی سماجی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ایک پریم بندھن میں باندھنا چاہا، شاہی محل میں ہندو رانیاں آئیں، اور حکومت میں براہ راست ہندو راجاؤں کا اثر کام کرنے لگا۔ راجہ مان سنگھ نے ایک قدم آگے بڑھ کر فارسی کو دفتری زبان کی حیثیت دے دی۔ اکبر اعظم کے نورتن اور ہندو مسلمانوں کے گہرے تعلقات نے ایک علیحدہ زبان کی مستقل بُنیاد ڈال دی۔ جو اکبر اعظم کے پوتے شاہجہاں کے عہد حکومت میں خاص طور پر پروان چڑھی۔ میرامّن کی تقلید میں تقریباً تمام مورخ یہی کہتے ہیں کہ اس نئی زبان کی بنیاد شاہجہاں کے عہد حکومت میں پڑی اور اسی لئے اس کا نام اُردوئے معلّیٰ پڑا۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ زندگی کے کسی پہلو میں بھی انقلاب بغیر حالات کی موافقت پیدا نہیں ہوتا۔ اکبر اعظم نے ہندوستان کی سماجی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس انقلاب کے لئے اُس نے جتنے لوازمات فراہم کئے تھے، اُس کا لازمی نتیجہ ایک نئی زبان کی پیدائش تھی۔ البتہ شاہجہاں نے ایسے مواقع کو وسیع کردیا تھا جس میں یہ نئی زبان نشو ونما پاگئی۔ یہی نئی زبان ایک عرصہ تک ہندی، ہندوی، ریختہ اردوئے معلیٰ کے نام سے پکاری جاتی رہی اور اب کچھ دنوں سے اُردو اور ہندی کہی جاتی ہے۔

عہد شاہجہانی میں یہ زبان لال قلعہ میں بڑے ناز ونعمت کے ساتھ پرورش پاتی رہی۔ اس کے بعد رؤسا کے مکانوں میں آئی، پھر متوسط درجہ کے لوگوں میں، پھر وہاں سے دہلی کی گلیوں گلیوں میں دوڑنے لگی۔ اور سب کی پیاری بن گئی۔ جو جہاں گیا اُسے اپنے ساتھ لیتا گیا، اس طرح اس کے قدم دہلی سے بھی باہر نکلے۔

انقلاب زمانہ نے تاریخ ہندوستان کا ورق اُلٹ دیا، ایک دوسرا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ۱۸۵۷ء کی تند وتیز ہواؤں نے ہمیشہ کے لئے بجھا دیا۔ لال قلعہ میں اندھیرا ہوگیا، فورٹ ولیم میں چراغاں ہوا، خوشیاں منائی گئیں۔ سیاست کی بساط بچھی اور ہندوستانیوں کو مات دینے کے لئے مختلف چالیں چلی گئیں۔ انھیں چالوں میں سے ایک فورٹ ولیم کالج کا قیام بھی تھا۔ جان گلکرائسٹ نے دیکھا کہ ہندوستان کی یہ نئی زبان ممکن ہے کہ

اس کے لئے مضرت رساں ہو، اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کو ایک سے دو کر دیا جائے۔

دہلی کی محفل کی پراگندگی کے بعد جس کا منھ جدھر اُٹھا چلا گیا، اور اپنی زبان کو دہلی کی شوکت و سطوت کی یادگار بنا کر ساتھ لیتا گیا۔ جان گلکرائسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں اس عہد کے فضلا کو دعوت دی۔ اور عقلمندی کے ساتھ اُن کے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ دیدیا جس کو وہ شربت کے گھونٹ بنا کر پی گئے۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا اور رسم خط کی بنا پر زبان کا ایک رخ سنسکرت کی طرف اور دوسرا رخ عربی اور فارسی کی طرف پھیر دیا گیا۔ اس کے بعد جان گلکرائسٹ کی ڈالی ہوئی بنیادوں پر لوگوں نے عمارتیں قائم کرنی شروع کردیں۔ اور زبان کے معماروں نے الگ الگ کچھ ایسی عمارتیں بنا دیں کہ اب یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ یہ دونوں عمارتیں ایک ہی آب و گل کی ہیں۔

یہ ہے ہماری زبان کے ارتقا کی مختصر تاریخ، اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں نے کیسا دھوکا کھایا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کی زبان تو ایک رہی لیکن خواص کی زبانیں دو ہوگئیں، ہندوؤں میں اونچے درجے کے لوگوں کی زبان ہندی اور مسلمانوں میں اونچے درجہ کے لوگوں کی زبان اُردو۔ اور وہ اب بھی باقی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ہی طبقہ، یعنی اونچے درجہ کے لوگوں کا طبقہ ہے، جو اُردو اور ہندی کی دُکان الگ الگ لگا کر بیٹھا ہے۔ ورنہ عوام کی زبان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ مسلم عوام کی زبان اُردو، اور ہندو عوام کی زبان ہندی ہے۔

عوام کی زبان ایک ہے اور ایک ہی ہوسکتی ہے، اس لئے کہ زبان نام ہے الفاظ کے مجموعہ کا، اور الفاظ کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ متکلم اپنے مخاطب کو اپنا مافی الضمیر سمجھا دے۔ اگر اس مقصد کو زبان سے علیحدہ کر دیا جائے تو الفاظ بے معنی چیز رہ جاتے ہیں، یعنی زبان قطعی طور پر ایک مفاہمی چیز ہے، اور اسی مفاہمت کی بنا پر دنیا کے مختلف حصوں کی زبانیں الگ الگ ہیں۔ الفاظ دراصل اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لئے مقرر کردہ آوازیں ہیں، جن کو ہم سمجھ لیتے ہیں تو اُن کا مقصد پورا ہوجاتا ہے۔ اسی بنا پر الفاظ کی تقسیم موزوں اور مہمل کے ناموں پر ہوئی۔ مثال کے طور پر اگر کسی جاہل کے سامنے اعلیٰ درجہ کی عربی یا انگریزی میں کوئی بات کہی جائے، یا امراء القیس اور ورڈسورتھ کے اشعار پڑھے جائیں تو اُس کے نزدیک اُن کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ وہ عربی اور انگریزی زبان سے قطعی نابلد ہے۔ لیکن اسی کے سامنے کوئی معمولی سا دیہاتی دوہا پڑھ دیجئے۔ دیکھئے وہ سر دُھننے لگےگا اس لئے کہ دوہا کے الفاظ سے وہ واقف ہے۔ اور ٹھیک جس طرح الفاظ مقرر کردہ آوازیں ہیں

اُسی طرح "حروف" مقرر کردہ نقوش ہیں، جن کے ذریعہ ہم اپنے مافی الضمیر کو تحریر کی شکل میں منضبط کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے الفاظ یا حروف بالکل مفاہمتی چیزیں ہیں متکلم اور مخاطب کے درمیان ایک مفاہمت ہے کہ فلاں آواز یا فلاں نقشہ سے فلاں چیز سمجھی جائے۔ البتہ ہماری یہ مفاہمت اتنی قدیم ہو چکی ہے کہ اب اس کا احساس تک باقی نہیں۔ لیکن اگر مفاہمت کی حقیقت کو دیکھنا چاہتے ہیں تو اُس شخص کو دیکھ لیجئے جو اپنی مادری زبان کے علاوہ اور کوئی دوسری زبان سیکھ رہا ہو۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہمارے الفاظ ہمارا رسم خط ہی نہیں بلکہ ہماری زبان بھی قطعی طور پر ایک مفاہمتی چیز ہے جس کے لئے جھگڑنا کسی حال میں بھی محمود قرار نہیں دیا جا سکتا ہماری زبان ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے، ابھی اس کو ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کرنا باقی ہیں، اور اس قسم کی اُلجھنوں میں پڑنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔

اب آئیے ایک دقیق نکتہ کو پیش نظر رکھ کر آئندہ کے متعلق کچھ سوچیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ملک میں شہنشاہی کا دور دورہ تھا، اور اب بھی ہے لیکن پہلا سا نہیں۔ ملک کے ہر فرد کے دل میں جمہوری حکومت کے قیام کی خوشگوار تمنائیں موجزن ہیں، اور اس کے لئے کوششیں جاری ہیں۔ اس کوشش میں اُن نوجوانوں کا بھی ہاتھ ہے، جو ملک کی اصلی سیاسی نجات اور فلاح اشتراکی جمہوریت کے قیام و استحکام میں دیکھتے ہیں، اور ہندوستانی تمدن کا ایسا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں مدارج نہ ہوں کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا نہ ہو بلکہ سب برابر ہوں۔ کیونکہ مدارج کے پھیر میں پڑ کر سخت سے سخت نقصانات برداشت کر چکے ہیں۔ نوجوانوں کی کوششیں ہیں کہ ملک کی دولت عام ہو جائے، تمدن عام ہو جائے تو پھر زبان کو بھی عام کیوں نہ بنایا جائے۔ عام زبان سے میری مراد وہ زبان نہیں ہے جس کا تصور اُردو اور ہندی کے حامیوں کے دماغ میں ہے۔ عام زبان سے میری مراد یہ ہے کہ ہم اُنھیں الفاظ کو استعمال کریں جن کو بولتے ہیں۔ اُردو اور ہندی کے حامی زبانی طور پر تو عام اور سہل زبان کے قائل ہیں لیکن کیا اُردو اور ہندی کا کوئی ادیب کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ وہ لکھتا ہے وہ ملک کی عام زبان ہے۔ اس کو ملک کا ہر فرد سمجھ سکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ تو پھر ہم یہ کیوں نہ کہیں کہ اُردو اور ہندی ملک کے امرا اور متوسط درجہ کے لوگوں کی زبان ہے۔ عام لوگوں کی زبان ھندوستانی ہے جسے وہ بولتے اور سمجھتے ہیں، ورنہ اُردو اور ہندی کا تو یہ عالم ہے کہ جاہل آدمی تو ایک طرف معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سُن کر حیرت سے منہ کھول دیتا ہے اور شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کی زبان نہیں۔ اس لئے ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ملک میں عوام کی طاقت اُبھرتے ہی

انقلاب کی موجوں میں حرکت پیدا ہوتے ہی اردو اور ہندی کے قدم میداں سے اُکھڑنے شروع ہو جائیں گے، اور ایک دن اُن کو بھی تقریباً وہی حیثیت حاصل ہوگی جو آج سنسکرت کی ہے۔ مگر سنسکرت سے اس کی حالت کچھ اچھی رہیگی، کیونکہ یہ پھر بھی کسی حد تک عوام کی زبان زد ہے۔

سر دست ہمیں ایک عام زبان کی تخلیق کی جد و جہد کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ پیدا ہونے والی انقلابی تحریکیں خود ہی اُس کی تخلیق کا باعث ہونگی۔ اور جس طرح آج برج بھاشا، مگدھی، ہریانی وغیرہ اور مسلمانوں کے میل سے ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی، ٹھیک اُسی طرح ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانوں کے میل جول سے از خود ایک نئی زبان پیدا ہو جائیگی جو صحیح **ہندوستانی** ہوگی جس کے لئے ہمیں کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

چونکہ رسم خط کا تعلق زبان سے بہت گہرا ہے، اس لئے یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ زبان کے ساتھ رسم خط کا مسئلہ کس طرح طے ہوگا۔ تو اس کا جواب بھی وہی ہے یعنی احیائے تمدن اور تبلیغ تمدن کے خبط کی موجودگی میں یہ مسئلہ طے نہیں پا سکتا۔ جبتک ہماری سماجی زندگی کی باگ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے، کچھ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہاں احیائے تمدن اور تبلیغ تمدن کا خبط کام کر رہا ہے۔ لیکن جب سماجی زندگی کی باگ ڈور عوام کے ہاتھوں میں آ جائے گی تو رسم خط کے معاملہ میں کوئی جھگڑا باقی نہیں رہ سکتا کیونکہ ان کا تمدن ایک تھا اور ہے۔ اور اُن کو اس کی حفاظت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اُن کی کوششیں تو جدید تمدن کے قیام میں صرف ہونے والی ہیں۔

رسم خط کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ ان کا مصرف صرف مافی الضمیر کو منضبط کر دینا ہے، اور بس۔ اس کے بعد ہم کسی رسم خط کو بھی اختیار کر سکتے ہیں، یا کوئی جدید سائنٹیفک رسم خط تیار کر سکتے ہیں، یہ ہمارے اختیار کی بات ہے۔ آخر ہم ٹیلیگرام کے لئے الفاظ اور رسم خط کو الگ چھوڑ کر چند "چٹک مٹک" کی آوازوں سے کس طرح کام لیتے ہیں۔ اس لئے آئندہ ہندوستان میں رسم خط کا مسئلہ بالکل بے معنی ہوگا۔

دنیا تیزی کے ساتھ بین الاقوامیت کی طرف بڑھتی جا رہی ہے، مختلف ذرائع سے ایک ملک دوسرے ملک سے، ایک قوم دوسری قوم سے، ایک زبان دوسری زبان سے قریب تر ہوتی جا رہی ہے، البتہ ہمیں اس راہ میں کوئی ایسا قدم اُٹھانا ہوگا کہ ہمیں پھر واپس نہ آنا پڑے۔ اس لئے زبان کا جھگڑا چکانے سے پہلے ہمیں اس مقدم ترین فتنہ کا سر کچل دینا چاہیئے جو ان تمام جھگڑوں اور اُلجھنوں کا سرچشمہ ہے اور جبتک یہ باقی رہیگا ساری لعنتیں ہمارے سروں پر اسی طرح سایہ فگن رہیں گی۔

اور اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں اپنا فرض آفتاب سے زیادہ روشن نظر آنے لگتا ہے۔ کیا زبان کا جھگڑا چکانے کی کوشش کرنے والے حضرات ان حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟

ہندوستانی سے خطاب

(از حضرت محمود اسرائیلی)

دنیا کی رُت بدل گئی، تجھ کو خبر نہیں!
ہر قوم اب سنبھل گئی، تجھ کو خبر نہیں!
بڑھ کر کہاں نکل گئی، تجھ کو خبر نہیں!
یہ بیسویں صدی ہے مگر سو رہا ہے تو!!

سوداگری میں طاق، نہ صنعت کا تجھکو شوق!
تعلیم کا مذاق نہ حکمت سے تجھ کو ذوق!
مدّت سے ہے غلامی کا گردن میں تیری طوق!
لیکن اس امتیاز پہ خوش ہو رہا ہے تو!!

کچھ لطف تجھ کو ملنے لگا ہے عناد سے!
کچھ دشمنی سی ہو گئی ہے اتحاد سے!
مطلب ہے تجھکو کام ہے اپنے مفاد سے!
یہ کانٹے اپنے حق میں تو خود بو رہا ہے تو!!

اوراق منتشر ہوں تو پھر گُل کہاں بنے!
یکجا نہ ہوں جو نخل تو کیا گلستاں بنے!
اینٹیں جُدا جُدا ہوں تو کیونکر مکاں بنے؟
تفریق سے تو اپنا بھرم کھو رہا ہے تو!!

تجھ کو نہ پاسِ وضع نہ رسمِ کہن سے اُنس!
کہسار سے لگاؤ، نہ اپنے چمن سے اُنس!
اہلِ وطن عزیز نہ تجھ کو وطن سے اُنس!
دل سے نقوشِ حُبِ وطن دھو رہا ہے تو!

مغرب پرستیوں نے تری کھو دیا تجھے!
اپنا سمجھ کے اس نے نہ پھر بھی لیا تجھے!
اس ذہنیتِ ردی نے تری رسوا کیا تجھے!
برگشتگیِ بخت کو کیوں رو رہا ہے تو!!

مُضارع فارسی

(از مسٹر سلیم جعفر)

ہمارے قواعد نویس بزرگ فرماتے ہیں کہ مضارع فارسی کے حرفِ آخر کے پہلے "شرف آموزی سخن" یا "شترم از سخن وے" کے حرفوں میں سے کوئی سا ایک حرف آتا ہے۔ بجا و درست۔ اس سے انھوں نے طالب علم کے لئے ایک طرح کی آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کوشش کو وہ خود کس قدر ناکام سمجھتے ہیں۔ یہ ہم پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد مرحوم کی "جامع القواعد" کا اقتباس پیش کرکے دکھانا چاہتے ہیں[1]۔

"[2] یہ ماضی کے صیغے سے بنتا ہے، مگر حق پوچھو تو اس کے بنانے کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں [3] اکثر صیغوں میں اسے ماضی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً دید سے بیند، اور کرد سے کند فارسی زبان کی بہت کتابیں پڑھنے سے اور بہت بولنے سے فکر کو اور زبان کو ایک ڈھب آجاتا ہے کہ صحیح مضارع نکال لیتے ہیں۔ قواعد کی کتابوں میں یہ لکھتے ہیں کہ ماضی کے حرف آخر کو دال سے بدل دو، اور ماقبلِ آخر کو زبر دو۔[4] پھر ماضی کے ماقبل آخر کہ ہمیشہ گیارہ حرفوں میں سے ایک ہوتا ہے، [5] اُسے حروفِ مفصلہ ذیل میں سے ایک یا دو سے تبدیل کرو جس کا مجموعہ (شرف آموزیِ سخن) ہے اور کبھی تبدیلی نہیں بھی ہوتی۔" صہ ۳۳

جامع القواعد مطبوعہ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ۱۹۳۶ء۔

جن فقروں پر خط کھینچ دیئے گئے ہیں وہ قابل غور ہیں۔ پہلے تو ہمیں اسی سے اتفاق نہیں کہ مضارع بنانے کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں۔ مرحوم خود فرماتے ہیں اور مشاہدہ تائید کرتا ہے کہ ماضی کا حرفِ آخر دال سے بدلا اور اس کے ماقبل پر زبر لگایا جاتا ہے۔ یہ مضارع بنانے کا اٹل قانون ہے۔ ماضی اور مضارع میں تعلق نہ ہونے کے جو دو مثالیں دی ہیں اس کا سبب محض اصلیت سے ناواقفی ہے۔ فارسی قواعد کے لحاظ سے دیدن منصرف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیدن غیر منصرف یا مقتضب ہے اور بینیدن جس کا موجودہ فارسی میں کہیں پتا نہیں اور جس کا ماخذ سنسکرت

کا وین (वेन , वेरा) ہے، اس کے صیغے لے کر تصریف پوری کی گئی ہے۔ کردن سے کند بھی فارسی دانوں کے لئے معمہ ہے لیکن سنسکرت داں جانتے ہیں کہ پانچویں گن (باب) سے تعلق کی بنا پر اس کے صیغۂ حال (یہ سنسکرت) میں نُ (नु) بڑھانا پڑتا ہے اس لئے یہ بیان حقیقت سے بعید ہے لیکن قابل گرفت بھی نہیں کیونکہ ہمارے بزرگوں نے سنسکرت کو پیش نظر رکھ کر قواعد فارسی لکھے ہی نہ تھے۔ تیسرا فقرہ فقط پہلے کی تائید کرتا ہے۔ چوتھے میں "ماضی کے ماقبل آخر" کے گیارہ حرف بتائے ہیں، مگر لون سے ؛ ہم مانے لیتے ہیں کہ یہی "شرف آموزی سخن" کے، کیونکہ یہ بھی گیارہ ہیں، لیکن اس میں یہ دقت پیدا ہوتی ہے کہ پانچویں فقرہ میں بتایا ہے کہ حرف ماقبل ماضی انھیں گیارہ حرفوں میں سے "ایک یا دو سے تبدیل" ہوتا ہے۔ قصہ مختصر مصدر سے مضارع بنانا جوئے شیر کا لانا ہے۔

جامع القواعد کا سال تصنیف معلوم نہیں۔ اس کا سبب تالیف تھا پنجاب میں اشاعت تعلیم۔ لیکن ہمارے پاس ایک اور کتاب ہے جس کے مؤلف جناب روشن علی صاحب انصاری جونپوری ہیں، اور اس کو "بہ تصحیح تمام و تنقیح مالاکلام دکوشش بلیغ در رفع اغلاط" "مطبع نامی گرامی جناب منشی نولکشور صاحب" نے دسمبر ۱۸۶۶ء میں بار پنجم طبع کیا۔ اس کا سبب تالیف تھا "برائے خاطر برخوردار فضل علی و دیگر فرزندان دل بند اطال اللہ اعمارہم" اس مؤلف نے فارسی مصدروں کو "باعتبار حرف ماقبل علامت مصدر" گیارہ بابوں میں تقسیم کرکے ہر باب کو فصلوں میں تقسیم کردیا ہے، فرماتے ہیں :۔

"بدانکہ جملہ مصادر مشہور مستعمل فارسی یازدہ باب است باعتبار حرف ماقبل علامت مصدر کہ یازدہ است۔ و در کلام استادان مصدرے کہ ماقبل علامتش سوائے ایں یازدہ حرف حرفے دیگر باشد، یافتہ نہ شدہ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر آزاد نے مذکورۂ بالا چوتھے فقرہ میں جن حرفوں کا ذکر کیا ہے، وہ بھی گیارہ حرف ہیں جن کا مجموعہ "شرف آموزی سخن" ہے۔ کیونکہ روشن علی صاحب نے بھی ماقبل علامت مصدر جو حرف بتائے ہیں وہ یہی حرف ہیں۔ انھوں نے ان حرفوں سے لفظ نہیں بنائے بلکہ سیدھی سادی طرح سے یوں گنائے ہیں :۔

الف و خا و را و زا و سین و شین و فا و میم و نون و واو و یا۔ اس میں بہت سے حرف نہیں آئے مثلاً ب جو خوابیدن و طلبیدن میں آتی ہے، یا ک جو ترکیدن میں آتا ہے۔ لیکن اس قسم کے تمام مصدروں میں انھوں نے ماقبل علامت مصدر "ی" کو مانا ہے، اس مؤلف نے گو ایک نیا راستہ اختیار کیا لیکن بابوں میں باب سدا کے اُلجھے۔ "دوم

نہ کرسکا۔ ہمارے نزدیک اس کا تیر نشانہ کے پاس سے نکل گیا۔ گیارہ باب بنائے اور پھر ان کو اٹھائیس فصلوں میں تقسیم کیا۔ ان فصلوں کی تعداد بہت کم ہو جاتی اگر وہ حذف الف و یا کو جو دن کے پہلے آتے ہیں، ذرا توجہ کر کے اصول کلیہ میں داخل کر دیتا۔

ہمارے خیال کی رُو سے مضارع بنانے کے لئے چند اُصول کلیہ قانون ابدال یا مبادلۂ حروف اور چند ایسے مستثنیات کا جاننا جو کہ کسی کلیہ سے وابستہ نہیں ہیں، کافی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد ہونا چاہیئے کہ مصدر منصرف ہے یا مقتضب۔ مثلاً :-

منصرف	مقتضب
آرائیدن	آراستن
بافیدن	بافتن
پیرائیدن	پیراستن
جوئیدن	جَستن
جہیدن	جُستن
خیزیدن	خاستن
شگفیدن۔ شگوفتن	شگفتن
شناسیدن	شناختن
فروشیدن	فروختن
کاویدن	کافتن
گسلیدن	گسستن۔ گسیختن
نگریدن	نگریستن

ہمارے مستخرجہ اُصول کلیہ یہ ہیں :-

کلیات۔ (۱) تن یا دن مصدر سے گرانے کے بعد جو مجموعۂ حروف باقی رہے، اس کے حرف آخر پر فتحہ لگا کر دَ لگا دو۔ جیسے افگندن سے افگند۔ بافتن سے بافد۔

(۲) تن کے پہلے جن مصدروں میں نس یا یس ہوگا اُن کا س بھی تن کے ساتھ گر جائے گا جیسے دانستن سے داند۔ بایستن سے باید۔

(۳) دَن کے پہلے اگر اَ یا یَ میں سے کوئی حرف ہوگا تو وہ بھی اس کے ساتھ گر جائے گا

جیسے افتادن سے افتد۔ ترکیدن سے ترکد۔

(۴) دن گرانے کے بعد جن مصدروں کا مجموعۂ حروف و معروف پر ختم ہوتا ہے د لگانے سے پہلے اُن کا واؤ۔ الف اور ی مفتوح سے بدل جاتا ہے۔ جیسے فرسودن سے فرساید۔

(۵) جن مصدروں میں ئیدن آیا ہے اُن کا یہ حصّہ گرا کر مضارع کی د سے پہلے ی مفتوح بڑھائی جاتی ہے جیسے سائیدن سے ساید۔

قانونِ ابدال۔ جن مصدروں میں تن ہے ان میں تن سے پہلے خ۔ س۔ ش۔ اور ف میں سے کوئی نہ کوئی حرف آتا ہے۔

خ ہمیشہ ز سے بدلتی ہے جیسے آمیختن سے آمیزد۔

س اکثر غیر منصرف مصدروں میں آیا ہے اس لئے بحث کی ضرورت نہیں۔

ش ہمیشہ ر سے بدلتا ہے جیسے داشتن سے دارد۔ برشتن۔ کشتن و نوشتن (لکھنا) مستثنیٰ ہیں

ف کے پہلے جہاں کوئی حرفِ علت آیا ہے ب سے بدل گئی ہے، جیسے یافتن سے یابد

مستثنیات:۔

مصدر	مضارع	مصدر	مضارع
آفریدن	آفرنید	شکستن	شکند
بودن	باشد	کردن	کند
چیدن	چیند	گرفتن	گیرد
دادن	دہد	گزیدن	گزیند
دیدن	بیند	مُردن	میرد
زدن	زند	نشستن	نشیند

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے وہ صرف فارسی مصدروں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے، کیونکہ مقصود یہ تھا کہ طالبِ علم سنسکرت کے مادّوں اور قانونِ ابدال کے چکّر میں نہ پھنسے اور ژند کے جھگڑوں میں بھی نہ پڑے ورنہ از مستثنیات کی تعداد جو کسی کلیہ سے وابستہ نہیں ہیں بہت کم رہ جاتی مثلاً کردن۔ چیدن۔ گزیدن وغیرہ کے مادّے سنسکرت کے پانچویں گن کے مادّوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِس لئے اُن میں نُ اصول قواعد سنسکرت کے مطابق آتا ہے۔ گرفتن کا سنسکرت مادّہ گربھ (ग्रभ = وید) ہے جو ژند میں گِرِیو (ص) مم (م) دد [illegible]) ہوجاتا ہے اس سے گیرد بنتا ہے وغیرہ وغیرہ

کلامِ فراق

(از مسٹر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے۔ گورکھ پوری)

جسے لوگ کہتے ہیں تیرگی، وہی شب حجاب سحر بھی ہے
جنھیں بیخودی فنا ملی اُنھیں زندگی کی خبر بھی ہے

ترے اہلِ دید کو دیکھ کے کبھی کھُل سکا ہے یہ راز بھی
اُنھیں جس نے اہلِ نظر کیا وہ ترا خرابِ نظر بھی ہے

یہ وصال و ہجر کی بحث کیا کہ عجیب چیز ہے عشق بھی
تجھے پا کے ہے وہی دردِ دل، وہی رنگِ زخمِ جگر بھی ہے

یہ نصیبِ عشق کی گردشیں! کہ زماں مکاں سے گذر کے بھی
وہی آسماں وہی شامِ غم، وہی شامِ غم کی سحر بھی ہے

ترے کیفِ حُسن کی جان ہے، مری بیدلی و فسردگی
جسے کہتے ہیں غم رائیگاں، وہ لئے ہوئے کچھ اثر بھی ہے

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرقِ ناز و نیاز بھی
کہ جہاں ہے عشقِ برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہے

وہ غمِ فراق بھی کٹ گیا، وہ ملالِ عشق بھی مٹ گیا
مگر آج بھی ترے ہاتھ میں وہی آستیں ہے کہ تر بھی ہے

دمِ حشر ازل کی بھی یاد کر، یہ زبان کیا، یہ نگاہ کیا
جو کسی سے آج نہ ہو سکا، وہ سوال بارِ دگر بھی ہے

جو وصال و ہجر سے دُور ہے جو کرم ستم سے ہے بے خبر
کچھ اُٹھا ہوا ہے وہ درد بھی، کچھ اُٹھی ہوئی وہ نظر بھی ہے

یہ پتہ ہے اس کی عنایتوں نے خراب کتنوں کو کر دیا
یہ خبر ہے نرگسِ نیم وا کی گرہ میں فتنہ و شر بھی ہے

اسی شامِ مرگ کی تیرگی میں ہیں جلوہ ہائے حیات بھی
انھیں ظلمتوں کے حجاب میں یہ چمک یہ رقصِ شرر بھی ہے

وہی درد بھی ہے دوا بھی ہے، وہی موت بھی ہے حیات بھی
وہی عشق ناوکِ ناز ہے، وہی عشق سینہ سپر بھی ہے

تو زمان مکاں سے گذر بھی جا تو رہِ عدم کو بھی کاٹ لے
وہ ثواب ہو کہ عذاب ہو، کہیں زندگی سے سفر بھی ہے

جو گلے تک آکے اٹک گیا، جسے تلخ کام نہ پی سکے
وہ لہو کا گھونٹ اُتر گیا تو سُنا ہے شیر و شکر بھی ہے

کوئی اہلِ دل کو کمی نہیں، مگر اہلِ دل کا یہ قول ہے
ابھی موت بھی نہیں مل سکی، ابھی زندگی میں کسر بھی ہے

بڑی چیز دولت و جاہ ہے بڑی وسعتیں ہیں نصیب اسے
مگر اہلِ دولت و جاہ میں کہیں آدمی کا گذر بھی ہے

یہ شبِ دراز بھی کٹ گئی وہ ستارے ڈوبے وہ پو پھٹی
سرِ راہ غفلت خواب سے اب اٹھو کہ وقت سحر بھی ہے

جو اُلٹ چکے ہیں بساطِ دہر کو اگلے وقتوں میں بارہا
وہی آج گردشِ بخت ہے وہی رنگِ دورِ قمر بھی ہے

نہ غمِ عذاب و ثواب سے کبھی چھیڑ فطرتِ عشق کو
جو ازل سے مستِ نگاہ ہے اُسے نیک و بد کی خبر بھی ہے

وہ تمام شکر و رضا سہی وہ تمام صبر و سکوں سہی
تو ہے جس سے مائلِ امتحاں وہ فرشتہ ہے تو بشر بھی ہے

نہ کھو تغافلِ حُسن سے کوئی کارسازیِ غم کرے
کہ جو آج غم سے نکل گئی وہ دعا خراب اثر بھی ہے

ترے غم کی عمرِ دراز میں کئی انقلاب ہوئے، مگر
وہی طولِ شامِ فراق ہے وہی انتظارِ سحر بھی ہے

شاعری میں اہمیت وزن

(اکبر علی منہاس مدیر ساربان)

تخیل اور احساس، شاعری کے عام اور دائمی خواص ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ ان کی موجودگی ہی شعر کی ہستی کی ضامن ہو سکتی ہے۔ ہم ان کو فقط خصوصیات کا درجہ دے سکتے ہیں لیکن بعض اوقات یہ خصوصیات ایک نظم منثور میں بھی ہوتی ہیں۔ اسلئے منظوم نثر اور منثور نظم میں کوئی امتیازی حد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ نظم اور چیز ہے اور نثر اور چیز۔ اس لحاظ سے شاعری فن کی ایک مخصوص قسم ہے۔ اور وہ اس وقت وجود میں آتی ہے۔ جب خیال اور احساس کو موزوں کلام کا جامہ پہنایا جائے۔ اس کلام موزوں سے مراد وزن اور قافیہ ہے۔ اور اگر یہ نہ ہوں۔ تو گویا شاعری کی روح کسی خارجی قالب سے محروم رہی۔ شاعری اپنے مکمل ترین رنگ میں اسوقت نمایاں ہوگی۔ جب صوری اور معنوی محاسن بدرجۂ اتم موجود ہوں گے۔

شعر اور وزن ہم چاہتے ہیں۔ کہ ان متنازعہ فیہ مسائل سے گریز کریں۔ جو شعر اور وزن کے لازم ملزوم ہونے کے متعلق پیدا ہو چکے ہیں۔ تاہم لے ہنٹ کی رائے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ جو کہتا ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شعر کو موزوں ہونا ہی نہ چاہیئے۔ اور نثر ہی نفس شاعری کے اظہار کا آسان ذریعہ ہے۔ لیکن یہ خیال قرین قیاس نہیں۔ حقیقت میں ترنم اور غنا ایسی چیزیں ہیں۔ جو شعر کو نثر سے جدا کرتی ہیں۔ شعر کے لئے صورت کے لازم ہونے کی یہی وجہ ہے۔ اور روح شعری کا اقتضا بھی یہی ہے۔ کیونکہ شعر کے جوش، خوبصورتی اور قوت کا حلقہ اس کے بغیر نامکمل رہتا ہے"۔ یہ رائے اپنے اندر وزن کی اہمیت کے متعلق غلو رکھتی ہے۔ کیونکہ غالباً لے ہنٹ کو یہ معلوم نہیں۔ کہ شعر کی روح حقیقی بعض اوقات نہایت کامیابی سے بدون کسی موزوں اظہار بیان کے ادا ہو جاتی ہے۔ میرے خیال میں یہاں فرق طرز ادا کا ہے۔ وہی چیز نثر میں شعری خصوصیات کی حامل ہو سکتی ہے۔ لیکن جب اس کو موزوں کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ شعر کے لحاظ سے پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتی ہے۔ اگر ہم ورڈز ورتھ اور کالرج کے اقوال کو صحیح سمجھیں "کہ شاعری روح اور صورت کے لحاظ سے سائنس کی ضد ہے"، تو لازمی ہے۔ کہ صورت کے لحاظ سے اس کو اپنی موزونیت کی بنا پر نثر سے ممتاز رکھا جائے۔ اس خیال کی تائید

کارلائل بھی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے" جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اُس پرانے اور فرسودہ خیال میں کہ شعر ہمیشہ موزوں ہوتا ہے۔ بہت سے معنی دیکھتا ہوں۔ اگرچہ شاعری میں بہت سا ایسا مواد ہے جو فقط اندرونی جذبے کی بنا پر نظم میں آگیا۔ ورنہ اس کا بہت سا حصّہ نثر میں کامیابی کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے" اسی طرح آرنلڈ بھی اپنی اس رائے کے باوجود کہ" شاعری تنقید حیات کا نام ہے" اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ نثر کے تخیلی مضامین سے نظم کے تخیلی مضامین کو جدا کیا جائے۔ شاعری کا وزن اور نظم اس کے خیال میں جب التزام اور ارتباط کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔ تو شعر تقریباً پایۂ تکمیل تک پہونچ گیا۔

اب یہ بات ثابت ہوئی۔ کہ وزن شاعری کی ایک ناقابل ترک خصوصیت ہے۔ اور جب ہم اس کو شعر اور نثر کے درمیان حدِ فاصل قرار دیتے ہیں تو بلاشبہ بہت سی مشکلوں میں الجھنا پڑتا ہے۔ غالباً بہت حدتک وٹیلے کی یہ بات صحیح ہے" کہ کوئی منظوم کلام قطع نظر اس کے کہ وہ اچھا ہو یا برا، ان تمام اشخاص کے لئے جو امتیاز کا کوئی معیار نہیں رکھتے، حقیقی شاعری کا مظہر ہو سکتا ہے" قطع نظر اسکے کہ وزن کا التزام شعر کی تعریف میں داخل ہے۔ ہمیں اس اصول کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں۔ کہ وزن شعر کا اس کی صورت کے لحاظ سے آج تک ایک اہم، ناقابلِ ترک اور ضروری جزو رہا ہے۔ اور یہی وہ احساس محکم ہے جس پر ہم شعر کی ادبی خصوصیات کی پسندیدگی کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔

پس ہمیں شعر ہی سے یہ بات سمجھ لینی چاہئے۔ کہ روحِ شعری اور جذبات کا خواہ کچھ ہی تعلق ہو شعر کا منظم اور موزوں طریقۂ بیان شعر کا ایک جزو لاینفک ہے جس پر تفہیم مطالب کی جمالیاتی مسرتوں کا انحصار ہے۔ آجکل کے نظریہ باز اشخاص کبھی کبھی یہ کہتے سُنے گئے ہیں۔ کہ شعر کو اسکی فرسودہ قیود سے آزاد کر دیا جائے۔ لیکن طلبگارانِ فن کی ایک کثیر جماعت ایسی موجود رہے گی۔ جو اس حقیقت کو تسلیم کرتی رہے گی۔ کہ شاعری کا لسانی ترنم اور وزن کا ربط اور نظم ہی ایسی چیزیں ہیں جو اس معنوی نشاط کی حقیقی محرک ہیں۔ جو شعر کو پڑھ کر ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی وہ عجیب و غریب چیز ہے۔ جس کی بدولت شعر کو ہمیشہ نثر پر عظمت اور فوقیت حاصل رہے گی۔ اور ہم آرنلڈ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہیں گے۔ کہ" وزن ارتقائے شعر کا ایک لازمی مرحلہ ہے"

وزن کی اہمیت بہ لحاظ جذباتِ شعریہ

اس بحث کے متعلق دوسری بات یہ ہے۔ کہ وزن صرف شاعری کا جزو ہی نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک ایسا اسلوب ہے۔ کہ روحِ شعریہ جس کی مقتضی ہے۔ اور وزن شاعری کو اظہارِ جذبات کا ایک بہترین ذریعہ عطا کر کے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

مل کہتا ہے" ابتدائے آفرینش سے انسان لطیف، عمیق اور رنگین جذبات کا اظہار منظم، مربوط اور موزوں کلام میں کرتا چلا آتا ہے۔ اور جہاں تک کہ کلام کا ترنم اور غنائی خصوصیات ہمیشہ جذبات کے عمق کی آئینہ دار رہی ہیں۔ یہ وہ نفسیاتی حقیقت ہے جو شعر میں صورت اور روح کے رشتوں کی علت غائی ہے۔ دیکھا گیا ہے۔ کہ نثر کے پرزور فقروں اور مؤثر انداز بیان میں مکمل طور پر نہ سہی جزواً شاعری کی روح جھلکیاں لیتی ہوئی نظر آتی ہے" اس کے علاوہ ہیگل نے مشاہدہ کیا کہ چند چنی تلی تراکیب کا ترنم اور موسیقیت سے بہرہ ور جا پڑھنے والے کو نشاط معنوی کی ایک رنگین دنیا میں لے جاتا ہے۔ اور یہ بات نثر کے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ لیکن ایک اطالوی فلاسفر دیفن ان تاثرات کے متعلق بحث کرتا ہے۔ جو قلب انسانی پیدا کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ان کی رائے کا مفہوم جامع اور مانع ہے۔ اور جرمنی کے ایک اور شاعر کا مقولہ اس بیان کی تصدیق کر رہا ہے۔ شلر نے گوئٹے کو لکھا کہ آجکل میں نثر کی ایک کتاب کا منظوم ترجمہ کر رہا ہوں۔ اور مجھے عمر بھر اتنا لطف نصیب نہیں ہوا جتنا کہ مجھے یہ محسوس کر کے ہوا کہ شعر میں صورت اور روح بہت نازک طور سے آپس میں ربط رکھتی ہیں۔ جب سے میں نے نثر کو منظوم کرنا شروع کیا ہے۔ میری زندگی نئے اصولوں کے زیر اثر نظر آتی ہے۔ بعض چیزیں جو نثر کی ایک کتاب میں برمحل اور مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ نظم ان کے محدود معانی کی قیود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ بلکہ اس کا تقاضا یہی ہے۔ کہ تخیل کی رنگینیوں کو الفاظ کی صورت میں گوندھا جائے۔ اور اس لحاظ سے میرے مقاصد حیات روحانی اور الہامی ہو گئے ہیں" جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے۔ یہاں مضمون نگار نے لوازمات شعری کو ایک غیر معمولی نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ کیونکہ عام طور پر ہم شعریہ جذبات کا بہترین طرز اظہار وزن ہی کو تصور کرتے ہیں۔ لیکن شلر ہمیں ایک بھولی ہوئی حقیقت یاد دلاتا ہے کہ شعر کی صورت کس قدر شاعر کے جذبات اور احساسات کی محرک ہوتی ہے۔

اب ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں۔ کہ شعر کو عام طور سے خیالات منثور کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ محاسن شعری کی فنائیت کے مترادف ہے۔ اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ قوت متخیلہ کی وجدساماں صلاحیتوں اور قلب انسانی کی لطیف وارداتوں کو نثر میں بیان کرنا شاعری کے حقوق کو الٹی چھری سے ذبح کرنا ہے۔ نثر اور نظم مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کی حیثیت مختلف ہے۔ اور دونوں کے مقاصد مختلف۔ اور ان کے درمیان امتیاز کرنا نہ صرف ضروری بلکہ اصول ادب کا یہی اقتضا ہے۔ پس یہ ایک روشن حقیقت ہے۔ کہ ایک بلند شعر صوری اور معنوی رنگینیوں کا مرقع ہوتا ہے۔

اور یہ ایک کٹھن منزل ہے۔ اور ہمیں اسپنسر کے ہم زباں ہوکر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ہوسکے تو شعر مت کہو"

اب ہم اس موضوع کو ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ وزن موسیقی کی طرح دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھدینا۔ اور ایک خاص شکل میں پیش کرنا ان کے معانی میں ایک نیا رنگ بھر دینا اور ان کے پوشیدہ پہلوؤں کو نمایاں کرنا حقیقت میں ایک ایسا جادو ہے۔ جو نثر کو نصیب نہیں ہوسکتا۔ یہ کیونکر ہوتا ؟ اور کس طرح ہوتا ؟ اس کا جواب ماہر نفسیات سے دریافت کیجئے۔ اُس کے لئے یہ ایک قابل تحقیق امر ہے۔ وہ جانتا ہے۔ کہ بعض اوقات ایک اجنبی زبان سے حسین اشعار سنے جائیں۔ تو الفاظ کا ترنم۔ وزن کا زیروبم بحروں کی روانی اور تراکیب کی پرفسوں ہم آہنگی ہی اس قدر جاذبیت کی مالک ہوتی ہے۔ کہ پڑھنے والے کے دل پر نہیں بلکہ اسکی روح کی وسعتوں پر ایک کیف بارگھٹا بن کر چھا جاتی ہے۔ اور اس وقت وہ اس حقیقت کو پہچانتا ہے۔ کہ وزن ہی کی وجہ سے شاعرانہ خیالات جذبات کی شورشوں سے آشنا ہوسکتے ہیں۔ اور وزن کی چند اصناف جنکو شاعر اظہار جذبات کا فطری ذریعہ سمجھتا ہے۔ پڑھنے والے کے دل پر اپنا اثر ڈالنے کے لحاظ سے اور اپنے فنی لوازمات کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ جیمز منٹگمری لکھتا ہے" اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ شاعری کی قوت کا وزن کے بہترین انتخاب پر کتنا انحصار ہے۔ تو ہم تجربے کے طور سے شکسپیر اور ملٹن کی ابیات کا نثر میں بکھیر دیں۔ اور پھر نظم کرنا چاہیں۔ یہ کوشش بالکل اسی طرح ہوگی۔ جیسے کوئی شبنم کے ان قطروں کو اٹھانا چاہے۔ جو سبز گھاس پر موتی بنکر چمکتے ہوں۔ لیکن ہتھیلی پر پانی ہوکر بہ جاتی ہوں ان کا جوہر اور عناصر تو قائم رہتا ہے۔ لیکن ان کی تابانی خوشنمائی اور ظاہری شکل کافور ہو جاتی ہے"۔ پس ایک بار پھر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ وزن شعر کا کوئی رسمی قابل ترک اور نمائشی پہلو نہیں۔ بلکہ یہ روح حقیقی کی بہترین تخلیق ہے اور شاعری کو یہ لحاظ فن ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔

ہلدی گھاٹ کی سرزمین

از پرنسپل رام پرشاد صاحب کھوسلہ ناشاد ایم اے

یہی وہ سرزمیں ہے جسمیں ہلدی گھاٹ کا رن تھا   یہی خطّہ ہے وہ جسمیں جوانمردوں کا مدفن تھا
دکھائے تھے یہاں پرتاپ نے تلوار کے جوہر   لٹائے جاں نثاروں نے یہاں تھے جان کے گوہر
پہن کر زعفرانی پگڑیاں گھمسان میں اُترے   وہ گویا باندھ کر سر سے کفن میدان میں اُترے
قدم پیچھے ہٹا اُن کا نہ ہرگز جان کی خاطر   وہ اپنے آخری دم تک لڑے ایمان کی خاطر
یہ بھومی دیوتاؤں کی یہ مسکن راجپوتوں کا   ملا ہوگا لہو اس خاک میں کتنے سپوتوں کا
وطن کے آستانے پر یہاں سر کٹ گئے کتنے   یہاں کی داستاں سُن کر کلیجے پھٹ گئے کتنے
لکھے ہیں کارنامے اِن شہیدوں کے چٹانوں پر   چمکتے ہیں شہادت کے نشاں اُجڑے مکانوں پر
یہاں کے ذرّے ذرّے میں بھری اُلفت وطن کی ہے   یہاں کے تنکے تنکے میں بسی خوشبو چمن کی ہے
اجل کی گود میں سو کر بھی وہ زندہ رہے ابتک   فلک پر مہر و مہ ہو کر وہ تابندہ رہے اب تک
نہ کر دل سے فراموش اے بشر تو ان کی ہستی کو   حقارت سے نہ دیکھ اے آسماں تو اِنکی بستی کو
زمیں گر بھول بھی جائے فلک ہے پاسباں اِن کا   رہے گا تا ابد ناشاد دنیا میں نشاں اِن کا

کہ اِن کی موت رازِ ہست کی شرح مکمّل ہے
کتابِ زندگی میں ان کا خوں رنگین جدول ہے

حضرت امیرؔ مینائی کا رنگِ تغزل

از منشی دیبی پرشاد سریواستو منشی وکامل

امیر الکلام حضرت امیرؔ مینائی دُنیائے علم وادب میں اپنی مختلف خصوصیاتِ گوناگوں وکمالات رنگارنگ کے اعتبار سے جو فضیلت ومرتبت رکھتے ہیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ بارہ سال کی عمر ہی سے بغیر کسی کی فرمائش کے اشعار نظم کرنے لگے تھے۔ یہ خیال کہ حضرت امیرؔ مفتی تھے انھیں شاعر نہ ہونا چاہئے تھا اصلیت سے دُور ہے۔ یہ انتہائی کمال ہے کہ ایک طرف اُن کی فاضلانہ ہستی اپنے مفتیانہ مسائل کے حل میں مصروف اور اپنے فرائضِ عالمانہ کی تکمیل پر آمادہ رہتی تھی تو دوسری طرف ادب نواز فطرت اور بجت و وجدت میں محو ومستغرق دل نغمات سرور انگیز بلند کرنے میں منہمک۔ شاعری کی کامیابی اُسی حالت میں ممکن ہے جبکہ ایک شاعر اُس کے تمام پہلوؤں اور فنِ سخنوری کے تمام اسرار سے کماحقہ واقف ہو کر اُس کے نکات ورموز پر حاوی ہو، اِس حیثیت سے امیرؔ مینائی کا ذخیرۂ کلام سامنے رکھئے تو انصاف کی نظریں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہونگی کہ فنِ شعر پر اُنھیں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔

تغزل اُردو غزل پر عام طور پر یہ اعتراض ہے کہ وہ عشق ومحبت کے غیر فطری جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے لیکن یہ کلیہ کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں اور بعض دیگر اہلِ کمال کی طرح حضرت امیرؔ نے بھی ثابت کردیا ہے کہ غزل کا دائرہ صرف حسن وعشق کے مضامین کے لئے تنگ اور مخصوص نہیں۔ اس میں حکمت ومعرفت اور فلسفہ وتصوف کی چاشنی سے بھی رنگ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ صرف اسلوبِ بیان سے دلکشی اور لطافت پیدا کرکے غزل کی نزاکت کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ مگر یہ امر بھی حقیقت سے دُور نہیں کہ غزل کا مفہوم اصلی حُسن وعشق کے لئے کسی حد تک مخصوص ضرور ہے اِس سے مراد صرف یہ ہے کہ حسن وعشق کے مضامین جب نظم کے قالب میں ڈھلتے ہیں تو غزل کی شکل اختیار کرتے ہیں، یہ مقصد نہیں کہ غزل میں سوائے اِن خیالات وجذبات کے دیگر مضامین کا اظہار ہی منع ہے۔

وارداتِ حسن وعشق سے کسی متمدن قوم کی شاعری خالی نہیں کیونکہ حُسن وعشق ہی پر مدار کائنات ہے۔ عشق وہ جذبۂ صداقت ہے جس کے بغیر اِنسان اِنسان کہلانیکا مستحق نہیں۔ حُسن وعشق سے کائنات کا ذرہ ذرہ معمور ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ جذبۂ صادقہ (عشق) صرف عشق ہی رہے۔ اہل ہوس خواہش کا

نامِ عشق اور نمایش کا نام حُسن رکھ کر حُسن و عشق کی مٹی خراب کرتے ہیں۔ اس کا فنِ شاعری جیسا فنِ شریف ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا۔ اِس لئے غیرِ فطری ہونیکا الزام بھی کسی حد تک صحیح نہیں اور محض غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

متذکرہ بالا بحث کو سامنے رکھکر حضرت امیر مینائی کی شاعری کے دفاتر کے مطالعہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ حقیقتاً وہ ایک کامل الفن اور بلند پایہ شاعر تھے اور غزل کو اُنھوں نے جن مضامین دلکش و لطیف سے سجا کر اپنی کامیاب ترین عشقِ سخن کا ثبوت دیا۔ وہ اُنھیں کا حصّہ تھا۔

ملاحظہ ہو جذباتِ عشق و محبت کے اظہار کے لئے زمینِ غزل کو کس طرح کامیاب بنایا ہے ؎

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — میرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

خوگرِ جورِ محبت کی عالی حوصلگی کی اعلےٰ ترین مثال ہے۔ کس لطیف پیرایہ میں کس پاکیزہ جذبہٗ محبت کو بیان کیا ہے ؎

پھنسی جو دام میں بُلبل تو کن نگاہوں سے — کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا

عشق کی دشوار گذار راہوں سے ناآشنا دل جب پہلے پہل اِس وادی میں قدم رکھتا ہے تو مشکلات کے اندازہ سے اُس کے نوگرفتار دل کی کیا کیفیت ہوجاتی ہے۔ اِس آسان اور دلکش طرز میں اُس واقعہ کی تصویر کھینچنا امیر الکلام کے ہی شایانِ شان تھا۔ نوگرفتارِ دامِ محبت کے حسیات کا اظہار اِس سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ "کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا" یہ ہے اُردو شاعری کا شباب ؎

امیر ایسی کہاں قسمت جو پہونچوں اُڑ کے پھولوں تک — کبھی چاکِ قفس سے جھانک لیتا ہوں بیاباں کو

گرفتارِ محبت کی مایوسی اور بے بسی کا بیان کسقدر رقت انگیز اور دلگداز ہے ؎

رہ رہ کے ایک کھٹک سی سینہ میں ہو رہی ہے — شاید ابھی ہے باقی ٹکڑا کوئی جگر کا

کیسے سادہ الفاظ میں داستانِ محبت کے ایک ناقابلِ تشریح ٹکڑے کو بیان کردیا ہے ؎

تم دُکھاتے تو ہوا امیر کا دل — اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ یہ ہے رنگِ استادی! اِس کا فرِ حقیقت کی تشریح نہیں ہوسکتی ؎

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے — شمع کی سرگذشت کون سُنے

دفورِ جذبات کی اِس سے بہتر مثال کیا ہوگی ؎

بے قراری نے بدلوائی تو کروٹ بدلی — دردِ دل نے جو مدد کی تو میں بستر سے اُٹھا

یہ ہے اُردو و تغزل کی کامیاب مثال جس پر بے اختیار آہ نکلتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ

جذبہ عشقِ صادق کا جذبہ حقیقی نہیں ؎

کرتے ہیں جو لوگ ذکر اُن کا　　ایک ایک کا منھ میں دیکھتا ہوں

اس پر محبت کی مجبوری و ناکامی کی تصویر کن قیامت خیز و محشر زا الفاظ میں قلمبند فرمائی ہے،
زہے شانِ امیر الکلام ؎

ہزار طرح کے ہوتے ہیں وہم ہم کو امیر　　کسی کی آنکھ جہاں ہم پُرآب دیکھتے ہیں

کس بسیط داستان کو دو مصرعوں میں اِس آسانی سے ادا کر دیا، سبحان اللہ! اور محبت کی جس آخری منزل کا ذکر ہے شرح نہیں کی جا سکتی۔ ذیل میں اسی نوعیت کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو عشق و محبت کی جیتی و جاگتی تصویریں اور حُسن و عشق کی تاثیر کی دلکش داستانیں ہیں گویا ہر ہر شعر درد و اثر۔ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا نشتر ہے ؎

خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیر　　کیوں میری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے
ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی　　نگہ نیچی کئے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں
میں جو ہر ایک سے خطا اپنی بیان کرتا ہوں　　ہے یہ مطلب کہ اُسے کوئی ستمگر نہ کہے
جانے ہیں جو صبر و ہوش جائیں　　ہم کو اے درد تو بہت ہے
بیخود ایسا ہوں کسی کی لذتِ تقریر سے　　پہروں کرتا ہوں خموشی کا گلہ تصویر سے

معاملہ بندی اور شوخی ایک رنگِ سخن جو بہت لطیف اور دلچسپ ہوتا ہے یہ بھی ہے کہ شاعر کی شوخیٔ مزاج شعر سے ظاہر ہو۔ جس شاعر کی طبیعت میں میر کی طرح درد موجزن ہوتا ہے وہ اس قسم کی شوخیوں پر قادر نہیں ہو سکتا۔ مگر دُنیا میں بعض شعراء ایسا جامع دماغ رکھتے ہیں کہ دونوں متضاد کیفیتوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ امیر الکلام کے کلام میں جہاں مضامین عالی اور خیالات بلند پائے جاتے ہیں۔ وہاں رنگ آمیزی اور شوخی بھی غضب کی ہے۔ درد و محبت کی آمیزش قابل داد ہے معاملات حُسن عشق کو اس دلآویز انداز میں نظم کیا ہے اور سلیس و سادہ طرزِ ادا نے وہ رنگ پیدا کر دیا ہے، جسے شاعری اور خالص تغزل کی جان کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

وصل کو اُن سے جو کہیے تو کریں وعدۂ حشر　　کہیے قتل کی خواہش تو ابھی حاضر ہیں
روز آنے کو جب کہا بولے　　اک تمہیں مجھکو پیار کرتے ہو
مرا خط پھینک کر قاصد کے منھ پر طنز سے بولے　　خلاصہ سارے اس طومار کا یہ ہے کہ "مرتے ہیں"
مرے مرقد کو ٹھکرانے قیامت بنکر آتے ہیں　　پڑا ہوں میں یہاں آکر تو مجھکو یوں ستاتے ہیں

مری صورت جو بدلی فرطِ غم سے ‏ ‏ تو وہ بولے کہ اچھا روپ بدلا

تشبیہات | آپ کے یہاں تشبیہات اِسقدر لطیف اور جدید ہیں کہ کسی دیوان میں اتنی کثرت نہیں ہے ذیل کا ہر شعر سامانِ تغزل کی سجی ہوئی دکان ہے۔ اور ایک شاعرِ کامل کی قادر الکلامی کا لطیف نمونہ ؎

شفقِ شام نہیں ہے یہ میرے ماتم میں ‏ ‏ مُنھ کو آیا ہے کلیجہ شبِ تنہائی کا

نہیں ہے مُہر لفافہ پہ خط کے اے قاصد ‏ ‏ یہ داغ ہے مری قسمت کی نارسائی کا

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے مُنھ سے کچھ نہ بول ‏ ‏ آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہن تصویر کا

تشبیہ و استعارہ میں آپ نے ایک خاص ترکیب ایجاد کی ہے وہ اِسقدر نازک ہے کہ اُس کی نقل کرنا بھی مشکل ہے اور اِس نوعیت کے یہی موجد ہیں اور یہی خاتم۔ وہ صورت تشبیہ یہ ہے کہ مشبہ کو مشبہ کے قبضہ میں دیدیتے ہیں اور اُسے اسکا مالک بنا دیتے ہیں۔ مثلاً "برق تجلی" مشبہ ہے "اور شعل" مشبہ بہ آپ نے برق تجلی کو مشعل افروز بنا دیا ہے ؎

اِس شان سے ہم آئے تیری جلوگاہ میں ‏ ‏ شعل دکھائی برقِ تجلی نے راہ میں

یا چینِ جبیں سے چھُری کو تشبیہ دیجاتی ہے مگر منشی امیر احمد صاحب نے چھُری چینِ جبیں کے قبضہ میں دے دی ہے ؎

رُکا خنجر جو دستِ نازنیں سے ‏ ‏ چھری جھنجھلا کے لی چینِ جبیں نے

رندی و سرمستی | مے و مینا کی رنگین داستانیں جہاں حضرت امیر نے بیان کی ہیں۔ ہر شعر بجائے خود صہبائے مینائی کا پرکیف ساغر ہے۔ رندی و سرمستی کے تذکرے ذیل کے اشعار میں پڑھکر اہلِ ذوق کے دماغ سُرور و کیف سے مخمور ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

وہ مست ہوں کہ ساغرِ مے جب میں پا گیا ‏ ‏ اک بار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

مسجد میں بُلاتا ہے ہمیں زاہدِ نافہم ‏ ‏ ہوتا کچھ اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے ‏ ‏ پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہوں میں

زاہد! امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے ‏ ‏ پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

سادگی و سلاست اور سہلِ ممتنع | زبان کی سلاست و سادگی اور لطیف طرزِ ادا کے لئے تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ حضرت امیر کے کلام کا کیا پایہ ہے۔ ہر ہر شعر اُن کے ذخیرۂ کلام کا ان خصوصیات کا آئینہ ہے اور اعلیٰ کیفیات کا نمونہ ؎

پہلے تو مجھے کہا نکالو ‏ ‏ پھر بولے غریب ہے بُلالو

دل ٹھہر جائے یہ اُمید نہیں ایسے بگڑے کہیں سنورتے ہیں

کس پُر لطف انداز میں مصرعہ ثانی میں پورا محاورہ نظم ہوا ہے۔

سہل ممتنع میں علاوہ کثرتِ معانی کے ایک صورت یہ بھی ہے کہ اُسمیں معناً عمق ہو اور تخئیل جسقدر وسیع اور نادر ہو اُسی قدر صفائی وسلاست ہو۔ ایسے اشعار میر، مومن اور غالب کے یہاں بہت ہیں۔ حضرت امیر کا کلام اِس رنگ میں بھی بہت کافی ہے ؎

بڑی پیچ در پیچ تھی راہِ دیر خدا ہم کو لایا خدا لے گیا

دیر سے مقصود عالمِ شہود۔ اُس کے حوادث میں ابتلا و گرفتاری ظاہر ہے اور اُس سے بچ کے صاف نکل جانا خدا ہی کی مدد پر موقوف ہے۔ نثر میں تشریح کرنے سے وہ لطف پیدا نہیں ہوسکتا، جو خود اِس شعر کے پڑھنے میں ہوتا ہے ؎

نامہ بر میں جانتا ہوں پر بتا سکتا نہیں دل میں ہے لب تک نہیں آتا نشانِ کوئے دوست

اِس شعر کے دونوں مصرعے صنعتِ ابہام سے معمور ہیں۔ "بتا سکتا نہیں" اور "لب تک نہیں آتا نشانِ کوئے دوست"۔ علاوہ پہلوئے رشک کے ایک خاص معنی اِس شعر کے یہ ہیں کہ معشوقِ حقیقی کا مقام اگر متعین کردیا تو اُس کی ذات محدود ہوجاتی ہے ؎

آئینہ کی آنکھ سے لڑتی ہے جب عاشق کی آنکھ چاہتی ہے چھین لے لذت ترے دیدار کی

اِس قدر صاف کہ سہل ممتنع اور اِسقدر نیا کہ آج تک یہ مضمون نظر سے نہیں گذرا۔ بلاغت اِسمیں یہ ہے کہ آئینہ بے روح ہے اور چشمِ عاشق ذی روح۔ اس کے دیدار کی لذت اِسقدر موثر ہے کہ آئینہ جب اپنے آپ میں وہ کیفیت نہیں پاتا تو زبانِ حال سے لذتِ دیدار چشمِ عاشق سے طلب کرتا ہے۔

حضرت امیر شمع اور آئینہ کے مضامین میں اپنا مثل ونظیر نہ رکھتے تھے۔ اِسی رنگ میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ یہ شعر اگرچہ نیا نہیں کیونکہ مولانائے رومؒ فرما گئے ہیں ؏

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من

مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جس تبدیلی سے اِس شعر میں جدت پیدا کی گئی ہے، وہ تبدیلی کسقدر ضروری اور زمانۂ حال کے مطابق ہے ؎

آئینہ ہوں میں شاید جو دیکھتا ہے مجھکو ہندو ہو یا مسلمان اپنا سا جانتا ہے

اس شعر میں مصرعہ اولیٰ اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ تشبیہ مولاناؒ کے شعر میں نہیں ہے۔ میں مثل آئینہ ہوں جو مجھے دیکھتا ہے اپنا سا سمجھتا ہے۔

افسانۂ سنگ و تیشہ ہے اور یاں محبتِ ناخن و جگر ہے

جسقدر فصیح ہے اُسی قدر بلیغ - فرہاد کا مشغلہ تیشہ زنی و کوہ کنی - یہاں جگر کاوی اور ناخنِ غم سے خراشں ہے - وہاں پہاڑ پر تیشہ زنی ہوتی تھی - یہاں اپنے ہی جگر پر - ظاہر ہے کہ اِس دلخراشی کا اثر کسقدر جانکاہ ہے - محاکات - بلاغت - رفعت - جدت و وسعتِ تخیل کی ہزاروں مثالیں آپ کے کلام میں موجود ہیں - آپ نے غزل میں سادہ و سلیس و دلکش مضامین کو سجانے کیسا تھ بلیغ و نادر خیالات جدت و ندرت کے ساتھ نرالے انداز میں نظم کر کے ثابت کر دیا ہے کہ ایک قادرالکلام شاعر محض حُسن و عشق کی معاملہ بندی تک ہی اِس وسیع دائرہ کو محدود نہیں رکھتا بلکہ رفیع خیالات اور اعلیٰ جذبات - ندرتِ اسلوب اور جدتِ تراکیب سے ادا کر کے غزل کی نرالی شان پیدا کرتا ہے - ملاحظ ہو - فرماتے ہیں ؎

ایک جا رہے ہمیشہ مگر مثل رنگ و بو ہم سے نہ وہ ملے نہ کبھی اُن سے ہم ملے

اِس شعر کو جدت نے بہت بلند کر دیا ہے - اِسی چمنِ دہر میں معشوق بھی ہے اور عاشق بھی مگر دونوں اِسی طرح الگ الگ رہے جس طرح رنگ و بو - ہر چند کہ دونوں ایک ہی گلستان میں رہتے سہتے ہیں مگر اس تفرقہ کی مثال رنگ و بو سے - اِسے سوائے الہام کے اور کیا کہا جائے - اِس شعر کی تشبیہہ و تمثیل تعریف سے مستغنی ہے ؎

تیز یوں دل ترے کوچہ کی طرف جاتا ہے جس طرح تیر کوئی سوئے ہدف جاتا ہے

بعض اشعار اِسی رنگ سہل ممتنع میں ایسے ہیں کہ معنوی نزاکتیں اور عمق تو کم ہے مگر وسعت زیادہ ہے جس طرح ایک سمندر زیادہ گہرا تو نہ ہو مگر پاٹ اِسقدر چوڑا ہو کہ ساحل نظر نہ آئے ؎

امید جواب کی ہو کیا خاک جب اِس سے نہ ہو سوال ممکن

علاوہ محاکات کے معشوق کے وقار کا ایک کوہستان اِس شعر سے نظر کے سامنے آجاتا ہے اِس شعر کے معنی میں یہ مفہوم بہت وسیع ہے کہ رُعب و اقبال - ناز و تمکین اور نہ معلوم کتنی صفات معشوق سوال کو مانع ہیں - محاکات کا ایک شعر اور ملاحظ ہو ؎

کرتے ہیں جو لوگ ذکر اُن کا ایک ایک کا منھ میں دیکھتا ہوں

اِس سے عمدہ اور بہتر محاکات کی کیا مثال ہو سکتی ہے - ایسے اشعار جن میں مضامین نئے ہوں یا تشبیہیں جدید ہوں اور صفائی و وضاحت سے نظم ہوں - انتہائی قادرالکلامی اور مشق کا نتیجہ ہیں - ایسے اشعار بھی سہل ممتنع کم نہیں ہوتے - حضرت امیر کی قادرالکلامی ہر ہر قدم پر سر اٹھا اٹھا کر

کہتی ہے ؎

کیا تعجب ہوا آنکھوں نے اگر جان لیا دِل نے دیکھا نہیں اِس پر تجھے پہچان لیا

جدت و ندرت ملاحظہ ہو ؎

رو سیاہ جرمِ الفت بے قصور آیا نظر سطرِ قرآں کی طرح ظلمت میں نور آیا نظر

کیا بے مثل ثبوت ظلمت میں نور کا دیا ہے۔ سطرِ قرآں ایک الہامی تشبیہہ ہے ؎

دونوں ہیں اُدھری سے گر فرق ہے تو اتنا تقدیر بنا دی ہے تدبیر بنا دی ہے

اِس مطلع کی وسعت بھی دیکھنے کے قابل ہے ؎

تو وہ بت ہے کہ تجھے ساری خدائی چاہیے بندہ اللہ سے کس کس کی برائی چاہیے

سہل ممتنع اور جدتِ مضامین سے بھی زیادہ مرتبہ اگر کسی نوعیت کا ہو سکتا ہے تو وہ تاثیر کا۔ فی الحقیقت جس شاعر کے کلام میں اثر نہیں ہے۔ اس کا جسم شعر بے روح ہے۔ حضرت امیر کے یہاں ایسے بکثرت اشعار موجود ہیں۔ جو تاثیر و تاثر کی روح و جان ہیں۔ چند شعر بطور نمونہ ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

ہونٹوں پہ دم ہے لیکن دل میں یہی ہے حسرت دو حرف اُن کے مُنہ کے سُن لیتے ہم کسی سے

پنہاں جو سوزِ عشق کرے مرد ہے وہی دل گو پھک گیا نفس سرد ہے وہی

میر کا شعر بھی اِسی رنگ اور اِسی مضمون کا ہے ؎

عاشق ہیں ہم تو میر کے اِس ضبطِ عشق کے دِل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

دونوں کا امتیاز اور مطلع و شعر کا فرق اظہار سے مستغنی ہے ؎

اپنی کہو گذرتی ہے کس طرح اے امیر ہم ہیں فقیر لوگ ہماری بھلی کہی

لہو رو، آنسوؤں کا قحط اگر ہے اسی دِن کے لئے خونِ جگر ہے

حضرت میر کا ایک شعر مشہور ہے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے (میر)

اِس پر سودا نے کہا کہ میر کی دایہ نے میر کو سُلا دیا تھا۔ اور سودا نے اِس مضمون کو یوں ادا کیا ؎

سودا کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اِس پر اُس سے زیادہ اعتراض ہوتا ہے کہ سودا کا دماغ اِسقدر بھدّا تھا کہ شورِ قیامت پر بھی آنکھ نہ کھلی اور "خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے"۔ مفتی صاحب نے بھی کہا ہے ؎

شورِ محشر امیر کو نہ جگا سو گیا ہے غریب سونے دو

اِس میں یہ گنجایش باقی ہے کہ ابھی شور اُٹھا نہیں ہے مگر سوداؔ تو یہ کہتے ہیں کہ ع

سوداؔ کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت

اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

اِس کی پروا کچھ نہیں تکلیف یا آرام ہے　　اے غمِ جاناں مجھے تیری خوشی سے کام ہے

بے سبب نالاں نہیں میں یار کے در پر امیرؔ　　آشنا کرتا ہوں اس کو درد کی آواز سے

تیرے وعدے پہ شاد ہوں کیونکر　　اپنی قسمت کو جانتا ہوں میں

اے عمرِ رفتہ کہہ دے یارانِ رفتہ سے تو　　بچھڑے ہوئے تمھارے تمکو پکارتے ہیں

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت امیرؔ کی قادر الکلامی کا پایہ کیا تھا۔ اور زبان کی چاشنی کے ساتھ بلندئی جذبات و رفعتِ خیال کے اظہار پر انھیں کس درجہ قدرت حاصل تھی۔ امیر الکلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اُنھوں نے تنوع و رفعت و ندرت و جدت پیدا کرکے شانِ قادر الکلامی کا اظہار کیا اور درجۂ امتیاز حاصل کرکے صفِ معاصرین میں سب سے اوّل رہے۔

حضرت امیرؔ نے اسرارِ علیہ و محسوسانہ حکیمانہ کو ایسے لطیف اور سلیس پیرایہ میں غزل کے رنگ میں سمویا ہے کہ سبحان اللہ! دو چار شعر تفنن طبع کے لئے ملاحظہ ہوں ؎

لاشں پہ عبرت یہ کہتی ہے امیرؔ　　آئے تھے دُنیا میں اس دن کیلئے

کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ کی مکمل تشریح دو مصرعوں میں ہو گئی ؎

زبان ضعفِ پیری میں چلتی رہی　　سحر ہو گئی شمع جلتی رہی

عالم پیری کی تصویر کس انداز میں کھینچ دی ہے ؎

لذتِ شرمِ گنہ تھی کب فرشتوں کو نصیب　　یہ مزا چکھنے کو پیدا خلق میں آدمؔ ہوا

فطرتِ عاصی کا گناہوں پر شرمندہ ہونا اور رحمتِ غفور کا جوش میں آنا عید گنہگار کے لئے ایسی ناقابل بیان کیفیت ہے جو صرف انسان کو ہی نصیب ہوئی۔ ملائک بھی اِس" لذت" سے محروم رہے۔ رشکِ ندامت کا رتبہ کسقدر بلند ہوا ہے۔ سبحان اللہ۔

غرض حضرت امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی اُن چند شعراء میں ہیں، جن کا رنگِ تغزل ہمیشہ قائم رہے گا۔

اِندر دیوتا

(ترجمہ از سید مقبول حسین احمد پوری بی۔اے۔ ایل ایل بی)

(یہ نظم رگ وید کی ایک حمد کا ترجمہ ہے جس کو مشہور مورخ رومیش دت نے انگریزی میں بہ عنوان "Hymn to Indra" نظم کیا ہے۔ اب ہمارے کرم فرما سید مقبول حسین صاحب احمد پوری نے قدرے تصرف کے ساتھ اس کا ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا ہے جو شکریہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس نظم میں قدیم آریہ قوم کے مذہبی عقائد اور اُن کے جذبات کی کچھ جھلک نظر آتی ہے۔ ا۔ ز)

اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۱

سب سے بلند اور سب سے اعلیٰ　　تخت ہے اُس کا بادل کالا
سب سے زیادہ قوت اُس کی　　سب کے دلوں میں عظمت اُس کی
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۲

پربت اور پہاڑ بنایا　　ہلتی دھرتی کو ٹھہرایا
نیلا نیلا گنبد اوپر　　چار طرف سے صاف برابر
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۳

اَندر اُس کا باہر اُس کا　　ندی اُس کی ساگر اُس کا
بجلی اُس کے اشاروں میں ہے　　سورج عہدہ داروں میں ہے
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۴

گائے بنائی دودھ پلایا بَیل بنا کے رتھ کو چلایا
گھوڑا اُس کا اُسی کا ہاتھی وہی لڑائی میں بھی ساتھی
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۵

بستی اور بیاباں اُس کے کھیت پہاڑ اور میداں اُس کے
اُسکی دَیا سے بادل چھائے جَل تھل ساگر اُس نے بنائے
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۶

رِترا سے پانی برسایا داسوں کا اَبھمان مٹایا
ہے اُس کا ہتھیار نرالا جی لیوا ہے اُس کا بھالا
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۷

سنکھ میں ہے آواز اُسی کی تیر میں ہے پرواز اُسی کی
اُس کا قابو سب کے اُوپر ہے وہ سب کے اندر باہر
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۸

داسوں کو دھرتی سے مٹایا آریہ لوگوں کو پھیلایا
ہے نیکوں کا وہی سہارا اُسی نے رِدھِن کو بھی مارا
اِندر دیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۹

وَیدک گیان ہے اُس کا گانا سوما رس اُس کا نذرانہ
اُوشا اُس کی پریم سہیلی سب سے نرالی اور البیلی

اِندر دَیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۱۰

راجہ پرجا اُس کے پجاری ہم اور تم سب اُس کے بھکاری
یہ نہ سمجھنا اِندر نہیں ہے اُسی کی چھایا ساری زمیں ہے

اِندر دَیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

۱۱

دھرتی اور آکاس کا مالک سب کے دل کی آس کا مالک
مَنتر[1] پڑھو توصیف میں اُسکی گاؤ بھجن تعریف میں اُس کی

اِندر دَیو کی شکتی پربل
راج ہے اُس کا بادل بادل

جذباتِ منوّر

از حضرت منوّر لکھنوی

مرے اشکوں کی طغیانی سلامت اِسی دریا میں بہنا چاہتا ہوں
جگر میں گو سکت اتنی نہیں ہے مگر ہر چوٹ سہنا چاہتا ہوں
بہت ہوتی ہے خاموشی سے اُلجھن مگر خاموش رہنا چاہتا ہوں
ہے کچھ ایسی ہی میرے دل کی بیتی کہ تنہائی میں کہنا چاہتا ہوں

[1] مَنتر نہ کہ منتر۔ اصل سنسکرت تلفظ یعنی "م" متحرک اور باقی سب حروف ساکن۔

پسِ پردہ

از ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ صاحب

منورما کے والد لالہ کشن چند تھے لیکن ماں کا نام کسی کو وثوق کے ساتھ معلوم نہ تھا۔ اس قسم کی باتوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں نے البتہ بڑی چھان بین کے بعد پتہ لگالیا تھا کہ اس کی ماں کا نام کملا تھا۔ لالہ کشن چند اور کملا میں دلی محبت کے علاوہ بظاہر کوئی باقاعدہ رشتہ نہ تھا، اور منورما اُس محبت کی یادگار تھی۔

لالہ کشن چند نے منورما کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ختم کرنے کے بعد وہ اسکول میں داخل ہوئی۔ لالہ جی خود اُس کو بڑی توجہ کیساتھ دو گھنٹے روزانہ پڑھاتے تھے۔ اپنے کلاس میں ہمیشہ اوّل آنیکا سہرا منورما ہی کے سر رہتا تھا۔ اُس کو موسیقی سے بھی دلی لگاؤ تھا، چنانچہ شہر کے سب سے بڑے اُستاد جی لالہ جی کی نگرانی میں اُس کو گانے بجانے کی تعلیم دیتے تھے۔

کالج میں پہونچتے ہی منورما کے حُسنِ خداداد نے وہاں کی فضا میں ایک ہلچل پیدا کردی۔ درجنوں ٹی پارٹیوں کے کارڈ اُسے روزانہ موصول ہوتے تھے اور بعض حضرات کو تو منورما کے جوابی خط کا تصور ہی دل خوش کُن ہوتا تھا۔ لیکن ستم ظریفِ منورما لالہ جی کی طرف سے پوری آزادی ملنے پر بھی ان دعوتوں میں کبھی نہ شریک ہوتی تھی اور شکریہ کے طور پر کسی کو دو سطر لکھنا بھی اُسے گوارا نہ تھا۔

اس شعلۂ حُسن کا طواف کرنیوالے پروانوں میں ڈاکٹر جھا کا نام نامی خاص طور پر قابلِ ذکر تھا۔ ڈاکٹر جھا ایک شکیل، خوش قامت نوجوان تھے جو ولایت سے لٹریچر کے ڈاکٹر ہوکر آئے تھے، اور مقامی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے شاخ کے بجائے جڑ ہی پکڑنا مناسب سمجھا۔ لالہ کشن چند سے ایک پکچر ہاؤس میں اُن کا رسمی تعارف ہوا۔ اُنھوں نے اپنی حُسنِ لیاقت کی بدولت لالہ جی پر وہ سکہ جمایا کہ رشتۂ اتحاد روز بروز مضبوط ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ ڈاکٹر نے اپنی محبت کا ایسا گہرا نقش جمایا کہ اگر کبھی اتفاقاً وہ کشن چند کے یہاں نہ جاتے تو لالہ جی فوراً اپنی کار بھیجتے اور آدمی پر آدمی دوڑاتے۔ وہ منورما کی شادی سے بے نیاز ہوگئے تھے منورما ڈاکٹر کی طرف خاص طور پر متوجہ ہوگئی۔ اُن کے جاتے ہی وہ ایک کمی محسوس کرنے لگتی جو دوسری طرح پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ وہ ڈاکٹر سے کھُل کر ملتی تھی کیونکہ اُسے اپنانے کے لئے اُنھوں نے مناسب طریقہ پر سلسلہ جنبانی کی تھی۔

ایک دن موقعہ مناسب سمجھ کر لالہ کشن چند نے اپنے مختصر حالات ڈاکٹر سے بیان کئے اور زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

گرمی کے دن تھے۔ ڈاکٹر جھا اپنا بہترین سوٹ پہن کر آئے تھے۔ بی۔ اے پاس ہونے کی خوشی میں آج منورما نے اُن کو دعوت دی تھی۔

لالہ کشن چند نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "آگئے بیٹا۔ منورما نے تو بی۔ اے پاس کرلیا نہ؟ اخبار میں نام نکلا ہے۔"

"جی ہاں"۔ ڈاکٹر نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا۔ "مبارکباد عرض کرتا ہوں، غالباً اسی خوشی میں چائے پی رہا ہوں"۔

"بیٹھو۔ ابھی مٹھائی منگاتا ہوں۔ آج کا دن بڑا مبارک ہے، میں اپنی منورما کو تمہیں سونپتا ہوں، اسے قبول کرو"۔ کہتے ہوئے لالہ کشن چند نے بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر کے ہاتھوں میں دیدیا۔

ڈاکٹر کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھل اُٹھا۔ اُس نے آہستہ سے منورما کا ہاتھ دبا دیا۔ اور منورما نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں۔

دوسرے دن لالہ جی نے بنگلہ خالی کردیا۔ ڈاکٹر جھا اور منورما ایک ساتھ رہنے لگے۔

محبت ریگستان کا آدھ کھلا پھول ہے۔ عورت اپنے دامن سے اُسے ہوا دیتی ہے اور مرد اُس کی جڑ میں جوانی کا رس ٹپکاتا ہے۔ پھول رات کے بھیانک سناٹے میں کھل اُٹھتا ہے۔ مگر آنکھ کھلتے ہی پچھلے پہر کی دلچسپیوں کو ختم ہوتے دیکھ کر بے اختیار چلاتا ہے۔ "پیاری دُنیا تو اپنی رنگینیوں کو اتنی جلدی نہ سمیٹ میں نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہے"۔ ٹوٹنے والا تارا اُس کے بھولے پن پر ہنستا ہوا دُنیا کی بے ثباتی ظاہر کرتا ہے۔ پھول دم بخود ہوکر نکلتے ہوئے سُورج کو حسرت کے ساتھ دیکھتا ہے اور دُنیا کی نیرنگی میں محو ہوجاتا ہے۔ یکایک مرد کی ظالم نگاہ دھوپ میں چمکنے والے پھول پر پڑتی ہے اور اُس کو وہ صرف اپنی ریاضت کا پھل سمجھ کر بیدردی کے ساتھ شاخ سے جُدا کرلیتا ہے۔ عورت ہاتھ ملتی رہ جاتی ہے۔ پھول کی رنگینی ختم ہوتے ہی مرد اُسے مٹی میں ملنے کے لئے پھینک دیتا ہے۔

جب تک چڑیا اونچی ڈالیوں پر پھدکتی رہتی ہے، صیاد اچھا سے اچھا دانہ اور صاف سے صاف پانی چمکدار پیالیوں میں اُس کے سامنے رکھتا ہے۔ مگر پنجرے کی چڑیا کو وہ دانہ پانی نہیں ملتا۔ "اختیار" فرض کے احساس کو دل سے یکقلم محو کرکے ہمیں ظلم و ستم کی تعلیم دیتا ہے۔ ہم مظلوم کے ساتھ اگر کبھی انصاف سے

پیش آتے ہیں تو اُسے "رحمدلی" سے منسوب کرتے ہیں۔

رفتہ رفتہ ڈاکٹر جھا منورما سے کھنچنے لگے۔ اُن کو اس بات کا غرور تھا کہ اگر وہ منورما کا ہاتھ نہ پکڑتے تو وہ یقیناً تحت الثریٰ کو پہونچ گئی ہوتی۔ منورما بڑی دریا دلی سے اُن کے اس احسان کو مانتی، لیکن اُس کے ساتھ ہی وہ اس احسان کو بھی فراموش نہ کر سکتی تھی جو اُس نے ڈاکٹر جھا کو اپنا شوہر منتخب کر کے اُن پر کیا تھا۔ مگر ابھی تک یہ نوک جھوک پردے ہی پردے میں ہوا کرتی تھی۔

ایک دن ڈاکٹر جھا معمول سے زیادہ رات گئے گھر آئے۔ منورما چپ رہی۔ دوسرے اور تیسرے دن پھر وہی پروگرام دُہرایا گیا۔ منورما زہر کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ چوتھے دن ڈاکٹر نے بیوی کی بے اعتنائی کا خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا اور رات بھر غائب رہے۔ منورما نے پھاٹک بند کرا دیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر دو مرتبہ آ کر لوٹ گئے۔ لیکن جب کالج جانے کا وقت قریب ہوا تو ناچار آواز دی۔ بیسیوں آوازوں کے بعد پھاٹک کھلا

ڈاکٹر نے جھلا کر کہا "کیا کان میں روئی ٹھونس رکھی تھی؟ دو مرتبہ چلّا کر لوٹ گیا۔"

"میں نے تھوڑے ہی کہا تھا کہ لوٹ جاؤ"

"مجھ سے بے سر پیر کی نہ[illegible] ا کرو۔ میں کہے دیتا ہوں"

"مجھ سے کوئی نہ بو۔ بر[illegible] ا چُپ رہوں گی"

بات بڑھتی گئی ڈاکٹر اپنے دل کی تمام قوتیں اکٹھا کر کے زوروں سے حملہ کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ منورما مرعوب ہو کر چپ ہو جائے مگر منورما ایک چھوٹا سا فقرہ چُست کر کے الگ ہو جاتی تھی۔ آخر کار ڈاکٹر نے گرج کر کہا۔ "ابھی یہاں سے نکل جاؤ"

"یہ بنگلہ میرے باپ کا ہے۔ میں اپنے ہی گھر میں ہوں کسی غیر کے یہاں نہیں" منورما نے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہی یہاں سے چلا جاؤں"

"یہ کہنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ میں عورت ہوں"

ڈاکٹر نے اپنے احسان گنائے۔ جواب میں منورما نے اپنے احسانات کی طولانی فہرست پیش کر دی۔ ڈاکٹر میں اگر غیرت ہوتی تو وہ ہاتھ بڑھا کر بیوی سے صلح کی درخواست کر لیتا لیکن ایک ہندوستانی شوہر کے لئے بیوی کی بات برداشت کرنا خلاف مصلحت بلکہ شاید مہلک ہوتا ہے۔ وہ کیوں کسی کی بات گوارا کرے، خصوصاً جب وہ ایک دو نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بیبیوں کا شوہر بن سکتا ہو۔ رہی عورت، وہ تو اُس کے پیر کی جوتی ہے۔ جب جی چاہا اُتار کر ایک کونے میں سڑنے کیلئے ڈالدی۔ جوتی کی کیا مجال کہ سر اُٹھائے۔

ڈاکٹر جھا کالج سے لوٹ کر گھر نہ گئے۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ منورما بیتابی کے ساتھ ڈاکٹر کا انتظار کر رہی تھی۔ دل بہلانے کے لئے وہ ایک ضخیم ناول کے صفحات اُلٹ رہی تھی۔ وہ لیمپ بجھا کر سونے ہی والی تھی کہ ایک موٹر کمپاونڈ میں داخل ہوئی۔ اُس سے ایک خوش قطع نوجوان اُتر کر منورما کے کمرہ کی طرف بڑھا۔

منورما نے نوجوان کا پُرتپاک استقبال کیا۔ یہ ڈاکٹر جھا کے ہم پیشہ اور کوچۂ حُسن کے کامیاب رقیب بمل بابو تھے۔ بمل بابو کو ہوائے شوق کوئے جاناں کی طرف اُڑا لائی تھی۔ خوش قسمتی سے دربان نہ تھا۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اپنا ایک منٹ بھی ضائع نہ کرنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے منورما سے پوچھا۔

"کہئے ہیں تو آپ اچھی طرح ؟ آج مسٹر جھا نہیں دکھلائی دیتے۔ کہاں گئے ہوئے ہیں ؟"

منورما۔ "جہاں اُنکی طبیعت ہوگی۔"

"یہ آپ کیا فرماتی ہیں؟ میں نے تو اکثر اُنھیں کی زبانی سُنا ہے کہ آپ اُن کو باندھے رکھتی ہیں اور کالج کے علاوہ کہیں آنے جانے نہیں دیتیں۔"

"اب وہ آزاد ہیں۔"

"کب سے ؟"

"آج سے۔"

پرفیسر بمل چُپ ہو گئے۔ جو افواہ اُنھوں نے سُنی تھی اُس کی تائید ہو گئی۔ زیادہ دیر تک ٹھہرنا خلافِ مصلحت تھا۔ اب وہ ڈاکٹر جھا سے مِلکر اس کی تصدیق کرنا اور دیکھنا چاہتے تھے کہ میاں بیوی میں ملاپ کی گنجائش ہے یا نہیں۔ بڑے انتظار کے بعد یہ دن آیا تھا۔ اسکا ایک لمحہ بھی وہ ضائع نہ کرنا چاہتے تھے۔ منورما کو ڈاکٹر جھا کی طرف سے بدظن کرنیکے لئے اُنھوں نے کہا۔ "اچھا تو پھر دمس کھنّا کے یہاں گئے ہونگے۔ مجھ اُن سے ایک ضروری کام ہے۔ اجازت دیجئے۔ آپ کو تو مذاق سوجھا ہے خیر کسی فرصت کے دن آؤں تو یہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔" پروفیسر بمل چلے گئے۔

منورما سمجھ گئی کہ یہ مس کھنّا کون سی بلا ہیں۔ لیکن اُس سے یہ بھی پوشیدہ نہ رہا کہ پروفیسر بمل کس لئے آئے تھے۔ اُس نے چپراسی کو بُلا کو کہا۔ "اس آدمی کی موٹر آج سے کبھی کمپاونڈ میں نہ داخل ہو اور جب وہ میری نسبت پوچھے تو کہدینا کہ میم صاحبہ نہیں ہیں۔"

منورما کچھ دیر تک ناول کے صفحے اِدھر اُدھر اُلٹتی رہی لیکن درحقیقت وہ ڈاکٹر جھا کے دِل کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی کہ اسمیں منورما کے خلاف کہاں تک میل یا کدورت آگئی ہے۔

سوچتے سوچتے اور آہیں بھرتے بھرتے اُسے نیند آگئی۔

کمرہ کا لیمپ بجھ گیا۔

موسم بہار کی سہانی رات، تاروں کی مدہم روشنی، درختوں کی نرم پتیوں میں ہوا کا تالی بجانا۔ آم کے بور اور کٹھل کے نازک پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہر ذی روح کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ مگر منورما کا اُداس دِل ان دلچسپ مناظر کی طرف سے آنکھیں بند کئے اپنے زخم پر مرہم رکھ رہا تھا۔

آسمان کی طرف دیکھ کر اُس نے ایک آہ بھری۔ تارے کانپنے لگے۔

"دُنیا کیسا رنگ بدلتی ہے۔ حسین بنکر دل لُبھاتی ہے مگر ناگن بنکر ڈستی ہے۔ زمانہ کا فریب کتنا خوبصورت ہے۔ اُس کے دھوکے میں گرفتار ہونے والی عورت کتنی معصوم ہوتی ہے، لیکن اپنے کو سب سے بڑا عقلمند سمجھنے والا مرد اُس سے کیا کچھ حاصل کرتا ہے۔ عورت انمول جواہرات کا خزانہ ہے۔ وہ مرد سے کوئی دِلخوش کُن وعدہ نہیں کرتی مگر اپنا سب کچھ اُس کی نذر کر دیتی ہے۔ بدنصیب مرد اُس کے حُسن کی دولت کو لوٹ کر نشہ میں آنکھیں بند کئے ہوئے بھاگتا ہے، اُس شرابی کی طرح جو بدمست ہونیکے بعد دُنیا کی کسی نعمت کی پروا نہیں کرتا اور گندی نالیوں میں لڑھکنے کے لئے ہمدردوں کی گرفت سے اپنے کو چھڑا کر بے تحاشہ اِدھر اُدھر دوڑتا ہے۔ ضبط کرکے بیٹھ رہنے والی عورت کا تو کچھ نہیں بگڑتا لیکن مرد برباد ہو جاتا ہے اور اپنی کرنی کا پھل پاتا ہے۔"

دِل کے اُمنڈے ہوئے طوفان نے منورما کو اس سے زیادہ سوچنے کا موقعہ نہ دیا۔ نیند نے اُس کیلئے اپنی آغوش وا کر دی۔

چاند کالے بادلوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ آسمان کے تارے ایک ایک کرکے رخصت ہو گئے۔ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیل گیا۔ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

ایک دوشیزہ ایک دریائے بے پایاں کے کنارے کھڑی ٹکٹکی باندھے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ بادلوں کی گڑگڑاہٹ نے فضا کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔ رہ رہ کر بجلی چمک اٹھتی تھی، جس کی روشنی میں دریائی موجیں مُنھ پھیلائے اپنے شکار کی طرف جھپٹتی نظر آتی تھیں۔ جنگلی جانوروں کی آواز بازگشت نے وادی کو اور بھی دہشتناک بنا دیا تھا۔

دوشیزہ نے آخری مرتبہ دُعا کے لئے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھائے۔ یکایک زور کی بجلی کڑکی اور دھماکے کے ساتھ کسی در پر لعل نکل گئے۔ ایک نوجوان ہاتھ میں مشعل لئے اُس کی طرف آتا دکھلائی پڑا۔

نزدیک آکر اُس نے سہمی ہوئی دوشیزہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

آسمان کی قندیلیں روشن ہوگئیں اور چاروں طرف اُجالا پھیل گیا۔ موجوں کا تلاطم پرکیف نغموں میں تبدیل ہوگیا۔

فرطِ مسرت سے دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے دریا کی طرف بڑھے، جہاں سے ابدی سرور کے نغمے پیدا ہوکر ہوا میں گونج رہے تھے۔ نوجوان شرابِ حُسن سے مخمور ہو رہا تھا۔ اُس نے بیتاب ہوکر دوشیزہ کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ دوشیزہ نے وارفتگی کے عالم میں نوجوان کو دونوں ہاتھوں سے کس کر باندھ لیا۔

منورما کے کمرے میں زور کا دھماکا ہوا اور اُس کی آنکھ کھُل گئی۔ اُس کے سینے پر ایک ضخیم ناول تھا جس کو وہ دونوں ہاتھوں سے دبائے تھی۔

سامنے میز پر شاید کسی چوہے کو پکڑنے کیلئے بلّی کودی تھی، جس سے کئی کتابیں گر پڑیں۔ کمرے کا لیمپ تیل نہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی بُجھ چکا تھا۔ بہرحال بے چینی نے منورما کو سونے نہ دیا۔ ڈاکٹر جھا صبح کیوقت بھی نہ آئے۔ یہاں تک کہ انتظار کرتے کرتے پھر شام ہو چلی۔

اِس وقت مسز جھا کے سامنے تین صورتیں تھیں۔ پہلی صورت تو یہ تھی کہ وہ چپ چاپ کہیں نکلجائے اور شکم پروری کا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈھ لے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ پروفیسر بٹل سے بیاہ کرکے ڈاکٹر جھا کی چھاتی پر مونگ دلے، اور اُن کو دکھلادے کہ میں تمہارے رحم وکرم پر نہیں ہوں۔ انکے علاوہ لالہ کشن چند کو خاوند کے سیاہ کرتوت سے آگاہ کرکے اُن کے سایہ میں بھی پناہ لے سکتی تھی۔ لیکن وہ کسی نتیجہ پر پہونچ نہ سکتی تھی۔ پہلا راستہ گھوم پھر کر اُسی پرمہیب وادی کی طرف جاتا تھا۔ جس سے ڈاکٹر جھا نے اُسکو نکالا تھا۔ دوسرے راستے پر رسوائی کے کانٹے تھے جنکی طرف دیکھتے ہی اُس کا دل کانپ جاتا تھا۔ آخری صورت کسی قدر تسلی بخش تھی مگر اُس پر عمل کرنے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہونے کی اُمید نہ تھی۔ لالہ کشن چند اسوقت تیرتھوں کا گشت لگارہے تھے، اِس لئے اُن کو پریشان کرنا مناسب نہ تھا۔ اب منورما کو محسوس ہورہا تھا کہ ڈاکٹر کو اُس نے ناحق ناراض کردیا۔ لیکن اپنا کوئی قصور نہ دیکھکر اُن سے معافی مانگتے ہوئے بھی اُسکی زبان بند ہوتی تھی۔ اُس کے نزدیک معافی مانگنے کا یہ مطلب تھا کہ وہ ڈاکٹر کو رات رات بھر گھر سے غائب رہنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ بالآخر اُس نے اس سلسلے میں مس کھنّا کے والد ہی سے ملنے کا ارادہ کیا۔

منورما نے عجلت سے کام لینا مناسب نہ سمجھ کر دو دن تک ڈاکٹر جھا کا مزید انتظار کیا۔ تیسرے دن دوپہر کو وہ پیدل ہی مسٹر کھنا کے بنگلہ پر گئی۔ مسٹر کھنا ریٹائرڈ انجنیئر تھے۔ اُن کا بنگلہ کچھ زیادہ دُور نہ تھا۔ اسوقت اتفاق سے وہ گھر ہی پر تشریف رکھتے تھے۔ منورما کے آتے ہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑی شگفتگی سے بولے:

"کہئے کیا خدمت ہے؟"

منورما آنے کو تو چلی آئی تھی، لیکن وہ کسی سوال وجواب کے لئے تیار نہ تھی۔ مگر اُس کو کہنا ہی پڑا:-

"کچھ نہیں، یونہی ذرا ڈاکٹر جھا سے کچھ کہنا تھا۔ سُنا ہے کہ وہ آجکل یہیں تشریف رکھتے ہیں۔"

"ہاں وہ تو یہاں گذشتہ چھ سات مہینوں سے آتا ہے۔ اُس کے لئے یہ بنگلہ خانۂ بے تکلف ہے، آپ ڈاکٹر جھا کو کس طرح جانتی ہیں، کیا آپ تعلیم پا رہی ہیں؟"

"جی نہیں۔ یونہی جانتی ہوں۔"

"کیا وہ آپ کے عزیز ہیں؟"

"تھے مگر اب نہیں ہیں۔"

ایک جوان عورت کا عزیز ایک نوجوان آدمی تھا مگر اب نہیں ہے، مسٹر کھنا کے کان کھڑے ہو گئے، "تھے مگر اب نہیں ہیں"۔ اِس کا مطلب حرف بحرف اُن کی سمجھ میں آگیا۔ مگر اسوقت وہ دماغی پریشانی کی اُس کیفیت میں مبتلا تھے جب انسان سُننے پر بھی مزید اطمینان کے لئے ایک مرتبہ وہی بات پھر سُننا چاہتا ہے اُنھوں نے کہا "آپ کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"میرا مطلب بالکل وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" منورما نے کہا۔ "ہاں اگر سمجھ کر نہ سمجھنا چاہتے ہوں تو میں نہیں کہہ سکتی۔"

"اچھا ذرا معاف کیجئے میں اپنا خاص کمرہ کھول لوں، تو آپ کے ساتھ اطمینان سے باتیں کروں۔"

مسٹر کھنا نے اپنا کمرہ کھولا۔ آرام کرسی کے نزدیک اٹھا کر ایک گدی دار کرسی رکھی اور کہا "آئیے۔"

منورما کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا "دیوی میں سمجھ تو گیا لیکن اگر بالفرض میں نے بدقسمتی سے غلط سمجھ رکھا ہو، تو آپ میری زبان سے وہ بات سُنکر ناراض ہونگی۔ اسی لئے اسکے متعلق ساری باتیں آپ ہی سے سُننا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کل واقعات بلاکم وکاست بیان کردیں، تو میں جرح کرنے کی زحمت سے بچ جاؤں، اور آپ کو پریشانی نہ ہو اور اُس کے ساتھ ہی وقت بھی ضائع نہ ہو۔"

منورما نے سارا حال صاف صاف کہدیا۔ مسٹر کھنا نے کہا "بیٹی تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔ کل ذرا تم شام کو ٹھیک پانچ بجے چلی آنا۔ تم کو یہاں سات بجے تک رہنا پڑیگا۔ کل میں تم سے کچھ اور باتیں کروں گا۔"

منورما نکلنے ہی والی تھی کہ مسٹر کھنّا نے پوچھا "اور ہاں بیٹی تمہارا نام کیا ہے؟"
"میرا نام منورما ہے۔ میں لالہ کشن چند کی لڑکی ہوں۔ شاید آپ اُن سے واقف ہونگے؟"
"مسٹر کھنّا نے اپنی عدم واقفیت پر شرمندہ ہوتے ہوئے کہا "خیر میں اس شہر میں نووارد ہوں، ورنہ ضرور جانتا۔ تم کل ٹھیک ٹائیم پر چلی آنا بیٹی، دیر نہ ہو۔"
منورما نے گھر پہونچ کر اطمینان کا سانس لیا۔ راستے میں اُسے اس بات کا کھٹکا تھا کہ کہیں شوہر سے اُس کی ملاقات نہ ہو جائے۔
مسٹر کھنّا عجیب اُلجھن میں پڑے تھے کہ کیا کیا جائے۔ پہلی مرتبہ نئی تہذیب کے چند پُجاریوں کے بہکانے پر اُنھوں نے سماج کے قیود کو توڑ کر ذات باہر شادی کرنیکی ٹھانی اور پہلی ہی مرتبہ ٹھوکر کھاتے کھاتے بچے۔

مسٹر کھنّا نے سب کچھ طے کر لیا تھا۔ مس کھنّا کو آج ڈاکٹر سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ڈاکٹر جہا کو گذشتہ دن شادی کا پیغام مل چکا تھا۔ وہ اپنا بہترین سوٹ پہنکر آتے تھے۔ منورما کو حکم ملا تھا کہ وہ چپ چاپ ایک کمرہ میں بیٹھی رہے کسی سے کچھ نہ بولے۔
مس کھنّا لاکھ کوشش کرنے پر بھی نہ سمجھ سکتی تھیں کہ پاپا نے آج ایسا حکم کیوں دیا ہے۔ ڈاکٹر کی شادی مئی کی آخری تاریخوں میں ہونے والی تھی، اس عجلت کا مطلب وہ نہ سمجھ سکے لیکن انتظار کی تکلیف اور اپنا راز فاش ہونے کے ڈر سے یہ عجلت بہتر تھی۔ منورما کرسی پر بیٹھی ہوئی دھڑکتے ہوئے دِل کیساتھ کمرہ کی تصویریں بڑے غور کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ کسی کے پیر کی آہٹ پاتے ہی اُس کا دِل دونی رفتار کے ساتھ دھڑکنے لگتا تھا۔ وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ کوئی عجیب واقعہ پیش آنیوالا ہے۔ مگر اسقدر جاننے پر بھی وہ یہ نہ جان سکتی تھی کہ اس سازش کی تہ میں اصلیت کیا ہے؟
ٹھیک وقت پر ڈاکٹر جہا کو ڈرائنگ روم میں جانیکی اجازت ملی۔ وہ اِس ہال میں بیسیوں مرتبہ چائے پی چکے تھے اور موسیقی سے لُطف اندوز ہو چکے تھے۔ مگر آج اُن کا دل دھڑک رہا تھا۔ بہر حال وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ کسی کو کمرہ میں آتے دیکھ کر منورما ذرا ٹھٹھک گئی۔ ڈاکٹر نے چاہا کہ مس کھنّا (؟) کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ایک ہی مرتبہ اُنکی عارضی حیا کو دُور کر دیں۔ مگر آنکھیں ملتے ہی وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ جیسے لوہے کے گرم سِتوں سے اُنھیں باندھنے کے لئے کوئی لئے جا رہا تھا۔ ہٹتے ہٹتے وہ دروازہ کے قریب آ گئے۔ اور آخری اطمینان کے لئے اُنھوں نے آنکھیں پھاڑ کر منورما کو دیکھا۔
اگر اُن کے پاس پستول ہوتا تو وہ یقیناً منورما کو گولی مار کر مسٹر کھنّا کا خاتمہ کرنیکے بعد اپنا بھی

وہیں خاتمہ کر دیتے، مگر وہ مجبور تھے۔

منورما رونے لگی۔

ڈاکٹر جھا یہ نہ سمجھ سکے کہ کیا کریں۔ وہ جلدی سے گھبرا کر باہر نکل آئے اور بھاگنا ہی چاہتے تھے، کہ مسٹر کھنا جو پہلے ہی سے اس کے لئے تیار کھڑے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر لے گئے۔ ڈاکٹر جھا کٹے ہوئے درخت کی طرح دھم سے گر پڑے۔

مسٹر کھنا نے پریما (مس کھنا) کو آواز دی۔ پریما نے آکر نمستے کی۔

"آیئے مسٹر جھا" مسٹر کھنا نے ایک ہاتھ میں ڈاکٹر جھا اور دوسرے ہاتھ میں پریما کا ہاتھ لے کر ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ پریما کا چہرہ کنول کی طرح کھل اُٹھا اور ڈاکٹر جھا کا مُنھ مُرجھائے ہوئے پھول کی طرح لٹک گیا۔ وہ نہ سمجھ سکے کہ کیا کریں؟ مشین کے پُتلے کی طرح مسٹر کھنا کے ساتھ ہولئے۔

"بیٹی یہ تمہاری بڑی بہن مسز جھا ہیں' اِن کو سلام کرو۔"

پریما نے منورما کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی جیسے کوئی پاگل بلا مطلب کسی کو دیکھتا ہو۔ اُس سے اِتنا بھی نہ ہوا کہ پاپا کے حکم کی تعمیل کرے۔

مسٹر کھنا نے ڈرائیور کو پکارا۔ "رحیم صاحب کو پہونچاؤ۔"

ڈاکٹر نے التجا آمیز نگاہوں سے مسٹر کھنا کو دیکھا۔ مسٹر کھنا نے آنکھوں سے اطمینان دلایا۔ کہ میں نوجوانوں کی طرح اوچھی طبیعت کا آدمی نہیں ہوں کہ یہ راز فاش کروں۔ ورنہ میں یہ میل ہی نہ ہونے دیتا' میرا کام تو وہیں ختم ہو جاتا کہ میں تمہیں بچہ کار دیتا کہ خبردار اب اِدھر نہ آنا۔ مگر اس راز کے فاش نہ کرنے کے لئے ایک بڑی رشوت تمہیں دینی ہوگی۔ اور وہ یہ کہ اب منورما سے بگاڑ نہ کرنا۔

ڈاکٹر جھا اور منورما نے مسٹر کھنا کے پاؤں چھوئے۔

مس کھنا نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی نکال کر منورما کو پہنادی۔ انگوٹھی پر کندہ تھا۔ "جھا"

رحیم نے پوچھا "کہاں چلیں حضور کٹرہ؟"

ڈاکٹر جھا نے کہا "نہیں سول لائن بنگلہ نمبر ۸ پر چلو۔ میں بتا دونگا۔"

حقیقتِ دل

(منشی دوارکا پرشاد صاحب گہرؔ لکھنوی)

دل اک گو قطرۂ خونِ جگر ہے دماغ اس کا ہمیشہ عرش پر ہے
ہیں کھیل اس کے بلندی اور پستی تماشا نیستی ہستی و مستی
جہاں تک وسعتِ حدِّ نظر ہے اسی کی شانِ قدرت جلوہ گر ہے
اسی کا نور ہے شمس و قمر میں اسی کی جلوہ ریزی بحر و بر میں
کبھی پستی میں ذرہ سے بھی ہے کم بلندی میں کبھی خورشیدِ اعظم
یہی ہے صنعت و حرفت کا بانی
یہی صورت گر بہزاد و مانی

بظاہر جو بہارِ آب و گل ہے حقیقت سب کی اک ننھا سا دل
یہ ہے جذبات کی چھوٹی سی دنیا ہے موجودات کی ننھی سی دنیـ
تعلق سب سے ہے سب سے جدا ہے خودی کی حد سے باہر خود خدا
دلوں کو دم میں کر لیتا ہے تسخیر ہے اس کی خاک بھی دنیا میں اکسیـ
کبھی عاشق کبھی معشوق ہے یہ کبھی خالق کبھی معبود ہے
کبھی گرجا کبھی دیر و حرم میں
کبھی مسجد کبھی کوئے صنم میں

بظاہر ہر در و دیوار میں ہے بباطن پردۂ اسرار میں ہے
کبھی ہے یہ سیاسی جد و جہد میں کبھی سعی و عمل کے رد و کد میں
علم بردارِ حریت کبھی ہے ہر اک ذی روح کی ہمت کبھی ہے
اسی کا عالمِ ہستی میں غل ہے یہی اک شمعِ بزمِ عقلِ کل ہے
نظامِ سلطنت قایم ہے اس سے وجودِ زندگی دائم ہے اس سے

یہی مخزن ہے کانِ بحر و بر کا
جواہر لعل و یاقوت و گہر کا

حقیقت دل کی ہر اک پر عیاں ہے — مقیم اس میں زمین و آسماں ہے
مُسافر ہے یہ ہستی و عدم کا — محافظ ہر قدم ہر دم ہے دم کا
کبھی سازِ حقیقت کی صدا ہے — کبھی معشوق ازلی کی ادا ہے
نزاکت بھی ہے شوخی بھی حیا بھی — شرارت بھی جفا بھی ہے وفا بھی
کبھی بے خانماں آوارہ برباد — کبھی قیدِ علائق سے ہے آزاد

گہر بس اپنے دل کی کر دکاں بند
کر اس میں دفترِ کون و مکاں بند

جذبات مدہوش

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے)

جلوۂ پیر کی ہے جن کی نظر دیوانی — وہ نہ ہندی نہ حجازی ہیں نہ ہیں ایرانی
نہ موحّد ہیں نہ مشرک ہیں نہ منکر اے دوست — قائلِ حسن و خوبانِ خوشِ روحانی
خواہشِ سدرہ و طوبیٰ انہیں رکھتے ہرگز — طالبِ سرو قد و قامتِ یارِ جانی
اُن کو بھرما نہیں سکتا کبھی یہ رنگِ جہاں — جو سمجھتے ہیں کہ کیا شے ہے مقامِ فانی
دام در دام ہے یہ قیدِ تن و نفسِ رذیل — اور پھنستا ہی چلا جاتا ہے مرغِ جانی
جس میں تھا تیرا نشیمن، وہ ہے اے مرغِ اسیر — باغِ لاہوت کے آگے چمنِ سُبحانی
طائرِ سدرہ نشیں کو نہیں نسبت کوئی — تجھ سے شہبازِ پریدہ زیرِ یزدانی
کس لئے ہیں پر پرواز ترے بستۂ خاک — پر سیرِ اوجِ فلک بیٹھ کے کر سلطانی

کچھ سمجھتا نہیں تو کون ہے کیا ہے مدہوش
حیف صد حیف تری بے خبری، نادانی

سر بشیشور ناتھ سریواستو مرحوم

جس وقت یہ خبر آئی کہ اودھ چیف کورٹ کے فاضل چیف جج سر بشیشور ناتھ جو چار ماہ کی رخصت لیکر درستی صحت کی غرض سے یوروپ تشریف لے گئے تھے، واپسی کیوقت ساحلِ بمبئی پر قدم رکھتے ہی ۱۵ر جولائی کو اچانک علیل ہوگئے اور صرف دو روز کی مختصر علالت کے بعد صرف ۵۷ سال کی عمر میں ۱۷ر جولائی کو اِس دارِ فانی سے رہگرائے عالمِ جاودانی ہوگئے، تو تمام شمالی ہند میں عموماً اور اودھ میں خصوصاً صفِ ماتم بچھ گئی۔ آپ کی وفات سے لکھنؤ کا ایک بہت بڑا شہری، اودھ کی ایک بہت بڑی شخصیت، صوبہ کا ایک بہت قانون دان، ملک کا ایک دریا دلِ مخیر اور پبلک کا ایک بے لوث خادم دُنیا سے اُٹھ گیا۔ مرحوم نے اپنی محنت، جفاکشی، قابلیت و انصاف پروری، دیانت و ایمانداری ہی کی بدولت اِسقدر جلد اور اِسقدر اعلیٰ ترقی کی کہ دیکھتے دیکھتے جج اور جج سے چیف جج کے عہدہ جلیلہ تک فائز ہو گئے۔

سر بشیشور ناتھ سنہ ۱۸۸۱ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ چھوٹی ہی عمر میں اسکول کی تعلیمی منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کرکے تیرھویں سال میں اسکول فائنل کا امتحان پاس کرلیا اور سترہؔ سال کی عمر میں گریجویٹ ہوکر دستارِ فضیلت حاصل کرلی۔ اُس کے بعد قانون کا امتحان پاس کیا اور سنہ ۱۹۰۳ء میں جبکہ آپ کی عمر صرف بائیس۲۲ برس کی تھی، وکالت کی پریکٹس شروع کردی۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں اودھ کورٹ کے ایڈوکیٹ ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں چیف کورٹ کے قائمقام جج اور سنہ ۱۹۲۹ء میں مستقل جج مقرر ہوئے۔ اُسکے بعد سنہ ۱۹۳۴ء میں قائمقام چیف جج اور سنہ ۱۹۳۷ء میں مستقل چیف جج مقرر ہوگئے۔

عجب اتفاق ہے کہ اِس مرتبہ کے سوائے آپ کے لئے جولائی کا مہینہ ہمیشہ بہت مبارک ثابت ہوتا تھا۔ چنانچہ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء میں آپ قائمقام جج مقرر ہوئے اور اس کے بعد جولائی سنہ ۱۹۲۹ء میں مستقل جج ہوگئے۔ قائمقام چیف جج بھی آپ سنہ ۱۹۳۴ء کی جولائی میں ہوئے تھے اور پھر اسی ماہ سنہ ۱۹۳۷ء میں مستقل چیف جج ہوئے۔ مگر اِس دفعہ یہ مہینہ راس نہ آیا اور ۱۷ر جولائی سنہ ۱۹۳۷ء کے منحوس دن آپ نے اِس دُنیائے فانی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا۔

سر بشیشور ناتھ ایک قابل وکیل یا فاضل جج ہی نہیں تھے، بلکہ آپ نے تمام عمر پبلک کی ہرممکن

خدمت میں صرف کردی۔ آپ کی پبلک سرگرمیوں کا آغاز لکھنؤ میونسپل بورڈ سے ہوا۔ جس کے آپ ۱۹۱۴ء میں ممبر منتخب ہوئے تھے اور ۱۹۲۰ء میں چیرمین چنے گئے۔ لکھنؤ میونسپلٹی کی مالی حالت بہت دنوں سے خراب چلی آتی تھی مگر آپ نے انتہائی محنت و کفایت شعاری سے کام لے کر اُسے بالکل درست کردیا۔ گورنمنٹ نے بھی اس کارنمایاں کی یہ قدردانی کی کہ بورڈ کی چیرمینی کے بعد آپ کو لکھنؤ امپرومنٹ ٹرسٹ کا پہلا غیر سرکاری چیرمین مقرر کردیا۔ یہ عہدہ بھی اعزازی تھا۔ مگر آپ نے اسکی خدمات بھی اسقدر محنت و دیانت سے انجام دیں کہ مسلسل تین ٹرم تک آپ ہی ٹرسٹ کے چیرمین نامزد ہوتے رہے، بالآخر ان خدمات جلیلہ کے صلہ میں گورنمنٹ نے آپ کو O.B.E. کے خطاب ونشان سے ممتاز فرمایا

آپ کو اعلیٰ تعلیم کی توسیع و ترقی سے بھی خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ یونیورسٹی کی بنیاد ہی سے آپ کا اُس کے ساتھ تعلق شروع ہوا اور مرتے دم تک آپ یونیورسٹی کورٹ اور کمیٹی کارکن کے ایک بااثر ممبر رہے۔ اس کے علاوہ آپ کو لکھنؤ کے قریب قریب تمام بڑے بڑے اسکولوں اور کالجوں سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ آپ مہا ودیالیہ، لامارٹینی گرل ہائی اسکول، لامارٹینی کالج، کوئن اینگلو سنسکرت ہائی اسکول اور گورنمنٹ ٹکنیکل اسکول کی اگزیکٹو کمیٹیوں کے بھی پریسیڈنٹ تھے۔ دیگر پبلک سرگرمیاں میں بھی آپ ہمیشہ خاص دلچسپی لیتے رہتے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ سیوا سمتی بوائے اسکاؤٹ، رفاہ عام کلب، لیگ برائے انسداد مرض سِل و دق کے پریسیڈنٹ اور امیرالدولہ لائبریری کے سکریٹری تھے

سیاسی حیثیت سے آپ ایک اعتدال پسند مدبر تھے۔ لیکن ملک کی پولٹیکل ترقی چاہنے والی تحریکوں میں آپ بھی حسب موقعہ سرگرم حصہ لیتے رہتے تھے۔ مثلاً ۱۹۱۶ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا اکتیسواں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو آپ اُس کی استقبالیہ کمیٹی کے جنرل سکریٹری تھے اور ۱۹۲۴ء میں جب پراونشل لبرل کانفرنس کا اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا تو آپ ہی نے اُس کی صدارت فرمائی۔

آپ فطرتاً صلح کل اور عادتاً صلح جو واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ اس آخری خصوصیت کی تعریف ایک پبلک تقریب کے موقعہ پر ہز اکسلنسی سر ولیم میریس گورنر صوبہ متحدہ نے مرحوم کی شان میں فرمایا تھا کہ "فرقہ وارانہ اختلافات میں مفاہمت و مصالحت کرنے میں جو خدمات جلیلہ آپ نے انجام دی ہیں، وہ خاص قدر و منزلت کی مستحق ہیں"۔ درحقیقت مرحوم نے ہر طرح کے پبلک فرائض کا بارگراں اپنے سر پر لے رکھا تھا۔ اور ان کو وہ اس قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے کہ ہر طرف سے تعریف و تحسین کی صدا بلند ہوتی تھی۔ ان احسانات کے لئے صوبہ کی پبلک اُنکی ہمیشہ مرہون منت رہیگی۔

ایک ایسے شخص کا جس کی لیاقت اور خدمات کا ریکارڈ اسقدر شاندار ہو، لکھنؤ کیا صوبہ بھر میں

ہر دلعزیز ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ قانون پیشہ طبقہ میں جو ہر دلعزیزی اور وقار آپکو حاصل تھا اُس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ چنانچہ جب اودھ کی پہلی بار کونسل کا الکشن ہوا تو آپ کے ووٹروں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اور اس کا سلسلہ مدت تک جاری رہا۔ بہرحال جج مقرر ہونے تک آپ اودھ بار ایسوسی ایشن کے مسلّمہ لیڈر رہے۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر صاحب نے آپ کی قانون دانی کی داد دیتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ ہمیشہ وکالت میں آپ نے اپنا معیار جس قدر بلند رکھا اس سے اعلیٰ تر معیار شاید کسی وکیل نے کبھی رکھا ہو۔ سر بشیشور ناتھ کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ آپ کا ظاہر و باطن دونوں یکساں تھے۔ آپ کیرکٹر کے بہت بلند، طبیعت کے نیک، مزاج کے شگفتہ، آداب صحبت کے ماہر اور اسقدر خوش اخلاق واقع ہوئے تھے کہ جو شخص آپ سے ایک مرتبہ بھی بات کر لیتا تھا، وہ ہمیشہ کے لئے آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ سنجیدگی و متانت آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ایک مہربان دوست، فیاض رفیق، متواضع مہمان نواز اور فیاض طبع محب وطن تھے۔ آپ کی ذات سے سیکڑوں حاجتمندوں کی ضرورتیں رفع ہوتی تھیں۔ آپکی خیرات میں مذہب و ملت یا ذات پات کسی کی قید نہ تھی۔ چنانچہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب ممبر سروس کمیشن صوبہ متحدہ نے ایک پبلک جلسہ میں اس کا علانیہ اعتراف کیا ہے کہ آپ بیسیوں مسلمان بیواؤں اور یتیموں کی مدد کیا کرتے تھے۔ پبلک چندوں میں بھی آپ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ غرض آپ کے دروازے سے کبھی کوئی شخص مایوس یا شکستہ خاطر ہو کر نہیں آیا۔

آپ میں ایثار کا مادہ بھی بہت زیادہ تھا۔ ججی پر تقرر ہونے سے آپ کو بہت کچھ مالی نقصان پہونچا تھا۔ کیونکہ وکالت میں آپ کی بہت بڑی آمدنی تھی، لیکن چونکہ وکالت کی شب و روز مصروفیت کے باعث آپ کو پبلک خدمات کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس خیال سے آپ نے ججی قبول کر لی، تمدنی اصلاح کے بھی آپ بڑے حامی تھے۔ چنانچہ لکھنؤ ودھوا آشرم کے آپ پریسیڈنٹ تھے اور مردانہ کھیلوں سے بھی آپ کو دلچسپی تھی۔ غرض ہر حیثیت سے آپ صحیح معنوں میں ایک مکمل جنٹلمین تھے۔ شہر و صوبہ میں آپ سب طبقوں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ بات یہ ہے کہ آپ کے مزاج میں کسی قسم کی رعونت یا تمکنت کو بالکل دخل نہ تھا اور ہر کس و ناکس سے آپ حسن اخلاق اور خاطر سے پیش آتے تھے۔ رسالہ زمانہ کے آپ شروع سے قدردان تھے جب عرصہ دراز تک آپ کی خدمت میں باقاعدہ طور پر شرف باریابی ملتا رہا ہے۔

آپ نے پسماندگان میں ایک بیوہ، چھ صاحبزادے، تین صاحبزادیاں اور سیکڑوں احباب

چھوڑے ہیں۔ آپ کی لاش بمبئی سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے کانپور لائی گئی۔ سرسیا گھاٹ پر داہ سنسکار کیا گیا۔ آپ کے ماتم میں کچہریاں اور دفتر بند رہے۔ ایشور آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

آپ کی وفات پر "ہندوستان ریویو" کے فاضل ایڈیٹر ڈاکٹر سچدآنند سنہا صاحب نے جو تعزیتی مضمون رسالہ مذکور کے جولائی نمبر میں لکھا ہے۔ اُس میں آپ کی خصوصیات مندرجہ ذیل سطروں میں قلمبند کر دی ہیں:۔

"His life was gentle: and the elements.

So mixed in him, that Nature might stand up.

And say to all the world. 'This was a man.' "

ہمارے رفیق مکرمی محمد یعقوب خاں صاحب کلاَم بی۔ اے' نے اِس اقتباس کا برجستہ ترجمہ اشعار ذیل میں کیا ہے۔ جو اِس مضمون کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے:۔

گذاری عمر بصد عزت و بصد شوکت — تھا اختلاطِ عناصر کا اُس میں کچھ ایسا
ببانگ دہل یہ کہتی ہے مادرِ فطرت — حقیقی معنی میں "انسان" یہ بشیشور تھا

ہمارے دوست اقبال ورما صاحب سحر ہتگامی نے اس وفات حسرت آیات کے متعلق ایک برجستہ قطعہ تاریخ کہا ہے جو درج ذیل ہے:۔

سر بشیشور ناتھ کی یہ موت آہ! — کس قدر طاری ہے دل پر رنج و یاس
آگئی "شامِ اودھ" میں تیرگی — لکھنؤ کا لکھنؤ اب ہے اُداس
آج ہم سے چرخِ ناہنجار نے — چھین لی خوشخوئیوں کی اِک اساس
آہ وہ آداب و اخلاق اب کہاں؟ — اب کہاں وہ وضع کا بے مثل پاس؟
کیا ہوئی وہ ساری قانونی تمیز؟ — کیا ہوا وہ سب کمال بے قیاس؟
عدل کا پھول آج بھی ہے خوشنما — ہاں، وہ پہلی سی نہیں بُو اور باس؟
چیف جج کا پایۂ عالی مگر — طبع عالی کو نہ آیا حیف راس!
آپ کی سی شیوہ دانی اب کہاں — آپ کا سا اب کہاں آئین شناس؟
یوں تو ایسی ناگہانی موت پر — کرب سے یکجا نہیں ہوش و حواس
سب سے بڑھ کر رنج ہے اس بات کا — ہو رہی ہے قوم کی قوم اب نراس
بس یہی کہہ دو سحرؔ تاریخ — "سر بشیشور ناتھ کا مُنہ لوک واس"

تنقیدِ کتب

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری[1]

کسی خاص زبان کی ڈکشنری اسی زبان میں لکھنا اگرچہ مشکل اور بڑی وسیع معلومات کا کام ہے لیکن کسی زبان کی ڈکشنری کا ترجمہ غیر زبان میں کرنا نہ صرف دشوار ہے بلکہ بعض اوقات محال ہو جاتا ہے۔ ہندوستان میں جب سے انگریزی عملداری ہوئی ہے، انگریزی زبان کا سیکھنا ضروری ہو گیا ہے اس لئے شروع ہی سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مستند انگریزی ڈکشنری کا اُردو یا ہندوستانی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ چنانچہ متعدد اہل قلم نے اس کی کوششیں کیں، جن میں سب سے زیادہ عمدہ اور مستند ڈاکٹر فیلن کی مشہور ڈکشنری ہے۔ عام ڈکشنریوں سے جو عموماً بازاروں میں ملتی ہیں دفتر کے کلرکوں یا اسکول کے طالب علموں کا تو کام نکل جاتا ہے لیکن ان کی مدد سے کوئی علمی یا ادبی کام نہیں نکل سکتا۔ اور اب ڈاکٹر فیلن کی ڈکشنری بھی پرانی اور نایاب ہو گئی ہے، کیونکہ جب وہ مرتب ہوئی تھی اُس وقت سے اب تک انگریزی زبان کی وسعت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور اس میں نئے نئے الفاظ کا آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چونکہ اب ڈاکٹر فیلن کی ڈکشنری سے بھی پورا کام نہیں نکل سکتا۔ اس لئے سخت ضرورت تھی کہ ایک جدید انگلش ہندوستانی ڈکشنری تالیف کی جائے۔ ملک کو ہندوستانی زبان کے سچے خادم مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو و پروفیسر اُردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا شکر گذار ہونا چاہیئے جن کی جد و جہد سے مندرجہ عنوان انگلش اُردو ڈکشنری وجود میں آئی۔ یہ ڈکشنری کن کن دقتوں اور کن کن مصیبتوں سے مرتب ہوئی اس کا ذکر خود مولوی صاحب نے اپنے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس ضخیم ڈکشنری میں انگریزی الفاظ اور محاوروں کی تعداد دو لاکھ تک پہونچتی ہے، اور اُردو ترجمہ کے الفاظ کی تعداد لکھوکھا ہے۔ اگرچہ انگریزی الفاظ کے ترجمہ میں متعدد اہل قلم کا حصہ ہے۔ لیکن اصل محنت و جانفشانی مولوی عبدالحق صاحب کی ہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا حصہ ہے جنھوں نے بڑی دیدہ ریزی سے ترجموں پر نظر ثانی کی۔

---

[1] حجم ۱۵۳۰ صفحات قیمت سولہ روپیہ، ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

مولوی عبدالحق صاحب نے ایک کمال یہ بھی کیا ہے کہ اگر کسی انگریزی لفظ کے لئے انھیں اُردو میں کوئی موزوں لفظ نہ ملا، تو انھوں نے اُس کا ترجمہ نہایت خوش اسلوبی سے گھڑ لیا ہے۔ مثلاً انگریزی لفظ .Colour blind کا اُردو میں کوئی مترادف موجود نہیں ہے چنانچہ اُس کا ترجمہ مولوی صاحب نے "رتوندا" کے وزن پر "رنگوندا" بنالیا ہے جو چسپاں تو ہوگیا۔ اب رواج پائے یا نہ پائے، یہ مستقبل کی بات ہے۔ اسی طرح .Absentee کا ترجمہ "غائب باش" بروزن "حاضر باش" بنالیا گیا ہے۔ مولوی صاحب کی یہ اختراعات واقعی بہت قابلِ تعریف ہیں۔

بہرحال ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اِس سے اچھی انگلش اُردو ڈکشنری اس وقت کوئی دوسری موجود نہیں ہے۔ ہم اس کی تیاری مولوی عبدالحق و نیز انجمن ترقی اُردو کا ایک بہترین کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ ڈکشنری ہر اسکول و کتب خانہ میں ہونی چاہئے۔ اِسکی چھپائی میں بہت احتیاط برتی گئی ہے۔ اور ٹائپ میں ہوئی ہے، اور مولوی صاحب نے کاغذ بھی خاص طور پر ولایت سے تیار کرایا ہے جو باریک ہونے کیساتھ بہت مضبوط ہے۔

انور[1]

مسٹر فیاض علی ایڈوکیٹ فیض آباد کا یہ دوسرا ضخیم اور کامیاب ناول ہے۔ اِس سے پیشتر آپ "شمیم" نامی ایک مقبولِ عام ناول لکھ چکے ہیں۔ یہ ناول بھی کیا بلحاظ زبان اور کیا باعتبار اسلوب بیان اِسقدر دلچسپ ہے کہ شروع کرکے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ اِسکی سب سے بڑی خصوصیت اس کی کردار نگاری ہے قصہ کا ہیرو انور نامی ایک نوجوان گریجویٹ ہے جو بمبئی میں ایک بہت بڑے کارخانہ کا مینجر ہے۔ یہ شخص بہت نیک، سنجیدہ مزاج اور بات کا دھنی ہے۔ دوسرا شخص جو ہیرو سے بھی زیادہ نمایاں خصوصیات رکھتا ہے انور کا دوست بلکہ مربی ممتاز ہے اُس کی فلسفیانہ تقریریں اور حکمت طرازیاں پڑھکر طبیعت کو ایک خاص مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ناول کی ہیروئن کشور جہان بیگم بمبئی کی ایک دولتمند لڑکی ہے۔ انور اور کشور جہان میں حُسنِ اتفاق سے ملاقات ہوجاتی ہے، جو آخر عشق و محبت کا درجہ اختیار کرلیتی ہے ہیروین ایک بھولی بھالی اور ناتجربہ کار لڑکی ہے جو بہت جلد ڈاکٹر شیرازی جیسے عیار طرار اور اس کی عیارہ بہن زہرہ جمال کے مکر و فریب میں پھنس کر انور کے، جسے وہ واقعی دل سے چاہتی ہے، خلاف ہوجاتی ہے اور خود بھی تکلیفیں اُٹھاتی ہے اور انور کو بھی پریشان کرتی ہے۔

اس ناول کے دو کیرکٹر اور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ایک عذرا، ممتاز کی وفادار اور جان نثار بیوی اور

---

[1] ضخامت ۵۰۷ صفحات، قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ انڈین پریس الہ آباد۔

دوسری مہ جبین، ممتاز کی محبوبہ اور انور کی عاشق۔ مہ جبین نے اگرچہ بازاری حسن وعشق کے ماحول میں پرورش وتربیت پائی ہے، مگر اُس کی رگوں میں شرافت کا خون دوڑتا ہے، جسکی بدولت اُسے حُسن فروشی سے دلی نفرت ہے۔ ممتاز اس پر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے، مگر مہ جبین کو انور سے سچی محبت ہے اُس کے پھندے میں نہیں آتی ہے، بہر حال مہ جبین، ممتاز اور انور تینوں کا کیرکٹر اس ناول میں نہایت خوبی وکامیابی سے بیان کیا گیا ہے۔

پلاٹ کسی قدر اُلجھا ہوا ہے اور اسمیں رینالڈ کے ناولوں کی تقلید نمایاں ہے۔ ڈاکوؤں کے طلسمی قلعہ اور ڈاکٹر شیرازی کی عجیب وغریب موت نے اُسے اور بھی غیر فطری بنا دیا ہے۔ لیکن اِس سے ناول کی دلچسپی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اِس ناول کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ قصّہ کو اسقدر طوالت دی گئی ہے کہ وہ ساڑھے سات سو صفحات پر ختم ہوتا ہے۔ طوالت آجکل کے زمانہ میں جبکہ لوگ عموماً عدیم الفرصت ہیں، کسی قدر کھٹکتی ہے۔ بایںہمہ سرسری سی نظر سے پڑھنے والوں کا دل بھی اسے پڑھکر خوش ہوگا۔ ممتاز، انور اور مہ جبین کی تقریروں میں جو فلسفیانہ استدلال ہوتا ہے اُس کا جواب اُردو ناولوں میں شاید ہی کہیں نظر آئے۔ اکثر مقامات میں اِس استدلال میں نوعِ انسان کی نیکی سے انکار بھی پنہاں ہے لیکن اُن موقعوں پر مصنف کی ستم ظریفی بھی قابل داد ہے۔

بہرحال اس دلچسپ ناول کے لئے ہر کتبخانہ اور ہر لائبریری میں جگہ ملنی چاہیئے۔ مختلف ہاف ٹون بلاکوں نے اس کی دلکشی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ لکھائی چھپائی کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ کتاب انڈین پریس الہ آباد میں چھپی ہے اور جلد بندی انگریزی وضع پر ہوئی ہے

دہلی[1]

مولوی محمود علی خاں صاحب نے یہ کتاب بچّوں کے لئے بطور "دہلی گائڈ" تالیف کی ہے۔ جس میں نئی اور پُرانی دِلّی اور وہاں کے مختلف مشہور تاریخی اور قابل دید مقامات کے حالات درج کئے ہیں۔ مثلاً دہلی کے آٹھ شہر، دہلی کے بادشاہ، جامع مسجد، لال قلعہ، قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ، پُرانے قلعے اور نئی دہلی۔ ان جملہ مقامات کے تاریخی وجغرافیائی حالات مع نقشوں اور تصویروں کے درج ہیں۔ کتاب بہت آسان اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور سبق آموز [illegible]

لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔

---

[1] ضخامت ۸۰ صفحات، قیمت چار آنہ (۴) ملنے کا پتہ:۔ جامعہ ملیہ دہلی۔

رفتارِ زمانہ

(ممالک غیر)

اقتصادیات عالم | ظاہر بین نظروں کو سیاسی مطلع ابر آلود ہی نظر آرہا ہے اور اسپین و چین میں عرصہ سے خون کی بارش ہو رہی ہے لیکن اقتصادی مطلع نسبتاً بہت کچھ صاف ہے اور پیشتر کے مقابلہ میں اس وقت بے روزگاری میں خاصی کمی ہوگئی ہے۔ ۱۹۳۲-۳۳ء میں کساد بازاری کے باعث بے روزگاری کی کثرت تھی۔ مگر اُس وقت سے برابر کمی ہو رہی ہے۔ ۱۹۳۶ء کے اعداد و شمار سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سال گذشتہ کی حالت ۱۹۲۹ء سے بھی (جو فارغ البالی کا سال تھا) بہتر حالت رہی۔ لیکن یہ صورت چنداں تسلی بخش نہیں ہے بلکہ اس میں آئندہ مصیبت کا پورا سامان نظر آرہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت تمام ممالک میں توسیع اسلحہ کے جنون میں جنگی سامان بنانے کے کارخانے کھلتے ہی چلے جارہے ہیں جس سے وہاں کے باشندوں کے لئے روزگار کی صورت تو پیدا ہوگئی ہے لیکن دنیا کے امن و امان کو برابر خطرہ لاحق ہو رہا ہے۔ علاوہ بریں چین جاپان جرمنی، اٹلی اور اسپین میں لوگوں کی کافی تعداد فوج میں بھرتی ہے مگر جس طرح گذشتہ جنگ عظیم کے بعد بے روزگاری ایک حادثۂ عظیم بن کر نمودار ہوئی تھی اسی طرح موجودہ روزگار کی صورت بھی بعد میں بے روزگاری میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس خطرہ سے دنیا کو محفوظ کرنے کی غرض سے مدبّرانِ ملک کو ابھی سے مناسب تدابیر پر عمل درآمد کرنا چاہیئے تاکہ جب سامانِ جنگ بنانے کی ضرورت باقی نہ رہے تو تھوڑی سی ردو بدل کے بعد تمام کارخانے دوسری اشیا کی ساخت کے کام میں لائے جاسکیں، نیز ان کارخانوں کے مزدوروں کو پہلے ہی سے اس لائق بنادیں تاکہ ان اشیا کی ساخت کے لئے لگائے جاسکیں۔

برطانیہ۔ جرمنی زیکوسلاویکیا | جب سے جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار ہوا ہے اس وقت سے برطانیہ کی کبھی ایسی تشویشناک حالت نہیں ہوئی تھی جیسی کہ آجکل ہے۔ کیونکہ برطانیہ ابھی مکمل طور پر جنگ کے لئے تیار نہیں ہو پایا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ فی الحال دوسری کوئی بڑی لڑائی چھڑنے نہ پائے۔ برطانیہ نے اپنے حسن تدبیر سے اب تک جرمنی کو زیکوسلاویکیا کے خلاف جنگ آزمائی سے روکے رکھا ہے مگر جرمنی کے ذمہ دار وزرا بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ آخر جرمن صبر و تحمل کی کوئی حد ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا

کہ جرمنی کب کیا کر بیٹھے اور زیکوسلاویکیا کے کسی واقعہ کو اپنے لئے ناقابل برداشت قرار دیکر حملہ آور ہوجائے
غالباً جرمنی اسی انتظار میں ہے کہ برطانیہ اور فرانس ذرا کسی دوسری طرف مشغول ہوجائیں تو وہ اپنے منصوبہ
پر عملدرآمد کرے، کیونکہ اس کو اس بات کا پورا اندیشہ ہے کہ اگر اس نے زیکوسلاویکیا کی طرف قدم بڑھایا تو روس
و فرانس ہر طرح سے زیکوسلاویکیا کی مدد کریں گے۔ اسی خیال سے جرمنی نے روس کے خلاف جاپان کی امداد کرنے
کا اعلان کر دیا ہے۔ اور حدود وادی رائن اور علاقہ سار میں یعنی فرانسیسی سرحد پر زبردست مورچہ بندیاں
کر رہا ہے تاکہ ضرورت کے وقت فرانس کی شدید مزاحمت کرسکے۔ لیکن جرمنی کا ایک با اثر طبقہ دانشمندی سے
کام لیکر بغیر کسی جنگ و جدل کے جرمن مقاصد کی تکمیل میں کوشاں ہے۔ کیونکہ زیکوسلاویکیا سے جنگ آزمائی
ہونے پر یورپ میں ایک عام جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ ہے، اور گو جرمنی کی فوجی طاقت میں بہت
کافی اضافہ ہوگیا ہے تاہم ابھی تک اُسے اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہے۔ برطانیہ کے ارباب حل و عقد نے
بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ اب مشرقی اور وسطی یورپ میں جرمنی کا غلبہ مستقل طور پر روکا نہیں جاسکتا کیونکہ
جغرافیائی و اقتصادی لحاظ سے جرمنی کے لئے ان ممالک پر اپنا اقتصادی تسلط جمانا قدرتی امر ہے۔ یہ بات
بھی اب اُن کے ذہن نشین ہوگئی ہے کہ ہرچند جرمنی کے اندر نازیت کے مخالفین موجود ہیں اور یہ چاہتے
ہیں کہ جنگ چھیڑ کر دور نازیت کا خاتمہ ہوجائے تاہم غیر ممالک کو جرمنی کی اس اندرونی کمزوری پر بھروسہ
نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ نازیوں نے جرمن عوام کے لئے روزگار مہیا کرنے میں وہ کام کیا ہے کہ ان کے اکثر
مخالفین بھی اِس کے باعث اُن کے حامی ہوگئے ہیں۔

اسپین | اٹلی اور برطانیہ کے مابین معاہدہ ہوجانے کے بعد مسولینی اور جنرل فرینکو کو پوری اُمید ہوگئی تھی
کہ جلد ہی باغیوں کو مکمل فتح حاصل ہو جائیگی، لیکن دوسری طرف روس اور فرانس نے اسپین کی جمہوری
حکومت کو اور زیادہ مدد دینا شروع کر دیا۔ چنانچہ تازہ ترین خبر ہے کہ دریائے ایبرو کے محاذ پر باغیوں کے
خلاف جمہوری حکومت کو بہت کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ پچھلے چھ ہفتوں میں جنرل فرینکو کو کامیابی
حاصل ہوتی رہی لیکن یکایک ایبرو پر جمہوری فوج نے زبردست حملہ کر دیا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے کہ اس دریا کے
پار جمہوری فوجیں بڑھ رہی ہیں تو جنرل فرینکو کو والنشیا کی طرف بڑھنے میں بڑی رکاوٹ ہوجائیگی کیونکہ اُسے
اپنی فوجیں شمال کی جانب بھیجنا پڑیں گی۔ اسپیدام سیرہ کے کنارے جو ٹیرویل ساگنٹو روڈ کے متوازی
گئی ہے جمہوری فوجیں استقلال کے ساتھ باغیوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

فلسطین | کی دہشت انگیزی میں ابھی تک بہتری کی کوئی صورت ظہور پذیر نہیں ہوئی، چنانچہ موجودہ حالت

Teruel Saginto Road ؎ Spadam.sirra ؎

برطانیہ کے لئے بہت پریشان کن ہے۔ وزیر نوآبادیات نے حال ہی میں دارالعوام میں اعلان کیا تھا کہ قیام امن میں امداد دینے کی غرض سے دو سو مزید پولیس بھرتی کرکے فلسطین بھیجنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ماہ ستمبر میں ایک نئی پلٹن بھی بھیجی جائیگی تاکہ گورنمنٹ دیہاتی حلقوں میں بھی مستقل طور سے اپنا تسلط قائم کرکے اپنا پرانا دبدبہ حاصل کرسکے۔ اگر اس سے بھی زیادہ امداد کی ضرورت ہوگی تو اس کا بھی مناسب اہتمام کیا جائیگا۔ فلسطین کمیشن ماہ ستمبر میں لندن میں اپنی تحقیقاتی کارروائی کریگا لیکن ان کوششوں کے باوجود اس بات کی امید بہت کم ہے کہ عربوں اور یہودیوں میں مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہوسکے کیونکہ دونوں فریق ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں اور دونوں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا ہے کہ وہ ملک کی تقسیم کے سخت خلاف ہیں۔ غرض فلسطین کے معاملات اب تک ویسے ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔

روس اور جاپان آخرکار روس اور جاپان بھی برسرپیکار ہوگئے۔ روسی فوج نے مانچوکو کے حدود میں اپنی فوج داخل کردی۔ جاپان نے صدائے احتجاج بلند کی لیکن روس کے متوجہ نہ ہونے پر چھ گھنٹہ کی لڑائی کے بعد روسیوں کو چانگ کیو فنگ اور شاتون ڈنیگ سے بیدخل کردیا۔ غالباً پچھلی کسریں نکالنے کے لئے روس اس موقعہ کو بہترین خیال کرتا ہے جبکہ جاپان چین سے اُلجھا ہوا ہے۔ چین کو تو پہلے ہی سے روس تمام سامانِ جنگ بہم پہونچا رہا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اگر روس جاپان سے جنگ آزمائی کی ہمت کرگیا تو جنگ چین میں جاپان کی فتحیابی بہت مشکوک ہوجائیگی۔ کیونکہ جاپان کافی عاجز آچکا ہے، گو وہ اب بھی بظاہر کافی مطمئن نظر آرہا ہے اور علانیہ یہی کہہ رہا ہے کہ روس کو اس سے جنگ آزمائی کا حوصلہ نہ ہوگا۔ اُسے یہ کہنے کا اس وجہ سے حوصلہ ہوگیا ہے کہ روس میں بھی اندرونی سازشوں سے سخت ہل چل مچی ہوئی ہے اہل الرائے اصحاب کے خیال میں کوشش یہ ہورہی ہے کہ روس کو مشرق بعید کی طرف پھنساکر یورپ کی طرف سے غافل کردیا جائے۔ تاکہ جرمنی بے دھڑک زیکوسلاوکیا پر قبضہ کرسکے۔ جرمنی نے یہ اعلان بھی کردیا ہے کہ اگر روس و جاپان میں جنگ چھڑگئی تو جرمنی جاپان کی "اخلاقی اور دوسرے طریقوں سے مدد کرے گا۔" لیکن شکر ہے کہ یہ جنگ مقامی ہوکر عارضی طور پر ختم ہوگئی ہے۔ فریقین میں قرار پایا ہے کہ ۱۰۔ اگست کو بارہ بجے رات تک جو علاقہ جس کے قبضہ میں تھا وہ اسی طرح رہے اور سرحد کا تصفیہ ایک کمیشن کے ذریعہ ہوجائے جس میں دو روسی اور دو جاپانی ممبر ہوں۔

ہندوستان

صوبۂ متوسط کی وزارت کا قصہ گو بظاہر ختم ہوگیا ہے اور نئے وزیر اعظم مسٹر شکلا نے اپنی کیبنٹ

مرتب کرلی ہے لیکن ہنوز تشویش باقی ہو کہ دیکھئے اس انقلاب عظیم کا آئندہ کیا اثر ہو؟ مہاتما گاندھی اور سربرآوردہ
کانگریسی لیڈروں نے ڈاکٹر کھرے کے طریق عمل پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور ان کی خود مختاری
اور گورنر صوبہ کی امداد لینے پر انھیں موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ ڈاکٹر کھرے نالاں ہیں کہ ان کے ساتھ رہنمایانِ
کانگریس نے جو سلوک کیا اس سے ذمہ داری اور جمہوریت دونوں کے اُصولوں کا خون ہوگیا ہے۔ اکثر
اخبارات اور ہندوستان کی لبرل پارٹی ڈاکٹر کھرے سے متفق ہے اور بعض اصحاب اس سلسلہ میں
مسٹر نریمان کے واقعہ کی یاد تازہ کررہے ہیں اور اس بات کا خوف ظاہر کررہے ہیں کہ پے درپے ایسی
کارروائیوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس فسطائیت یعنی مطلق العنان حکومت کی طرف جارہی ہے
مہاتما گاندھی نے اِس الزام سے کانگریس کی بریّت کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اپنے
اخبار ''ہریجن'' مورخہ ۶۔ اگست میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ لڑنے والی مشین کی حیثیت سے
کانگریس کے لئے واجب ہے کہ وہ اپنے نظام کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے بڑے سے بڑے کانگریسی
کارکن کی بلا لحاظ اُس کی حیثیت و رتبہ کے رہنمائی کرے ان کی رائے میں کانگریس کسی دوسرے
طریق پر اپنی لڑائی نہیں لڑ سکتی ہے۔ معترضین کے اس الزام کا کہ کانگریس فسطائیت کا ڈھنگ
اختیار کررہی ہے۔ مہاتما گاندھی یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ نہ بھولنا چاہئیے کہ فسطائیت کو شمشیر برہنہ
کا درجہ حاصل ہے جس کے تحت میں ڈاکٹر کھرے کی گردن جدا کردی گئی ہوتی مگر چونکہ کانگریس کا
طریق عمل جبر و تشدد پر نہیں ہے بلکہ نیک نفسی پر مبنی ہے۔ اس لئے ہر کس و ناکس کو اس کی تمام
کارروائیوں پر نکتہ چینی کا پورا حق حاصل ہے۔ بہرحال اس قضیہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی مداخلت
سے اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ گورنر صوبہ متوسط کے متعلق بھی ورکنگ کمیٹی کی نکتہ چینی کو
لوگ برحق نہیں قرار دیتے ہیں۔ اور ملک کے ایک بڑے طبقے میں بہت کچھ بدظنی پھیلی ہوئی ہے۔

صوبۂ متحدہ میں ترقی دیہات کی اسکیم

صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کی کانگریس گورنمنٹ نے ترقی دیہات کے سلسلہ میں بڑے
غور و خوض کے بعد ایک وسیع پروگرام تیار کیا ہے جس کی غرض و غایت دیہات
میں مجلسی، تمدنی و اقتصادی زندگی کو ازسرنو ترتیب دینا ہے۔ مجوزہ اسکیم میں زراعت کی طرف اولین
توجہ دی گئی ہے اور مویشیوں کی نسل کی ترقی و بہبودی، دستکاری، صنعت و حرفت، معمولی سود پر قرض
کا انتظام، پیداوار کی فروخت کا بندوبست، علاج معالجہ کا انتظام اور تعلیم بالغان وغیرہ کی طرف
پوری توجہ دی جائیگی۔ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ گورنمنٹ کے مختلف
محکمے جن کا تعلق دیہات سے ہے اشتراکِ عمل کریں نیز سرکاری ملازم و غیر سرکاری کارکن بھی اتفاق

واتحاد سے کام کریں اور دونوں ایک دوسرے کو رفیق کار سمجھکر متحدہ و مشترکہ طور پر کوشش کریں

اس خیال سے کہ مجوزہ اسکیم کا عمل درآمد کامیابی کے ساتھ ہو یہ تجویز کیا گیا ہے کہ پہلے مخصوص اور منتخب رقبوں میں اسکیم کا تجربہ کیا جائے۔ یعنی بیس سے تیس گاؤں تک کو متحد کرکے یعنی تقریباً پندرہ ہزار کی آبادی کا ایک رقبہ قائم کیا جائے اور اس طرح بارہ پندرہ رقبے قائم کئے جائیں، جن کے اندر ہر گاؤں میں ایک انجمن ترقی معاشرت قائم کی جائے اور اس میں گانوں کے ۵۰ فیصدی بالغ مرد شریک کئے جائیں اور اس رقبہ کے اندر کے تمام گانوں کی انجمنیں متفق و متحد ہوکر ایک یونین قائم کریں اور پورے ضلع کے لئے ایک انجمن ترقی دیہات ضلع قائم ہو اور صوبہ بھر کے لئے ایک صوبجاتی ترقی دیہات بورڈ ہو۔

ہر گانوں کے لئے ایک دیہاتی گائیڈ اور ہر رقبہ کے لئے ایک آرگنائزر، تمام ضلع کے لئے ایک انسپکٹر اور کمشنری کے لئے ایک سپرنٹنڈنٹ اور کل صوبہ کے لئے ایک افسر ترقی دیہات مقرر کیا جائے ہر گانوں کی انجمن Better Living Society ایک نمایندہ پنچایت انتخاب کریگی جس کا ایک سرپنچ اور ایک سکریٹری ہوگا۔ کسی اسکیم پر عملدرآمد کے لئے ضروری فنڈ بصورت نقدی یا بشکل جنس یا محنت (Labour) گانوں کے اندر ہی سے مہیا کیا جائیگا اور جو کمی رہ جائے اُسے یونین گورنمنٹ عطیہ سے پورا کرے۔ سرکاری افسران بحیثیت اپنے عہدہ کے پنچایت کے ممبر شمار کئے جائیں گے

اس اسکیم پر اکثر نکتہ چینی ہورہی ہے لیکن صاحب وزیر اعظم اور آنریبل مسٹر کاٹجو وزیر محکمہ نے صوبے کے اکثر مقامات پر خود جاکر اصحاب متعلقہ سے تبادلہ خیالات کیا ہے اور ہر جگہ مقامی کارکنوں کو حسب ضرورت اس اسکیم میں ضروری ترمیمات کا اختیار دیا ہے۔

گورنمنٹ عنقریب ہی انتظامی و عدالتی اختیارات کے علیحدہ کرنے کا بھی بندوبست کررہی ہے مسٹر ڈبل کمشنر اس ڈیوٹی پر تعینات کئے گئے ہیں، اور انھوں نے ایک اسکیم تجویز کی ہے جس کی رو سے زائد اخراجات کے بغیر ان صیغوں کی علحدگی عمل میں آسکیگی۔ یہ اسکیم عنقریب امتحانی حیثیت سے جاری ہونے والی ہے۔ دیکھئے اس سے یہ دیرینہ شکایت پورے طور پر رفع ہوتی ہے یا نہیں۔

کاشتکاروں کی امداد کے متعلق اس وقت کئی مسودات قانون زیر غور ہیں۔ زمیندار و تعلقہ دار صاحبان کو ان کے متعلق بڑی شکایتیں ہیں، اور انھوں نے جا بجا ان کے خلاف بڑے بڑے دھوم دھامی

Organiser. ؎ Union. ؎ Better Living Society ؎
Rural Development Officer. ؎

جلسے بھی کئے ہیں جن میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں، اور بڑے بڑے ریزولیوشن پاس ہوئے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اگر زمیندار صاحبان کاشتکاروں کی اصلاح و بہبودی کے لئے خود ہی ایثار سے کام لیں اور اپنی آمدنی کا ایک معقول حصہ اپنے آسامیوں کی نفع رسانی میں صرف کرنے کا مصمم ارادہ کر لیں تو کسی گورنمنٹ کو کوئی مزید کارروائی کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ بحالت موجودہ عام کاشتکاروں کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور زمیندار صاحبان کا غم و غصہ بہت کچھ بے محل ہے۔ ابھی کانگریس کے رہنما ان کے بنیادی حقوق کے خلاف نہیں ہیں اور مصالحت سے کام لینا چاہتے ہیں، لیکن بعد چندے کانگریس کیا دنیا کی کوئی طاقت اس قدر کثیر حصۂ آبادی کو ہمیشہ کے لئے جاہل و نادار بنائے　　نہیں رکھ سکتی ہے۔

بنگال | میں پرجا پارٹی کے لیڈر مسٹر فضل الحق نے جو مخلوط وزارت قائم کر رکھی ہے اُس کو سوا برس سے زیادہ کی مدت گذر گئی ہے۔ یا تو الکشن کے وقت جو اُمیدیں اُس کی ذات سے قائم ہوئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں، یا اسمبلی کی مخالف پارٹیاں جس میں کانگریس پارٹی بھی شامل ہے زور پکڑ گئیں اس سے حق وزارت ڈانواں ڈول ہو گئی ہے۔ اس اثنا میں وزرا میں بھی کچھ اندرونی مناقشے ہوئے، جس کی وجہ سے سید نوشیر علی وزارت سے علحدہ کئے گئے اور باقی وزرا کا از سر نو تقرر ہوا۔ بہر حال ان دنوں حق وزارت کے مخالفین کی تعداد میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ پرجا پارٹی کے کئی ممبر سید نوشیر علی کے ساتھ مل گئے ہیں، جنھیں پست اقوام اور کانگریس پارٹی کی تائید بھی حاصل ہے۔ چنانچہ اب اس بات کی سخت کوشش ہو رہی ہے کہ حق وزارت کو شکست دیکر ایسی مخلوط وزارت قائم کی جائے جسے سب پارٹیوں کی حمایت حاصل ہو اور جس کی طرفدار کانگریس پارٹی بھی ہو۔ حال میں یہ کوششیں بڑی حد تک کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چنانچہ ۲۹۔ جولائی کو اسمبلی کا سیشن شروع ہوتے ہی مخالف جماعتوں نے وزارت کے خلاف دس ملامتی ریزولیوشن پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ دونوں طرف سے بڑے زور کی تیاریاں ہوئیں، جلسوں اور اشتہار بازی کے علاوہ لاٹھی ڈنڈوں سے بھی کام لیا گیا۔ اکثر ممبران اسمبلی پر فریقین کی طرف سے ہر قسم کا جائز و ناجائز دباؤ ڈالا گیا۔ مخالف جماعت کے قریب سو ممبر اجلاس اسمبلی سے ایک رات پہلے ہی سے آکر اسمبلی ہال میں آکر سوئے، اسمبلی کے باہر ہزاروں آدمیوں نے مسٹر حق کی حمایت میں مظاہرہ کیا، دونوں طرف سے ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی گئی۔ لیکن ۸۔ اگست کو جب اسمبلی میں سب سے پہلے مہاراجہ قاسم بازار وزیر بنگال کے خلاف ملامتی رزولیوشن پیش ہوا تو یورپین و اینگلو انڈین پارٹی کی مدد سے رزولیوشن

گر گیا، ملامت کی طرف اکسٹھ گیارہ ووٹ اور اس کے خلاف اکیتوئیس ووٹ آئے۔ اس کے بعد مسٹر سہروردی اور مسٹر ملک وغیرہ وزرا کے خلاف ریزولیوشنوں کا بھی یہی حشر ہوا مگر ان کے لئے رائے شماری کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد بقیہ ریزولیوشنوں کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ بہر حال اس وقت تو مسٹر حق کی وزارت اپنی جگہ پر قائم رہی لیکن مخالفین کی تعداد دیکھتے ہوئے اس کی آئندہ زندگی کی طرف سے کسی کو اطمینان نہیں ہو سکتا ہے۔ اس وقت انگریز ممبروں کی امداد سے قطع نظر مسٹر حق اپنے ہندوستانی ساتھیوں کی تائید بڑی ترکیبوں سے قائم رکھ سکے۔ کئی لوگوں کو انھیں پارلیمنٹری سکرٹری بنانا پڑا اور اب خبر ہے کہ کئی ممبروں کو مزید وزارتیں دینے کا بھی وعدہ ہو رہا ہے۔ انگریز لوگ اس کے خلاف ہیں، چنانچہ خوف ہے کہ اس قضیہ میں شاید ان کی ہمدردی عرصہ تک قائم نہ رہ سکے۔ خصوصاً جبکہ مخالفین شد و مد کے ساتھ اپنی کوششیں جاری کئے ہوئے ہیں۔

پنجاب | پنجاب میں بھی مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی متحدہ پارٹی کی وزارت قائم ہے جس کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں ہیں۔ کانگریس گورنمنٹوں کی طرح پنجاب گورنمنٹ کا مقصد بھی زراعت پیشہ کو فائدہ پہونچانا ہے جس میں زمیندار اور کاشتکار دونوں شامل ہیں۔ مگر جہاں کانگریسی حکومتیں کاشتکاروں کا زیادہ خیال رکھتی ہیں، وہاں پنجاب میں زمینداروں کا زیادہ لحاظ ہوتا ہے۔ چنانچہ حال میں پنجاب گورنمنٹ نے چار قوانین پاس کئے ہیں جن کا مجموعی نام "قوانین زمیندارہ" ہے، پنجاب میں زراعت پیشہ لوگوں کو کچھ خاص حقوق حاصل ہیں۔ نئے پاس شدہ قوانین میں ایک کا مقصد یہ ہے کہ دیوانی عدالتیں آیندہ کسی شخص کو زراعت پیشہ ہونے کی ڈگری نہ دیں۔ اور قانون انتقال اراضی کے خلاف تمام "بینامی" سودے منسوخ کر دئیے جائیں۔ دوسرا ایکٹ قانون ساہوکارہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص ڈپٹی کمشنر سے لائسنس حاصل کئے بغیر لین دین کا کام نہ کرے، اور اگر کرے گا تو اس کے دعوے کی کوئی سماعت نہ ہوگی۔ تیسرا ایکٹ واپسی اراضیات مرہونہ سے متعلق ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جن زراعتی اراضیات کا ۸۔ جون ۱۹۰۱ء سے پیشتر رہن نامہ ہو چکا ہے وہ منسوخ قرار دیا جائے اور اگر مرتہن دوران قبضہ اراضی میں اصل سے دُگنا روپیہ وصول نہیں کر چکا ہے تو اُسے ایک خاص حساب کے رو سے معاوضہ دلایا جائے۔ چوتھے قانون کا منشا یہ ہے کہ جو زمیندار لین دین کرتے ہیں وہ بھی بجز اُن صورتوں کے جو اس قانون میں درج ہیں زراعت پیشہ اقوام کی زمینوں کو رہن یا بیع نہ کر سکیں

اس کے علاوہ پنجاب گورنمنٹ نے ایک مارکٹنگ بل یعنی مسودۂ قانون خرید و فروخت بھی اسمبلی میں پیش کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جو زمیندار و کاشتکار اپنی پیداوار منڈیوں میں لاکر فروخت کرتے ہیں انھیں لوٹ مار سے بچایا جائے۔ کیونکہ لوگ جھوٹے باٹوں سے تول کر یا ڈنڈی مار کر

ان بیچاروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ چونکہ پنجاب کی وزارت در اصل ایک "زمیندار وزارت" ہے، اور ان قوانین سے ساہوکاروں اور دیگر کاروباری لوگوں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے پنجاب کے غیر زمیندار طبقہ میں اس وقت ان کے خلاف بڑا شور وشر مچ رہا ہے۔ چنانچہ لائل پور میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی زیر صدارت ایک زبردست کانفرنس ہوئی، جس میں متعدد ریزولیوشن سر سکندر حیات اور ان کے رفقائے کار کے خلاف پاس کئے گئے۔ پریس و پلیٹ فارم دونوں طرف سے اِن قوانین کی مخالفت ہو رہی ہے، دیکھئے اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

علمی خبریں اور نوٹ

سررشتۂ لاسلکی سرکار عالی حیدرآباد دکن کے دو سال ۳۷-۱۹۳۶ء کے دوران میں "زمانہ" کے پندرہ ۱۵ مضامین نظم دفتر ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد دکن سے باجازت براڈکاسٹ کئے ہیں۔ ان میں ادبی۔ تاریخی۔ تنقیدی سبھی قسم کے مضامین ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ ایک مدت کے انتظار کے بعد حضرت ریاض خیرآبادی کا مکمل دیوان "ریاض رضوان" کے نام سے آٹھ سو اٹھائیس ۸۲۰ صفحات پر چھپاہے ما و حیدرآباد دکن سے دیدہ زیب لکھائی چھپائی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے، اور چھ روپیہ قیمت پر منیجر صاحب شاہکار بک ڈپو گورکھپور یا حیدرآباد دکن سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

مشہور شاعر حضرت فانی بدایونی کا مکمل اُردو فارسی مجموعۂ کلام انجمن اُردو کی طرف سے جامعۂ ملیہ کے زیر اہتمام دہلی میں زیر طبع ہے۔

انجمن ترقی اُردو مولانا حالی مرحوم کی مشہور تصنیف "حیات جاوید" بھی (جو سر سید مرحوم کی مکمل و مفصل سوانح عمری ہے اور جو عرصہ سے نایاب تھی) عنقریب دوبارہ شائع کر رہی ہے۔ یہ ایڈیشن عمدہ کاغذ پر خاص اہتمام سے طبع ہو رہا ہے۔

ہم کو افسوس ہے کہ مکرمی سحر ہنگامی کی نظم "جہانگیری انصاف" (مندرجہ زمانہ جون ۱۹۳۸ء) کا ایک شعر جو مقطع سے پیشتر لکھا جانا چاہئے، کاتب کی سہو سے درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ ناظرین براہ مہربانی اس شعر ذیل کو نظم مذکور میں مقطع سے پہلے درج فرمالیں۔

کر چکی عرض وہ اس طرح جہانگیر سے جب
مطمئن ہو کے وہ فی الفور گئی اپنے گھر

مئی ۱۹۳۸ء کی مطبوعات جامعہ

بیوہ:۔ منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ایک بیوہ کی ترغیبات اُسکی اُلجھنوں اور اُن سے چھٹکارا حاصل کرنیکی کوششوں کو بہترین طریقہ سے پیش کیا ہے، ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ قیمت مجلد عہ۔

بنی اسرائیل کا چاند:۔ مصنفہ رائڈر ہیگرڈ، مترجمہ عبدالمجید حیرت بی۔ اے علیگ، فرعون کا دورِ حکومت شاہزادہ سیتی ولیعہد سلطنت کی انصاف و عدل کیلئے معزولی، عبرانیوں پر مظالم ایک عبرانی لڑکی میراپی کے حیرت انگیز کارنامے، مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے در پے مختلف قسم کی وبائیں، بنی اسرائیل کی آزادی، فرعون کی مع لشکر غرقابی، سیتی و میراپی کے تعلقات کی دلگداز داستان۔ قیمت مجلد عاشر

ضرب الامثال:۔ از خواجہ عبدالمجید دہلوی، یہ ۸۰۷ ضرب الامثال کا مجموعہ ہے۔ اسمیں ایسے ضرب الامثال ہیں جو قصہ طلب ہیں اور جن کا مفہوم بغیر قصہ بیان ہوئے کماحقہ سمجھ میں نہیں آتا، ابتک اردو زبان میں ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ قیمت ۸ر

دلی کی دو سو برس کی تاریخ:۔ یہ اردو اکاڈمی کا ایک مقالہ ہے، اسمیں تمام تر دہلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی گئی ہے، اُن کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائے فنون میں اُن کی جگہ اور قدر و قیمت دکھائی گئی ہے۔ قیمت ۵ر

عقاب:۔ از رقیہ ریحانہ، یہ چار چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔ ذرا الیوخاں کی بکری کو تو دیکھو، یہ بھی غلام رہنا پسند نہیں کرتی، لڑتے لڑتے مرجاتی ہے۔ لیکن غلامی کی زنجیر میں بندھنا گوارا نہیں کرتی۔ قیمت ۴ر

چنبیلی:۔ یہ چھوٹے بچوں کے لئے آسان اردو میں ایک دلچسپ کہانی ہے۔ قیمت ۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

ایڈیٹر و پبلشر منشی دیانرائن نگم بی۔ اے
پرنٹر شری لچھمبیر دال پریس کانپور

ZAMANA. September 1938.
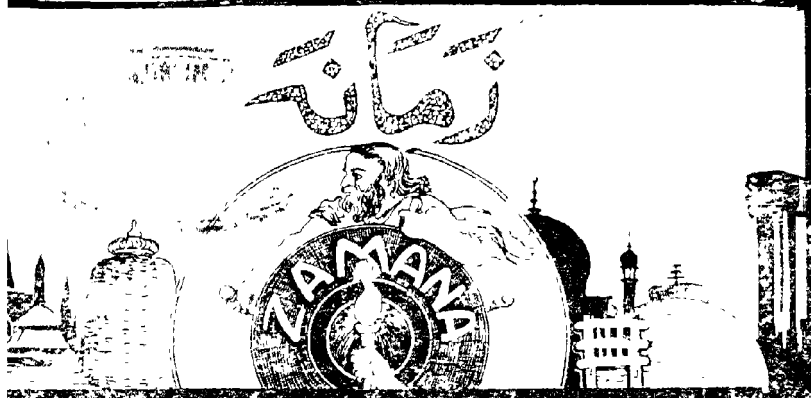
جلد ۷۱ نمبر	مرتبہ دیانرائن نگم بی اے	ستمبر ۱۹۳۸ء

فہرست

۱۔ والیان ریاست اور فیڈریشن
از مسٹر دیال پرشاد مہتا ۱۳۳

۲۔ فکر و نظر (نظم)
از حضرت نجم آفندی ۱۳۶

۳۔ علم کلام
از پروفیسر محمد اسحاق ایم۔اے ۱۴۰

۴۔ ترانۂ وطن (نظم)
از پنڈت اندرجیت شرما ۱۵۲

۵۔ فردوسی
از سید رضا قاسم صاحب حسین آبادی ۱۵۵

۶۔ فطرت خاموش (نظم)
از شیخ محمد یوسف ظفر بی۔اے ۱۶۲

۷۔ ستارۂ تخریب (نظم)
از حضرت نسیم قوجیا نوالی ۱۶۳

۸۔ دلی اور دلی والے
از خواجہ محمد شفیع دہلوی ۱۶۵

۹۔ کلام فراق (نظم)
از حضرت فراق گورکھپوری ۱۶۹

۱۰۔ کلام احسن
از حضرت احسن مارہروی ۱۷۰

۱۱۔ ماتا (قصہ)
از مسٹر بھگوت سروپ بی۔اے ۱۷۱

۱۲۔ صورت تسکین
از حضرت بیتاب بریلوی بی اے ۱۸۸

۱۳۔ پیر خوش لقا
از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔اے ... ۱۸۹

۱۴۔ رفتار زمانہ ۱۹۰

۱۵۔ علمی خبریں اور نوٹ ۱۹۵

فی پرچہ سات آنہ	دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا	قیمت سالانہ پانچ روپیہ

LA FONTAINE AND QUININE.

لافانٹین اور کونین

لافانٹین کے قصوں سے ہر شخص واقف ہے اور غالباً بہت لوگوں نے اسکی کہانیاں پڑھی ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں نے اسکی وہ نظم پڑھی ہوگی جو اس مشہور افسانہ نگار نے کونین پر ۱۶۸۲ء میں لکھی تھی۔

۱۶۷۹ء میں فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم کو ایک انگریز سیاح ٹالبور نامی نے بخار کی ایک شرطیہ دوا کا راز بتلایا۔ جس کے صلہ میں اُسے "سر" کا خطاب مل گیا۔ یہ دوا سنکونہ کی چھال کے سوائے اور کچھ نہ تھی۔ اُس زمانہ کے بہت سے ڈاکٹر اس دوا کی بڑی قدر کرتے تھے لیکن بہت سے ڈاکٹر ایسے بھی تھے جو اس دوا کی مذمت کرتے تھے۔ یہ قضیہ ڈاکٹروں ہی تک محدود نہ تھا۔ بلکہ امیر طبقہ کے لوگ بھی اس فرقہ بندی میں شامل تھے بوئیلون کی ڈچز صاحبہ نے جو جینٹ ڈی لافانٹین کی مربی اور بخار کی جدید دوائی طرفداروں میں تھی لافانٹین سے کہا کہ وہ چھال سنکونہ کی تعریف میں ایک مثنوی لکھ کر اُس کا پروپیگنڈا کرے۔

چنانچہ اُس نے ایک نظم لکھی جسمیں بیان کیا کہ کس طرح جیوپیٹر نے انسانوں سے ناراض ہو کر اُن پر بخار کا عذاب نازل کیا۔ لیکن اپالو نے رحم کھا کر لوگوں کو سنکونہ کی چھال جیسی حیرت انگیز دوا عطا فرمائی۔ جس کی بدولت اس عذاب (بخار) کی شدت رفع ہوگئی۔ اس کے بعد اُس نے سنکونہ کی چھال کی تعریف کے پل باندھ دیئے کیونکہ اُس نے کئی مشہور و معروف لوگوں کی جانیں بچائیں۔ مثلاً کاندے اور مشہور مدبر کولبرٹ:۔

ذیل میں اس نظم کے بعض اشعار کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:۔

تیزی، تلخی اور حدت　　نہیں ہے اس کی طاقت
گندھلوں نے دودھ پلایا　　راجیندر سبھا کو خوب پلایا
خون کو دیتی ہے تسکین　　ٹوٹ جائے بخار سنگین

اس کے بعد وہ اس حیرت انگیز دوا کی ثناخوانی پر فخر کرتا ہوا اُمید کرتا ہے کہ یہ نظم اُسے زندگی دوام بخش دیگی۔

لیکن سنکونہ کے بڑے بڑے حامی بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے کہ اس دوا کا ذائقہ نہایت خراب ہے۔ خواہ اُسے اُس زمانہ کے رواج کے موافق گرم شراب میں ہی حل کر کے پیا جائے۔ بالآخر ۱۸۲۰ء میں فرانسیسی دواساز پلیشیو اور کاونتو نے سنکونہ کی چھال کا ست نکال لیا۔ جسے اب کونین کہا جاتا ہے۔ پھر جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا کونین کی ٹکیاں اور گولیاں بننے لگیں۔ غرض اس دوا میں نہ صرف بہت ترقی ہوئی ہے بلکہ اس کی بدولت ملیریا بخار کے معالجہ میں اصولی تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ پہلے زمانہ میں ملیریا بخار کے دورہ کے وقت چھ ہفتہ تک کونین کا کھانا تجویز کیا جاتا تھا۔ مگر اب لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن نے پانچ سات روز تک پندرہ بیس گرین کونین روزانہ تجویز کی ہے (بچوں کے لئے بلحاظ عمر اس سے کم) اس کے بعد کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اگر مرض عود کر آئے تو پھر ہی علاج کیا جائے۔

حفظ ماتقدم کے طور پر کمیشن نے ملیریا کی فصل بھر چھ گرین کونین روزانہ کھانا تجویز کیا ہے۔

(M.E. No. 33.

بچّوں کی کتابیں

کہانیوں کی کتابیں تو تم اور بھی پڑھتے رہتے ہو، پر ہم نے اپنی کہانیاں بہت قابل لوگوں سے لکھوائی ہیں۔ انمیں خاص بات یہ ہے کہ زبان بہت سادہ، صاف اور آسان ہے اور قصّے تو اتنے دلچسپ کہ بس ایک ہی سانس میں ساری کتاب پڑھنے کو جی چاہے۔ یہ قصّے تمھاری قابلیت کا خیال رکھ کر لکھوائے گئے ہیں اور اُن کے درجے مقرر کر دئے گئے ہیں۔

درجہ اوّل

نھی مرغابی۔ از عبد الواحد صاحب سندھی اُستاد جامعہ ۲ر
بچوں کی کہانیاں۔ " " " " ۲ر

درجہ دوم

لال مرغی۔ از عبد الواحد صاحب سندھی اُستاد جامعہ، ۲ر
جنگو کی بلی۔ " " " " " " ۲ر
مرغی اجمیر علی۔ از رقیہ ریحانہ ۲ر
تانبیل خاں۔ از محمد حسین حسّان ایڈیٹر "پیام تعلیم" ۲ر
چھوٹا چمو۔ " " " " ۲ر
پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی۔ از رقیہ ریحانہ ۲ر

درجہ سوم

نیت کا پھل۔ از مظفر حسین صاحب۔ ۲ر
شیدلا۔ از پروفیسر محمد مجیب صاحب۔ ۳ر
چھچھوندو۔ از رقیہ ریحانہ ۳ر
بیکاری۔ " " " ۳ر
انعامی مقابلہ۔ از محمد حسین حسان ایڈیٹر "پیام تعلیم" ۳ر

درجہ چہارم

شہزادی گلنار۔ از پروفیسر محمد عطا اللہ ۴ر
عقاب۔ از رقیہ ریحانہ ۴ر
ترکوں کی کہانیاں۔ ۴ر

مکتبہ جامعہ ملیہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

زمانہ بک ایجنسی کی قابل دید بے مثل کتابیں

محمد بہادر شاہ ظفر خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ، از منشی محمد امیر احمد علوی بی۔ اے۔ اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں۔ جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ فیجلد عہ

کمال داغ ۔ حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب مع مقدمہ تنقیدی۔ مرتبہ مولانا حامد حسین صاحب قادری اردو غزل گوئی پر جدید زاویۂ نگاہ سے تنقید کرکے تغزل کے قدیم و جدید محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے اس کتاب میں داغ مرحوم کے دیوان گلزار داغ آفتاب داغ مہتاب داغ اور یادگار داغ کا بہترین انتخاب ہے قیمت عہ

پریم بتیسی ۔ یعنی اردو کے مشہور افسانہ نگار منشی پریم چند بی۔ اے مرحوم کے بہترین قصوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

نقش و نگار ۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی، کی کیف آور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ نہایت خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور۔ قیمت ع

فکر و نشاط ۔ حضرت جوش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ ہے جو حال ہی میں جامعہ ملیہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ عمدہ لکھائی چھپائی۔ بہترین جلد۔ قیمت مجلد عہ

آتشستان ۔ ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا دیوان جس کا مصرع مصرع تیر و نشتر ہے۔ قیمت عہ

نقش و نگار ۔ مسٹر جلیل قدوائی کی دلآویز اور پرلطف نظموں کا مجموعہ، جو ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کرچکا ہے۔ قیمت عہ

فلسفۂ جنگ ۔ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفۂ جنگ پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ۴ر

ہندو تیوہاروں کی اصلیت ۔ اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور انکی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اسکے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی و تمدنی نظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اردو ایڈیشن کی قیمت ۹ر، اور ہندی ایڈیشن کی قیمت جسمیں اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔ عہ

انتخاب حسرت ۔ مولانا حسرت موہانی کے دس دیوانوں کا سیر حاصل انتخاب اور اس پر حضرت جلیل قدوائی کے قلم کا لکھا ہوا فاضلانہ مقدمہ۔ قیمت عہ

طریق دولتمندی ۔ دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانیکے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔ اس کتاب میں دولت حاصل کرنیکے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں۔ ہر شخص کے لئے قابل خرید ہے۔ قیمت ۵ر

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

مُرقعِ اَدب - حصہ اول و دوم، مرتبہ جناب صفدر مرزا پوری - اسمیں ہندوستان کے مشہور انشاء پرداز و شعراء کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں جو انھوں نے اپنے احباب کو لکھے ہیں، قیمت حصہ اول ۱۲، حصہ دوم ۱۲،

سَیرِ گُل - یعنی مسٹر جلیل قدوائی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ، یہ وہ کتاب ہے جس نے مصنف کو دورِ حاضرہ کے اہلِ قلم کی صفِ اول میں جگہ دلائی ہے - آج روسی افسانوں کو عموماً اور چیخوف کی کہانیوں کو خصوصاً اردو ادب میں ایک عام شہرت حاصل ہے - اُن کے اولین پیش کرنیوالے کی تحریر کا اعجاز دیکھنا ہو تو "سیرِ گل" ملاحظہ فرمائیے - قیمت صرف عہ

اَسرارِ رنگون - مسٹر داؤد کا ایک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے - بڑی حد تک یہ ناول سچے واقعات سے مرتب ہے - حجم ۲۰۰ صفحات، قیمت عہ

ینگ دل - ... کی مشہور کتاب "السعودت" کا اُردو ترجمہ - اپنی وضع کی بہترین کتاب ہے - مترجمہ میر ولی اللہ صاحب وکیل - قیمت ۱۲

سَلومی - آسکر وائلڈ کے مشہور ڈراما "سالومی" کا ترجمہ ہے جس کو مجنوں نے نہایت محنت سے اُردو میں ترجمہ کیا ہے - قیمت صرف ۸

سَرابِ مغرب - نامناسب تربیت گاہوں میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کا انجام - قیمت ۸

بزمِ احباب - اخلاقی کہانیوں کا نایاب گنجینہ - ۸

نروکھی رانی - پریم چند کا ایک سبق آموز افسانہ قیمت ۶

ملنے کا پتہ:- **زمانہ پریس کانپور**

یادگارِ پریم چند

مشہور رسالہ زمانہ کانپور کا

"پریم چند نمبر"

(جس میں)

منشی پریم چند کے پرانے دوستوں اور اردو کے بہترین انشاپردازوں اور شاعروں کے چونتیس ۳۴ مضامین نثر اور تین ۳ نظمیں ہیں،

(اور)

منشی پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا ایک جامع و مکمل مرقع پیش کیا گیا ہے،

منشی جی کی تصانیف کی فہرست، ان کا عکس تحریر اور مختلف اوقات کی آٹھ ہاف ٹون تصاویر بھی ہدیۂ ناظرین کی گئی ہیں،

حجم خالص مضامین ۲۰۴ صفحات
تصاویر و ٹائٹیل علاوہ

قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

المشتہر:- **منیجر زمانہ کانپور**

زمانہ

جلد ۷۱ | ستمبر ۱۹۳۸ء | نمبر ۳

برٹش صوبجات
اور ہندوستانی ریاستوں کے اتحاد کا مسئلہ

از مسٹر ڈی۔ پی۔ مہتا

گو اس وقت ہندوستان کی تمام بڑی بڑی سیاسی جماعتیں فیڈریشن کے مجوزہ اسکیم کی سخت مخالف ہیں، تاہم اہل الرائے اصحاب کو اس سے انکار نہیں کہ فیڈریشن کا نظریہ ہی اُصولاً برطانوی ہند اور ریاستی ہندوستان کے پیچیدہ تعلقات باہمی کا صحیح حل ہے۔ ارباب حل و عقد کی رائے میں ملک کے ان دونوں حصوں کا جو ابھی تک سیاسی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں ایک مشترکہ اور متحدہ مرکزی حکومت کے رشتہ میں منسلک ہونا ملکی بہبودی کے لئے اشد ضروری ہے۔ واقعی ہندوستان کی سیاسی زندگی کے اس کٹھن مرحلے کا طے ہونا ملک کے مستقبل کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہندوستان دو خاص حصوں میں منقسم ہے، برطانوی ہندوستان اور ریاستی ہندوستان۔ ہندوستان کی ریاستیں کل ملک کا بلحاظ رقبہ تقریباً ۲/۵ اور بلحاظ آبادی تقریباً ۱/۵ حصہ ہیں۔ ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ کوئی جدید مسئلہ نہیں ہے، بلکہ بقول مسٹر پانیکر[1] یہ ہندوستانی تواریخ میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ قدیم ہندو سلطنتوں میں بھی کئی ایسے حصے شامل تھے جو شہنشاہ کے

---

[1] Mr. Pani kar

براہ راست قبضہ میں نہ تھے مگر انھیں شہنشاہ کا آئینی اقتدار تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ یہی حالت سلطنت مغلیہ کے عہد میں تھی۔ ہندو ریاستوں کو مغل بادشاہ کے آئینی اقتدار کے اعتراف میں کچھ خراج دینا پڑتا تھا۔ اکبر اعظم کے عہد میں یہ باہمی تعلقات صریح طور پر معین کر دیئے گئے تھے۔ شاہی سکہ قبول کرنا پڑتا تھا، غداروں کو سزا ملتی تھی اور وفادار حاکموں کو انعام و اکرام اور خطابات دیئے جاتے تھے۔ راجگان حکومت کرتے تھے مگر اُنھیں شاہی خطابات اختیار کرنے کا حق نہ تھا اور بادشاہ کے مقابلہ میں اُن کی حیثیت دوسری رعایا کی طرح تھی[1]۔ سلطنت مغلیہ کے زوال پر حالات نے پلٹا کھایا اور مقامی حکام موقع دیکھکر عملی طور پر خود مختار ہو گئے۔ اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی بھی یہی حالت تھی اور اس نے بھی موقع دیکھکر اپنا اقتدار بڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں ان حالات کا ذکر ضروری نہیں ہے جن سے گزرکر ایسٹ انڈیا کمپنی نے آہستہ آہستہ ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ محض یہ کہنا کافی ہوگا کہ اس سیاسی طوفان کی رَو میں بہت سی ریاستیں جو ذرا سرکش ثابت ہوئیں نیست و نابود ہو گئیں۔ لیکن جنھوں نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں اپنی بہتری سمجھی، وہی اس کے صدموں کو برداشت کر سکیں گو ان کی گذشتہ شان و شوکت اور اقتدار میں بھی بہت کمی واقع ہو گئی تاہم ان کے راجگان و مہاراجگان کو وفاداری کے صلے میں اپنے مقبوضات پر تسلط قائم رکھنے کی اجازت دی گئی۔ ہندوستانی ریاستوں کے موجودہ حکمران انھیں راجوں مہاراجوں یا وزیر و نائبوں کے جانشین ہیں۔ جنھوں نے برٹش حکومت کی آئینی عظمت[2] تسلیم کی تھی۔

ہندوستانی ریاستوں کے مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جہاں برٹش ہندوستان جس میں تمام برطانوی صوبجات شامل ہیں ایک مرکزی حکومت کے ذریعہ برٹش پارلیمنٹ کے ماتحت ہے، وہاں ہندوستان کی ریاستیں جسے ریاستی ہندوستان کہہ سکتے ہیں کسی خاص سیاسی نظام کے ماتحت نہیں بلکہ مختلف مدارج کے مطلق العنان اختیارات رکھنے والی ریاستیں ہیں۔ جن میں ایک کو دوسرے کے انتظام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور ان سب کے باہمی تعلقات حکومت ہند کے ہاتھ میں ہیں، ان کے رقبے بھی مختلف ہیں۔ یہ ہندوستان کے تمام طول و عرض میں جابجا پھیلی ہوئی ہیں۔ ان ریاستوں کی مجموعی تعداد پانچسو باسٹھ (۵۶۲) کے قریب ہے۔

[1] Quotedin "Indian states and British Suzerainty" [2] India" by Prof. Gur Mukh Nihal Singh, Page 23.

جن میں بعض کا رقبہ ہزاروں مربع میل اور آبادی کروڑوں کی ہے اور بعض ایسی چھوٹی ریاستیں ہیں جن کا رقبہ محض چند ایکڑ اور آبادی سو اشخاص سے بھی کم ہے۔ یہ سب ریاستیں ایک دوسرے سے قطعی علیٰحدہ ہیں۔ مگر اس کے برعکس برٹش ہندوستان ایک ہی سیاسی نظام کے اندر اور ایک مرکزی حکومت کے ماتحت ہے۔

برٹش ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں کے مابین یہ علیٰحدگی محض سیاسی ہے ورنہ ان میں کوئی خاص حدِ فاصل موجود نہیں۔ قدرتی اور جغرافیائی حیثیت سے پورا ہندوستان ایک ہے اور ان مختلف سیاسی حصوں کے درمیان کوئی جغرافیائی فصیل بھی موجود نہیں ہے۔ اس قدرتی ہم آہنگی کے کئی اہم نتائج ہیں۔ مثلاً آمدورفت اور تجارت کے لحاظ سے دونوں سیاسی طبقوں میں کسی تمیز کی گنجائش نہیں ہے۔ برٹش ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہندوستانی ریاستوں سے گزرے بغیر سفر نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ مرحوم مہاراجہ صاحب پٹیالہ نے کہا تھا "بمبئی سے کلکتہ بمبئی سے دہلی، یا بمبئی سے مدراس تک سفر کرنا قطعی ناممکن ہے جب تک راستے میں کئی سو میل اس علاقے کے بھی نہ طے کر لئے جائیں جو برٹش راج میں نہیں ہے۔"[1] اور نہ بقول نہرو رپورٹ دونوں حصّوں میں کوئی مصنوعی جغرافیائی فصیل ہی پیدا کرنا ممکن ہے۔ اقتصادی لحاظ سے بھی دونوں حصوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ برٹش ہندوستان کی مالی و اقتصادی پالیسی سے ہندوستانی ریاستیں بھی متاثر ہوتی ہیں، کیونکہ وہ صرف جغرافیائی اور اقتصادی لحاظ ہی سے ایک نہیں ہیں بلکہ مجلسی اور مذہبی حیثیت سے بھی اُن میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ زبان، ذات پات اور رسم و رواج کے لحاظ سے ہندوستان کے مختلف مقامات میں جو اختلافات ہیں وہی ہندوستانی ریاستوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر برٹش ہندوستان میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں تو ریاستوں کی بھی یہی حالت ہے۔ اگر برٹش ہندوستان کی آبادی مختلف فرقوں سے مرکب ہے تو ریاستوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔ اگر برطانوی ہند میں ہندو مسلم اتحاد یا ہریجنوں کا مسئلہ درپیش ہے تو ریاستوں میں بھی یہی مسئلہ موجود ہے۔ غرض ہندوستان کے تمام مختلف حصوں میں ایک ہی کلچرل ماحول پایا جاتا ہے، اور سب جگہ مذہبی، ادبی، اخلاقی نظریوں میں ایک بیّن ہم آہنگی اور مشابہت موجود ہے۔

اس لئے بقول نہرو رپورٹ ان تواریخی، مذہبی، مجلسی اور اقتصادی رشتوں کو جو برٹش ہندوستان

---

[1] Quoted in Indian States of British India" Page 3

اور ریاستوں کے مابین میں نظرانداز کرنا نہایت غیر مدبرانہ اور غیر دانشمندانہ پالیسی ہوگی کیونکہ ان دونوں حصّوں کی سیاسی علحدگی نہ صرف ناممکن بلکہ ہمارے آئندہ قومی مفاد کے لئے بھی قطعی متضاد ہوگی۔ چنانچہ برطانوی ہندوستان کے لئے جمہوری اور ذمہ دار حکومت کی جدوجہد میں ریاستوں کو کسی صورت میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ یہ صحیح ہے کہ سیاسی حیثیت سے وہ ہم سے بہت عرصہ سے علحدہ اور پیچھے ہیں تاہم وہ اسی مادرِ وطن کا جزو ہیں، اور ان کا اور برٹش ہندوستان دونوں کا مفاد ہر حیثیت سے ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ دونوں کی مشکلات اور مسائل مشترک ہیں۔ یہ محض ایک فروعی بات ہے کہ ریاستوں کے باشندے ایک خاص قسم کے آئینی نظام کے ماتحت ہیں اور برٹش ہندوستان کا سیاسی نظام بالکل مختلف ہے ورنہ وہ تفریق اور علحدگی جو ان دونوں حصوں میں پیدا ہوگئی ہے قطعاً غیر فطری اور محض مصنوعی ہے۔

واقعات اس کے متقاضی ہیں کہ مجموعی مفاد اور قومی ترقی کے خاطر ہندوستان کے ان دونوں حصّوں کو ایک مشترکہ مرکزی حکومت کے ماتحت رکھکر ایک رشتہ میں منسلک کیا جائے تاکہ موجودہ علحدگی جو مصنوعی ہے مفقود ہو جائے۔ اس کے بغیر وہ تمام امور اور مسائل جو تمام ہندوستان میں مشترک ہیں متحدہ کوشش سے حل نہیں ہو سکتے۔ بٹلر کمیٹی نے بھی جس نے بقول ڈاکٹر سپرو اپنی سفارشات سے برٹش ہندوستان اور ریاستوں کے مابین ایک دیوارِ چین کھڑی کردی ہے اپنی رپورٹ کے شروع میں یہ تسلیم کیا ہے کہ "مدبرین کا مقصد دونوں حصوں کو یکجا کرنا ہے[۱]"۔ بہرحال سبھی لیڈران خواہ وہ برطانوی ہند کے ہوں یا ریاستوں سے تعلق رکھتے ہوں فیڈریشن ہی کو ہندوستانی مسئلے کا صحیح علاج تصور کرتے ہیں۔ بقول مسٹر سی۔ وائی چنتامنی "ایک متحدہ (Federated) ہندوستان جو ایسی طاقتور اور ذمہ دار مرکزی حکومت کے ماتحت ہو جو ریاستوں اور صوبوں دونوں کی واقعی نمایندہ ہو، ہر ہندوستانی محب وطن کا عزیز ترین نصب العین ہے[۲]"۔ کانگریس کو بھی اس رائے سے اتفاق کلی ہے۔ اور مسٹر سوبھاش چندر بوس کے الفاظ میں ہندوستانی سنگٹھن کے نقطۂ نگاہ سے یہ امر سب سے پہلے ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ برٹش ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں کی موجودہ تفریق قطعاً غیر فطری ہے،

۱؎ Indian States and British India by Prof. Gurmukh Nihal Singh P. 3

۲؎ Nehru Report.

ہندوستان ایک ہے اور برٹش ہندوستان اور ریاستوں کے باشندوں کی امیدیں اور آرزوئیں یکساں ہیں۔ سب لوگوں کا نصب العین ایک خود مختار ہندوستان ہے جو میری رائے میں ایک ایسے فیڈرل جمہوری سلطنت کے ذریعہ وجود میں آسکتا ہے جس میں انگریزی صوبے اور ریاستیں دونوں اپنی رضامندی سے شریک ہوں[1]

اوپر برٹش ہندوستان اور ریاستوں کی جغرافیائی، اقتصادی، مذہبی اور کلچرل مشابہت کا ذکر ہو چکا ہے، مگر وہ چیز جسے دوربین نظریں سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہیں ملک کی آئینی ہم آہنگی ہے۔ جس کی عدم موجودگی ملک کے مجموعی مفاد کے منافی اور اس کے امن و اماں کے لئے خطرناک ہے۔ اس وقت جب صوبجاتی حکومتوں کو حکومت خود اختیاری کے زیادہ سے زیادہ حقوق دیے جا رہے ہیں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ان کو ہندوستانی ریاستوں سمیت ایک فیڈریشن کے ذریعہ آپس میں متحد کر دیا جائے تاکہ ملک کے مختلف حصے مشترکہ معاملات میں باہمی ارتباط اور اتفاق سے کام کر سکیں، ورنہ صوبجاتی خود اختیاری کی انتہائی ترقی ہونے پر اندیشہ ہے کہ موجودہ صورت حال کہیں ملکی و قومی مفاد کے منافی ثابت نہ ہو ملک کے مختلف حصوں کے ایک دوسرے سے متفق و وابستہ نہ ہونے سے مقامی مفاد پر ملک کے مجموعی مفاد کے قربان ہو جانے کا پورا احتمال باقی رہتا ہے جس سے خواہ مخواہ ملک میں انتشار و تفریق پھیلانے والے اسباب پیدا ہو جائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مختلف حصوں میں باہمی تنازعات کی وجہ سے جنگ و جدل تک نوبت پہونچ جائے۔ یورپ کی تاریخ میں اس قسم کے اکثر واقعات رونما ہو چکے ہیں اور آج بھی ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں بھی اس قسم کے ہولناک واقعات کا ہونا کسی طرح ناممکن نہیں کہا جا سکتا ہے۔

ان تمام باتوں کے لحاظ سے اس تجویز کی حمایت کرنا مشکل ہے کہ پہلے انگریزی صوبے متحد ہو جائیں اور جب ان میں جمہوری حکومت کا نفاذ ہو جائے تو ہندوستانی ریاستیں بھی فیڈریشن میں شامل ہو جائیں اس کے متعلق لارڈ لوتھین کی رائے قابل غور ہے وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"سب سے بڑا فائدہ جو آج ہندوستان کو حاصل ہے اس کی آئینی ہم آہنگی ہے۔ جس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ برٹش ہندوستان اور ریاستوں دونوں پر ایک شخص راعد یعنی وائسرائے ہند کا اقتدار ہے۔ اس لئے اگر موجودہ فیڈریشن میں محض برٹش ہندوستان کے صوبے شامل

Constitutional Unity of Lord Lothian [2]

[1] دیکھئے مسٹر سوبھاش چندر بوس کی تقریر بموقعہ ہری پورہ کانگریس:۔

کیئے گئے تو موجودہ ہم آہنگی باقی نہ رہے گی، کیونکہ اس صورت میں برٹش ہندوستان کے صوبے اپنے اپنے وزراء کی صلاح پر کاربند ہونگے جو ہندوستانی مجالس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہونگے مگر ہندوستانی ریاستیں حکومت بالادست کی ماتحتی میں کام کریں گی۔ بہرحال اگر اس طرح ہندوستان کا سیاسی اتفاق و اتحاد قائم نہ رہا تو نفاق انگیز اسباب اپنا اثر دکھانے لگیں گے، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کا خاتمہ کب اور کس طرح ہوگا۔ وہی دلائل جو گول میز کانفرنس کے وقت پیش کیے گئے تھے دوبارہ پیش کیے جائیں گے اور کہا جائیگا کہ بڑی ریاستوں کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ برٹش ہندوستان سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں۔ یا یہ کہ وہ ایک اوسط درجے کی جمہوریت جو لوگوں کو مطمئن کر سکے بنالیں اور جس سے طاقت بالادست کے دعوے کی تردید ہوجائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مختلف حکمران ریاستوں میں اپنی مرضی سے اتحاد کا ہونا ہمیشہ بہت مشکل بلکہ محال ہوتا ہے۔ یورپ کی تواریخ سے یہ افسوسناک سبق حاصل ہوتا ہے کہ کلچرل ہم آہنگی سے آئینی ہم آہنگی کی کمی پوری نہیں ہوسکتی اس لیئے علیحدہ علیحدہ مختلف حکمران ریاستیں بننے دینا خواہ ان میں شروع میں کتنی ہی رفاقت ہو آگے چلکر تفرقات پیدا کرنے کے مترادف ہوگا جس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ رفتہ رفتہ مخفی اختلافات مشتعل ہوکر آخرکار جنگ و جدل تک نوبت پہونچیگی اس کی بڑی وجہ ایک مجموعی طاقت کی عدم موجودگی ہوگی جو تمام ملک کے لیئے قانون بنا سکے امریکہ کو آج اس کا افسوس نہیں ہے کہ اس نے ابراہیم لنکن کے مشورہ پر بڑی قیمت ادا کرکے ریاستہائے امریکہ کی ایک فیڈرل یونین قائم کرلی تھی۔ آج وہ یورپ کی مختلف سلطنتوں کی باہمی رقابتوں سے محفوظ ہے۔ ہندوستان کو بھی ملکی آزادی اور حکومت خود اختیاری کے نصب العین کو مدنظر رکھتے ہوئے آئینی حیثیت سے ایک مجموعی فیڈریشن کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے۔ لیکن اگر ریاستوں اور صوبوں نے اتحاد باہمی اور آئینی تعلقات پیدا کیئے بغیر اپنی اپنی ترقی کی فکر کی تو انھیں بھی انھیں ہولناک حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جن کا آج یورپ شکار ہورہا ہے۔"

ممکن ہے کہ بعض اصحاب کا یہ خیال ہو کہ ہندوستان میں یورپ کی موجودہ حالت کبھی پیدا نہ ہوگی یا شاید وہ یہ خیال کریں کہ ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبے اور صیغے میں اتنی ہم آہنگی اور یکسانیت ہے کہ جس کا دُور ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ بحالت موجودہ ملک کی آئینی ہم آہنگی ہی اصلی چیز ہے، اور زندگی میں جہاں کہیں باہمی ربط پایا جاتا ہے وہ اسی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے درحقیقت کسی ملک کا نظام حکومت بقول لارڈ برائس[1] قومی زندگی کی خاص رَو کا نتیجہ بھی ہوتا ہے اور

[1] Lord Bryce

اسکی وجہ بھی چنانچہ اگر ملک کا آئینی نظام باہمی تفرقات اور اختلافات بڑھانے والا ہے تو یقیناً کلچرل ہم آہنگی کا قلع قمع ہو جائیگا۔ اور ملک کے مختلف حصے ایک دوسرے سے زیادہ علیحدہ منتشر اور غیر مربوط ہو جائینگے یہاں تک کہ آخر میں جنگ و جدل تک کی نوبت آجائیگی۔ اس لئے اگر ایک عرصہ دراز تک برٹش صوبجات اور ریاستوں کو ایک فیڈریشن کے ذریعہ متحد اور یکجا نہ کیا گیا اور آئینی اتحاد قائم کئے بغیر ملک کے مختلف حصوں میں حکومت خود اختیاری کی نشوونما ہوئی تو بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی موجودہ یورپ کے سے باہمی مناقشات پیدا ہو جائیں۔ یورپ اور ہندوستان کے حالات کا موازنہ کرتے ہوئے لارڈ لوتھین رقمطراز ہیں:۔

> "یورپ میں بھی کسی وقت ہندوستان کی سی کلچرل اور مذہبی ہم آہنگی تھی۔ یورپ بھر میں عیسائی مذہب کا زور تھا۔ اور اس کا مشترکہ مذہبی پیشوا پوپ تھا۔ اور روما کی مقدس سلطنت سب پر حاوی تھی۔ مگر جب دور بیداری کی نئی تعلیم اور مذہبی اصلاحات کی نئی تحریک شروع ہوئی جسے اصلاح مذہب یا Reformation کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے تو اس مذہبی اور کلچرل ہم آہنگی کا قلع قمع ہونا شروع ہو گیا اور تمام یورپ میں انتشار پیدا ہونے لگا۔ اس وقت سے یورپ ان قومی خود مختار سلطنتوں میں منقسم ہو گیا جن کے باہمی تنازعات اور لڑائیاں اس کو تباہ و برباد کرنے کے علاوہ تمام دنیا کے امن و اماں کے لئے خطرۂ عظیم ہیں۔ ہندوستان بھی آجکل ایک تعلیمی انقلاب اور مذہبی اصلاحات کے دور سے گذر رہا ہے۔ یورپ کی طرح اس میں بھی مجلسی اور سیاسی دونوں قسم کے اصلاحات کی تحریک زوروں پر ہے۔ اگر اس وقت اس سیاسی تعلق میں جو ہندوستان کو برطانیہ کے ساتھ ہے کوئی زبردست تبدیلی ہوئی تو اس کی روزمرہ زندگی اور نظامِ معاشرت میں بھی زبردست انقلاب ہو جائیگا۔ اس لئے ہندوستان کو اس آئینی ہم آہنگی کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئیے جو اس انقلاب کے زمانہ میں اس کے باہمی اتفاق کا واحد ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر ہندوستان متعدد آزاد حکمران ریاستوں میں تقسیم ہونے سے نہیں بچ سکتا ہے جن کے لئے علیحدہ علیحدہ فوجیں رکھنا ضروری ہوگا۔ اور یہاں بھی وہی حالات پیدا ہو جائیں گے جو موجودہ یورپ میں رونما ہو گئے ہیں۔"

تاہم فیڈریشن کی لابدی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ہم واقعات کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ برٹش صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کے باہمی اتحاد کی راہ میں بڑی مشکلات حائل ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ریاستوں کے طرزِ حکومت میں ذمہ داری کے

عنصر مفقود ہیں۔ شروع سے آخر تک مطلق العنانی کا دور دورہ ہے، اور بقول لارڈ میسٹن فیڈریشن کے ذریعہ تیل پانی کی آمیزش ناممکن ہے۔ کناڈا اور آسٹریلیا جزوی طور پر فیڈرل حکومتیں ہیں، گو اُن کی وضع ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ لیکن ہمیں اس فیڈریشن کے لئے کون سی وضع یا صورت تلاش کرنا ہوگی جس میں برطانوی صوبوں کو جو جمہوری اور پارلیمنٹری سسٹم کے ماتحت ہیں دیسی ریاستوں سے جو مطلق العنان راجاؤں کے زیر حکومت ہیں متحد کیا جا سکے" ظاہر ہے کہ جمہوری حکومتوں اور مطلق العنان ریاستوں میں مستقل حیثیت سے کوئی حقیقی رفاقت یا واقعی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بحالت موجودہ اول تو ہندوستانی ریاستوں میں جمہوری اداروں کا نام و نشان ہی نہیں ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو اُن کی حالت ناگفتہ بہ ہے اور انھیں واقعی کوئی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ چند مخصوص ریاستوں کے حالات کسی قدر بہتر ہیں لیکن زیادہ تر ریاستیں اپنے پُرانے طریق ہی پر قائم ہیں۔ اور ترقی کے راستے پر قدم بڑھانے سے انکار کرتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ ریاستوں کے حالات بھی تبدیل ہو رہے ہیں مگر اس کی رفتار بہت ہی سُست ہے وہاں کے باشندے قدرتاً اس رفتار کو تیز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اُن کی نمایندہ جماعت ریاستی پرجا منڈل[1] کا سب سے بڑا مقصد ریاستوں میں مطلق العنانی کا قلع قمع کر کے جمہوری حکومت قائم کرنا ہے لیکن ابھی اس کے لئے بہت وقت درکار ہے کیونکہ ہندوستانی ریاستوں کی رعایا تو جمہوری اداروں اور دیگر اصلاحات کا سرگرمی سے مطالبہ کر رہی ہے لیکن ان ریاستوں کے فرمانرواؤں کا رویّہ ان مطالبات کی طرف قطعی مخالفانہ ہے اور وہ مطلق العنان حکومت ہی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اُن کوششوں کی سخت مخالفت کرتے ہیں جو ریاستوں میں آئینی نظام قائم کرنے کی غرض سے کی جاتی ہیں۔

درحقیقت مسٹر مانٹیگو کے اعلان مورخہ ۲۵۔ اگست ۱۹۱۷ء کے وقت ہی سے ہمارے والیانِ ریاست کو اس بات کی تشویش پیدا ہو گئی ہے کہیں برٹش ہندوستان کو خود مختار مقبوضات[2] کا درجہ عطا ہونے یا جمہوری اختیارات ملنے پر ریاستوں کے متعلق تمام وہ اختیارات جو اب تک حکومت ہند اور گورنر جنرل کو حاصل ہیں ہندوستان کی فیڈرل اسمبلی کو منتقل نہ ہو جائیں جس کی وجہ سے برٹش ہندوستان کے لوگوں کو ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں دخل دینے کا موقع مل جائے۔ کیونکہ ایسا ہونا والیانِ ریاست کی مطلق العنانی اور اُن کے ذاتی مفاد کے سراسر خلاف ہوگا۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں اگر انھوں نے اسی وقت سے

Indian States Subject Conference [1] Democratic Institutions [2]

اِس بات کی کوشش کرنا شروع کردی کہ برٹش ہندوستان اور ریاستوں میں جب تک ممکن ہو علیحدگی قائم رہے۔ برٹش حکومت نے بھی ان کی اس کوشش کی حمایت کی کیونکہ ریاستوں کا اس کے اقتدار میں رہنا صریحًا اس کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ دونوں اس اصول کو اہمیت دینے اور ہر طرح سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات حکومت ہند کے ساتھ نہیں بلکہ تاج برطانیہ کے ساتھ ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی کارروائی یہ ہوئی کہ بعض ریاستوں کو صوبجاتی حکومتوں کی ماتحتی سے ہٹا کر مرکزی حکومت کے تحت میں لایا گیا۔ اور ان کے متعلق سیاسی اختیارات کو گورنر جنرل باجلاس کونسل (یعنی حکومت ہند) سے ہٹا کر صرف والسرائے (نمایندۂ تاج) کی طرف منتقل کرنے کا ارادہ کیا گیا، ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ریاستوں کی تمام سندیں، معاہدے اور شرائط نامے تاج برطانیہ کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ بٹلر کمیٹی؎ نے یہ سفارش کی کہ "آیندہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے بجائے والسرائے ہندوستانی ریاستوں سے تعلقات میں تاج برطانیہ کا نمایندہ ہو کیونکہ ہماری رائے میں تمام معاہدے شرائط نامے اور سندیں تاج برطانیہ (Crown) کے ساتھ کئے گئے ہیں، اس لئے فرمانروایانِ ریاست اور طاقت بالادست Paramount Power کے مابین تعلقات تاج برطانیہ کی مرضی کے بغیر برٹش ہندوستان کی کسی حکومت کو جو ہندوستانی مجلس قانون سازی جوابدہ ہو منتقل نہیں کئے جا سکتے"

ریاستوں کے مشہور کونسلی سر لیسلی اسکاٹ؎ نے "لا کوارٹرلی ریویو؎" جون ۱۹۲۸ء نیز اسٹینڈنگ کمیٹی میں اسی بات پر زور دیا ہے جس سے انڈین اسٹیٹس کمیٹی نے بھی کلّی اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ریاستوں کا طاقت بالادست سے تعلق تاج برطانیہ کے ساتھ ہے اور اُن کے ساتھ جو معاہدے ہوئے ہیں وہ تاج برطانیہ کے ساتھ ہوئے ہیں"۔

لیکن حیرت کا مقام ہے کہ ہر جگہ جہاں بلا کسی چون وچرا کے تاج برطانیہ سے براہ راست تعلقات کا اُصول تسلیم کیا گیا ہے وہاں اس کے استدلال میں تواریخی واقعات کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی راجگان ومہاراجگان کے ساتھ سب معاہدے ایسٹ انڈیا کمپنی نے کئے تھے اس لئے یہ کہنا کہ یہ معاہدے براہِ راست تاج کے

؎ Butler report ؎ Sir Leslie Scott

؎ Law Quarterly Review June 1928

تام پر ہوئے ہیں صریحاً خلاف واقعہ اور تواریخی لحاظ سے قطعاً بے بنیاد ہے۔ بعد ازاں جب گورنمنٹ ہند ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانشین اور قانونی وارث قرار پائی تو اس نے موخرالذکر کی تمام ذمہ داریاں اور اس کا کل اثاثہ قانونی حیثیت سے اپنے ذمہ لے لیا۔ تاج کے ایجنٹ یا نمایندہ کی حیثیت سے حکومت ہند کا ہندوستانی ریاستوں پر ہمیشہ اقتدار رہا ہے اور آیندہ بھی رہیگا۔ خواہ اس کی صورت میں کوئی بھی تبدیلی واقع ہو۔ "حکومت ہند" ہمیشہ حکومت ہند ہی رہیگی۔ خواہ وہ ایک غیر ملکی دفتری گورنمنٹ ہو یا ایک جمہوری ادارہ"

حکومت کے پہلی صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہونے کی وجہ سے کوئی شخص اسے اس کی میراث اور قانونی اختیارات سے محروم نہیں کرسکتا ہے، مگر جیسا کہ اوپر واضح کیا جاچکا ہے والیان ریاست کو اس بات کی سخت تشویش ہے کہ حکومت ہند کے جمہوری اور ذمہ دار ہوجانے سے ملکی نمایندوں کو کہیں ان پر اقتدار حاصل نہ ہوجائے۔ اسی لئے وہ تمام اختیارات براہ راست تاج برطانیہ کو منتقل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ انکا یہ کہنا کہ ریاستوں کا تعلق گورنر جنرل با جلاس کونسل یا حکومت ہند کے ساتھ نہیں بلکہ والسرائے کے ساتھ ہے قطعی غلط اور گمراہ کن ہے۔ دراصل یہ ہندوستانی ریاستوں کو برٹش ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے علحدہ رکھنے کی ایک شاطرانہ چال ہے۔

والیان ریاست کے اس غلط اصول کو اتنی اہمیت دینے اور اُسے ٹھیک ثابت کرنے کی کوشش کا سبب اوپر بیان ہوچکا ہے۔ لیکن برٹش ہندوستان کے لوگ کسی طرح اس روش کی حمایت نہیں کرسکتے۔ براہ راست تعلقات کا اصول اول تو تواریخی لحاظ سے بے بنیاد ہے۔ دوسرے والیان ریاست فیڈرل ہندوستان سے اپنے اس مخالفانہ رویہ میں بھی اصولاً حق بجانب نہیں ہیں یہ ثابت کرنا مشکل نہیں ہے کہ اُن کی یہ روش نہایت غیر مصالحانہ ہے کیونکہ فیڈرل ہندوستان اُن سے بہر حال بہتر سلوک کریگا۔

بہر نوع اس وقت والیان ریاست کو ہندوستانیوں کے بجائے برٹش افسران پر زیادہ اعتماد ہے اور جب تک ان پر یہ بخوبی ظاہر نہ ہوجائے کہ برٹش امداد اُن کی ریاستوں میں جمہوری اصولوں سے نہیں بچا سکتی ہے اُنھیں ہندوستانی افسروں کی ماتحتی منظور نہ ہوگی۔ جیسا پروفیسر گورمکھ نہال سنگھ نے لکھا ہے کہ والیان ریاست اپنی ریاستوں میں کسی ہندوستانی کو بطور سیاسی افسر یا ریزیڈنٹ رکھنا اپنی خلاف شان سمجھتے ہیں۔" اس کی وجہ اُن کی ذہنی پستی کے سوائے

Indian States and British India: Their Future Relationships

اور کچھ نہیں ہے اور اسکے دُور ہونے کے لئے وقت درکار ہے، تاہم موجودہ حالات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ریاستیں برٹش ہندوستان سے تعلقات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتیں تاج سے براہ راست تعلقات پیدا کرنے کے اُصول سے قطع نظر ہم اس امر کو بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ ہندوستانی ریاستوں کا ایسی پوزیشن میں واقع ہونا جہاں ان کا برٹش ہندوستان سے تعلقات نہ رکھنا ناممکن ہو، اُن کی برٹش ہندوستان سے علیحدگی اختیار کرنے کی کوششوں کو رائگاں کر دیتا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ برٹش ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں میں سیاسی علیحدگی کے علاوہ کسی دوسری طرح کی تمیز کرنا ممکن نہیں ہے جغرافیائی لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور اقتصادی، مجلسی، کلچرل سب اعتبار سے ایک ہی ماحول پایا جاتا ہے۔ دونوں جگہ زندگی کے تمام ضروری صیغوں میں لوگوں کے نظریے یکساں ہیں اور دونوں طبقوں کے باشندگان کو ایک ہی مشترکہ قومیت کا احساس ہے۔ اس لحاظ سے دونوں ایک ہی ماحول میں سانس لیتے ہیں۔ لہذا یہ ناممکن ہے کہ برٹش ہندوستان کی تحریکوں کا ریاستوں میں اثر نہ ہو۔ قومی ترقی اور دیگر قسم کی اصلاحات کسی ملک کے (جہاں ہر لحاظ سے ہم آہنگی اور ارتباط موجود ہو) صرف خاص حصوں ہی تک محدود نہیں رہ سکتیں۔ کچھ عرصہ بعد سب جگہ ترقی کے آثار نمایاں ہونگے، ہندوستان کو خود مختار مقبوضات کا درجہ (Dominion Status) ملنے اور ذمہ دار حکومت قائم ہونے پر ریاستوں میں عرصہ تک مطلق العنانی باقی نہیں رہ سکتی۔ "آئرلینڈ میں آلسٹر کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ آلسٹر کی آبادی مختلف نسل اور مختلف مذہب کی ہے، نیز آئرلینڈ کا اقتصادی مفاد بھی شمالی آئرلینڈ کے اقتصادی مفاد سے جداگانہ ہے۔ اسلئے ہندوستانی ریاستوں کو ایک ہندوستانی آلسٹر بنانے کی کوشش سراسر بے سود ہے اور اب جبکہ جمہوری اداروں اور دیگر اصلاحات کی تحریک زوروں پر ہے ریاستوں کے لئے ان مطالبات کو حقارت سے ٹھکرانا دانشمندی کا کام نہیں ہے خصوصاً جبکہ ان کی رعایا نے ببانگ دہل اس بات کا اعلان کر دیا ہے کہ وہ اپنی جدوجہد میں اُس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک اُن کے مطالبات تسلیم نہ کر لئے جائیں اور ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم نہ ہو جائے۔ اس لئے اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جلد یا دیر میں ریاستوں کا نظام حکومت بھی برٹش ہندوستان کے سانچے میں ڈھل جائیگا۔

ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے متعلق والیان ریاست کا مخالفانہ رویّہ نہ صرف عام نقطۂ خیال سے افسوسناک ہے بلکہ خود اُن کے مفاد کے لحاظ سے بھی خلاف مصلحت ہے اس غیر مصالحانہ

روش کا یہی نتیجہ ہوگا کہ برٹش ہندوستان کے لوگوں کے جذبات اور زیادہ مشتعل اور برانگیختہ ہوں گے اور انھیں ریاستوں کے لوگوں کی پولیٹیکل جد وجہد میں حصہ لینے کے لئے مجبور ہونا پڑیگا۔ بقول نہرو رپورٹ راجگان ہند کا یہ خیال کہ جو تحریکات برٹش ہندوستان میں اس وقت برسر کار ہیں وہ ایک عرصۂ دراز تک برٹش ہندوستان ہی تک محدود رہیں گی بالکل مہمل ہے۔ کیونکہ ناممکن ہے کہ ریاستوں کے باشندے جن کے دلوں میں برٹش ہندوستان کے لوگوں جیسے پُرجوش حوصلے اور سرگرم امیدیں موجزن ہیں ہمیشہ خاموشی کے ساتھ موجودہ حالات کو برداشت کرتے رہیں اور برٹش ہندوستان کے لوگ اپنے برادرانِ ملک کی جدوجہد میں شریک نہ ہوں۔ بلکہ کیا عجب ہے کہ دونوں کی متحدہ کوشش اور جد وجہد سے والیانِ ریاست کی ہستی ہی یک قلم خطرے میں پڑ جائے۔

ان تمام باتوں پر لحاظ کرتے ہوئے والیان ریاست کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہتا ہے، اور وہ یہ کہ زمانہ کی رفتار کا لحاظ رکھتے ہوئے جلد سے جلد اپنی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت قائم کر دیں۔ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ مطلق العنان حاکم رہنے کے بجائے شاہ برطانیہ کی طرح آئینی حکمران بن جائیں۔ اسی میں اُن کی بہتری اور اسی میں اُن کی آئندہ ترقی ممکن ہے اسی طرح اُن کی شان اور اُن کا اعزاز قائم رہ سکتا ہے۔ کیا شاہ برطانیہ کی جتنی شان اور عزت اس وقت ہے وہ کبھی پہلے بھی تھی؟ اسلئے مصلحت و دور اندیشی سب کا یہی تقاضا ہے کہ والیانِ ریاست فیڈریشن کو فی الفور بے چون وچرا تسلیم کرلیں، نہ کہ زار روس کی طرح اپنی مطلق العنانی برقرار رکھنے کی فضول اور غیر دانشمندانہ کوشش کریں۔ لارڈ لوتھین نے سچ کہا ہے:۔

"یہ بات اٹل ہے کہ جوں جوں سیاسی واقفیت پھیلتی جائے گی، والیان ریاست کو یورپ کے بادشاہوں کی طرح آئینی فرمانرواؤں کا درجہ اختیار کرنا پڑیگا۔ اور روزمرہ سیاست سے علحدہ رہ کر قوم کا نمایندہ بننا ہوگا۔ اسی میں اُن کی عزت ہے اور یہی تمام انقلابی تجویزوں سے اُن کے محفوظ رہنے کی اصلی ضمانت ہے۔"

اس کے علاوہ یہ بھی واضح ہو جانا چاہیئے کہ تاج برطانیہ سے براہ راست تعلقات کا اصول بھی ہندوستانی والیان ریاست کو ریاستوں میں ذمہ دار حکومت قائم ہونے سے نہیں بچا سکتا۔ کیونکہ بقول لارڈ ممدوح طاقت بالادست سے تعلق رکھنے کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا ہے کہ برطانیہ کسی ایسے والیٔ ریاست کی حمایت کرے جو اپنی رعایا کو وہ حقوق و مراعات دینے پر رضامند نہ ہو جو خود پارلیمنٹ کے حکم سے برٹش ہندوستان کے طول وعرض میں مسلّمہ قرار دیئے گئے ہوں۔

بہرحال اب جبکہ فیڈرل نظریہ ہی ہندوستانی ریاستوں اور برٹش ہندوستان کے مسئلہ کا صحیح حل

قرار دیا جا چکا ہے اور برطانوی اور ہندوستانی مدبرین بھی اس نظریئے سے متفق ہو چکے ہیں تو یہ امر لازمی و لابدی نظر آتا ہے کہ دونوں حصوں کو جو ہنوز سیاسی لحاظ سے علٰحدہ رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ نزدیک لانے اور ان میں مزید اتحاد و ارتباط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس ضمن میں والیان ریاست پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ صرف تاج برطانیہ سے تعلقات رکھنے کا قدیم اصول اور برٹش ہندوستان سے علٰحدگی اختیار کرنیکا پرانا خیال بالائے طاق رکھدیں اور مطلق العنانی کے خواب کو فراموش کر کے ریاستوں میں جلدی سے جلدی ذمہ دار حکومت قائم کر دیں۔

فی الواقع جب تک ریاستیں برطانیہ کی جمہوری اصولوں کی پیروی نہ کریں گی تب تک اُن کا فیڈریشن کے رشتہ میں منسلک ہونا مشکل ہے۔

جذباتِ جوش

(حضرت جوش ملیح آبادی)

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا — رندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا

کچھ روز تک تو نازش و فرزانگی رہی — آخر ہجوم عقل نے دیوانہ کر دیا

اے حسن! داد دے کہ جراحت کے ذوق نے — تیری حیا کو عشوۂ ترکانہ کر دیا

قرباں تجھے کہ اِک نگہِ التفات نے — دل کی جھجک کو جرأتِ رندانہ کر دیا

صد شکر درسِ حکمتِ ناحق شناس کو — ہم نے رہینِ نعرۂ مستانہ کر دیا

دنیا نے ہر فسانہ "حقیقت" بنا دیا — ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا

آواز دو کہ جنسِ دو عالم کو جوش نے
قربان یک تبسّم جانانہ کر دیا

فکر و نظر

(از حضرت نجم آفندی)

دیکھیے دماغ و دل نمایاں ہو کر
علم و حکمت کو زیب ہے پنہاں ہو کر
فطرت سے نجیب ہے یہ سب کچھ ہو کر
انسان کو پھر خاک سے یکساں ہو کر

ہو جائے گا معدوم یہ غم ہے شاید
فانی ہے روح یہ الم ہے تا باید
قطرہ شبنم ہے فضا میں محفوظ
شبنم سے عیاں ہستی تری کم ہے شاید

ہے حسن عمل سے یہ تمنائے بہشت
کہتے ہو کہ دنیا میں اتر آئے بہشت
ہے میری تمہاری آرزو میں یہ فرق
میں کہتا ہوں دنیا ہی بن جائے بہشت

سب تک یہ سیاہ کی ہے بے محابا مجھ سے
سب تک یہ نزار و سپید وا مجھ سے
جنت کے سکون کی خبر ہے ابتر ہو
انسان ہو تو بہ ہو غم دنیا مجھ سے

دیکھیے طوفان دم سے کہاں لیتا ہے
ہر سمت سے رخ یہ کارواں لیتا ہے
ذرہ ذرہ ہے ایک حیات بیتاب
ہر سنگ میں یہ سکون ہچکیاں لیتا ہے

سنسار کی ریت نرالی جب بھی سمرن
مالا کا وہ پھیر وہ اور بھی سمرن
جانیں نہ کبھی ہمارا سائیں جانے
ہر سانس کی سمرن ہے سب سے اچھی سمرن

علمِ کلام

پروفیسر محمد اسحٰق صاحب ایم۔اے ڈھاکہ

خلفائے بنو عباس کے آغاز حکومت میں عقائد نے ایک نیا رنگ اختیار کیا جو خود پیغمبر اسلامؐ اور صحابۂ کرامؓ کے زمانہ میں نہ تھا۔ چنانچہ اس بحث مباحثہ کی بدولت رفتہ رفتہ ایک نئے علم کی بنیاد پڑ گئی جس کا نام "علمِ کلام" رکھا گیا۔ اور جو دیگر علوم کی طرح عہد عباسی کے شروع میں ہی پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا۔

علمِ کلام کے ارتقائی منازل میں چند داخلی اور خارجی اسباب کام کر رہے تھے۔ داخلی اسباب سے مُراد وہ اسباب ہیں جو خود مسلمانوں کے ساختہ اور مذہبِ اسلام کے پرداختہ ہیں اور خارجی اسباب سے مُراد وہ اسباب ہیں جو غیر مسلم اقوام کی ذہنیت کا نتیجہ اور دیگر مذاہب کے آوردہ ہیں۔

اہم داخلی یا اندرونی اسباب حسب ذیل شمار میں لائے جا سکتے ہیں:-

۱۔ قرآنِ پاک کو اپنے طرزِ استدلال سے رسول مقبولؐ کے زمانے ہی میں بڑے بڑے مذاہب کے اقوال و عقائد سے دست و گریبان ہونا پڑا۔ ستارہ پرست، عیسائی، بت پرست، نبوت کے منکر اور حضرت محمد صلعم کی نبوت کے مخالف جن کے پاس قرآنِ پاک کی صریح دلیلوں کے مقابلہ میں کوئی معقول دلیل نہ تھی ناچار قائل ہوتے۔ تکلیف، جبر اور اختیار کے مسائل کی نسبت استدلال و مباحثہ ہوا۔ اور پیغمبر صاحبؐ نے لوگوں کو دینِ اسلام کی طرف دعوت دی۔ علمائے دین نے بھی اسی راستے کو اختیار کیا۔ اِس طرح بحث و مباحثہ و اعتراضات کی تردید کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ اور یہ سب باتیں "علمِ کلام" کی ترقی کا سبب ہوگئیں۔

۲۔ جب مسلمانوں کو ملکی فتوحات سے فراغت حاصل ہوئی اور اُن کی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہوگئیں تو ہر شخص دین کے مسائل میں اپنی علمیت اور فوقیت کا اظہار کرنے لگا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسائل دین بہت عام فہم اور سادہ تھے لیکن آنیوالی نسلوں نے ان میں عقلیات کا اضافہ کرکے سُلجھے ہوئے مسائل کو بھی مشکل بنا دیا۔ دورِ اوّل کے مسلمانوں کا ایمان بہت پختہ تھا اور وہ مسائل کی تحقیق اور تدقیق کی طرف مائل نہ تھے مگر بعد چندے دینی مسائل میں بحث اور مباحثے ہوئے اُنہوں نے ایک عملی صورت اختیار کر لی۔ دورِ اول کے مسلمانوں کا خاص عقیدہ تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے زیر فرمان ہے اور یہ اُن کے ایمان کا نہایت زور دار موضوع تھا۔ جسمیں اُنھیں کسی قسم کی بحث، تفتیش اور تحقیق کی

ضرورت نہ تھی، چنانچہ اُس زمانے کا مقولہ تھا کہ "الایمان ایمان العجوز" زمانۂ بعد کے مسلمانوں نے
قرآن کی اُن آیتوں کو اکٹھا کیا جو ایمان اور یقین کی تائید میں تھیں، اس کے برعکس اُن کو چند ایسی آیتیں
بھی ملیں جو جبر اور تکلیف مالا یطاق کی تائید میں تھیں۔ پھر اُنھوں نے دیکھا کہ قرآن کی بہت سی آیتوں سے
یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو کسی دین کے انتخاب کا اختیار ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایمان کے
انتخاب سے نہیں روکتا۔ پھر تو اُنھیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ اِن متضاد آیتوں کی تطبیق کیونکر ہو سکتی ہے؟ اور
اِنسان مجبور محض ہے یا مختار؟ چنانچہ دونوں قسم کی آیتیں یکجا کی گئیں اور ایک طول طویل بحث چھڑ گئی۔

۳۔ اگرچہ مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں، لیکن حضرت نبی صلعم کے بعد جو مسئلہ خلافت
پیش آیا وہ حقیقت میں اُس زمانہ کے مسلمانوں کے نزدیک ایک مذہبی مسئلہ تھا۔ ایک گروہ نے تو
حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ مان لیا، دوسرے گروہ نے حضرت علیؓ کو رسول کریمؐ کا جانشین قرار دیا، اور ایک
تیسرے گروہ نے اِن دونوں گروہوں سے علیحدگی اختیار کی اور ہر ایک گروہ نے اپنا مسلک درست
ثابت کرنے کے لیے عقلی اور نقلی دلائل پیش کیے۔ جب بحث و مباحثہ سے بات طے نہ ہوئی تو جنگ و
جدال کی نوبت آئی، چنانچہ شمشیر سے کام لیا گیا اور زبردست گروہ نے زیردست کو اپنے قابو میں کیا۔

لیکن آج ہم جس زمانہ کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اُسوقت یہ مسئلہ اتنا سادہ نہ تھا، کیونکہ اُسوقت
ہر ایک سیاسی جتھا مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا، اور جو لوگ سیاست کے جھگڑوں میں مارے جاتے تھے
وہ شہید خیال کیے جاتے تھے۔ اور بجائے اِس کے کہ اُن جتھوں کے سیاسی نام ہوں۔ اُن جتھوں نے
اپنا اپنا مذہبی نام رکھا، مثلاً شیعہ، خوارج اور مرجیہ۔ اور وہ امور سلطنت اور سیاسی معاملوں میں
بحث و مباحثہ کرنے کے بجائے کفر، ایمان، بہشت اور جہنم کو اپنا مبحث قرار دیتے تھے۔ عثمانؓ کے قتل
کے بعد مسلمانوں کے دو جتھے ہو گئے جو سیاسی تھے، اِن میں ہر ایک اپنے کو راہِ راست پر سمجھتا تھا اور
خلافت کے لیے اپنی پسند کا شخص انتخاب کرانا چاہتا تھا۔ ایک جتھے کے خیال میں حضرت علیؓ خلافت کیلئے
سب سے زیادہ مستحق تھے، دوسرے گروہ نے حضرت معاویہؓ کو پسند کیا اور انھیں کو خلافت کے
قابل سمجھا۔ تیسرا گروہ سرے سے خلافت کا منکر ہو گیا، اور کہنے لگا کہ اگر خلیفہ کا ہونا ضروری ہے۔ تو
ہر دیندار اور دیانت دار شخص خواہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو خلافت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ایک گروہ نے
ان جھگڑوں سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہو گیا۔ گروہ اوّل کو لوگ
شیعہ، دوسرے گروہ کو امویہ، تیسرے کو خوارج اور چوتھے کو مرجیہ کہنے لگے۔ ان گروہوں کے
درمیان دینی اختلافات موجود ہیں، اور ہر گروہ اپنی تائید اور تردید میں مذہبی دلائل پیش کرتا ہے۔

حالانکہ اُن کے نزاعی مسئلے محض سیاسی تھے لیکن اقتضائے زمانہ سے یہ مسائل اُسی زمانہ میں مذہبی رنگ سے رنگ گئے، یہاں تک کہ اُن کی اصلیت بالکل زائل ہوگئی اور مذہبی خط و خال بہت زیادہ نمایاں ہوگئے۔

اِس کا سبب یہ ہوا کہ اُس وقت اسلامی حکومت کے شباب کا زمانہ تھا اور مختلف مذاہب کے بہت لوگ اسلام کے معتقد ہوچکے تھے۔ اُن کا زمانہ بھی پیغمبر صاحبؐ کے زمانہ سے بہت قریب تھا۔ اِس لئے اُن کی نظر ہمیشہ دین اور احکام دین کی طرف رہتی تھی۔ اس طرح وہ ہر چیز کو مذہبی جامہ پہنا دیتے تھے۔ اُن مذہبی جتھوں اور فرقوں میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر ہر قسم کے مظالم ڈھانے کے لئے تیار رہتے تھے چنانچہ یہ لوگ اپنی مطلب براری کے لئے ہر سیاسی مسئلہ کو مذہبی جامہ پہنا دیتے تھے، تاکہ عوام مذہبی جذبات سے متاثر ہوکر تلوار اُٹھانے اور میدانِ کارزار گرم کرنے کے لئے آمادہ ہوجائیں بہرحال اِس طرح آپسمیں خونریزی کا بازار گرم ہوجاتا تھا۔ علماء بھی اپنی معلومات کے زور پہ دین کی باتوں میں مبالغہ اور افراط و تفریط سے کام لینے لگے، اور جب اُن کو دین میں کوئی چیز اُن کے مطلب کے موافق نہ ملی تو وہ اس کے لئے حدیثیں گڑھنے لگے جس سے دینی عقائد میں بھی فرق پڑ گیا۔ حضرت علیؓ کے پیرو شیعہ تھے، جن کا عقیدہ تھا کہ دین براہِ راست حضرت علیؓ کی اولاد سے وابستہ ہے۔ اسی طرح اموی جماعت نے یہ سمجھ لیا کہ خلافت اور امامت بنو اُمیہ کا حصہ ہے۔ تیسرا جتھا خوارج کا تھا جس کے عقائد اور اصول مذکورہ دونوں گروہوں سے بالکل جدا تھے۔ چوتھے گروہ مرجیۂ کے بھی جس نے خلافت اور امامت کے جھگڑے سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی، خاص عقائد اور آئین تھے۔ یہ سیاسی جتھے جو مذہبی لباس میں نمودار ہوئے۔ اول اول تو ایمان، کفر، گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کی تعریف اور حل و عقد میں پڑے رہے۔ چنانچہ فروعات اور جزئی باتوں میں بھی اختلاف پیدا ہوگیا۔ اور اگر وہ دور جلد ختم نہ ہوجاتا، تو شاید مسلمان اب تک اسی گورکھ دھندے میں مبتلا رہتے، جیسا کہ ہندوستان میں اب بھی ہو رہا ہے۔

بیرونی اور خارجی اسباب حسب ذیل بیان کئے جاسکتے ہیں:۔

۱۔ خارجی اسباب میں سب سے پہلا سبب یہ تھا کہ جب عرب مسلمانوں کے فتوحات کا دائرہ وسیع ہوگیا تو بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے۔ جنمیں یہودی، نصرانی، مانوی، زردشتی، برہمن، صابئی اور دہری وغیرہ سبھی فرقوں کے تھے۔ جنکی تعلیم و تربیت اُن کے مختلف مذاہب کے موافق ہوئی تھی۔ اور یہ لوگ خود بھی اپنے قدیم مذہبی عقائد کو اسلامی لباس میں دکھانے لگے۔ یہی سبب ہے کہ ہم کو آج کتابوں میں اسلام کی نسبت بہت باتیں ایسی بھی نظر پڑتی ہیں۔ جنھیں دیکھکر ہمیں تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً احمد بن حائط کا عقیدہ

تناسخ کے بارہ میں بالکل وہی ہے جو ہندوؤں کا ہے، اور یہی شخص عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت ایک ایسی بات نقل کرتا ہے جس کا کہ خود عیسائی دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اس طرح کی مثالیں ہماری کتابوں میں افراط سے ملتی ہیں۔

۲۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اسلام کے اولین فرقوں خاص کر معتزلہ نے تبلیغ اسلام کا کام اپنا نصب العین قرار دیا اور غیر مذاہب کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے لگے۔ جس میں انھیں بعض ایسی اقوام سے سابقہ پڑا جن کے پاس فلسفہ اور حکمت کا کافی ذخیرہ موجود تھا۔ اس لئے مجبوراً ان کو فلسفہ، حکمت اور دوسری ایسی چیزوں کا مطالعہ کرنا پڑا، تاکہ وہ اپنے مخالف پر بحث و مباحثہ میں غالب آسکیں۔ یہی سبب ہے کہ اسلامی ممالک میں بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہنے لگا۔ اور مختلف قسم کے عقائد معرض وجود میں آگئے۔

بعض مذاہب کے لوگ خصوصاً یہودی اور عیسائی یونان کے فلسفہ سے بہرہ یاب ہو چکے تھے۔ مثال کے طور پر فیلوّن یہودی (۲۵ - ق-م + ۵۰ میلادی) ایسے لوگوں میں تھا جس نے پہلے پہل اسکندریہ میں مذہب یہود کو فلسفہ کے اصول سے ملا دیا تھا۔ کلیماّن اسکندری (تولد ۱۵۰ء) اور ادریجن (از ۱۸۵ء تا ۲۵۴ء) اُن لوگوں میں ہیں جنھوں نے سب سے پہلے نصاریٰ کے مذہب کو افلاطون کے فلسفہ کے ساتھ ملا دیا۔ اور بہت سے نسطوری عیسائی اُن کے پیرو کار ہو گئے۔ چنانچہ معتزلہ بھی خود کو انھیں ہتھیاروں سے مسلح کرنے لگے، جن سے کہ ان کے معاندین سجے ہوئے تھے۔ یہی سب سے بڑا سبب علم کلام کے رواج پانے کا ہوا۔

۳۔ تیسرا سبب دوسرے سبب کا نتیجہ ہے۔ متکلمین کو اپنے حریف سے مقابلہ کرنے کیلئے فلسفہ کی ضرورت پڑی، تاکہ وہ اپنے حریفوں کو پورا پورا جواب دے سکیں، اور اپنے سوالات سے مخالفین کا ناطقہ بند کر دیں۔ اس لئے متکلمین کو یونانی فلسفہ کا مطالعہ کرنا پڑا۔ جس کے ضمن میں مسلمانوں نے یونانیوں سے منطق اور ماوراء الطبیعۃ کو یونانیوں سے حاصل کیا۔ مثلاً نظاّم نے ارسطو کی کتابیں پڑھ کر اُن کا رد لکھا۔ اسی طبقہ میں سے ابوالہذیل علاف بھی ہے۔ اکثر معتزلہ جوہر اور عرض، اور جوہر فرد سے بحث کرتے ہیں۔ اس لئے بعض ایسے مسائل جنکا شمار یونانیوں کے فلسفہ میں ہوتا ہے۔ متکلمین کی بحث میں داخل ہو گئے۔

یہ سب باتیں خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی علم کلام کو وجود میں لانے کا باعث ہوئیں۔ انھیں کی بدولت یہ ایک مستقل فن بن گیا۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ مذہب اسلام خالص ہے اور یوناّن کے

فلسفہ کا اس میں کوئی شمہ اور دیگر مذاہب سے کوئی علاقہ نہیں تو یہ حقیقت سے انکار ہوگا۔ بہت سی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں جو ہمارے اِس بے بُنیاد دعویٰ کو باطل کرسکتی ہیں۔ اِسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام صرف یونان کے فلسفہ کا ساختہ وپرداختہ ہے، کیونکہ اسلام ایک ایسا محور (Axis.) ہے جس کے گرد یونان کا فلسفہ چکر لگاتا ہے۔ البتہ مذہب اسلام یونان کے فلسفہ کے ساتھ گھُل مل گیا ہے۔

بہرنوع علم کلام وہ علم ہے جو عقلی دلیلوں کے ذریعہ عقائد سے بحث کرکے حریف کے دعویٰ کو باطل کرتا ہے۔ جو لوگ اِس فن کے ماہر ہیں، انھیں اصطلاح میں متکلمین کہتے ہیں۔ اس کی وجہ تسمیہ میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ اسلام کے دورِ اوّل میں جو مسئلہ بحث اور مباحثہ کا ہدف قرار پایا وہ قرآن اور خلقِ قرآن کا سوال تھا، اِس لئے اِس کلام کا نام علمِ کلام پڑ گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ مناظرہ اور مباحثہ میں زیادہ تر بحث عقائد کی نسبت ہوا کرتی تھی اور اعمال کے متعلق بہت کم گفتگو ہوتی تھی۔ اِس وجہ سے اِس علم کا نام علمِ کلام پڑ گیا۔ اِسی طرح کے اور بہت سے وجوہ علمِ کلام کی وجہ تسمیہ کی نسبت بیان کئے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اِس علم کا یہ نام عصرِ عباسی اور مامون کے زمانہ میں قرار پایا۔ کیونکہ اِس سے پہلے "الفقہ فی الدین" مانند "الفقہ فی العلم" وغیرہ جیسے موضوعات معرضِ وجود میں آچکے تھے، جو قانونی علم تھے۔ چنانچہ اُس زمانہ کا مقولہ ہے کہ "الفقہ فی الدین افضل من الفقہ فی العلم" اور ابوحنیفہؒ کی کتاب کا نام "فقہ الاکبر" ہے۔ شہرستانی لکھتا ہے کہ "اس کے بعد مامون کے زمانہ میں معتزلی علماء فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ اور فلسفہ اور کلام کو آپس میں ملا دیا۔ اُس کے بعد اِس کو ایک جداگانہ علم قرار دیا اور اُس کا نام کلام رکھا۔ اِس قول کے مطابق معتزلہ نے اِس علم کا نام کلام رکھا، اور یہ کام مامون الرشید کے زمانہ میں ہوا جبکہ یونان کے فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوچکا تھا۔

اِسی یونانی کے ذریعہ بہت جلد اسلام میں معتزلی، شیعی، خوارج اور مرجیہ کی طرح متکلمین کے گروہ پیدا ہوگئے، مسلمانوں میں الکندی (متوفی ۲۶۰ھ) سب سے پہلا فیلسوف گنا جاتا ہے، حالانکہ اُس سے برسوں پہلے واصل بن عطاء، عمرو بن عبید، ابوالہذیل علاف اور نظام جیسے متکلمین اسلام میں گذر چکے تھے۔ اُن کے قواعد ترتیب دئے جاچکے تھے، اور علمِ کلام کی بُنیاد پڑ چکی تھی۔ اور اِس سے بھی پہلے بنو اُمیہ کے عہد میں حسن بصری، غیلان دمشقی اور جہم بن صفوان علمِ کلام پر اعتراض کرچکے تھے۔

ترانۂ وطن

(از پنڈت اندرجیت شرما ماچھرو ضلع میرٹھ)

ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن
عظمت ہے دل میں۔ لب پہ ترا نام اے وطن

سر پر ہمارے ہے ترا احسان اے وطن
تیرے ہی دم سے پائی ہے یہ جان اے وطن
ہیں تیرے ہی طفیل سے انسان اے وطن

پیارا ہو کیوں نہ سب سے ترا نام اے وطن
ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

کیفیتِ بہار گھٹاؤں میں ہے تری
لطفِ حیات مست ہواؤں میں ہے تری
جنت ہے جس کا نام فضاؤں میں ہے تری

پُر ہے مئے ازل سے ترا جام اے وطن
ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

قربان تیرے جلووں پہ چاند اور ستارے ہیں
ہیں جتنے ذرّے خاک کے خورشید سارے ہیں
دریا میں جس قدر بھی وہ چاندی کے دھارے ہیں

یہ صبح پُر فضا یہ تری شام اے وطن
ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

گلزار، ہیچ ہے ترے صحرا کے سامنے
کوثر بھی پانی پانی ہے گنگا کے سامنے
عظمت نہیں کسی کی ہمالا کے سامنے

اونچا ہے آسماں سے ترا بام اے وطن
ہم جھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

کشمیر کا جواب بہشتِ بریں نہیں
اور آگرے کے تاج کا ثانی کہیں نہیں
جیسی تری زمیں ہے کوئی سرزمیں نہیں
سب سے نرالا ہے یہ ترا دھام اے وطن
ہم جھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

کس کی مجال ہے جو کرے تیری ہمسری
اُٹھے ہیں تیری خاک سے وہ صف شکن جری
آتی ہے جن کے نام سے رستم کو تھرتھری
تُرکِ فلک ہے لرزہ براندام اے وطن
ہم جھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

رشیوں کا اور ولیوں کا مسکن تو ہی تو ہے
تہذیب کا جہان کی معدن تو ہی تو ہے
ہر علم ہر ادب کا نشیمن تو ہی تو ہے
دنیا کے فلسفی ہیں ترے رام اے وطن
ہم جھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

مفلس کا بے نوا کا سہارا کہیں تجھے ؟
دکھیا کی پھوٹی آنکھ کا تارا کہیں تجھے ؟
ہر دردِ لاعلاج کا چارا کہیں تجھے ؟
ہے سب کو تیرے سایہ میں آرام اے وطن
ہم جھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

میدان جیت جیت کے ہارا ہے ہم نے آج
آپس کی پھوٹ نے ترا کھویا ہے تخت و تاج
آتی ہے ہائے ہم کو یہ کہتے ہوئے بھی لاج

تو تھا کبھی زمانے میں سرنام اے وطن
ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

سیوا میں اے وطن تری تن من لگائیں گے
دشمن ہے جو ترا اُسے نیچا دکھائیں گے
ہم صدقے جائیں گے، ترے قربان جائیں گے
آئے گی زندگی یہ ترے کام اے وطن
ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

فرزند تیرے جامِ محبت پیئے ہوئے
میدان میں پھر آگئے پرچم لئے ہوئے
سینے کو ہر جوان سپر ہے کیئے ہوئے
نزدیک تیرے غم کا ہے انجام اے وطن
ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

سینوں میں لے کے اُٹھے ہیں دردِ نہاں ترا
موجود ہے دماغوں میں سُود و زیاں ترا
رگ رگ میں خون بن گیا نام و نشاں ترا
کیا کر سکے گی گردشِ ایّام اے وطن
ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

بغض و نفاق تیرا مٹا کر رہیں گے ہم
سِکّہ ترا دلوں پہ بٹھا کر رہیں گے ہم
تجھکو مصیبتوں سے چھڑا کر رہیں گے ہم
توڑیں گے ہم غلامیوں کا دام اے وطن
ہم جُھک کے تجھکو کرتے ہیں پرنام اے وطن

فردوسی

از سید رضا قاسم صاحب (حسین آبادی)

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را — گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

ابوالقاسم منصور، صوبہ خراسان کے ابتدائی دارالسلطنت طوس میں ۹۳۵ء میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کے باپ کا نام اسحاق بن شرف تھا۔ جو صوبہ دار طوس مسمی عمید کی ایک جائداد کا محافظ تھا۔ اُس ملکیت کا نام فردوس تھا۔ اسی رعایت سے ابوالقاسم نے اپنا تخلص فردوسی رکھا۔

ایک رات فردوسی کے باپ نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بچہ چھت پر کھڑا ہوا لوگوں کو پکار پکار کر کچھ کہہ رہا ہے اور لوگ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اُس کا جواب دے رہے ہیں۔ دوسرے دن اسحاق، شیخ نجیب الدین علیہ الرحمۃ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے خواب کی تعبیر پوچھی، اُنھوں نے فرمایا کہ تیرا بچہ بہت بڑا شاعر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی کرنا مقصود تھا خواب سچا ہوا اور فردوسی اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

فارسی شاعری میں اُس نے انتہائی کمال پیدا کیا، جس کے ثبوت میں اُس کی مشہور عالم نظم شاہنامہ ایک بے نظیر قومی داستان کی حیثیت سے آج بھی دُنیا کے سامنے موجود ہے اور یقیناً اُس کا یہ کارنامہ رہتی دُنیا تک باقی رہنے والا ہے۔ جسمیں ساسانی نسل کے اوّل فرمانروا سے لیکر آخری بادشاہ کی موت تک ایران کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

فردوسی نے ابتدائی عمر میں کافی تعلیم حاصل کرلی تھی، جب وہ قدیم تاریخ ادبیات اور شاعری میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تو اُس کے بعد چشموں کے کنارے بیٹھکر اشعار کہنا اُس کی خاص دلچسپی اور شغلہ تھا عروضی کے چہار مقالے کی ورق گردانی کرنے پر یہ پتہ ملتا ہے کہ اُس کے پاس کچھ تھوڑی سی جائداد بھی تھی۔ اور اسی کے محاصل پر وہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اپنے وارثوں میں مرتے وقت اُس نے صرف ایک لڑکی چھوڑی تھی جو باپ ہی کی طرح قانع اور وجاہت ہونیکے علاوہ نہایت مطیع و فرمانبردار بھی تھی۔

فردوسی دوسرے ایرانی شعراء کی طرح غزلیں یا عاشقانہ نغمے نظم نہ کرتا تھا، اُسکی رگوں میں خالص ایرانی خون دوڑ رہا تھا۔ اُس کے قلب میں وطن پروری کی آگ مشتعل تھی۔ عربوں کی تاراجی کو گو عرصہ ہوگیا تھا لیکن یہ خلش اُس کو اب بھی ستاتی تھی، وہ اپنے نسلی وقار کو کسی طرح گھٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا

اُس کے دل نے اُس کو مجبور کر رکھا تھا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی شجاعت و دلاوری کے کارناموں کو صفحۂ قرطاس پر اُس طرح ثبت کر دے کہ اُن کو پڑھ کر اہلِ ایران اپنی عظمتِ رفتہ کی یاد تازہ رکھ سکیں چنانچہ شاہنامہ کی تصنیف کے وقت اُس نے انہیں خیالات کو مدنظر رکھا۔

شاہنامہ، فردوسی کے کمال شاعری اور قدرتِ کلام کا ایسا نادر اور عظیم الشان کارنامہ ہے جس کا اب تک دنیا کی کسی زبان میں جواب نہ ہو سکا، اس کے اشعار کا زور اور اثر، شان و شوکت حیرت انگیز ہے۔ اور اُس نظم میں اتنی آمد و برجستگی ہے کہ ایک شعر کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا آہستہ آہستہ چشمے کی روانی کی طرح سامنے آتا جاتا ہے۔ رزمیہ شاعری، محاکات اور جذبات آفرینی فردوسی پر ختم ہو گئی ہے۔ وہ جس واقعہ کو بیان کرتا ہے الفاظ میں ہو بہو اُس کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ کوئی واقعہ اُس کے قلم سے ایسا نہیں نکلتا جس میں وہ محاکاتِ شعری کے لاجواب کارنامے نہ پیش کرتا ہو، اُس کا یہ خاص وصف ہے کہ دوسروں کے جذبات کو اِس طرح ادا کرتا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ اُس کے سینے میں اُس شخص کا دل نہیں ہے جس کی وہ ترجمانی کر رہا ہے۔

مشرق میں شاعری ہمیشہ عزت کی نگاہوں سے دیکھی گئی اور فردوسی کے کمال کا اعتراف اُس کے اہلِ وطن نے نہایت پُرجوش الفاظ میں کیا ہے چنانچہ ایک ایرانی شاعر کہتا ہے ؎

در شعر سہ تن پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ادبیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدیؔ

جامیؔ علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں کہ فردوسی، انوریؔ اور سعدیؒ ایران کے یہی تینؔ بزرگ ترین شعراء ہیں، اور خود محمد اوحدالدین انوری کا فردوسی کے متعلق بیان ہے کہ وہ میرا آقا ہے اور میں اُس کا غلام ہوں، شیخ مصلح الدین سعدیؒ نے بھی فردوسی کا نام احترام و امتنان کے ساتھ لیا ہے۔ نظامی گنجوی کا قول ہے کہ فردوسی طوسی کا مرد دانا اور ماہرِ فن قوافی و نظم تھا۔ چنانچہ فردوسی کی شاگردی و بندگی پر فخر کرتے ہوئے نظامی گنجوی لکھتے ہیں ؎

آفریں بر رواں فردوسی آں سخن آفریں فرخندہ
او نہ اُستاد بود و ما شاگرد او خداوند بود و ما بندہ

واقعی یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ رزم نگاری میں فردوسی جیسا مشرق میں کوئی دوسرا شاعر نہیں گذرا ہے، اُس نے شاہنامہ میں خالص ترین فارسی زبان استعمال کی ہے اور تا امکان عربی الفاظ سے اجتناب کیا ہے۔ اپنے ملکی علم و ادب سے ذوق اور اُس کی ترویج و ترقی کا خیال حبِ وطن کا بیّن ثبوت ہے

چنانچہ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر اپنی مادری زبان کو علمی زبان ثابت کر دیا۔

مغرب میں ہمیشہ یہی دستور رہا ہے کہ کسی کے کلام کی تعریف نہیں کی جاتی، جب تک کہ اُسمیں کسی قسم کا کمال نہ پایا جائے، چنانچہ اہلِ مغرب نے بھی فردوسی کی نظموں کو پرکھا اور اپنی قیمتی اور بے لوث رائیوں کا اعلان کر دیا۔ جس کا اقتباس درج ذیل ہے :۔

"فردوسی نے اپنے مُلک کو ادبیات سے خالی پایا اور اُس نے ایک ایسی نظم چھوڑی ہے کہ تمام آنے والی نسلیں محض اُس کی نقل کریں گی، اور کبھی بھی اُس سے نہ بڑھ سکینگی۔ اُسکی تنہا ایک نظم اُن تمام نظموں کا مقابلہ کر سکتی ہے جو مختلف عنوان و انداز میں لکھی جائیں گی اور غالباً آج اُسکی یہ نظم (شاہنامہ) طول و عرض ایشیا میں اُسی طرح اپنی نظیر نہیں رکھتی جس طرح یوروپ میں ہومر کی داستانیں"

—(۲)—

سلطان محمود غزنوی بڑا روشن دماغ اور شعراء کا قدر دان تھا، اُس کی وسیع الاخلاقی نے فردوسی کو بھی اُس کے دربار میں کھینچ بلایا اور جب وہ غزنی پہونچا تو اُس کو عنصری، عسجدی اور فرخی جیسے درباری شاعروں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

دربار سلطانی میں پہونچنے اور سلطان تک رسائی حاصل کرنیکے متعلق بہارستان جامی میں یہ پُرلطف واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ فردوسی پر کسی نے کچھ زیادتی کی جسکی فریاد لے کر وہ غزنی پہونچا۔ اتفاقاً اُس کا گذر ایک باغ میں ہوا جہاں اُس نے دیکھا کہ تین آدمی بیٹھے ہوئے آپسمیں کچھ گفتگو کر رہے ہیں، فردوسی نے انھیں دیکھکر یہ موقعہ غنیمت جانا کہ اِن سے مل کر غزنی کے کچھ حالات معلوم کرلے۔ فردوسی کو اپنے قریب آتا دیکھکر محض ٹالنے کی غرض سے اُن تینوں شخصوں نے یہ طے کیا کہ اُس کے آتے ہی یہ کہیں گے کہ ہم لوگ سلطان محمود غزنوی کے درباری شاعر ہیں، اور جو شاعر نہ ہو اُس سے بات نہیں کرتے اور اِس مقصد کے لئے ہمیں تین مصرعے موزوں کرلینے چاہئیں، اور چوتھے مصرعے کے لئے کہنا چاہئے کہ جو شخص چوتھا مصرعہ موزوں کر دیگا اُسے ہم اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت دیں گے۔

اُن تینوں شاعروں نے ایک ایک مصرعہ ایسا موزوں کر لیا تھا جسکا قافیہ روشن، گلشن اور جوشن تھا ان کا خیال تھا کہ فارسی زبان میں چوتھا قافیہ نہیں ہے۔ جب فردوسی اُن کے قریب پہونچا تو انھوں نے اس مجوزہ مقابلے کا اُس سے اعلان کیا۔ فردوسی نے کہا کہ وہ تینوں مصرعے کیا ہیں؟ آپ براہِ کرم ذرا مجھے بھی سنائیں، چنانچہ عنصری، عسجدی اور فرخی نے یکے بعد دیگرے اپنے موزوں کردہ مصرعے پڑھے۔

عنصری نے کہا ؎ چوں عارضِ تو ماہ نباشد روشن

عسجدی نے کہا ؎ مانندِ رُخت گل نہ بود در گلشن

اُس کے بعد فرخی نے کہا ؎ مژگانِ تو ہمی گزر کند در جوشن

فردوسی نے ان مصرعوں کو سُنکر فی البدیہہ اُسی قافیہ میں چوتھا مصرعہ

مانندِ سنانِ گیو در جنگ پشن

نظم کرکے رُباعی کو مکمل کر دیا۔

تینوں شعراء فردوسی کے اِس مصرعے کو سُن کر متعجب و ششدر ہو گئے اور گیو و پشن کے حالات سُننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ فردوسی نے ایسی تفصیل کے ساتھ اُس قصے کو بیان کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایران کی تاریخ پر اُس کو ایسی زبردست واقفیت حاصل تھی جسمیں اُس کا کوئی حریف نہ تھا۔

فردوسی کی زبان سے یہ حال سُن کر تینوں شعراء بیحد خوش ہوئے اور اُنھوں نے اُسکو اپنا اُستاد تسلیم کر لیا۔ اپنے ہمراہ دربار سلطانی میں لے گئے اور سلطان کو سارا حال کہہ سُنایا۔ سلطان محمود غزنوی کو جب فردوسی کی اس قابلیت اور شاعرانہ کمال کا حال معلوم ہوا تو وہ بیحد خوش ہوا اور اُسے اپنے دربار میں بلاکر الطافِ خسروانہ و مرحمت ملوکانہ سے سرفراز فرمایا۔

کچھ عرصہ بعد سلطان محمود نے اُسے شاہنامہ لکھنے کا حکم دیا، فردوسی نے ایک ہزار اشعار کہہ کے پیش کئے سلطان نے ایک ہزار دینار سُرخ بطور صلہ عنایت فرمائے اور اِس طرح اپنی علم دوستی کا مظاہرہ کیا اور اس کی آغاز کردہ تصنیف کو بہ ایں شرط مکمل کر دینے کی فرمایش کی کہ اگر اس نظم کی تکمیل ہو جائے گی تو فی شعر ایک اشرفی بطور حق المحنت شاہی خزانے سے اُس کو عطا کیجائیگی۔

فردوسی نے شاہی سرپرستی شکریہ کے ساتھ منظور کی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اشعار نظم کرنا شروع کر دئے۔ اُس کا سن اُسوقت چالیس سال سے کچھ زاید ہو چکا تھا اور تیس برس تک مطالعے اور تصنیف کی شاقہ محنت برداشت کرنے کے بعد ساٹھ ہزار اشعار پر اُس نے نظم کو ختم کیا۔ یہ نظم اتنی عُمدہ ہے کہ جب تک فارسی زبان دُنیا میں باقی ہے اُس کی شہرت کبھی کم نہ ہوگی۔ جب یہ نظم مکمل ہو چکی تو فردوسی نے اُس کا ایک نہایت خوشخط نسخہ سُلطان کی خدمت میں پیش کیا۔ اُسے امید تھی کہ پہلے کی طرح ہر شعر پر موعودہ ایک دینار سُرخ اُس کو فوراً مل جائے گا لیکن ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

حاسدوں نے اُس کی اُمید پوری ہونے نہ دی، ستم تو یہ ہوا کہ اپنے قیام غزنی کے دوران میں فردوسی نے وزرا کو خوش کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہ کی چنانچہ اُنھوں نے سُلطان کے کان خوب بھرے۔

—(۳)—

اس بادشاہ میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں ایک سخت عیب یہ بھی تھا کہ بعض اوقات انصاف پر طمع غالب ہو جاتی تھی، چنانچہ سلطان محمود نے فردوسی کی تصنیف کو نہایت سرد مہری سے دیکھا اور اپنی دون ہمتی سے صرف چار سو اشرفیاں دینا چاہیں جس کو فردوسی نے قبول نہیں کیا۔

جب فردوسی نے اس رقم کو لینے سے انکار کر دیا، تب وزرا نے سلطان کو یہ مشورہ دیا کہ بجائے اشرفیوں کے ساٹھ ہزار درہم یعنی چاندی کے سکّے بھیج دئے جائیں، اس صورت سے شاہی خزانہ بھی خالی نہ ہوگا اور قولِ سلطانی کی تکذیب بھی نہ ہوگی۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ، سلطان نے وزرا کے مشورے کے مطابق چاندی کے سکّے بھجوائے۔

جس وقت شاہی ملازم تھیلیاں لے کر گئے تو اُسوقت فردوسی حمام میں تھا، سلطان کی اس حرکت سے اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور کھڑے ہی کھڑے اُس نے کل درہم ملازمین سلطانی کے روبرو حمام کے خدمتگاروں، شربت فروشوں اور غلاموں کو تقسیم کر دئے اور سلطان کی عہد شکنی کا انتقام اپنے زورِ قلم سے اِس طرح لیا کہ راتوں رات اپنا شرربار قلم اُٹھا کر سلطان محمود غزنوی کی ہجو میں کم و بیش چالیس شعروں کی ایک بے مثل نظم لکھ ڈالی، جس کے بعض اشعار ابتک زبان زد خلائق ہیں جو ناظرین کی تفنن طبع کے لئے درج ذیل کئے جاتے ہیں ؎

اگر شاہ را شاہ بودے پدر	بسر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادر شاہ بانو بُدے	مرا سیم و زر تا بہ زانو بُدے
درختے کہ تلخ است او را سرشت	گرش در نشانی بباغ بہشت
پرستار زادہ نہ آید بکار	اگرچہ بود زادۂ شہریار
بسے رنج بُردم دریں سال سی	عجم زندہ کردم بدیں پارسی
بہ سی سال بردم بہ شہنامہ رنج	کہ تا شاہ بخشد بہ من مال و گنج
بہ پاداش من گنج را بر کشاد	مرا جز بہائے فقاعے نہ داد
کنوں عمر نزدیک ہفتاد شد	امیدم بہ یکبار برباد شد

فردوسی کی تصنیف کردہ یہ ہجو ہمیشہ اس غزنوی سلطان کی سیرت کو بے نقاب رکھے گی۔ یہ ہجو نظم کرنیکے بعد وہ توشہ خانہ کے داروغہ کے پاس گیا اور کسی طریقے سے شاہنامہ کا وہ نسخہ جو اُس نے سلطان کو نذر کیا تھا حاصل کر کے اُس ہجو کے کل اشعار اُسمیں نقل کر دئے۔ اُسکے بعد وہ غزنی سے فی الفور روانہ ہو کر

بغداد چلا گیا اور پھر وہاں سے اپنے وطن طوس[1] کو روانہ ہو گیا۔ سلطان محمود کو جب اُس کی اِس ہجو کی خبر ہوئی تو اُس نے حکم دیا کہ فردوسی کو ہاتھی کے پیر تلے کچلوا دیا جائے۔ اس خبر کو سُنکر بہت دِنوں وہ اپنے وطن میں پوشیدہ زندگی بسر کرتا رہا۔

اب جبکہ وہ غم و فکر اور ضعیف العمری کے باعث بہت کمزور ہو گیا تھا ایک دِن وہ ایک گلی سے گذر رہا تھا کہ اُس نے ایک لڑکے کو اپنی منظومہ ہجو کے چند اشعار پڑھتے ہوئے سُنا، معاً اُس کو سلطان کی عہد شکنی، ناانصافی و ناقدری یاد آگئی، اُس پر اتنا غم طاری ہوا کہ وہ وہیں پر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔ اُسی حالت میں وہ اپنے مکان پر لایا گیا، جہاں اُس نے نہایت بددلی و مایوسی کے عالم میں ۴۱۱ھ[2] میں انتقال کیا۔

اُسی دوران میں سلطان محمود کو اپنی غلطی اور عہد شکنی کا احساس ہوا، ایک مرتبہ خواجہ حسن میمندی نے شکارگاہ[3] میں ایک خاص موقعے پر شاہنامہ کے چند اشعار پڑھے جو سلطان کو بہت پسند آئے، سلطان نے دریافت کیا کہ یہ کس کے اشعار ہیں؟ خواجہ حسن نے جواب دیا کہ فردوسی کے، سلطان اپنی حرکتوں پر بہت نادم ہوا۔ اور ساٹھ ہزار اشرفیاں اونٹوں پر بار کرا کے طوس روانہ کیں، لیکن افسوس کہ سلطان محمود کی یہ پشیمانی بعد از وقت ثابت ہوئی کیونکہ جس وقت اشرفیوں سے لدا ہوا کارواں شہر میں داخل ہوا اُسی وقت فردوسی کا جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ شاہی قاصدوں نے اس عطیۂ سلطانی کو فردوسی کی لڑکی کے حوالہ کرنا چاہا مگر اُس غیرتمند نے بھی اُسے ٹھکرا دیا۔ بالآخر سلطان محمود غزنوی کو جب ان واقعات کی اطلاع پہونچی تو اُس نے اپنے کارندوں کو حکم دے کر اسی رقم سے طوس[3] کے قرب و جوار میں

---

[1] علامہ آزاد بلگرامی نے "خزانہ عامرہ" میں یہ لکھا ہے کہ فردوسی اپنے وطن طوس سے استمدار چلا گیا، وہاں کے حاکم نے اُس کا بہت اعزاز کیا اور اُس کے تصنیف کردہ ہجویہ اشعار کو ایک لاکھ درہم میں خرید کر شاہنامہ سے خارج کرا دیا لیکن اِس کارروائی سے فردوسی کی تصنیف کردہ ہجو کی وہ مقبولیت کم نہ ہو سکی جو پر لگا کر اُسے اڑانے لئے پھرتی تھی اور اُسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی یہ ہجو اُسی طرح مشہور ہے گویا ابھی ابھی کہی گئی ہے۔ [2] مگر علامہ آزاد بلگرامی اپنی کتاب "خزانۂ عامرہ" میں سلطان محمود کے اس احساس کا واقعہ اس طرح لکھتے ہیں کہ سلطان محمود ایک دِن شہنشاہ دہلی کو خط لکھوا رہا تھا، اُسی دوران میں اُس نے حسن میمندی کی طرف دیکھ کر سوال کیا کہ جواب باصواب نہ آیا تو کیا ہوگا؟ خواجہ حسن نے فوراً شاہنامہ کا یہ شعر پڑھ دیا ؎

دگر نہ بکام من آید جواب   من و گرز و میدان و افراسیاب

جس کو سُنکر سلطان رو دیا اور کہنے لگا کہ میں نے فردوسی پر بڑا ظلم کیا۔ [3] بہارستان جامی روضہ ہفتم ذکر فردوسی میں اِس سرائے کی تعمیر کی نسبت طوس کے قرب و جوار میں اُس کا بنایا جانا لکھا ہے مگر علامہ آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ اس رباط کا نام چاہہ ہے اور مرو و نیشاپور کے درمیان واقع ہے۔

ایک کارواں سرائے تعمیر کرادی۔

ایرانؔ کی اس بے بدل ہستی کو جس نے اپنی زبان و ملک کے لئے جان و دل سے کوشش کی، اور شاہنامہ ایسی عدیم المثال نظم لکھ کر ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کا مصداق پیش کیا ہے، اگرچہ اِس دنیائے آب و گل سے رخصت ہوئے ہزار سال سے زائد عرصہ گذر چکا، لیکن آج بھی اُس کی یاد لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے اور اُس کا یہ کارنامہ ایسا بقائے دوام حاصل کر چکا ہے کہ فارسی داں دُنیا اُسے کبھی بھی بھلا نہ سکیگی۔ چنانچہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

فنا کے بعد بھی اہلِ کمال زندہ ہیں
زہے وہ کام کہ جس سے جہاں میں نام رہے

تیس سال پہلے

زمانہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۰۸ء کے مشترکہ نمبر میں شمس العلما خان بہادر مولانا ذکاء اللہ خان صاحب دہلوی کا ایک مفصل مضمون "سودیشی تحریک" کے عنوان سے زیب رسالہ ہوا ہے، جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:۔

"دُنیا میں ہزاروں برس تک بھارت ورش یا آریہ ورت کی زراعت و کشت و کار صنعت دستکار کا آفتاب نصف النہار پر چمکتا رہا۔ وہ دُنیا کے اندر زراعت میں سرفراز تھا اور صنعت میں ممتاز۔ مگر اب فقط زراعت میں وہ نامور رہ گیا ہے کہ ایک عالم اسکو زراعتی ملک کہتا ہے، وہ صنعت میں ایسا گمنام ہوگیا ہے کہ کوئی اب اُس کو صنعتی ملک نہیں کہتا۔ پہلے اس کی صنعت کی کارپردازی اور نادرہ کاری اور دستکاری کی علمی و عملی کارشناسی ایسی شہرۂ آفاق تھی کہ دور دراز ملکوں کے کالاشناس یہاں آتے تھے، اور یہاں کی مصنوعات کو بطور عجائبات کے سوغات میں لے جاتے تھے۔ شال بافی، ابریشم طرازی، پنبہ بنانے میں اہلِ ہند کو وہ ملکہ تھا کہ یہیں کا لباس رومیوں اور ملکوں کے بادشاہوں و شہنشاہ بانوؤں اور طرح دار اُمرا کے حُسن کو دوبالا کرتا تھا۔ یہیں کے ظروف گلی و برنجی اور ہاتھی دانت اور آبنوس کی بنی ہوئی چیزیں اُن کے محلوں اور قصروں کو آرائش دیتی تھیں۔ دُنیا کے تمام عیش و عشرت کے سامان اور زیب و زینت کے اسباب یہیں تیار ہوتے تھے۔ جن کے لینے کیواسطے ممالک مغربیہ کے جہاز ساحل ہند کے بندرگاہوں میں کھڑے رہتے تھے۔"

فطرتِ خاموش[1]

(از شیخ محمد یوسف ظفر بی۔اے)

یہ ترنم خیز خاموشی، یہ گاتی چاندنی　　یہ اودھ کی رات، یہ پُرکیف خوابِ زندگی
یہ ہوا کے نرم جھونکے یہ فضاؤں کا سکوں　　یہ ستاروں کا تبسم، یہ ردائے نیلگوں
یہ طرب افروز میکش مست سایوں کا شباب　　یہ مری تنہائیوں کو گدگداتا ماہتاب
ہر طرف سیال چاندی، ہر طرف بیخود جمال　　ہر طرف پیڑوں کی گہری سوچ، پتوں کے خیال
اُس طرف گاتی ہوئی ندی میں بہتی چاندنی　　اِس طرف خاموش گلشن میں خراماں زندگی
اُس طرف تنویر زا میٹھے دھندلکے کا خرام　　اِس طرف میرے لئے خاموشیوں کا انتظام
اُس طرف تنویر و ظلمت کا وصالِ دلفریب　　اِس طرف جامِ تمنا میں مئے صبر و شکیب
اُس طرف چشمِ تماشا کی نگاہِ کامیاب　　اِس طرف جاگا سا دل، سویا ہوا سا اضطراب
اُس طرف نظارگی سے چشمکیں تنویر کی　　اِس طرف ماحول میں رنگینیاں تصویر کی
اُس طرف رقصِ تجلّی میں سراپا حور کا　　اِس طرف قندیلِ روشن میں دھواں کافور کا

اِس طرف مَیں اور میری مستیوں کا کارواں
آسماں کے زیرِ سایہ عشرتوں کا آسماں

مجھ پہ اتنی مہرباں ہے آج غیروں کی زمیں　　گویا مجھ سا شادماں کوئی زمانے میں نہیں
آج فطرت کامراں ہے آج فطرت کامگار　　میری جنت ہو چکی اب ایسی جنت پر نثار
اِس تبسم زاد نظارے میں جامِ مے نہ ہو　　اس ترنم ریز خاموشی میں کوئی لے نہ ہو
اِس جگہ حورِ ارم کی ہمدمی ہونے نہ پائے　　اور اِن خاموشیوں میں کچھ کمی ہونے نہ پائے
میری فطرت کا تقاضا ہے کہ فطرت ہی رہے　　اور اِس جلوت کے میخانے میں خلوت ہی رہے
میری اُلفت کے لئے آئے اگر وہ مہ جبیں　　کہدو اُس سے آج مجھکو عشق کی فرصت نہیں

آج میں کھویا ہوا ہوں فطرتِ خاموش میں
آج ہے جنت ظفر میری مرے آغوش میں

---

[1] یہ نظم فیض آباد میں کہی گئی۔

ستارۂ تخریب

(مشہور بنگالی شاعر قاضی نذرالاسلام کے شہرہ آفاق گیت کا منظوم ترجمہ)

(از حضرت نسیم خوجیا نوالی)

میں ہراک دور میں آتا ہوں پیغامِ قضا لیکر (۱)
میں ہراک عہد میں آتا ہوں پیغامِ بلا لیکر

میں ہراک عصر میں تکمیلِ محشر بن کے آتا ہوں
میں لپنے ساتھ اِک طغیانِ آتش خیز لاتا ہوں

میں انجم پارۂ تخریب ہوں سوزِ قیامت ہوں
میں قاصد اہرمن کا ہوں پیامِ موت و آفت ہوں

مری پیشانی روشن ہے جہنم کے شراروں سے
خراجِ آتشیں لیتا ہوں بجلی اور ستاروں سے

میں وہ شعلہ ہوں جو پلتا ہے مظلوموں کی آہوں میں
میں وہ بجلی ہوں جو پوشیدہ رہتی ہے گناہوں میں

جہنم کے مغنی کا سرودِ آتشیں ہوں میں
قضا کی سمیّت ہے مجھ میں سوزِ آخریں ہوں میں

مرے سینے میں سوتی ہے تباہی بد دعاؤں کی
مری آنکھوں میں رقصاں ہے سیاہی بد دعاؤں کی

وہ آوازِ فغاں ہوں میں جو گاہے قلبِ یزداں سے
اُبھرتی ہے حکایتہائے جورِ نوعِ انساں سے

میں بنکر داغ رہتا ہوں غمِ گیتی کے سینے میں
کہ جیسے پھول لالے کا ہو صحرا کے سفینے میں

سراپا بد دعا ہوں میں جہاں کو پھونک ڈالوں گا
جو میرے راستے میں پڑ گیا میں اُس کو کھالوں گا

مری سانسوں میں پھنکاریں بھری ہیں اژدہاؤں کی
مری آنکھوں میں روحیں مسکراتی ہیں وباؤں کی

تڑپ بجلی کی بادل کی گرج طوفاں سمندر کا
میں بربادی کے نوحوں کو سموتا ہوں ہواؤں میں

میں اذن ابدے رہا ہوں لپنے آتشناک تیروں کو
تباہی کا سبق دیتا ہوں ان بے باک تیروں کو

اجل کے پھر دھماکے لو سنو میری صداؤں میں
وہ دیکھو تیرتی ہیں موت کی چیخیں فضاؤں میں

وہ میں نے دُم کی مشعل سے لگا دی آگ دنیا میں
وہ شعلے گا رہے ہیں موت کا پھر راگ دنیا میں

اُفق پر سرخیاں چھانے لگیں خونِ جہنم کی
وہ سانسیں رُک چلیں پھر محفلِ خورشید و انجم کی

یہ آگ اور خوں کا کھیل اس سے بھی پہلے میں نے کھیلا ہے
مری موجِ نفس طوفاں کا محشر خیز ریلا ہے

بھنور کا جوش غصہ عدد کا میرے خیالوں میں
فلک کی بجلیاں گوندھی گئی ہیں میرے بالوں میں

مری ہیبت سے جلوہ قدس کے بالانشینوں کا
الٹ دیتا ہوں تختہ آسمانوں کا زمینوں کا

میں کیا ہوں کچھ نہ پوچھو مجھ بلائے ناگہانی کی
قلم سے موت کے لکھتا ہوں سُرخی زندگانی کی

مری رگ رگ میں وہ سیال آتش دوڑی پھرتی ہے
جو زہریلے لبوں سے نارِ دوزخ کے ٹپکتی ہے

اُسی مے کے نشے میں لڑکھڑاتا جھومتا گاتا
میں اس راہِ فنا کی دامنوں سے ہوں گذر جاتا

گناہوں کی شر انگیزی ڈرا سکتی نہیں مجھکو
کوئی شئے اپنے مرکز سے ہلا سکتی نہیں مجھکو

مرے دہشت فزا گیتوں میں شعلوں کی ہے طغیانی
میں ہوں رندِ خراباتی مرے ہیں گیت بھی وحشی

سمندر کا خروشِ تُند میرے شور کے آگے
ہوائے تُند و پر ہیبت میں جیسے گیت بھونروں کے

تباہی کے پریشاں خواب جو قوموں نے دیکھے ہیں
مری آتش فگن زلفوں کے ہیبت ناک سائے میں

یتیموں کی قیامت سوز فریادیں بھی پلتی ہیں
ابھی تک میرے بالوں میں تڑپتی ہیں مچلتی ہیں

کسی دن یہ طلسمِ ہستیِ انسان توڑیں گی
یہ سحرِ سامری کو بھی جگائے بن نہ چھوڑیں گی

تباہی کا ستارا ہوں میں اِک سوزِ قیامت ہوں
میں قاصد اہرمن کا ہوں پیامِ موت و آفت ہوں

مجھے افلاک پر قدسی نقیبِ حشر کہتے ہیں
میں ہر اک دَور میں آتا ہوں پیغامِ قضا لیکر

طوق غلامی

از منشی گوردسرن لال ادیب ایم-اے لکھنوی

صبح کو اک دن جو نکلا سیر کرنے کے لئے
میں نے دیکھا آرہا ہے سامنے اِک نوجواں

سر جھکائے چل رہا ہے کچھ عجب انداز سے
مست ہے رفتار چہرہ سے اُداسی ہے عیاں

درد سا اُٹھا مرے دل میں یہ حالت دیکھکر
پاس جب پہونچا تو میں کہنے لگا اے مہرباں

یہ شباب اور آپ کی رفتار ایسی سست سُست
ہیں ابھی سے آپ میں پیرانہ سالی کے نشاں

کیا طبیعت دشمنوں کی آج کچھ ناساز ہے؟
یا ہوا ہے غم کوئی لاحق نصیبِ دشمناں

سر جھکا کر آپ کیوں چلتے ہیں کچھ کہئیے سہی
عمر ہی کیا ہے ابھی نامِ خدا ہیں نوجواں

مجھکو دیکھا اس نے اور پر درد لہجے میں کہا
جانتے ہیں آپ ہوں باشندۂ ہندوستاں

پوچھتے ہو مجھ سے کیا مغموم ہونے کا سبب
شادمانی ہے مری داغِ غلامی میں نہاں

میری گردن پر گراں طوقِ غلامی کا ہے بار
سر اُٹھا کر چل سکوں اتنی مری ہمت کہاں

کام آسکتا مقدر جب آہ اپنی قوم کے
شرم آتی ہے اگر کہتا ہے [illegible]

دِلّی اور دِلّی والے[1]

از خواجہ محمد شفیع دہلوی

کیا بُود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ‌ ‌ ‌ ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب ‌ ‌ ‌ رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا ‌ ‌ ‌ ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

دِلّی کی دلبری زمانہ کو ہمیشہ سے اپنا دلدادہ کئے رہی۔ خدا معلوم اِس اُجڑے دیار کی مٹی کیسی من موہنی ہے اور اِس خاک میں کس قیامت کی کشش کہ ہر کس و ناکس کھنچا چلا آتا ہے۔

ہندوؤں میں برہمن، شتری، ویش، دوجنمی، زنّار بند سے لیکر شودر تک ہمیشہ سے اِس شہر میں آباد ہیں۔ مسلمان کچھ حملہ آوروں کے ہمراہ آئے، جو خاں، سیّد اور مغل کہلائے۔ کچھ اسلام لائے۔ انھوں نے شیخ کا لقب پایا ؂

خراب کیوں نہ ہو اِس شہرِ دل کی آبادی ‌ ‌ ‌ ہمیشہ لوٹنے والے ہی اِس دیار میں آئے

جب اِس شہر پر شاہوں کی نظرِ کریمانہ پڑی تو گداؤں کا دستِ طلب بھی دراز ہوا۔ یہ خوانِ نعمت دیکھ کر قزاقوں اور ڈاکوؤں کے دندانِ آز بھی تیز ہوئے ؎

ہر کمالے را زوالے ہر زوالے را کمال

کسی نے باغ کی طرح ڈالی، کسی نے سینچا اور کسی نے اس پھلے پھولے چمن کو برباد کیا۔

نادر شاہ سر بکف تیغ بدست طوفانِ بلا کی طرح آیا۔ محمد شاہ کی رنگ رلیوں پر پانی پھیر دیا۔ شہر برباد۔ شہری خانماں خراب۔ بادشاہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ تختِ طاؤس نذر کر کے پنڈ چھڑایا۔ مرہٹہ گردی، گردشِ روزگار سے کم نہ تھی۔ روز کی مار دھاڑ۔ قتل و غارت سے دِلّی والے دل برداشتہ ہو کر بادلِ ناخواستہ گھر بار تج۔ راضی برضا نکل کھڑے ہوئے۔ زمانہ قدر شناس تھا۔ جہاں گئے مسندِ عزت پر بٹھائے گئے۔ جس جگہ جا نکلے قدر دانوں نے ہاتھوں چھاؤں لیا۔ جس بزم کا رُخ کیا، عزت تالبِ فرش لینے آئی۔ صدر میں جگہ پائی۔ ستاروں میں چاند بن کر چمکے۔ اپنی شعلہ بیانیوں سے

---

[1] یہ مضمون دہلی کے محکمہ براڈ کاسٹنگ کی اجازت سے شائع کیا جاتا ہے۔ جس کیلئے ہم ڈائرکٹر صاحب دہلی اسٹیشن کے ممنون ہیں۔

محفلوں کو گرمادیا۔ گل افشانیوں سے ہر بزم کو رشکِ صد گلستان بنا دیا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں " دہی دلی کے لوگ اور ان کی اولاد تھی کہ جب تباہیٔ سلطنت اور آبادیٔ لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہونچے تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں "۔

دلی ایک شہر تھا۔ ہندوستان کا صدر مقام۔ مغلوں کا دارالسلطنت۔ عیش و عشرت کا سرچشمہ۔ رنگیں بیانی کی راجدھانی۔ آنکھوں کے سامنے دم کے دم میں دیکھتے دیکھتے پانسہ پلٹ گیا۔ رنگ بدل گیا نہ وہ رنگیلے رہے، نہ ان کی رنگیں بیانیاں۔ وہ محفلیں اجڑ گئیں وہ قہقہے چہچہے نہ رہے ع

اک جہاں پھر گیا چشم بت بے پیر کے ساتھ

برجائے رطل و جام مے گوراں نہاد ستند پے | برجائے چنگ و نائے، ونے آواز زاغ است و زغن

دلی برباد ہوئی تو کبھی آباد بھی تھی۔ اجڑا دیار کیا آباد کیا برباد۔ دلی کو آسماں کی نظر کھا گئی۔ یہ تھی بھی نظر فریب، جو چڑھتا ہے وہ ہی گرتا ہے ع وہ طفل کیا گرینگے جو گھٹنوں کے بل چلیں۔

۵۷ء کا واقعہ آخری زخم تھا جو اس تن بے جان کو لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلی والے کا دلی ٹھکانا نہ تھا۔ جو نکل بھاگا، بچ گیا جو ہاتھ آیا مارا گیا۔ اور کہاں کہاں گمنامی کی زندگی بسر کرکے اس دکھ بھری دنیا سے سدھار گئے۔

گوالیار دربار میں ایک شخص حاضر ہوتا ہے۔ نوکری کا طالب، مصیبت کا مارا، ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج کالے خاں نام، پیشہ ستار نوازی، قوم میراثی بتاتا ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ کچھ سناؤ۔ گوالیار میاں تان سین کی جنم بھومی، گویوں کا مرکز ہے۔ ایک سے ایک بڑا صاحبِ کمال پڑا ہے۔ دربار کا ستار نواز دست بستہ عرض کرتا ہے اگر حکم ہو تو پہلے خانہ زاد کچھ چھیڑے۔ اشارہ پاکر شروع کرتا ہے۔ صاحب کمال ہے کمال دکھاتا ہے وہ وہ تان پلٹے لیتا ہے کہ باید و شاید محفل پر جادو سا کر دیتا ہے، کچھ ایسا رنگ جماتا ہے کہ محفل دنگ رہ جاتی ہے۔ اہلِ نظر جان جاتے ہیں کہ اب کالے خاں کا رنگ جمتا دکھائی نہیں دیتا۔ جب وہ ختم کرتا ہے تو کالے خاں کو حکم ہوتا ہے۔ جو چیز اس نے شروع کی تھی۔ وہ ہی یہ بھی چھیڑتا ہے۔ صاحب فہم دیوانہ سمجھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ بھلا اسمیں کیا عہدہ برآ ہو سکیگا۔ پر اس موسیٰ کے آگے اس میراثی کا سحر سامری نہیں چلتا۔ چاند کے سامنے مہ نخشب نہیں ٹکتا۔ دم کے دم میں محفل کو مسخر کر لیتا ہے جو جو رنگ اس میراثی نے دکھائے تھے وہ سب پیش کرتا ہے اور پھر اپنا راستہ الگ نکالتا ہے۔ نئے نئے سوت۔ نئی نئی مینڈہیں۔ نیا رنگ نرالا انگ۔ محفل پر سکوت کا عالم طاری ہے۔ زمانہ کی آنکھیں دیکھا ہوا میراثی اسی تمام نہاد کالے خاں کی آنکھوں کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ مغلیہ آنکھ شاہانہ سج دھج نظر آتی ہے

تاڑ جاتا ہے دست بستہ عرض کرتا ہے کہ سرکار یہ لال پردہ ہے۔ آپ کالے خاں نہیں مرزا کالے ہیں۔ اپنا پرانا نام سُنکر چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ دِل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔ طبیعت کو سنبھالتا ہے ارباب محفل وطن دریافت کرتے ہیں۔ بیساختہ کہہ اٹھتا ہے ؎

گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں   غربت زدہ کیا وطن بتاؤں

ہم فقیروں کا کیا گھر کیا دریغ درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اوست۔ اِس بے سروسامانی کو دیکھکر لوگ استفسار حال کرتے ہیں۔ آنکھ اُٹھاکر اُن کی جانب دیکھتا ہے اور کہتا ہے ؎

چہ پرسی از سروسامانِ من عمریست چوں کاکل   سیہ بختم، پریشاں روزگارم، خانہ بردوشم

مہاراج میراثیوں میں نہیں مصاحبوں میں جگہ دیتے ہیں، اور مرزا کالے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ دست بستہ عرض کرتا ہے۔ مرزا کالے صاحب عالم دہلی غدر میں مارے گئے اب تو یہ روسیاہ کالے خاں زندہ ہے۔ سرکار اگر آیندہ کالے خاں فرمائیں تو کرم ہوگا۔ باقی زندگی گمنامی کی حالت میں گذار دی اور اس جہانِ گذراں سے گذر گئے۔

ان کا واقعہ مشہور ہے اور خدا معلوم ایسی کتنی درد بھری داستانیں ہیں جو صفحۂ ہستی سے مِٹ گئیں ع۔ خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ دِلّی والوں کو کس کس طرح برباد اور خانماں خراب کیا گیا۔

نیا تاجدار۔ نئی تہذیب اور نیا تمدن لے کر آیا۔ دِلّی پر پُرانا رنگ چڑھا تھا جس کا اُترنا آسان نہ تھا۔ ایک سماج تھا کچھ رسم و رواج تھے جن کو مٹتے مٹتے زمانہ درکار تھا۔ ہم کو ایک عمارت ڈھاکر دوسری بنانی تھی۔ دِلّی والے اِس دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور ایمان کی یہ ہے کہ مصلحتاً بھی پیچھے رکھے گئے۔

قانونِ قدرت ہے کہ خوددار انسان، عزت دار انسان پر جب وقت پڑتا ہے تو اُسکی خودداری اور چمک اُٹھتی ہے۔ اس کا پاس عزت دوبالا ہو جاتا ہے۔ دِلّی والوں کے جب بُرے دن آئے، تو مصائب اُن کو جھکا نہ سکے۔ یہ خشک لکڑی ٹوٹ گئی پر خمیدہ نہ ہوئی۔ مصیبتوں نے دِلّی والوں میں خودداری کا تخیّل سخت سے سخت تر کر دیا۔

شکر کی جگہ ہے کہ باوجود بادِ مخالف اور طوائف الملوکی کے اِس سرزمین میں قحط الرّجال کبھی نہیں ہوا، اِس گئے گذرے زمانہ میں بھی سرسیّد جیسا عالی دماغ، حکیم محمود خاں صاحب جیسا طبیب حاذق، غالب جیسا خوش بیان۔ ذوق سا قصیدہ سرا یہیں پیدا ہوا۔

[illegible]

بعضوں کو گماں یہ ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں　　دِلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں
دِلّی غیروں کا دل موہ لیتی تھی۔ الطاف حسین حاؔلی پانی پت کے رہنے والے دِلّی کی مفارقت میں فرماتے ہیں ؎

دِلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر　　گویا نہ رہا اب کہیں دُنیا میں ٹھکانا

دُنیا بدل گئی نہ وہ شکلیں رہیں نہ وہ محفلیں۔ وہ زمانہ نہ رہا نہ یہ وقت رہ جائیگا ع

چناں نماند وچنیں نیز ہم نخواہد ماند

سکندر ہے نہ دارا ہے نہ قیصر ہے نہ کسریٰ ہے　　یہ بیت المال ملک بیوفا بے وارثا گھر ہے
نہ در جاتم ہوا باقی نہ اندر دل ہوس مانده　　بیا ساقی کہ ایں ویرانہ از بسیار کس مانده

رہے نام سائیں کا

حدیثِ آرزو

(از حضرت ادیب مالیگانوی)

لطافت ریز ہے، کتنا طلوعِ صبح کا عالم　　وہ دیکھو پَو پھٹی، وہ گُل کھلے صحنِ گلستاں میں
بساطِ برگِ گل پر ہے ہجومِ قطرۂ شبنم　　مگر سب جذب ہو جائیں گے خورشیدِ درخشاں میں

سمندر میں عمل تبخیر کا ہوتا ہے رہ رہ کر　　سحابِ رحم بننے کو بخارات اُڑتے جاتے ہیں
برستے ہی مگر نالوں کی صورت میں یہ بہہ بہہ کر　　سمندر ہی سے آخر کار مل جانے کو آتے ہیں

تمنا ہے کہ میں بھی تجھ میں یونہی جذب ہو جاؤں
مٹا کر اپنی ہستی کو ترے جلووں میں کھو جاؤں

رباعی

اُلٹے گا فلک نقاب تیرے آگے　　کھل جائے گی ہر کتاب تیرے آگے
ہو جائے گا جب عارفِ یک ذرہ فلک　　جھک جائے گا آفتاب تیرے آگے

کلامِ فراق

(حضرت فراق گورکھپوری ایم۔ اے)

سُنا ہے بادِ خزاں کے ہاتھوں چمن کا دُونا نکھار ہوگا
اثر سے اس شعلۂ نہاں کے کچھ اور حُسنِ بہار ہوگا

یہ کہہ کے ڈالی بنائے دل دستِ غیب نے گلشنِ جہاں میں
چمن کے ہر خار و خس کے نیچے دبا ہوا اک شرار ہوگا

اگرچہ ہر اہل کارواں کے بصیرت افروز نقش پا ہیں
یہ منزلیں جس سے جاگ اٹھی ہیں دلِ غریب الدیار ہوگا

یہ رنگِ بزم نشاطِ ہستی کرشمہ ہے حسنِ شادماں کا
کھلیں گے رازِ حیات جس سے وہ عشقِ غم دوستدار ہوگا

شجر حجر کا جمود ہستی پیامِ عبرت ہے اہل دل کو
جسے تلاشِ سکوں نہیں ہے وہ کس لئے بیقرار ہوگا

لگاوٹیں بھی لئے ہوئے ہے ترا یہ بے لاگ مسکرانا
کبھی یہی اک شرارِ لرزاں رگوں میں چڑھتا بخار ہوگا

پتہ تو برقِ جمال دے کچھ تو چھپ گیا ہے کہ سامنے ہے
اگر یہی شوخیاں ہیں تیری تو پھر کسے اعتبار ہوگا

درازیِ شامِ غم کے ہاتھوں تڑپتے دل بھی ٹھہر چلے ہیں
بچھڑ کے تجھ سے کوئی کہاں تک ستم کشِ انتظار ہوگا

یہ دھندلی پرچھائیاں ہیں جس کی دبی دبی گرمیاں ہیں جس کی
وہ شب قیامت کی رات ہوگی وہ روز روزِ شمار ہوگا

نہ قتلِ منصور کا زمانہ نہ قتلِ سرمد کا دور ہے یہ
اب اس سے اوروں کی صبح ہوگی جو نعرہ گیرودار ہوگا

منازلِ ارتقا کے دھوکے یہ پیرِ گردوں بھی کھا چکا ہے
زمانہ خود حسن سے بے خبر ہے وہ انقلاب ایک بار ہوگا
وہ حشر اُٹھا کہ اہلِ غم کے سُلانے والے بھی چونک اُٹھے
دلوں کو ہشیار کرنے والا فراقِ غفلت شعار ہوگا

کلامِ احسن

(از حضرت احسن مارہروی)

حسنِ دل کش نہ ہو وابستہ اگر دنیا سے
خاک پھر عشق کرے کوئی بشر دنیا سے

روز جاتی ہے عدم کو یہ خبر دنیا سے
کہ چلے آتے ہیں سب شام و سحر دنیا سے

رہ کے دنیا میں جدا کیا ہو بشر دنیا سے
زندگی بھر نہیں دنیا کو مفر دنیا سے

پوچھتے کیا ہیں وہ عشاق کا آغاز و مآل
پاک دل آئے، گئے خاک بسر دنیا سے

گرچہ بدنام وہ ہے سب میں کہ ہے مردہ پسند
زندہ ہے نام محبت کا مگر دنیا سے

کس طرح جائیں گے، یہ فکر ہو کیوں جبکہ ہمیں
دوشِ احباب پہ کرنا ہے سفر دنیا سے

داغِ دل اس کو دکھاتا ہوں جو کرتا ہے سوال
کیا ملا نخلِ محبت کا ثمر دنیا سے

شوقِ رہبر ہے تو ہے منزلِ مقصود قریب
ہم جدا ہیں نہ تری راہ گزر دنیا سے

محتسب پیکرِ شر، رند شریر و خود سر
خیر اُدھر دین سے رخصت ہے اِدھر دنیا سے

کیوں زمانے میں دلِ شیفتہ رسوا ہوتا
عشق کا راز نہ کہتے ہم اگر دنیا سے

کہہ رہا ہے تجھے کیوں قاتلِ عالم ہر ایک
تو نے کیا لڑنے کو باندھی ہے کمر دنیا سے

دل ہے کیا دین بھی جاتا ہوا آتا ہے نظر
کہہ گئی کیا تری دزدیدہ نظر دنیا سے

تو نہ آیا جو عیادت کو تو پھر فائدہ کیا
پھر گیا گر ترے بیمار کا گھر دنیا سے

ایک دن ایک گھڑی چین نہ پایا اُس نے
واسطہ جس کو رہا آٹھ پہر دنیا سے

جب سے پیدا ہوئے ہم سیرِ عدم جاری ہے
سانس کے ساتھ ہے آغازِ سفر دنیا سے

نہ وہ عاشق نہ وہ معشوق نہ وہ ناز و نیاز
کیوں نہ اُٹھ جائے محبت کا اثر دنیا سے

یہ محبت ہے کہ تو ہے محبت احسن
عشق اور عشق بھی اک شعبدہ گر دنیا سے

ماستا

(ایک قصہ)

از مسٹر بھگوت سروپ بی۔ اے

ادھر ٹرین پلیٹ فارم پر رکی، اُدھر مسافروں نے اُترنا شروع کر دیا۔ ہوڑہ کا بڑا اسٹیشن مسافروں سے بھر گیا۔ سریندر بھی جلدی سے اُترا اور ایک ڈیوڑھے درجہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہجوم زیادہ تھا۔ ایک شریف خاتون گود میں بچہ لئے درجہ میں کھڑی تھی۔ راستہ رکا ہوا تھا، اس لئے اُس کے چہرہ سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔ سریندر اندر گیا اور لپک کر بچے کو لے لیا۔ "مائی بھیڑ زیادہ ہے۔ بچے کے چوٹ نہ لگ جائے میں آپ کا اسباب اُتروا لونگا۔ آپ اطمینان سے اُتر آئیں۔" "ارے آپ تو تنہا معلوم ہوتی ہیں آپ کہاں جائیں گی؟ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔ اگر آپ کو محلہ کا نام اور مکان کا نمبر معلوم ہے تو میں آپ کو پہنچا دونگا۔" گھبرائی ہوئی عورت کچھ کہنے ہی کو تھی کہ ایک شریف آدمی بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا "واقعی تم بڑی پریشان ہو گی۔ میں پچھلے درجے میں بیٹھ گیا تھا۔" "میں بھی آپ رہ گئے۔"

"نہیں" (سریندر کی طرف دیکھکر) "یہ لڑکا کون ہے؟"

"میں نہیں جانتی۔ درجہ میں بڑی بھیڑ تھی۔ اس نے مراری کو مجھ سے لے لیا اور سارا اسباب اُتروالیا۔"

"لڑکے تم کون ہو؟ اور تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"میں خواہ کوئی ہوں۔ ارشاد ہو تو آپ کا اسباب لے چلوں؟"

"کیا مضائقہ ہے۔ مگر تم قلی تو معلوم نہیں ہوتے؟"

سریندر نے بچہ ماں کو دیدیا۔ بکس سر پر رکھا۔ بستر کاندھے پر۔ ٹوکری ہاتھ میں لٹکائی۔ خالی بازو عورت کی طرف بڑھا کر کہا۔ "مراری بابو کو دیدو۔"

"مگر تمہارے پاس اسباب زیادہ ہے، گر نہ جائے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ دیوی جی میں کافی مضبوط ہوں۔" عورت نے بچہ دیدیا اور ہینڈ بیگ اُٹھا کر چلنے لگی۔

مرد نے کہا "لڑکے کیا مزدوری لوگے؟ قلی لوگ بعد میں بڑا جھگڑا کیا کرتے ہیں۔"

"جھگڑا تو قلی کرتے ہیں۔ میں نے مزدوری ضرورتاً کی ہے۔ آپ جو پیسے دے دیجئے گا۔"

"بہت مناسب۔ چلو۔"

اسٹیشن سے باہر نکلکر گھوڑا گاڑی کرایہ کی گئی۔ اسباب رکھا گیا۔ میاں بیوی سوار ہوئے۔ سُریندر کے ہاتھ پر ایک دوّنی رکھدی۔

"نہیں جناب میری مزدوری تو صرف چھ پیسے طے ہوئی تھی"۔ "بقیہ تمھارا انعام ہے"۔

"نہیں جناب میں خیرات نہیں لونگا"۔ "مگر تم بچّہ کو بھی لائے۔ وہ سامان سے زائد......"

"مگر دیوی جی، وہ تو میرا فرض تھا"۔ "کیا تم انگریزی پڑھے ہو؟"

"میں نے اسی سال میٹرک پاس کیا ہے"۔

"پھر تم یہ کام کیوں کرتے ہو؟ تمھارا نام کیا ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو؟"

دوّنی واپس کرتے ہوئے سُریندر نے کہا۔ "آپ کو اس سے مطلب؟ مجھکو چھ پیسے دیدیجئے اور بس"۔

گاڑی والے نے دیکھا۔ اس جھنجھٹ میں دیر ہو رہی ہے، اُس نے چھ پیسے دیدیئے اور مسافر سے کہا کہ "حضور مجھکو گھر چلنا ہے، کر دیدیں"۔ یہ کہکر اُس نے گھوڑوں کے چابک مارا۔ گاڑی چلدی۔ سُریندر نے سُنا۔ عورت نے کہا "بڑا عجیب لڑکا ہے"۔ مرد بولا "لیکن معلوم شریف ہوتا ہے"۔

(۲)

سُریندر ناتھ بوس ہری پور کے زمیندار نریندر ناتھ کا لڑکا تھا۔ ذہین، ذکی، حوصلہ مند۔ ان اوصاف کے علاوہ اُسمیں چند خصوصیات ایسی تھیں جو عموماً بنگالیوں میں کم ہوتی ہیں۔ یعنی اُس کا رنگ بہت گورا اور صاف تھا۔ اُس کی آنکھوں میں نیلگوں جھلک تھی۔ اُسکا قد لمبا۔ جسم توانا۔ سینہ چوڑا اور پیشانی کشادہ تھی۔ بال بھی قدرے سنہرے تھے۔ نریندر ناتھ کے احباب کہا کرتے تھے "بابو یوں تو تمہارا کُنبہ ہی خوبصورت ہے لیکن سُریندر تو دُور سے فرنگی معلوم ہوتا ہے"۔

سُریندر جہاں پڑھنے لکھنے میں تیز تھا۔ وہاں کھیل کود اور مردانہ ورزش میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ اپنے ہم عمروں سے نہیں بلکہ دو چار برس بڑوں سے بھی بازی لے جاتا۔ تیرہ برس کی عمر میں سولہ سترہ برس کا جچتا تھا۔

بڑا گھر، خوبصورت لڑکا۔ پڑھنے لکھنے میں ہوشیار، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، رئیس بہاری گھوش کی حسین لڑکی کا پیغام نریندر ناتھ کیسے نامنظور کر دیتے۔ علاوہ پانچ ہزار نقد جہیز کے اور بھی بہت کچھ اُمیدیں تھیں۔ پندرھواں برس لگا۔ سُریندر نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا جس دن یہ خبر آئی، رئیس بہاری سو روپیہ انعام لے کر مبارکباد دینے کو آئے۔ بات پختہ ہوگئی۔ جاڑوں میں

سُریندر جانتا تھا کہ اُسکی حوصلہ مندی اور آرزوؤں کے خرمن کے لئے شادی برقِ سوزاں ہے۔ اُس نے ہر ممکن طریقہ سے اظہارِ ناراضگی کیا۔ کسی نے پروا نہیں کی۔ کھلم کھلا مخالفت کر نہیں سکتا تھا اِس لئے اُس نے گھر سے بھاگ جانے کا تہیہ کر لیا۔ اُس نے سوچا" کلکتہ بڑا شہر ہے۔ پتہ بھی نہیں لگیگا۔ میں کسی دُکان پر نوکری کرکے پیٹ بھی پال لونگا اور تعلیم بھی جاری رکھ سکونگا۔"

آج سُریندر دو گھڑی رات رہے اُٹھ بیٹھا۔ کپڑے پہنے۔ اسٹیشن صرف دو میل تھا۔ آدھ گھنٹہ میں پہنچ گیا۔ ہوڑہ جانیوالی گاڑی تیار تھی۔ ٹرین نے حرکت کی ہی تھی کہ یہ لپک کر ایک درجہ میں سوار ہو گیا۔ دو گھنٹہ بعد ہوڑہ آگیا۔ وہ اُتر پڑا اور خوش قسمتی سے مزدوری بھی مل گئی اور کسی نے ٹکٹ بھی نہیں مانگا۔

(۳)

گیارہ بج گئے۔ مُنھ میں کھیل تک نہیں گئی۔ سُریندر کے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھانے لگے۔ یوں تو دن میں چار بار کھانا ملتا ہی تھا لیکن ماں کبھی پھل کبھی مٹھائی کچھ نہ کچھ اور بھی کھلاتی ہی رہتی تھی۔ علاوہ بریں جیب خرچ کا کثیر حصہ بھی چاٹ میں صرف ہوتا تھا۔ بنگالی بار بار کھانیکے عادی ہوتے ہی ہیں۔ سُریندر کا مُنھ ہر وقت چلا کرتا تھا۔ اُس کی جیبوں میں کچھ نہ کچھ ہر وقت بھرا رہتا تھا۔ اور کلاس میں بھی وہ کھاتا ہی رہتا تھا۔ گھر سے چلتے وقت بھی اُس کو اِسکا احساس ہوا مگر اُس کو خیال تھا کہ اگر گھر سے کچھ لے کر چلا تو بدنامی کی بات ہوگی۔ عزت سے نکل جانے کے یہ معنے ہیں کہ تن تنہا جائے اور ماں باپ کی ایک کوڑی نہ لے جائے۔ بے اصولا بھگوڑا! اور چور بن کر بھاگنا اُسکے احساس خودداری کے خلاف تھا۔ لیکن اب جبکہ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں اور ہاتھ پاؤں کی سکت جواب دے رہی تھی۔ سارے اصول بھوت بن کر کھانے کو دوڑ رہے تھے۔

جیب کی کُل کائنات چھ پیسے تھے۔ اب خیال یہ تھا کہ ایسی چیز ہو جو پیٹ بھی بھرے اور کفایت بھی ہو۔ انھیں خیالات میں غرق وہ شہر کی طرف جا رہا تھا کہ اُس کی نگاہ ایک بھاڑ پر پڑی۔ بھُنے چنوں کی تیز خوشبو نے بھوک کو اِسقدر تیز کر دیا کہ وہ سیدھا بھاڑ پر چلا گیا۔ دو پیسے کے چنے خریدے، ریل سے آتے وقت راستہ میں ایک باغ پڑتا تھا۔ اُسمیں ایک چھوٹی سی نہر تھی۔ بس اُسی کے کنارے بیٹھکر وہ چنے کھائے، جو بچے جیب میں ڈال لئے۔ نہر کا ٹھنڈا پانی پیا۔ آنکھوں میں دم آیا۔ ٹانگوں میں جان آئی۔ شہر جاکر شام تک بازار کا گشت لگایا۔ دکان دکان پھرا۔ کہیں سبیل روزگار دکھائی نہ دی۔ مارواڑی بنگالی لڑکے کو کیسے ملازم رکھتے۔ بنگالیوں نے آوارہ گرد لونڈا سمجھا۔ انگریزی دکانداروں کے یہاں نوکری کا کیا ذکر [illegible]

نہر کے کنارے شب گذار دی۔

صبح ہوئی تو خیال آیا کہ چلو ریل پر ہی مزدوری کریں گے۔ لیکن آج گیٹ پر ایک موٹا گرانڈیل سارجنٹ کھڑا ہوا تھا۔ ہر ایک مسافر کا ٹکٹ دیکھتا اور ہر قلی کے بلّے پر (جو سب کے بازوں پر بندھا ہوا تھا) نگاہ ڈالتا جاتا تھا۔ سریندر نے بیدھڑک اندر گھسنے کی ناکام کوشش کی، کیونکہ سارجنٹ نے پکڑ کر باہر کی جانب دھکا دیدیا۔ لاچار پھر بازاروں کے گشت کا ارادہ کیا۔ لیکن ع

صبح سے شام ہوئی، شام سے پچھلا پہرا

نتیجہ جو کل تھا وہی آج ہوا۔ بقیہ پیسے دوپہر ہی تک ختم ہو گئے تھے۔ شام کو فاقہ رہا۔ بھوک کے مارے نیند آنی مشکل ہو رہی تھی۔ سُریندر کو اپنی حماقت پر افسوس ہونے لگا۔ اُس کو ماں کا دُلار۔ چچی کا پیار۔ بھائی بہنوں کا دوّا دوّا کہہ کر کھانے کو بُلانا یاد آنے لگا۔ آدھی رات تک جاگ کر اُس کی آنکھ لگی، تو خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ماں کے ہاتھ میں دال بھات کی تھالی ہے۔ شوربہ دار آلو گوبھی کی بھاجی، بُھنی ہوئی مچھلی، کاٹر گولہ، سا پڑ سو پڑ سے بھاپ نکل رہی ہے۔ چھوٹی بہن کے ہاتھ میں طشتری رس گلّوں اور چمچموں سے بھری ہوئی ہے۔ ماں نے کہا "بٹیا تم گھر سے کیوں چلے گئے۔ دیکھو تمھارے لئے کیسی اچھی دُلہن ڈھونڈی ہے۔ پھر تمھارے سُسر کیسے مالدار ہیں۔ تمھاری دُلہن کیا تم کو پڑھنے سے تھوڑا ہی روکے گی۔ جتنا چاہے پڑھنا لکھنا۔ یہ تم نے اچھا کیا چلے آئے۔ تمھارا مُنھ بہت اُتر رہا ہے، تم نے دو دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ لو اُٹھو کھانا کھالو۔ میں تمھارے پتا جی سے کہدونگی، وہ تم کو نہیں مارینگے۔ لو جلدی کرو کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" ماں نے کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا۔ سریندر کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک لمبا مالی ڈنڈا لئے ڈانٹ رہا ہے۔ "تو کون ہے؟ پرائے باغ میں گھس کر سو رہا ہے، کیا کوئی مسافر خانہ سمجھا ہے؟ چل راستہ لے۔ ورنہ پولیس کے حوالے کر دونگا۔"

پولیس کا نام سُنکر اُس کے ہوش اُڑ گئے۔ چپکے سے باغ سے نکل آیا۔ جنگل میں ضروریات سے فارغ ہو کر سوچنے لگا۔ "خواہ کچھ ہی ہو گھر تو اب جانا نہیں ہے۔ لیکن پھر جینا بھی مشکل ہے۔ آج بھی اگر ایسے ہی گذرے گی تو شام تک تو اُٹھنا بیٹھنا بھی محال ہو جائیگا اور پھر رات کہاں کٹے گی؟ چلو ذرا ہگلی کی بندرگاہ کی سیر تو کر لیں۔ وہاں سمندر کے جہازوں سے مال اُتارنے کی مزدوری خوب ملتی ہوگی۔ یہ قسمت آزمائی اور سہی۔ بالفرض اگر نہیں بھی ملتی، تو گھر جا کر مُنھ دکھلانے اور باپ کی قمچیاں کھانے سے بہتر تو یہ ہے کہ میں ہگلی میں ڈوب مروں۔" بس یہ سوچ کر اُس نے ساحلِ دریا کا راستہ لیا۔

سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اُسکی سُنہری سُنہری شعاعیں سطحِ آب پر کلیلیں کر رہی تھیں۔ ہگلی کی لہریں

لطف دکھا رہی تھیں۔ دُور فاصلہ پر بڑے بڑے جہاز کھڑے تھے۔ کنارے کے آس پاس سیکڑوں کشتیاں اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ بجرے بھی دریا میں پڑے تھے۔ بڑی بڑی کشتیاں جہازوں سے مال اُتار اُتار کر لا رہی تھیں۔ دریا کا سماں، کشتیوں کی آمد و رفت کا نظارہ دیکھکر تھوڑی دیر کو سُر یندر کی بھوک بھاگ گئی۔ وہ عالمِ محویت میں یہ دلکش سماں دیکھتا رہا۔ لیکن تا بکے۔ رات بھر کا فاقہ، جسم کی کمزوری، پیٹ کی اینٹھن، آخر یہ مدہوشی جلد ہی دُور ہو گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ مزدوری تو جہازوں پر ملیگی۔ مگر بلا کشتی وہاں پہنچنا محال ہے اور کشتی کا کرایہ کہاں سے آئیگا؟ سامنے کتنا بڑا جہاز کھڑا ہے۔ سمندر کی نیلگوں سطح پر سفید جہاز کسقدر خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ کیا وہاں بھی مزدوری کی کمی ہوگی؟ نہیں۔ نہیں۔ وہاں ضرور کچھ نہ کچھ کام مل جائیگا۔ مجھکو وہاں پہونچنا چاہیئے۔ کوشش کرنی چاہیئے۔ آہ! میں کتنا کمزور ہو گیا۔ اُنہو فاصلہ بہت ہے۔ میں تیرنا بھی نہیں جانتا۔ لاؤ کوشش تو کروں اگر اپنی نہیں تو مچھلیوں ہی کی بھوک بجھاؤں۔

سر یندر دریا میں گھس گیا۔ ایک قدم آگے بڑھاتا اور کنارہ کی طرف حسرت سے مڑ مڑ کر دیکھتا۔ بازوں تک پانی آگیا اور فاصلہ ابھی تک وہی کا وہی ہے۔ وہ رُک گیا۔ اُس نے کبھی آسماں کو دیکھا اور کبھی دریا کو۔ نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے لوٹنے کی سکت تھی۔ اُس نے دیکھا کوئی بُلا رہا ہے۔ اُس کو کون بُلا سکتا تھا؟ اُسکو وہاں کون جانتا تھا؟ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ آوازیں متواتر آنے لگیں ایک کشتی جس کے نصف حصہ پر ترپالوں کا کمرہ بنا تھا تیزی سے اُس کی طرف آرہی تھی۔ ایک یوروپین ملاح اس کو چیخ چیخ کر پکار رہا تھا۔ اور اشارہ سے واپس جانے کو کہہ رہا تھا۔

سُر یندر اُس کی بولی نہیں سمجھ سکا۔ اُس کو گمان ہوا کہ باپ نے کسی کو اُس کی گرفتاری کے لئے بھیج دیا ہے۔ وہ چلّایا میں ہرگز ہرگز گھر نہ جاؤں گا۔ میں شادی نہیں کرونگا۔ اگر میرے ساتھ زبردستی کی گئی۔ یہ لو "ہری بولو رے"۔

سُر یندر نے غوطہ لگایا۔ لیکن انگریزی ملاح کودا اور اُس کو پانی سے نکال کر کشتی پر ڈال دیا۔ سُر یندر نے آنکھیں کھولیں، کشتی پر جرمن جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اُس پر لکھا تھا "ہمبرگ لائنز" دس منٹ میں اُس کے اوسان درست ہوئے۔ یوروپین ملّاح نے اُس کو کمرہ کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ پردہ پر لکھا تھا "ہمبرگ لائنز"۔

میم بیٹھی ہوئی تھی۔ مسٹر ہیندر کو اُس نے بڑے غور سے دیکھا۔ اُس کے تربتر کپڑوں، اُسکی ندامت آمیز آنکھوں اور اُس کے حسین لیکن کمھلائے ہوتے چہرہ کو چند بار دیکھ کر سرد آہ بھری۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اُس نے گلوگرفتہ آواز میں پوچھا "لڑکے کیا تم دریا میں ڈوبنا چاہتے تھے؟"

"میڈم میں سامنے والے جہاز پر جانا چاہتا تھا"۔ "کیوں؟"۔ "بھوک مٹانے کو روٹی کی تلاش میں"

"تم دریا میں کس طرح جا سکتے تھے؟ کشتی پر کیوں نہیں گئے؟"

"میڈم میرے پاس پیسہ نہیں تھا۔ کشتی پر کیسے جاتا؟"

"اچھا یہ دوّنی لو اور جہاں چاہو چلے جاؤ"

"میڈم، میں خیرات نہیں لونگا"۔　　"تو پھر؟"۔

"آپ مجھکو کام دیں اُسس کا معاوضہ میں بخوشی لوں گا"

"کیا تم کو اُمید ہے کہ اس جہاز پر تم کو جگہ مل جائے گی؟"

"دنیا اُمید پر قائم ہے۔ نا اُمیدی کا نتیجہ آپ دیکھ ہی رہی ہیں"۔

"اگر تم کو وہاں بھی کام نہ ملا تو پھر کیا کروگے؟"　　"خود کو بیکسی کے حوالہ"۔

"لیکن خیرات نہ لوگے؟"　　"ہرگز نہیں"　　"کیوں؟"

"اس وجہ سے کہ میں شریف خاندان سے ہوں۔ بھلے آدمی بھیک نہیں مانگتے ہیں، لیکن محنت کر سکتے ہیں"۔

"تمھارے ماں باپ کیا کرتے ہیں؟ اگرچہ تمہارے کپڑے میلے ہیں، لیکن معلوم بھلے آدمیوں کے سے ہوتے ہیں"

"میں اپنے ماں باپ کی نسبت صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ عالی خاندان ہیں۔ بس۔ میں متواتر دو رات زمین پر سویا ہوں۔ کپڑے میلے ہونے لازمی ہیں۔ مجھ کو دن میں چار پانچ مرتبہ کھانے کی عادت ہے مگر اب توکل سے قطعی فاقہ ہے۔ میڈم! اگر آپ کو مجھ پر ترس آتا ہے تو مزدوری دلوادیجئے"

"تاہم مجھ کو کچھ تو اپنا حال بتلاؤ۔ میں تمھاری سرگذشت سننا چاہتی ہوں"

سر ہیندر نے مختصراً اپنا حال سنادیا۔ لیکن نام وغیرہ نہیں بتلایا۔

لیڈی نے آہ سرد بھری۔ سر ہیندر کو ایک مرتبہ پھر اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اور ملاح کو حکم دیا کہ کشتی جہاز پر لے چلو۔

جہاز کے ملاحوں نے فوراً سیڑھی لگادی۔ لیڈی نے سریندر کو اشارہ کیا اور وہ اُس کیساتھ اوپر چڑھ گیا۔

اوپر متعدد ملاح اور فوجی سپاہی کھڑے تھے۔ لیڈی کو سب نے مودبانہ سلام کیا۔ لیڈی نے ایک سپاہی سے کچھ پوچھا۔ جس کو سُریندر نہ سمجھ سکا، لیکن سپاہی نے لفظ "فراؤ" کہا اور ایک طرف کو اشارہ کیا۔ لیڈی آگے آگے اور سُریندر پیچھے پیچھے ایک بڑے کمرہ کے دروازہ پر پہونچے۔
دروازہ پر پہونچکر لیڈی نے کچھ کہا۔ سریندر کی سمجھ میں آیا کہ اُس نے پوچھا "فیری ڈیرا کیا میں اندر آسکتی ہوں؟"　　جواب ملا "ہاں فراؤ ڈیر"۔

اندر انگریزی سے ملتی جلتی زبان میں باتیں ہورہی تھیں۔ سریندر باہر سُن رہا تھا مگر سمجھتا کچھ نہ تھا۔ لیڈی کی آواز سے کبھی غم کبھی جوش اور کبھی سسکیاں لینے کا اظہار ہورہا تھا۔ مرد کی آواز کرخت، اور لہجہ سخت تھا۔ جوں جوں عورت کی آواز آہستہ اور پُر غم ہوتی جاتی تھی، مرد کا لہجہ ملائم اور آواز مدہم ہوتی جاتی تھی۔

جب لیڈی باہر نکلی تو وہ آنسو پوچھ رہی تھی، لیکن اُس نے مُسکرا کر سُریندر کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اور آہستہ سے کہا "دیکھو تم فان آف ڈمبلرگ برگ کے پاس جارہے ہو"۔

ایک بہت بڑے تن و توش کا قوی الجثہ، پُر رعب شخص فوجی وردی پہنے بیٹھا تھا۔ سریندر کو دیکھ کر وہ چونک پڑا۔ اور پھر اُسے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ اور پوچھا۔

"تم فراؤ کے ہمراہ آئے ہو؟"　　"جی ہاں"۔　　"انگریزی خوب جانتے ہو؟"

"میں نے اسی سال میٹرک پاس کیا ہے"۔　　"اچھا اِس کتاب کو پڑھو"۔

سُریندر نے دیکھا، حروف انگریزی لیکن لفظ دوسری زبان کے ہیں۔ اُس نے بے سمجھے بوجھے فر فر پڑھنا شروع کر دیا۔

"ٹھہرو! ٹھہرو!! اب یہ اخبار پڑھو"۔

اخبار انگریزی کا تھا۔ سریندر نے انگریزی لہجہ بنا کر خوب پڑھا۔

"آنریبل فان"

"ٹھہرو، تم سے کس نے کہا کہ مجھکو فان کہو؟"　　"میری عقل نے"۔

"اچھا عقلمند لڑکے، تم کیا کام کروگے اور کیا تنخواہ لوگے؟ اور کیا تم ممالک غیر میں چل سکوگے؟"

[illegible]

اور مجھکو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے تو میں دُنیا کے ہر حصّہ میں چل سکونگا۔"

"بہتر ہے تم کو اسٹوارڈ کی نیابت میں کام کرنا ہوگا۔ تم کو ایک پونڈ تنخواہ ملے گی۔"

"لیکن جناب نے کھانے کی بابت کچھ نہیں فرمایا؟"

"ہاں! ہاں!! کیوں نہیں کھانا بھی ملے گا۔"

"کم سے کم کے بار؟ کیا جناب تین مرتبہ مل سکیگا؟"

آنریبل خان کی متانت قائم نہ رہ سکی۔ وہ ہنس پڑا اور گردن ہلاکر کہا۔ "لڑکے چار بار۔ اور اگر تم چاہو تو جتنی مرتبہ خواہش کرو کھانا ملیگا۔"

"شکریہ۔ شکریہ۔ آنریبل خان شکریہ۔" "فراؤ ڈیر۔ اِس کو لیجاؤ۔"

فراؤ اندر آئی۔ بڑی خوشی اور محبت سے سُرینِدر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ اُس کو ایک کیبن میں لیگئی۔ "پیارے لڑکے جاؤ۔ مُنھ دھو، تمہارے کپڑے تر ہیں، اُن کو بدل ڈالو۔ دیکھو غسلخانہ میں سب سامان موجود ہے"

غسلخانہ میں سب سامان موجود تھا۔ سُرینِدر خوب نہایا۔ بال سنوارے۔ کنگھا کیا۔ لونڈر لگایا۔ جب اُس نے کپڑے بدلے تو اُس کو سخت تعجب ہوا۔ ہر کپڑا بالکل فٹ تھا۔

آدھے گھنٹے میں وہ باہر نکلا۔ فراؤ منتظر تھی۔ اُس نے سُرینِدر کو دیکھا۔ اُچھل پڑی۔ اُس کے لیئے گالوں کو تھپتھپایا۔ "ڈارلنگ تم تو بالکل جرمن شاہزادہ معلوم ہوتے ہو۔ یہ تمھارا کھانا موجود ہے کھاؤ"

میز پر چائے۔ بسکٹ۔ انڈا۔ روٹی۔ کباب چُنے ہوئے تھے۔ سُرینِدر نے خوب ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ سب قابیں خالی کر دیں۔ فراؤ نے اور سامان لانے کا حکم دیا۔ سُرینِدر نے خوب شکم سیر ہوکر کھایا۔

"میرے لڑکے تم تھکے ہوئے ہو۔ جاؤ سو جاؤ۔ آرام کرو۔"

سُرینِدر کیبن میں گیا۔ پلنگ پر لیٹتے ہی غافل ہوگیا۔

کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ

سُرینِدر کی آنکھ کھلی۔ گھڑی پر نگاہ پڑی تین بجے تھے۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ لیڈی دروازہ پر کھڑی تھی۔ سُرینِدر کو دیکھتے ہی اُس نے کہا۔

"مائی بوائے۔ میں پریشان ہوگئی۔ کتنی ہی بار تم کو دیکھ گئی، تم اِتنا سوئے کہ مجھکو وہم ہونے لگا۔ خیر یہ دیکھو برابر والے سب کمرے تمھارے لئے ہیں۔ تم مُنھ ہاتھ دھوکر کپڑے بدلو اور جلدی آؤ، چائے تیار ہے۔"

سُریندر نے دیکھا۔ اُس کو تین کمرے دئے گئے ہیں، اور ڈریسنگ روم میں بے شمار طرح کے کپڑے موجود ہیں۔ جب مُنھ ہاتھ دھو کر اُس نے دو تین سوٹ پہنکر دیکھے تو وہ حیران رہ گیا۔ ہر چیز ناپ میں بالکل درست تھی۔ وہ باہر آیا۔ فراؤ موجود تھی۔ سُریندر کو دیکھا۔ خوشی سے اُس سے لپٹ گئی۔ "بالکل وہی، بالکل وہی۔ آہا ہاہا۔" سُریندر کی پیشانی چومی، سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور چائے کا حکم دیا۔ اُس نے کچھ کھایا۔ چائے پی۔ اب اُس کی بھوک اتنی تیز نہ تھی۔

فراؤ اُس کو ڈک پر لائی۔ "یہ ہمارا جہاز ہے۔ جرمن جھنڈا کسقدر خوبصورت ہے۔ دیکھو اس پر سات توپیں لگی ہیں۔ تین سو سپاہی بھی ہیں۔ دیکھو ہمارے پاس کسقدر چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہیں۔ تم نے اِتنا شاندار جہاز کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ ایک دن تم ....." وہ رُک گئی۔

"میڈم فراؤ۔ ایک دن میں کیا؟"

فراؤ نے گھبرا کر کہا۔ "تم بڑے اچھے جرمن ملاح بن سکو گے۔ مجھکو میڈم مت کہو۔"

"آپ نے مجھ سے ماں کی سی محبت کی ہے۔ کیا میں آپ کو ماما کہہ سکتا ہوں؟"

"بیٹے! کیوں نہیں، جو جی میں آئے کہو۔ وہ دیکھو فیری آرہے ہیں۔ اُن کو شام کا سلام کرو۔ میں کوشش کرونگی کہ وہ تم سے محبت کرنے لگیں۔"

سنجیدہ صورت فیری کے برابر جا کر سُریندر دو زانو ہوگیا۔ فیری کا لمبا لٹکتا ہوا ہاتھ چوما۔ اور ادب سے سلام کیا۔ اُس نے شاہانہ انداز سے اس کا جواب دیا۔

شام کا کھانا بڑا لذیذ تھا۔ مچھلی۔ انڈا۔ پڈنگ۔ سموسے وغیرہ وغیرہ۔ میز پر فیری بھی موجود تھا اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے بار بار سُریندر کو گھورتا تھا۔ کھانے میں صرف ایک مرتبہ اُس نے کہا۔

"فراؤ۔ تم لڑکے کو جلد مہذب بنا لوگی؟"

"ڈیر کوئی تعجب نہیں۔ کیونکہ وہ ایک شریف گھرانے کا لڑکا ہے۔"

علی الصباح سُریندر کپڑے پہن کر ڈک پر آیا۔ فیری کو سلام کیا۔

"حضور والا! میرے فرائض مجھ کو بتلا دئے جاویں۔"

"تم ابھی اور آرام کر سکتے ہو۔"

"جناب عالی۔ مجھکو اب آرام کی ضرورت نہیں ہے۔ میں مُفت کی روٹی نہیں کھانا چاہتا۔"

"اچھا۔ تو تم اسٹوارڈ سے احکام حاصل کرو۔"

سُریندر نے سلام کیا اور اسٹوارڈ [illegible]

رہا تھا۔ کہ اُس نے دیکھا ایک سپاہی نے اُس کو سلام کیا اور ایک طرف کو ہٹ گیا۔ سُرتیندر نے اسٹوارڈ کا نام لیا تو اُس نے اشارہ سے بتلا دیا۔ جس طرف سرتیندر جاتا اہلِ جہاز آداب بجالاتے، اور اُس کے لئے راستہ چھوڑ دیتے۔ اب سرتیندر اُس حصہ جہاز پر پہونچا۔ جہاں اسٹوارڈ کا کمرہ تھا۔ بوڑھے افسر نے لپک کر اُس کا خیر مقدم کیا اور نہایت کشادہ پیشانی سے اُس کو سلام کیا۔ بوڑھے سردار نے اپنی ٹوپی اُتار لی اور خود کرسی بچھا کر علیحدہ کھڑا ہوگیا۔ سُرتیندر نے کہا "آپ بھی بیٹھ جائیے"۔

"حضور، میں اِس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔ بے ادبی ہوگی"۔

"میں تم سے درخواست کرتا ہوں۔......" "حضور صرف حکم دے سکتے ہیں...."

"لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ اِس جگہ میرے فرائض کیا ہیں؟"

"عالیجاہ! میں سمجھا۔ حضور میرے ہمراہ آئیں۔ دیکھئے یہ انجن ہے۔ یہ مشینری ہے۔ پہلے اِن سب سے واقفیت حاصل کیجئے۔ یہ ملازمان کی حاضری کا رجسٹر ہے۔ ہر ایک کے فرائض خوب معلوم فرمائیے۔ پھر یہ نقشے ہیں۔ یہ چارٹ ہیں۔ یہ سمندری راستہ کے نشانات ہیں۔ اِن کا درست استعمال جاننا آپ کے لئے ضروری ہے تاکہ حکم حضور کا ہمیشہ بجا اور درست ہو"۔

"شکریہ۔ شکریہ"۔

جہاز دس بارہ دن تک برابر دریائے ہگلی میں کھڑا رہا۔ جسقدر سُرتیندر کی واقفیت جہاز اور اس کے حصوں سے بڑھتی جاتی تھی، اُتنا ہی فراؤ کی خوشی میں اضافہ ہوتا جاتا۔ ڈریسنگ روم میں بکس پوشاکوں سے بھرے پڑے تھے اور سُرتیندر جتنی مرتبہ نئی پوشاکیں بدلتا، فراؤ خوش ہوتی۔ ملازمین جہاز اُس کا احترام کرتے۔ فراؤ اس کو بتلاتی کہ کون کس رُتبہ کا آدمی ہے اور کس طرح اُس سے پیش آنا چاہئے۔ خاموش سیرت، سنجیدہ صورت فرڈی ننڈ بھی اب اُس سے ایک آدھ بات کرنے لگا۔ اُسکی گفتگو محبت آمیز مگر بیحد مختصر ہوتی تھی۔

——(۵)——

آج جہاز پر نئے جھنڈے چڑھائے جا رہے تھے۔ جہاں جہاں رنگ و روغن میں ذرا سا بھی فرق آگیا تھا۔ اُس کی دُرستی ہو رہی تھی۔ تمام اہلِ جہاز کی دوڑ دھوپ اور انہماک ظاہر کرتا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ اُس نے دیکھا خان فرڈی ننڈ ہر کام کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ سُرتیندر نے اُس سے پوچھا

"آج کوئی نئی بات ضرور ہے۔ کیا میں بھی کوئی خدمت بجا لا سکتا ہوں؟"

"لڑکے! تم کو معلوم ہو کہ آج ہمارے ولی نعمت شہنشاہ قیصر ولیم کی سالگرہ ہے"۔

"سرفان۔ اس خاص موقع پر مجھکو بھی اظہارِ وفاداری کا موقع ملنا چاہیئے"
"تم سب کاموں کی نگرانی میں حصہ لے سکتے ہو"
"مگر میں تو چاہتا تھا کہ ———" "یعنی"
"یعنی کچھ آرایش ہندوستانی طرز پر کروں"
"اچھے لڑکے یہ سُنکر مجھکو بڑی خوشی ہوئی۔ تم کلکتہ جاکر حسب پسند سامان لے آؤ"
بڑی کشتی نکالی گئی اور چھ جرمن سپاہی سُریندر کے ہمراہ کردے گئے۔"
ایک دوکان پر سُریندر ڈوری، کاغذ اور کپڑے کے پھول، گلدستہ، شیشے کے قمقمے، سبزی اور سنہری روپہلی جھنڈیاں خرید رہا تھا کہ اس نے دیکھا اُسی دکان پر اُس روز والا مسافر بھی مع اپنی بیوی اور گود کے بچے کے سامان خرید رہا ہے۔ اس نئی ہیئت میں اُس نے سُریندر کو نہیں پہچانا لیکن جب سُریندر نے بچے کو آہستہ سے تھپتھپایا تو اُس نے پہچان لیا اور پوچھا "تم کو کہاں کام ملا؟ اب تم کیا کرتے ہو؟"
"ہمبرگ لائنر۔۔۔۔۔۔"
کپتان فنٹلر نے کہا "حضور عالی، معمولی دیسیوں سے بات کرنا حضور عالی کی شان کے خلاف ہے۔ فراؤ اس کو سخت ناپسند کرینگی"
سُریندر کو بلا مزید گفتگو کا موقع دئے ہوئے سامان موٹر میں رکھدیا گیا اور سُریندر کو سوار کرادیا۔
جنٹلمین نے دیکھا قلی لڑکے کو چھ یوروپین سپاہی کس شان سے سوار کرا رہے تھے میاں بیوی ایک دوسرے کا منھ تک رہے تھے کہ یہ راز کیا تھا؟
جہاز کو آراستہ کرکے نئی دُلہن بنادیا تھا۔ سُریندر نے ڈک کے اوپر شامیانہ لگوا کر ایسا آراستہ کیا تھا کہ فراؤ اور فان دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔
شام ہوئی جہاز بُقعہ نور بن گیا۔ فراؤ نے کہا "لڑکے تم نے سخت محنت کی ہے۔ جاؤ کپڑے بدل لو، سُرخ فوجی پوشاک پہننا۔ آج تم ہتھیار اور جال کرچ سے آراستہ ہوجانا۔ تاکہ تم واقعی جرمن شاہزادہ معلوم ہو"
ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے سب لوگ جہاز کے ڈیک پر جمع ہوگئے۔ سب باوردی سر سے پاؤں تک اوپچی بنے۔ فراؤ نے دستک دی "دو مائی بوائے۔ جلدی آؤ سب ٹھیک ہے۔ ڈنر کا وقت قریب آگیا۔
جب سُریندر فوجی وردی پہنکر باہر نکلا تو فرطِ انبساط سے فراؤ نے اُس کو چمٹا لیا۔ "فری تمھاری سجاوٹ کی تعریف کر رہے تھے۔ اب وہ تم کو دیکھ کر بے حد خوش ہوں گے"

آنریبل فان فرڈی نَنڈ صدر نشین ہوئے۔ اُس کے بعد فراؔو اور اُس کے بعد سُریندر کی جگہ تھی۔ پھر اور لوگ درجہ بدرجہ بٹھلائے گئے تھے۔

پہلے ایک فوجی راگ گایا گیا۔ بینڈ بجا۔ جہاز پر سے توپیں سر ہوئیں۔ دُعائیں مانگی گئیں۔ "قیصر ولیم زندہ باد" کے نعرے بلند ہوئے۔ جام و سبو سجے ہوئے رکھے تھے۔ سوڈے کی بوتلیں موجود تھیں۔ سبھوں نے ارغوانی شراب سے پیالے لبریز کئے۔ فرائر کے کھڑے ہوتے ہی سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ فرڈی نَنڈ نے مختصر سی تقریر کی اور قیصر ولیم کی درازئ عمر و اقبال کی دُعائیں مانگیں۔ پھر قیصر کا جام صحت تجویز ہوا۔ سبھوں نے اپنے اپنے گلاس اُٹھائے اور چشم زدن میں خالی کر دئے۔ سُریندر نے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ وہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اُس کا گلاس میز پر تھا۔

فرڈی نَنڈ چونک پڑا۔ چہرہ غصہ سے تمتما گیا۔ قہر آلود لہجہ میں وہ چلّایا "غدار"۔ اُس کی تلوار میان سے نکلی۔ ہاتھ اوپر کو اُٹھا اور قریب تھا کہ سُریندر کے دو ٹکڑے ہو جائیں کہ یکایک فراؔو نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"فیری ڈیر! ڈیر! ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ کیا تم اجنبی کو قتل کر دوگے؟ وہ ہمارے طریقے کیا جانے۔ غلطی میری ہے۔ سزا مجھ کو دو۔ مجھکو لازم تھا کہ اس کو پہلے سے ہی سمجھا دیتی۔"

سنجیدہ صورت فرڈی نَنڈ کا ہاتھ رُکا۔ تلوار میان میں گئی۔ شیشے پھر سے بھرے گئے۔ جام صحت پھر سے تجویز ہوا۔ سُریندر نے گرج کر کہا "قیصر ولیم کی جے"۔ اور سارے کا سارا گلاس خالی کر دیا۔

فرڈی نَنڈ کی باچھیں کھل گئیں۔ فراؔو کی مسرت کی انتہا نہ رہی، وہ بولی "سیکھ کر اچھا جرمن بن جائیگا"

شب کو گیارہ بجے جلسہ ختم ہوا۔

(۶)

پندرہ دن کے قیام کے بعد ہمبرگ لائنر نے لنگر اُٹھایا۔ دوران سفر میں سُریندر نے محسوس کیا کہ جہاز والے مثل مالک کے اُس کا احترام و عزت کرتے ہیں۔ بوڑھا اسٹوارڈ جب اُس کو موقع ملے، یہی کہتا رہتا ہے۔ "سرکار میں بوڑھا ہوں، میرے بال بچوں کا خیال رکھئے"۔ اور جب سریندر اُس سے کہتا کہ "مجھ سے کیا مطلب؟" تو وہ کہتا "عزت پرور! آپ ایک دن بہت بڑے آدمی ہوں گے"۔

آٹھویں دن جہاز رنگون پہنچا۔ بارہ بجے تھے۔ بہت سے آدمی شہر کی طرف جانے لگے۔ سُریندر کے بھی جی میں آیا کہ لاؤ میں بھی سیر کر آؤں۔ چنانچہ وہ بھی کچھ لوگوں کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اور شہر میں آہستہ علیحدہ ہو کر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ نیا ملک۔ نیا شہر۔ نئی وضع قطع دیکھ کر وہ خوب پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہونے لگی تو اُس کو واپسی کا خیال آیا۔ وہ جہاز پر لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا۔ کہ

تین برمی سپاہیوں نے اُس کو گرفتار کرلیا۔ اُس نے بنگلہ، ہندوستانی اور انگریزی میں اپنی گرفتاری کا سبب پوچھا۔ لیکن یہ لوگ کچھ نہ سمجھ سکے۔ یہ لوگ اُس کو تھانہ پر لاتے، جہاں ایک برمی انسپکٹر کے پاس وہ پیش کیا گیا۔ یہ انگریزی جانتا تھا اور سُریندر کے پوچھنے پر اُس نے کہا کہ "تم بڑے شریر لڑکے ہو اِس وجہ سے گرفتار کئے گئے ہو۔" اُس کو برآمدہ میں ایک کرسی پر بٹھلا دیا گیا۔ اور دو سپاہی نگرانی کرتے رہے۔ کئی گھنٹے انتظار کرتے گذر گئے۔ سُریندر سوچ رہا تھا کہ میں کسی غلط فہمی کا شکار ہوگیا ہوں۔ یکایک اُس نے دیکھا کہ تھانہ پر ایک موٹر رُکی۔ فراؤ اُتر کر سیدھی سریندر سے چمٹ گئی۔

"میرے لڑکے — تم مجھ کو چھوڑ کر کیوں بھاگ آئے؟"

"ماں میں پگوڈا دیکھنے اور سیر کرنے میں لگ گیا۔"

"ارے لڑکے۔ یہ تو میں تم کو خود سب کچھ دکھلاتی۔ تم کو جہاز پر نہ پاکر میں نے تحقیقات کی۔ سہ پہر کو جب چند آدمی شہر سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ تم کو بھی شہر کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے میں نے پولیس کمشنر کو فون کرایا۔ تمھارے ڈھونڈنے کا انعام مقرر کیا۔ تمہارا حُلیہ۔ کپڑے سب کا اعلان کرایا۔ خدایا شکر ہے تیرا، تم مجھکو پھر مل گئے۔ اب جن لوگوں نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا اُنکو سزا دیجائے گی۔"

"ماں۔ اوروں کو جاتے دیکھ کر میں بھی چلا آیا۔ اُن کا قصور کچھ نہیں ہے۔ میں خود ہی اُن سے علیحدہ ہوگیا تھا۔"

"لیکن اُن کا فرض تھا کہ تم سے علیحدہ نہ ہوں۔"

"کچھ ہی ہو ماں، آپ اُنھیں معاف کردیں۔ میں آیندہ خود احتیاط رکھونگا۔"

"خیر تمھاری خاطر سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔"

کہاں یہ خیال تھا کہ جہاز رنگون ایک ہفتہ ٹھہرے گا اور پھر جاپان تک کی سیر ہوگی۔ کہاں واپسی کی گھنٹی بجنے لگی۔ فراؤ کا خیال ہے کہ سریندر کو تعلیم دلانا۔ اُس کو جرمن بنانا ضرور ہے۔ اِس لئے سفر ملتوی۔ بس اب وطن کو واپسی ہوگی۔ ہگلی میں چند ضروری کاموں کی وجہ سے ایک ہفتہ پھر قیام ہوگا۔ اور اُس کے بعد ہمبرگ لائنر جرمنی لوٹ جائیگا۔

آج رات بھر سُریندر سوچتا رہا، "میں کیا نوکر ہوں۔ مجھ سے کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ فراؤ کی محبت مادرانہ روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ فرڈی نینڈ بھی پدرانہ شفقت سے پیش آتا ہے۔ وہ کم سخن سنجیدہ صورت، دل سخت جو کسی سے بولتا تک نہیں۔ مجھ سے کیسے خوش اخلاقی سے بات کرتا ہے۔

پرسوں کس لہجہ میں اُس نے کہا تھا "لڑکے! اب تم کے مرتبہ کھانا چاہوگے، تم بھوکے تو نہیں رہتے ؟" ملازمان جہاز فرڈی ننڈ اور فراؤ کے بعد اپنا مالک مجھ کو ہی تصور کرتے ہیں۔ ایسے ایسے قیمتی سوٹ، یہ نفیس سامان ایک دم میرے لئے کہاں سے آگیا؟ برہما کی سیر میری خاطر ذراسی بات پر ملتوی کردی گئی، میری تعلیم کا اتنا خیال کیوں ہے؟ ایک جرمن سے کیوں مجھے مشابہت دیجاتی ہے۔ ہاں ٹھیک ہے کل خواہ کچھ ہو بوڑھے خانساماں سے یہ راز معلوم کئے بغیر نہ رہونگا۔ سُریندر کو اچھی طرح نیند نہیں آئی وہ تین بجے جاگ پڑا اور چپکے سے بوڑھے خانساماں کے دروازہ کو کھٹکھٹایا۔ اُس نے کواڑ کھولے اور اس بے وقت آمد کا سبب پوچھا۔

سُریندر نے کسی قدر حاکمانہ اور قدرے التجا آمیز لہجہ میں آنے کی غرض بیان کی۔ خانساماں نے راز کو افشا کرنے سے انکار کیا تو سُریندر نے سختی سے کہا "اگر تم مجھ کو سب حال نہ بتلاؤ گے تو میں علی الصباح فان سے کہونگا کہ خانساماں مجھسے کہا کرتا ہے کہ میرے بچّوں کا خیال رکھنا وغیرہ وغیرہ"

یہ سنکر اسٹوارڈ گھبرا گیا اور بولا" اچھا اگر آپ رازداری کی قسم کھائیں تو میں بتلادونگا۔ کم از کم اُس وقت تک کہ یہ راز از خود آپ پر ظاہر نہ ہو"

سُریندر کے اطمینان دلانے پر اُس نے کہا" میرے آقا سُنو، فرڈی ننڈ قیصر ولیم کا قریبی بھائی ہے ڈمبلرگ برگ کا وہ خان ہے۔ وہاں کا وہ خود مختار حاکم ہے۔ فراؤ اُس کی بیوی اپنے خاوند سے علیحدہ جائداد اور زرِ نقد کی مالکہ ہے۔ یہ جہاز انھیں کی ملکیت ہے۔ ڈیوک آف ڈمبلرگ برگ کے کئی جہاز ایسے ہی اور بھی ہیں۔ انگلینڈ کی سیر کو جارہے تھے کہ راستہ میں اُن کا لڑکا جو تمہارا ہمشکل وہم سن تھا بیمار ہوا اور مرگیا۔ سمندر میں ہی اُس کی قبر بنائی گئی۔ ان دونوں کو لڑکا بڑا عزیز تھا۔ اس غم میں یہ لوگ نہ انگلینڈ ٹھہرے اور نہ گھر واپس گئے بلکہ جی بہلانے کیلئے دُنیا کی سیر کا ارادہ کیا۔ چار مہینے سے برابر گھوم رہے ہیں۔ فراؤ نے تم کو دریا میں ڈوبتے دیکھا۔ انسانی ہمدردی نے تم کو بچایا۔ جب تم سامنے آئے تو اپنے لڑکے کی ہو بہو شبیہ دیکھ کر محبت مادری نے جوش مارا۔ تم سے بات چیت کی۔ شریف اور ہونہار پایا۔ بس اُسی وقت سے وہ تم کو اپنا لڑکا سمجھنے لگی۔ اور ہے بھی یوں کہ تم میں اور اُس لڑکے میں بال برابر بھی فرق نہیں۔ میرے مالک! تم جرمنی جاؤگے۔ ریاست ڈمبلرگ برگ کے حاکم ہوگے۔ اُس وقت اِس خادم کے بچّوں کا خیال رکھنا"

اگر دعوت والے روز آپ سے ذراسی فروگذاشت نہ ہوجاتی تو آنریبل فان ڈمبلرگ برگ نے آپ کے اپنا لڑکا ہونے کا اعلان کردیا ہوتا۔ لیکن اب وہ وقت جاتا رہا۔ اب آپ کو جرمنی میں جرمن

بنایا جاویگا اور ڈمبلرگ برگ کا تاج و فراؤ کی بے انتہا دولت آپ کا ورثہ ہوگی"

(۷)

بنگلی آئے جہاز کو چار دن ہوگئے۔ صبح کا وقت تھا سُریندر چائے پی کر تختۂ جہاز پر سمندر کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اُس کو شبہ ہوا کہ کنارے پر پولیس کے کچھ سپاہی جہاز کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ لپک کر اپنی کیبن میں گیا۔ اور دُوربین سے کنارے کی طرف دیکھا۔ کشتی کنارے سے چل چکی تھی، چار سپاہی، ایک سارجنٹ اور اُس کا چچا اُسمیں سوار تھے۔ وہ بھاگا۔ جہاز کی دوسری طرف فرڈی ننڈ اور فراؤ کھڑے تھے۔ وہ فراؤ سے لپٹ گیا۔

"ماں۔ ماں۔ میری ماں۔ مجھ کو بچالو۔ وہ آرہے ہیں۔ وہ مجھ کو لیجائیں گے۔ تم مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔ آنریبل فان مدد۔ مدد"

آج پہلی مرتبہ سُریندر نے جوش سے فراؤ کو ماں کہا تھا" فراؤ نے فرطِ محبت سے بیقرار ہوکر اُسکو لپٹالیا" بیٹے۔ پیارے بیٹے۔ کوئی انسانی طاقت تجھ کو مجھسے جدا نہیں کرسکتی۔ وہ کون ہیں۔ بتلاؤ؟"

"دیکھو۔ دیکھو وہ آرہے ہیں۔ یہ لو وہ آن پہنچے۔"

ایک جرمن سپاہی نے آکر کہا" ایک انگریز ملنا چاہتا ہے"

فرڈی ننڈ نے اجازت دی۔ سارجنٹ نے سُریندر کی جانب اشارہ کرکے کہا" یہ گھر سے بھاگ کر آیا ہے۔ ہم اس کو لینے آئے ہیں"۔

فراؤ نے گرج کر کہا" میں حکم دیتی ہوں ہمارے جہاز سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ ہمارے سپاہی تم کو سمندر میں پھینک دیں گے۔

"یہ میرا بھتیجا ہے اور مجھکو حق حاصل ہے کہ اُس کو میں اپنے ہمراہ لے جاؤں"

فراؤ" تم لے جاؤگے، ہمبرگ لائنر سے۔ کپتان اِن سب کو سمندر میں دھکیل دو۔ تو پوں کا رُخ پھیر دو۔ اسی بحرِ بنگال میں ہم جنگ کرینگے۔

سارجنٹ نے کہا" میڈم آپ کا جہاز انگریزی عملداری میں ہے اور یہاں آپکو انگریزی قانون کی پابندی لازمی ہے"

"لیکن یہ جرمن جہاز ہے اور یہاں ہمارا حکم ناطق ہے"

فرڈی ننڈ نے نہایت اطمینان سے سیٹی نکالی۔ اور ایک سگنل کے دینے پر دو سو مسلح جرمن سپاہی تختۂ جہاز پر جمع ہوگئے۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں آج سے پندرہ دن پہلے قیصر کی سالگرہ منائی جا رہی تھی۔

فراؔو کے اشارہ پر قریب تھا کہ آنے والوں کو جہاز سے اُن کی کشتی میں دھکیل دیا جائے کہ سُرؔیندر کے چچا نے نہایت مودبانہ انداز میں فراؔو سے کہا " معزز میڈم ۔ قبل اس کے کہ ہم نکالے جائیں، میری ایک درخواست سُن لیجئے "۔

" کہو "

" آپ لڑکے کو رکھ لیں ۔ لیکن ذرا اُس ماں کا بھی خیال کریں جو رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ رہی ہے، اور جس نے مہینہ بھر سے کھانا نہیں کھایا ہے ۔ اور جو اِس کو کھو کر زندہ نہیں رہ سکتی "۔

فراؔو بُت بن گئی ۔ اُس کا غصہ جاتا رہا ۔ اُسکی گردن جُھک گئی ۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے ۔ وہ سُبک کر رونے لگی ۔ بمشکل اُس نے خود پر قابو پایا ۔ اُس نے انگریزی میں کہا ۔

" آہ! ماں کی ماتا ۔ ماں کی محبت ۔ پیارے لڑکے، میں نے تم کو اُس کی جگہ دی اور جو اُس کو ہونا تھا ۔ تم کو بنانے کا خیال کیا ۔ کیوں؟ ماں کی محبت کے باعث ۔ سُریندر! دیکھو میرے دل کی ترازو میں ایک طرف میری محبت اور دوسری طرف تمہاری ماں کی محبت کے احساس کا توازن بتلا رہا ہے کہ تمہارا رکنا ظُلم ہے ۔ وہ ظُلم جسکی تلافی نہیں ہوسکتی ۔ وہ گناہ جس کا کفارہ نہیں ۔ بیٹے ۔ جاؤ ۔ اپنی ماں کی گود میں جاؤ ۔ اُسکی آنکھوں کو روشن کرو ۔ اُس کے کلیجہ کو ٹھنڈا کرو ۔ اُس کو مرنے سے بچاؤ "۔

سُریندر نے کہا " کیا تم میری ماں نہیں ہو؟"

" سچ ہے ۔ بیٹے سچ ہے ۔ تم میری محبت کا اندازہ نہیں لگا سکتے ۔ لیکن میں اُسکی محبت کا اندازہ لگا رہی ہوں جس نے تم کو نو مہینے پیٹ میں رکھا اور اب تمہارے لئے تڑپ رہی ہے ۔ لڑکے یہ میرا تبرک ہے ۔ میں تم کو کبھی نہ بھولونگی ۔ تم بھی مجھ کو کبھی نہ بھولنا ۔ اور جب کبھی تم اپنی ماں سے اجازت لے کر جرمنی آؤگے تو میری آغوشِ محبت تمہارے لئے کُھلی ملے گی ۔ جاؤ ۔ جاؤ ۔ اپنی ماں سے میرا پیغام کہنا ۔ " میں اُس کے کھوئے ہوئے بیٹے کو اُس کے پاس بھیجتی ہوں ۔ وہ میرے کھوئے ہوئے بیٹے کیلئے دُعا کرے "

سُریندر اور سب ہمراہی کشتی پر سوار ہوئے تو فراؔو ہی نسؔ کی متانت قائم نہ رہ سکی ۔ سُریندر کو الوداع کہتے وقت دو موتی جیسے آنسو اُس کے سُرخ و سفید رخساروں پر ڈھلک رہے تھے ۔

اُس نے ایک تھیلی سُریندر کو پکڑا دی جسمیں سُنہری سکّے چھلک رہے اور جو سُریندر کی چند روز کی مزدوری تھی ۔ جہاز پر واپسی کا گھنٹہ بج رہا تھا ۔ کشتی جانبِ ساحل رواں تھی اور ہم گنگنا رہے

جانبِ وطن جارہا تھا۔

سُریندر کا حلیہ اخبار "بنگالی" میں شائع کیا گیا تھا۔ یابندہ کو سو روپیہ کا انعام مشتہر کیا گیا تھا۔ ریل کے مسافر لالہ رلا رام کی نگاہ سے گذرا۔ ریل کا واقعہ اور وقت نریندر ناتھ کو تحریر کیا۔ اور جب ہمبرگ لائنر کا ذکر بازار میں سُریندر نے کیا۔ تو اُس کی شان وشوکت اور موجودگی کی خبر بھی نریندر ناتھ کو دے دی گئی۔

ہمبرگ لائنر کی دوسری مرتبہ کی واپسی پولیس کی متجسسانہ نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی اور یوں بیچارہ کشاں کشاں پھر ہری ہر پور لایا گیا۔

(۸)

ریل کا سفر ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہوگیا۔ گھنٹہ بھر بعد ہری ہر پور پہنچ گئے۔ سُریندر نے دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ نریندر ناتھ لمبی سی قمچی لے کر دوڑے کہ بھگوڑے کو سزا دیں لیکن سُریندر کی ماں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس نے سُریندر کو گود میں لے لیا۔ "میرے لال کو کچھ مت کہنا"

نریندر ناتھ نے ہاتھ روک لیا اور کہا: "تمھارا ہی بگاڑا ہوا ہے"

سُریندر کی شادی ہوگئی۔ بی۔ اے بھی پاس کرلیا۔ نوکری کو بھی مارے مارے پھرے۔ جب سب جگہ کی خاک چھان لی تو کانپور میں منورما پریس کھول کر پیٹ بھرنے کا سہارا کرلیا۔ اب جب احباب اُن کے دفتر میں جاتے ہیں تو اُن کے یون درجن بچّے اِدھر اُدھر اُن کے ارد گرد چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ اور جب کوئی اُن سے ہمبرگ لائنر کا ذکر کرتا ہے تو آہ سرد بھر کر کہتے ہیں۔ ع

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

صورتِ تسکین

(از حضرت بیتاب بریلوی بی۔اے۔ ایل ایل۔بی)

روکشِ میکدۂ حسن! وہ اُٹھا بادل — برق وش ڈوب کے موجِ بط و ساغر سے نکل
آبِ آتش وہ سرِ عرش میں ہمدوشِ زحل — ہے یہی وقت نکل جائے نہ میدانِ عمل

کچھ تجھے عالمِ امکاں کی خبر ہے کہ نہیں
غربتِ مادرِ ہستی پہ نظر ہے کہ نہیں

پھر ہوس تجھکو مٹانے پہ اُتر آئی ہے — تو نے کیا ہوش میں آنے کی قسم کھائی ہے
شیوۂ ضبطِ فغاں درپئے رسوائی ہے — پھر بھی تو قائلِ آئینِ شکیبائی ہے

پردۂ اُمتِ مرحوم ترے ہات میں ہے
ہاں خبردار کہ صیاد ترے گھات میں ہے

طائرِ فکر ترا مائلِ پرواز نہیں — منہ میں غیروں کی زباں ہے تری آواز نہیں
نغمے خوابیدہ ہوں جس ساز میں وہ ساز نہیں — مادرِ ہند کو تجھ پہ تو کوئی ناز نہیں

رنگ و روغن پہ نہ جا پیکرِ تصویر نہ بن
مائلِ دام نہ ہو، حلقۂ زنجیر نہ بن

شورشِ نالۂ شبگیر میں کیا رکھا ہے — شکوۂ گردشِ تقدیر میں کیا رکھا ہے
جلوۂ شوخیِ تحریر میں کیا رکھا ہے — شعلۂ گرمیِ تقریر میں کیا رکھا ہے

بات یوں بات بنانے سے کہیں بنتی ہے
دل نشیں آنکھ چرانے سے کہیں بنتی ہے

نوکِ شمشیرِ دلہن بنکے جگر سے نکلے — موجِ خوں ابر صفت جھوم کے بر سے نکلے
لاش دولھا کی اسی شان سے گھر سے نکلے — ایک آنسو نہ مگر دیدۂ تر سے نکلے

ایک صورت یہی تسکیں کی نظر آئی ہے
شیشۂ دل میں پری بن کے اُتر آئی ہے

اک پیرِ خوش لقا سے

از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم۔ اے

دل میں ہے جوشِ رندی لب پر ہے مست نعرا — ملتا نہیں کسی سے رنگِ سخن ہمارا

خود ہم نے اپنے اوپر یہ ظلم کر گزارا — وہ درد لے لیا ہے جس کا نہیں ہے چارا

پامالیوں پہ مائل دل ہو چکا ہمارا — جز پائے پیرِ مرشد ہو گا کہاں گزارا

ہاتھوں سے دل کو تھاما منہ سے یہی میں پکارا — "دل میرود ز دستم صاحبدلاں خدا را"

مجبوری محض تھی معذوری فقط تھی — وہ چشم دلنشیں اور طاقت ربا اشارا

اک پیرِ خوش لقا سے یوں ابتدا ہوئی ہے — آگے کا اب محافظ اللہ ہے ہمارا

مے سے وضو کرایا اُس شیخ پارسا کو — وقتِ نماز آیا رندوں میں وہ قضا را

گوشہ نشینِ بزمِ پیرِ مغاں ہوا ہے
دُنیا سے کر لیا ہے مدہوش نے کنارا

تصحیح:- زمانہ بابت ماہ اگست ۳۰ء میں سہوِ کاتب سے صفحہ ۸۰ کی تیسری سطر میں حسب ذیل عبارت رہ گئی ہے۔ "مگر بودن اور شنودن اِس سے مستثنیٰ ہیں۔" ناظرین اسے اضافہ کر کے پڑھیں۔

(۲)۔ اِسی پرچہ میں صفحہ ۹۰ پر حضرت فراق کی غزل کے اِس مصرع "سرِ راہ غفلت خواب سے اب اُٹھو کہ وقتِ سحر بھی ہے" میں لفظ "سحر" کے بجائے "سفر" ہونا چاہئے۔ اور مصرع "کہ جو آج غم سے نکل گئی وہ دعا خراب اثر بھی ہے" میں "غم" کے بجائے "دل" ہونا چاہئے۔ ناظرین درست فرما لیں۔ (ا۔ز)

رفتارِ زمانہ

(غیر ملکی)

وسطِ یوروپ میں خطرۂ جنگ شروع ماہ ستمبر سے تاحال یوروپ میں جنگ کے امکانات روز بروز قوی تر ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسوقت مغرب میں جنگ کے بادل جرمنی سے اُٹھکر امنِ یوروپ کے اُفق پر منڈلارہے ہیں یہ بادل برس کے رہیں گے اور نیوزبرگ سے خون کی بارش شروع ہوجائیگی۔ کیا ہٹلر واقعی اب جنگ پر آمادہ ہے اور چیکوسلاویکیا پر حملہ کرکے ہی رہیگا؟ علامتیں تو کچھ اچھی نظر نہیں آرہی ہیں۔ جن جنگی مظاہروں کا ہٹلر نے اِن دنوں اہتمام والتزام کیا ہے۔ وہ قیصر ولیم کے وقت سے لیکر اب تک کبھی اس پیمانہ پر نہیں ہوئے تھے۔ اس عظیم الشان فوجی اجتماع کا محرک محض تفریح وتنظیم کا خیال تو ہو نہیں سکتا۔ جیساکہ ہٹلر کی طرف سے بیان کیا جاتا ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہٹلر کا اصلی منشا صرف دھمکی دینا ہے لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ مظاہرہ فقط ایک دہمکی ہے تو واقعی یہ بڑی خطرناک دہمکی ہے۔ لیگ اقوام کے حلقوں میں موجودہ صورت حالات نازک تو ضرور سمجھی جاتی ہے لیکن بہت زیادہ مایوس کن نہیں خیال کی جاتی۔ اصل سوال جس کے صحیح جواب سے جنگ کے چھڑنے نہ چھڑنے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ کیا جرمنوں کے مطالبات ایسے ہیں جو جنگ کے بغیر پورے نہیں ہوسکتے؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا جرمنی کو واقعی یہ اطمینان ہے کہ وہ ایک اور جنگ عظیم کی جسمیں برطانیہ اور فرانس اس کے حریفوں کا ساتھ دیں، تاب لاسکتا ہے۔

اکثر اہل الرائے اصحاب کا خیال ہے کہ جرمنی ہرگز ایسی کاروائی نہ کریگا۔ جسمیں اُسے برطانیہ سے پھر برسرِ جنگ ہونیکا اندیشہ ہو۔ تاہم جرمنی اِس تاک میں ضرور ہے کہ اگر ممکن ہو تو یکایک ایک پُر زور حملہ کرکے چیکوسلاویکیا کو قبل اس کے کہ دوسری طاقتیں اسکی امداد کے لئے آسکیں، دبوچ لے۔ اِس لئے اگر برطانیہ اور فرانس ڈر نہ گئے اور کمزوری نہ دکھائی تو جرمنی کو چیکوسلاویکیا پر حملہ کرنے کا حوصلہ بھی نہ ہوگا۔ فرانس نے تو علانیہ اعلان کردیا ہے کہ وہ چیکوسلاویکیا کی مدد کرے گا۔ خواہ برطانیہ اس کی رفاقت کرے یا نہ کرے۔ برطانوی حکومت نے بھی کروٹ بدل لی ہے اور اب خود مسٹر چیمبرلین ہوائی طیارہ ہٹلر سے ملاقات کرنے جرمنی گئے ہیں۔

روس اور رومانیہ میں معاہدہ ہوگیا ہے کہ اگر روس کو زیکوسلاویکیا کی مدد کے لئے جانا پڑا تو وہ روسی فوجوں کو اپنے ملک سے گذرنے کے لئے پانچ میل چوڑا راستہ دیدیگا۔

فلسطین | فلسطین میں صورت حالات ابھی تک ویسی ہی ہولناک ہے جیسی کہ ایک عرصے سے چلی آ رہی ہے
قتل، آتشزدگی، لوٹ مار کے واقعات میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ہنوز عربوں اور یہودیوں کے درمیان صلح و
صفائی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔
فوجی انتظامات بدستور جاری ہیں مگر یہ صورت کب تک قائم رہ سکتی ہے۔ آخر کوئی فوج قیام امن کیلئے
ایک معینہ مدت ہی تک رکھی جا سکتی ہے۔ دائمی طور پر یہ انتظام ممکن نہیں۔ یہ بھی درست معلوم ہو رہا ہے
کہ جب تک عربوں اور یہودیوں کو ایک دوسرے سے قطعی علیحدہ اور ایک دوسرے کی زد سے باہر نہ
کر دیا جائیگا۔ اُس وقت تک یہ ہولناک خون آشامی برابر قائم رہے گی۔ لیکن دونوں کو الگ تھلگ رکھنا
بھی تو ممکن نہیں۔ دونوں بہانگ دہل اعلان کر چکے ہیں کہ انھیں ملک کی تقسیم کی اسکیم قبول نہیں۔ عرب
پھیلے جا رہے ہیں۔ اور یہودیوں کے لئے پناہ لینے کی جگہ بھی روز بروز کم ہو رہی ہے۔ اُن کی تعداد کے لحاظ
سے بھی یہ جگہ کافی نہیں ہے خصوصاً جبکہ جرمنی اور آسٹریا سے نکالے ہوئے یہودیوں کی وجہ سے تعداد میں
غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ جرمن حکومت تقریباً تین لاکھ یہودیوں کو مُلک بدر کرنا چاہتی ہے۔ اس پالسی
نے فلسطین کے مسئلہ کا حل اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ یہودی ایک حفاظتی فوج قائم کئے جانے کا پُر زور
مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں اپنی حفاظت کا خود انتظام کرنا چاہیئے۔ جس کے لئے یہودی
نوجوان دل و جان سے تیار ہیں اور انگریزی فوجی افسران کی رہنمائی میں اپنے حقوق کی خود حفاظت
کرنا چاہتے ہیں۔

پولینڈ | پولینڈ کے لئے یہ مسئلہ ایک معمہ لاینحل بنا ہوا ہے اور وہ عجیب مشکل میں ہے کہ جرمنی کا ساتھ دے
یا چیکوسلاویکیا کا۔ باشندگانِ پولینڈ نے زیکوں کو کبھی بھی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ کیونکہ انیسویں
صدی میں زیکوں نے روسیوں سے ربط رکھا۔ درحالانکہ اہل پولینڈ انھیں اپنا سگر ہی سمجھتے رہے۔ اُس
وقت سے ٹیکس پر جزوی مگر شدید رنجش رہی ہے۔
دوسری طرف ہٹلر نے جس طرح رائن لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ اُسی طرح وہ اس علاقہ پر بھی از سر نو
قبضہ کرنے کی فکر میں ہے جو مشرقی پروشیا کو مغربی حصہ سے علیحدہ کرتا ہے اور جو جنگ عظیم کے بعد پولینڈ
کے لئے سمندری راستہ نکالنے کی غرض سے ملحق کیا گیا تھا۔ البتہ اب تک اُس نے مصلحتاً اپنی نیت ظاہر
نہیں کی کہ کہیں پولینڈ اُس سے بدظن نہ ہو جائے۔

ہنگری | ۲۰ ر اگست کو برلن میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہنگری کے وزیر اعظم، وزیر خارجہ اور

ریجنٹ کا استقبال کیا گیا۔ جرمنی نے معزز مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی فروگذاشت نہیں کی، اور ہنگری کے ان برسر اقتدار مدبروں نے بھی جرمنی کے ساتھ دوستی کا علانیہ اعتراف کر کے اُسے یقین دلایا کہ ہنگری میں نازی تحریک کے خلاف کارروائیوں کی جرمنی کو اب تک جو شکایت رہی ہے، وہ آیندہ باقی نہ رہے گی۔ غرض دونوں طرف سے باہمی رفاقت کا یقین دلایا گیا۔ اگر واقعی امیرالبحر جنرل ہارتھی، ڈاکٹر ایمرڈی اور M. de Kanya. جرمنی کے پھندے میں آگئے ہیں اور دل سے اُس کے ہمدم ہوگئے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ جرمنی اور ہنگری کی اقتصادی اور خارجی پالسیوں میں امتزاج پیدا ہو کر جرمنی کا حلقۂ اثر چیکوسلاویکیا کو محیط کر کے روانیہ کے محاذ تک پہونچ جائیگا جہاں جرمنی کے فوجی مظاہرات نے کھلبلی پیدا کردی ہے۔

جہاں یہ امکانات ہیں وہاں دوسری طرف زیکوسلاویکیا۔ یوگوسلاویا اور رومانیہ کے اتحادِ ثلاثہ نے ہنگری سے بھی ایک غیر جارحانہ معاہدہ کرلیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ یہ ممالک ہنگری کو جرمنی کی دوستی سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ ہنگری کو دوبارہ اسلحہ بندی کی اجازت دیدی گئی ہے اور اُن امور پر بھی غور کرلیا گیا ہے۔ جن سے ان چاروں ممالک میں باہمی میل جول قائم رہے تاکہ اُن کے خلاف کسی طاقتور قوم کی جارحانہ کارروائی موثر نہ ہوسکے۔

شروع سے ریاست ہائے بلقان سے نازیوں کے خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ لیکن اب پتہ چل گیا ہے کہ جہاں اقتصادی معاملات میں نازی حکومت وعدہ خلافی سے کام لیتی ہے۔ وہاں قومی معاملات میں بھی اُس کا رویہ روز بروز ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔ بہرحال جرمنی کا اُن سب ملکوں پر جہاں جرمن ہیں، دانت ہے۔ اسلئے اِن سب کی بہتری اسمیں ہے کہ وہ نازیت کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کریں۔ اس لئے یہ معاہدہ جرمنی کے لئے ایک چیلنج کے بمنزلہ ہے مگر اس سے اُسی وقت فائدہ ہوسکتا ہے، جب انگلستان اور فرانس جو ان ممالک کو اپنے حلقہ اثر میں لانے کے خواہشمند ہیں۔ انھیں کافی طور پر تجارتی مراعات پیش کر کے اپنا بنالیں۔

جاپان پچھلے چند ہفتوں میں ہانگ کاؤ کی طرف جاپانیوں کے حملوں کا بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ اس مہم میں چینیوں کے مقابلہ میں جاپانیوں کا نقصان بھی کم نہیں ہوا۔ جہاں تک معلوم ہوسکا ہے۔ ہانگ کاؤ کے گرد ابھی چینی فوجوں کی اور مضبوط صفیں ہیں۔ بہرحال اہل الرائے اصحاب کا یہی خیال ہے کہ اکتوبر کے آغاز سے پہلے جاپانی ہانگ کاؤ پر قبضہ نہ کرسکیں گے۔ اور عجب نہیں کہ اس سے بھی زیادہ عرصہ لگ جائے۔ تاہم عام طور پر یہی خیال ہے کہ ہانگ کاؤ پر بالآخر جاپانی فتحیاب ہوجائیں گے۔

(مُلکی)

ہندوستانی فوج کا مسئلہ مُلکی نظم ونسق کے لئے دو چیزیں سب سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ ایک فوج، دوسرے مالی انتظامات۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی یہ دونوں چیزیں ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ برٹش گورنمنٹ نے یہ بات کاغذی حیثیت سے تو منظور کر لی ہے کہ ہندوستان کی فوج کو ہندوستانی بنایا جائے یعنی ہندوستانی افسروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ لیکن جس سُست رفتار سے یہ اضافہ ہو رہا ہے، وہ بہت مایوس کُن ہے۔ چنانچہ مرکزی اسمبلی میں مولانا شوکت علی کا ریزولیوشن، بدیں سفارش کہ ایک کمیٹی مقرر ہو، جو فوج میں ہندوستانی عنصر کی ترقی کی بابت تبصرہ کرے، پیش ہو کر گورنمنٹ کی طرف سے منظور کیا گیا۔ مسٹر آگلوی نے صاف طور پر اس امر کا اعتراف کیا کہ ہندوستانی فوج میں اعلےٰ عہدوں کے لئے ہندوستانی نوجوانوں کی بھرتی کے مسئلہ پر سرکاری طور پر جیسا کہ چاہئے عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے۔ ہندوستانی فوج کے مسئلہ پر کونسل آف اسٹیٹ میں بھی غور و خوض ہوا۔ مگر وہاں مسٹر پرکاش نرائن سپرو کا ریزولیوشن جو مرکزی اسمبلی، کونسل آف اسٹیٹ اور ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ کے درمیان زیادہ قریبی تعلقات کے متعلق تھا۔ اس بنا پر رد کر دیا گیا کہ اس ریزولیوشن کا اثر دراصل گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی منسوخی ہو گا۔ جس کی رو سے گورنمنٹ ہند ملکی حفاظت کے معاملات میں قطعی خود مختار ہے۔ ممکن ہے کہ مسٹر سپرو کے ریزولیوشن کے الفاظ میں اس موشگافی کی گنجائش نکلتی ہو، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ڈیفنس اور لیجسلیچر کے مابین جس باہمی اتحاد کا تقاضا اس ریزولیوشن میں کیا گیا۔ وہ کیوں قابلِ قبول نہیں سمجھا گیا۔

اخراجاتِ فوج کا نیا بار گورنمنٹ ہند نے طے کیا ہے کہ ہندوستانی فوج میں انگریزی سپاہیوں کی آسایش و آرام کی تجاویز کے سلسلہ میں جو اخراجات بڑھیں۔ اُن کے بار کا متحمل انگلستان کے خزانہ کو ہونا چاہئے لیکن برٹش محکمہ جنگ نے اس فیصلہ کو رد کر دیا ہے۔ لارڈ زٹلینڈ وزیر ہند اور لارڈ لنلتھگو کی ایک نہ سُنی گئی۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حضور والیسرائے ہند اس کی بابت انڈیا آفس اور اُس کے ذریعہ برٹش وار آفس سے اپیل کر رہے ہیں کہ وہ اس مد میں ہندوستان کو مزید زیر باری سے معاف رکھیں تنخواہوں میں جو اضافہ کیا گیا ہے اس سے ہندوستان کو تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ کا زائد صرفہ برداشت کرنا پڑے گا۔ ہم کو امید ہے کہ یہ اپیل صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی۔ ورنہ اس سے سیاسی پیچیدگیاں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

کشمیر [illegible]

برطانوی ہند سے گذر کر ریاستوں میں پہونچ گئی ہے۔ چنانچہ پہلے میسور میں، اس کے بعد ٹراونکور اور اب ریاست کشمیر میں زور شور کا ایجی ٹیشن ہو رہا ہے۔ کشمیر کے تمام مسلم، ہندو اور سکھ لیڈر ریاست میں ذمہ وار حکومت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور اس کا ڈھانچہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

ٹراونکور میں اسٹیٹ کانگریس نے پبلک جلسے اور مظاہرات بند کر دیے ہیں۔ وہاں کی پولیس لاٹھی چارج اور فوج گولی چلانے میں بھی ذرا دریغ نہیں کرتی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اہل ٹراونکور اس تشدد سے دب جائیں گے اور ذمہ وار حکومت کا مطالبہ نہ کریں گے۔

فسادات رنگون: پچھلے دنوں برہما کے بودھوں اور ہندوستانی باشندوں میں زبردست تصادم ہو گیا۔ برہمی شورش پسندوں کے ہجوم نے بارہا ہندوستانیوں پر حملے کئے جس میں تقریباً سو ہندوستانی ہلاک اور پانسو سے زائد زخمی ہوئے۔ پولیس اس فساد کا تدارک نہ کر سکی اور گورنمنٹ کو فوج سے امداد لینی پڑی اور کئی بار گولی چلائی گئی۔ تب جاکر بمشکل تمام سڑکوں کو معمولی کاروبار کے لئے خطرے سے پاک کیا جا سکا۔ کچھ دنوں تو یہ حال رہا کہ بازار اور دوکانیں سب بند رہیں۔ اور کھانے پینے کی چیزیں بھی ملنا محال ہو گیا۔ ان سب واقعات کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک برہمی مسلمان نے ایک کتاب "یوگی اور مولوی" لکھکر بودھوں کی دل آزاری کی تھی۔ گو بظاہر فسادات مسلمانوں کے خلاف ہوئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مجموعی طور پر سب ہندوستانیوں کے خلاف تھے۔ رنگون میں برہمیوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ ہے اور برہمی ہمیشہ سے یہی چاہتے رہے ہیں کہ ہندوستانیوں کو نکال کر پورا اقتصادی تسلط خود اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔

سرکاری دفتروں میں بھی ابتک ہندوستانیوں ہی کو اپنی قابلیت کی وجہ سے فوقیت حاصل رہی ہے، ان فسادات نے ۱۹۳۱ء کے فسادات کی یاد تازہ کر دی جو کہ اولاً جنوبی ہند کے مزدوروں کے خلاف ظہور پذیر ہوئے مگر بعد کو مجموعی حیثیت سے ہندوستانیوں کے خلاف تھے۔ ان فسادات کے زخمی ہندوستانی مدراس، کلکتہ اور چاٹگام وغیرہ مقامات میں بالکل بے سروسامانی کی حالت میں پہونچے ہیں۔ ہزاروں ہندوستانی بالکل لٹ گئے ہیں۔ اس وقت جو ہندوستانی برہما نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ اس ادھیڑبن میں ہیں کہ وہاں سے کسی طرح واپس آکر ہندوستان میں پھر آباد ہو جائیں۔

نئے آئین کے ماتحت اہل برہما کو سیاسی قوت ضرور حاصل ہو گئی ہے لیکن وہ ہندوستانیوں کو اس طرح برہما سے نہیں نکال سکتے جس طرح کہ یہودیوں کو ہٹلر نے نکال دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس سیاسی قوت کی بنا پر جو انھیں نئے آئین کی رو سے حاصل ہو گئی ہے وہ رفتہ رفتہ اپنا اقتصادی تسلط

بڑھاکر ہندوستانیوں کو نقصان پہونچا سکتے ہیں مگر ہندوستان بھی برہما کو ترکی بہ ترکی جواب دیسکتا ہے
ہاں ضرورت اِس امر کی ہے کہ دہلی اور شملہ کے حکام استقلال سے کام لیں۔ اور برہما کی حکومت سے
اِس باب کا سختی سے تقاضا کریں کہ وہ ہندوستانیوں کے نقصانات کی پوری تلافی کرے۔ اسمبلی وغیرہ
میں سوالات پوچھے جارہے ہیں کہ کیا حکومت برہما نے فسادات کے روکنے کی ضروری کوشش کی۔
اُدھر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ برہما کی موجودہ وزارت اُن لوگوں کی امداد کے بھروسے پر قائم ہے۔ جو
مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا کے محرک ہیں۔

سنہ ۱۹۳۱ء کے فسادات کی جانب ہندوستان نے کوئی خاص توجہ نہیں کی تھی۔ اسی لئے امسال
ایسے ہولناک فسادات ظہور پذیر ہوئے۔ بہرحال پچھلے ماہ کے واقعات نے اِس بات کو بخوبی ثابت
کردیا ہے کہ ہندوستان اب اِس معاملہ میں بے پروا نہیں رہ سکتا ہے۔ یہ امر ضرور تسلی بخش ہے کہ اہلِ
برہما کا اعلےٰ طبقہ ان فسادات کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ مگر اس کی بھی یہی کوشش ہے
کہ آئینی پالسی سے ہندوستانیوں کے مفاد کو پسِ پشت ڈال کر اقتصادی اقتدار حاصل کرلیں۔

(س۔پ)

علمی خبریں اور نوٹ

راجہ راجیشور راؤ صاحب اصغر والی سمستان لنڈہ کا نام اُردو کی علمی دُنیا میں تعارف کا محتاج نہیں ہے
تذکیر و تانیث، فانوس الہند اور نغمہ عنادل وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ حال میں آپ نے بڑی کوشش
و تحقیق سے ایک ہندی اُردو لغت تیار کیا ہے جو ۹۱ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ اور ۱۲ قیمت پر دفتر فانوس الہند،
رما باغ، اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر احمد اور مسٹر منظر رضوی نے سوشلزم کے بنیادی اصولوں پر سادہ و سلیس زبان میں ایک
کتاب "سوشلزم کی پہلی کتاب" کے نام سے لکھی ہے جو عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔

حضرت تمکین کاظمی صاحب زادیہ ادبیہ عثمان پورہ حیدرآباد دکن، مومن کی شاعری اور سوانح عمری
کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھنے میں مصروف ہیں اور قدردانانِ مومن سے امداد کے طالب ہیں۔

یورپ میں رباعیات عمر خیام کے صدہا ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ حال میں انگریزی قدردانان خیام نے ایک بہت ہی چھوٹا مختصر ایڈیشن شائع کیا ہے۔ جسکا سائز اتنا چھوٹا ہے کہ ایک انگلی میں دباکر رکھا جا سکتا ہے۔

ہم کو یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ ایسٹرن پبلشنگ کمپنی لیمٹیڈ لاہور اُردو کی ایک بلند پایہ انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کا بندوبست کر رہی ہے۔ جس کا حجم بارہ ہزار ۱۲۰۰۰ صفحات سے زائد ہوگا۔ پوری کتاب سو ۱۰۰ حصوں میں شائع ہوگی اُس کے ابتدائی حصہ کے چند مطبوعہ صفحات ہمارے پاس بطور نمونہ آئے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے کمپنی موصوف کی الوالعزمی کا پورا ثبوت ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب انگریزی کی مشہور کتاب "Book of Knowledge" کے طرز و نمونہ پر شائع کیجائیگی۔ مضامین کی تشریح میں رنگین و سادہ تصویروں سے کے جو نمونے آئے ہیں وہ ایسے ہی نفیس، خوشنما اور دیدہ زیب چھاپے گئے ہیں، جیسے کہ اس قسم کی انگریزی تصانیف کی تصاویر ہوتی ہیں۔ کمپنی کے مینجنگ ایجنٹ صاحب کے تخمینے کے بموجب اس مہتم بالشان کتاب پر کئی لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ اِس کا پہلا جزو تیار ہو چکا ہے اور عنقریب خریداروں کو بھیجا جائیگا۔ ہمکو اُمید ہے کہ حامیان اُردو اِس عظیم الشان کوشش کی پوری طرح سے حوصلہ افزائی کریں گے۔

کئی مہینے ہوئے ہم نے افسوس کے ساتھ سُنا تھا کہ ہندستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ کے صدر رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب غالباً بوجہ عدیم الفرصتی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے ہیں۔

اکیڈمی کو قائم ہوئے دس سال ہو گئے۔ اِس اثنا میں اُس نے کئی قابل قدر کتابیں شائع کیں۔ لیکن جو اُمیدیں اُس کی ذات سے قائم کی گئی تھیں، وہ ایک بڑی حد تک پوری نہیں ہوئیں۔ اب ملک اسکولوں اور کالجوں میں ہندستانی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کا عام خیال ہو رہا ہے۔ اکیڈمی ملک و صوبہ کی بہت بڑی خدمت انجام دیسکتی ہے۔ کمیٹی اِس مسئلہ کی طرف بھی توجہ دیگی اور اکیڈمی کو زیادہ مفید بنانے کی غرض سے اُسکی از سر نو ترتیب کے متعلق ضروری تجاویز پیش کریگی۔ کمیٹی کے صدر مسٹر کرن سنگھ کانے ایم۔ ایل۔ اے پارلیمنٹری سکریٹری محکمہ تعلیم ہوں گے۔ ممبروں میں خان بہادر سید آل محمد۔ پنڈت گوبند مالویہ ایم۔ ایل۔ اے نامزد ہوئے ہیں۔ اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم سکریٹری کی خدمات انجام دیں گے۔

ملک کے مایۂ ناز ادیب اور شاعر
جناب احسان بن دانش
کی نظموں اور غزلوں کے دو مجموعے "نفیر فطرت"
و "نوائے کارگر" زیر ترتیب ہیں۔ کون نہیں جانتا
کہ احسان کا ہر شعر فطرت کا آئینہ دار اور درد
کا علمبردار ہوتا ہے۔
دونوں مجموعوں کی قیمت چھ روپیہ ہوگی۔ مگر
پیشگی رقم ارسال کرنیوالے اصحاب سے رعایتی قیمت
صرف پانچ روپیہ وصول کی جائے گی۔
پتہ:- منیجر دلشان بکڈپو، مزنگ لاہور
کالیداس
چودھری جے کرشن ایم اے وکیل ایبٹ آباد نے
اس مختصر لیکن جامع کتاب کے ذریعہ سنسکرت کے غیر فانی
شاعر اعظم کالیداس کو اردو دنیا میں نہایت عمدگی سے
روشناس کرایا ہے۔ یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔
پہلے حصہ میں کالیداس کے حالات زندگی درج ہیں
دوسرے میں اس کی شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا
ہے اور تیسرے میں اس کے مشہور ڈراموں اور نظموں
کو کہانی کی شکل میں اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔
کالیداس کے متعلق اس سے پہلے کوئی منظم و
کامیاب تبصرہ شائع نہیں ہوا۔ یہ کتاب اردو ادبیات
میں ایک قیمتی اضافہ کی حیثیت سے قابل قدر ہے۔
قیمت صرف ایک روپیہ
مصنف سے طلب فرمائیں
پیام تعلیم سالگرہ نمبر ۱۹۳۸ء باتصویر
پیام تعلیم کے سالناموں نے بچوں کے رسالوں میں ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ ان سالناموں
کو بچے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اس سال کا سالنامہ ہم اور بھی احتیاط سے نکال
رہے ہیں۔ اب کی اس میں زیادہ تر مضامین مشغلوں پر ہوں گے۔ یہ مشغلے اس قدر دلچسپ
ہوں گے کہ بچوں کا پورا سال نہایت دلچسپی سے کٹے گا، اور دلچسپی ہی دلچسپی میں وہ بہت
کچھ سیکھ جائیں گے۔ اس میں فوٹو کی تصویروں کے علاوہ ہاتھ کی بنی ہوئی تصویریں بھی
ہوں گی۔ ان دنوں ہمارے طرز تعلیم میں جو انقلاب ہوا ہے اس کے اعتبار سے یہ استادوں کے لئے بھی رہنما کا کام دے گا
اپنے بچوں کے لئے ضرور منگوائیے۔
قیمت صرف ۸
مکتبہ جامعہ

مکتبہ جامعہ کی ایک نئی شاخ

مکتبہ جامعہ کی بنیاد علی گڑھ میں ایک دوکان کی حیثیت سے کھولی گئی تھی، لیکن اللہ کے فضل و کرم، کارکنوں کی پیہم جد و جہد اور اربابِ ذوق کی ہمت افزائیوں کی بدولت اب وہ ہندوستان میں اُردو کتابوں کی اشاعت کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔ پہلے اس نے ایک شاخ دہلی میں شہر والوں کی سہولت کے لئے کھولی، لاہور میں اہلِ پنجاب کی خاطر مستقل انتظام کیا گیا۔ اور صوبہ متحدہ کے پایہ تخت (امین آباد) لکھنؤ میں بھی ایک شاخ یکم اگست سے کھولی گئی ہے۔

اُمید ہے کہ اودھ اور خصوصاً لکھنؤ کے اربابِ ذوق اِس سے فائدہ اُٹھا کر ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

صدر دفتر:۔

شاخیں:۔ دہلی۔ لاہور لکھنؤ

ایڈیٹر و پبلشر منشی دیا نراین نگم بی اے۔ پرنٹر پنڈت شری [illegible] پریس کانپور

The ZAMANA. October 1938.

زمانہ

ZAMANA

اکتوبر ۱۹۳۸ء | مرتبہ دیا نراین نگم بی۔ اے۔ | جلد ۷۱ نمبر ۴

فہرست

۱۔ شاہ ظفر کا فارسی کلام
حضرت نآئل صدر انجمن اُردو بھوپال ۱۹۷

۲۔ کہاں ہے؟
حضرت احسان دانش کاندھلوی ۲۰۱

۳۔ جنون و حکمت کی کشمکش (نظم)
سید اعظم حسین ایڈیٹر سرفراز لکھنؤ ۲۰۲

۴۔ وشنو گیت
ٹھاکر جے آر۔ رائے۔ جرنلسٹ پنجاب ۲۰۳

۵۔ میرے وطن (نظم)
جگناتھ صاحب آزاد بی۔ اے ۲۱۶

۶۔ وائے نادانی (نظم)
منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی۔ اے۔ ایل ایل بی ۲۱۸

۷۔ شور و غل
ترجمہ شوپنہار از مسٹر غلام ابرار صدیقی اثر بی۔ اے ... ۲۱۹

۸۔ یادش بخیر (نظم)
حضرت سرشار کسمنڈوی ۲۲۳

۹۔ افکار پریشاں (نظم)
حضرت جگر بریلوی بی۔ اے ۲۲۴

۱۰۔ بھوپال کے سنگ مرمر
رائے زادہ منشی گوبند پرشاد آفتاب بی۔ اے ۲۲۵

۱۱۔ ستارۂ تخریب (نظم)
حضرت نسیم خوجیا نوالی ۲۲۹

۱۲۔ اُردو۔ ہندی۔ ہندستانی (مباحثہ)
از حق پرست ۲۳۱

۱۳۔ جذبات منور (نظم)
منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی ۲۳۳

۱۴۔ روداد چمن (نظم)
حضرت ادیب مالیگانوی ۲۴۲

۱۵۔ للو کی واپسی (قصہ)
ٹھاکر جیندر بھوشن سنگھ ۲۴۳

۱۶۔ تاثرات (نظم)
حضرت اعجاز صدیقی ایڈیٹر شاعر آگرہ ۲۵۰

۱۷۔ تنقید کتب (ریحانہ۔ الہام۔ کیف سخن۔ سراج سخن۔ ہمارا دلی کی تاریخ۔) ۲۵۱

۱۸۔ شورش آرزو (نظم)
حضرت خلیق وارثی ۲۵۸

۱۹۔ رفتار زمانہ ۲۵۹

قیمت سالانہ پانچ روپیہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | فی پرچہ سات آنہ

زمانہ کے پُرانے فائل

دفتر ہذا میں سنہ ۱۹۲۶ء سے پُرانے فائل موجود ہیں۔ زمانہ کے تشنگانِ ادب خوب واقف ہیں کہ شمالی ہند کا یہ قدیم ترین اور مشہور رسالہ پینتیس ۳۵ سال سے اُردو زبان و ادب کی کس قدر انہماک و سرگرمی سے خدمت کر رہا ہے۔ اس کے نقادانہ مضامین اور گرانمایہ نظمیں ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ زمانہ کے پُرانے فائل لائبریریوں میں رکھنے کے قابل چیز ہیں۔ صرف چند فائلیں باقی رہ گئی ہیں۔ خریداروں کے ساتھ حسبِ ذیل رعایت کی جائیگی

۱۔ گیارہ سال کے مکمل سٹ کے خریدار سے صرف ۲۵ روپیہ

۲۔ چار سال کے خریدار سے تین روپیہ فی فائل سالانہ

۳۔ ایک سال کے خریدار سے ۴ علاوہ محصول

نوٹ۔ آرڈر کے ہمراہ چوتھائی قیمت پیشگی بھیجنا چاہیے۔ فائل سنہ ۱۹۲۶ء میں جوبلی نمبر باقی نہیں ہے سنہ ۱۹۳۳ء میں ستمبر کا پرچہ موجود نہیں سنہ ۱۹۰۶ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک مختلف پرچے بھی آرڈر آنے پر مل سکتے ہیں۔

مینیجر زمانہ کانپور سے طلب فرمایئے۔

قوت مردانگی جاذب توجہ ہوتی ہے

جب ہم ہر وقت خود کو تھکا ہوا اور کمزور محسوس کرتے ہیں، اس وقت ہم کو یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ طاقتور اور تندرست ہونا کیا چیز ہے۔ سالہا سال کے تجربوں کے بعد ہوشیار سائینسدانوں نے یہ معلوم کرنے میں کامیابی حاصل کی کہ طاقت کن چیزوں سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد انھوں نے ایک زود ہضم سفوف ایجاد کیا ہے جو وہی طاقت بخشتا ہے جس کی جسم انسان کو ضرورت ہے۔ یہ سفوف سیناٹوجن کہلاتا ہے۔

اس سفوف کے چند چمچ چائے تھوڑے سے پانی میں دن میں دو تین مرتبہ استعمال کیجیے اور تھوڑے سے عرصہ میں آپ کے جسم میں طاقت کی رو دوڑ رہی ہے۔ آپ بہت جلد خود دیکھیں گے۔ حتی کہ تندرستی اور شباب پھوٹے پڑتے ہونگے۔ لہٰذا سیناٹوجن کی ایک شیشی خرید لیجیے۔

مسٹر ایم، ڈی۔ ایس، بی تحریر فرماتے ہیں:-

مجھے عادت ہے کہ جب کبھی اعصاب کی کمزوری محسوس کرتا ہوں تو میں سیناٹوجن استعمال کر لیتا ہوں۔ اس لیے مجھے جو فائدہ ہوتا ہے وہ بہت حیرت انگیز ہوتا ہے۔ سیناٹوجن استعمال کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد دوسرا آدمی معلوم ہونے لگتا ہوں۔ اعصابی شکایتوں کیلئے صرف یہی ایک چیز ہے۔

SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام دوافروشوں اور بازاروں سے دستیاب ہوتی ہے۔ تیاری کے کسی مرحلہ میں سیناٹوجن کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا اور اس میں کسی ذات یا مذہب کے خلاف کوئی شے ہے۔

واردات

منشی پریم چند آنجہانی کے جادو نگار قلم کے ۱۳ تازہ ترین مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ یہ افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی تصویریں ہیں جو افسانوں کی شکل میں منشی صاحب آنجہانی نے پیش کی ہیں۔ کاغذ طباعت اعلیٰ تقریباً ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد صرف ایک روپیہ عہ

ملنے کا پتہ

زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور

پنڈت ٹھاکر دت شرما وید موجد امرت دھارا کی چند ادویات

جو کہ ہزارہا انسانوں کو نفع پہنچا چکی ہیں

گندھارا رس رجسٹرڈ } سخت سے سخت اور پرانے سے پرانے اسہال، پیچش، سنگرہنی وغیرہ چند یوم میں کافور۔ اکثر ایک ہی خوراک کو دست و پیچش وغیرہ کو آرام آتا ہے۔ قیمت فی تولہ ایکروپیہ۔ ۶ ماشہ ۸ نمونہ ۲ ۔

عرق بخار رجسٹرڈ } موسمی بخار، ملیریا ہر قسم۔ روزانہ۔ تیجیہ۔ چوتھیہ وغیرہ سب اس ایک شیشی کے تین دن کھانے سے قطعی دور ہو جاتے ہیں۔ قیمت فی شیشی خوراک تین یوم صرف ۸ ۔

درد شکن رجسٹرڈ } اس دوائی کی ایک ہی پوڑیہ کھانے سے پانچ منٹ کے اندر چاہے کسی قسم کا درد ہو۔ اور آنکھ۔ دانت۔ ناک۔ کان۔ کمر۔ جوڑ وغیرہ کسی جگہ درد ہو جاتا رہتا ہے۔ قیمت صرف ایکروپیہ۔ نمونہ ۴ ۔

انکھ روشن } آنکھوں کی تمام امراض دھند۔ جالا۔ پانی، خارش وغیرہ کو اکسیر ہے۔
قیمت فی تولہ ۱۲ ، ۶ ماشہ ۶

چت موہنی رجسٹرڈ } چہرے کے بدنما داغ۔ کیل۔ چھائیاں وغیرہ دور ہو کر چہرہ صاف ہوتا ہے اور جھریاں نہیں پڑتی۔ قیمت صرف ایکروپیہ۔ نمونہ ۴ ۔

دل سندری رجسٹرڈ } یہ تیل ہے جو چہرہ کو چمکاتا ہے اور داغ۔ کیل وغیرہ کو دور کرتا ہے
قیمت فی شیشی ایک روپیہ۔ نمونہ ۴ ۔

بال اڑانیکی بے نظیر دوائی } اس سے ایک منٹ کے اندر سخت سے سخت اور نرم سے نرم جگہ کے بال بصفائی کمال جڑ سے دور ہوتے ہیں۔
قیمت فی ڈبیہ ۶ ، نمونہ ۱ ۔

منجن ۶ } دیسی طرز کا کار بالک منجن ہے۔ دیسی ادویات کار بالک ایسڈ کی ملاوٹ سے بنتا ہے۔ ولایتی سے زیادہ مفید ہے درد بند ہوتا ہے اور ہلتے دانتوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ ۶ نمونہ ۲ ۔

باغ پھول تیل رجسٹرڈ } بالوں پر تمام تیلوں کا سرتاج ہے بالوں کو نرم و ملائم کرتا ہے۔ بڑھاتا ہے۔ سیاہی قایم رکھتا ہے۔ قیمت فی شیشی ۱۲ ۔

دوائی بواسیر ۲ } خونی و بادی ہر قسم کی بواسیر کے واسطے بے نظیر ہے۔ قیمت دو روپے (عہ) نمونہ ۴ ۔

دوائی تلی ۲ } تاپ تلی (طحال) کے واسطے بینظیر دوا ہے۔ ہاضمہ کو تیز کرتی ہے۔ قیمت دو روپے

کرکول } ہاضمہ کے لئے بے نظیر دوا ہے۔ معدے و انتڑیوں کی تمام تکالیف کو دور کرتی ہے۔
قیمت ۶۰ گولی دو روپے، ۳۰ گولی ایک روپیہ، نمونہ [illegible]

میٹھا پھل } حمل کے دو ماہ بعد استعمال کرایں۔ شرطیہ لڑکا ہوگا۔ اگر لڑکی ہو تو قیمت واپس۔ قیمت دس [illegible]

آرام جان } جن کو دائمی قبض ہے۔ وہ ان کو کھایا کریں آہستہ آہستہ بیماری دور ہو جاوے گی۔
قیمت ۳۲ گولی ایک روپیہ۔ ۱۶ گولی ۸ ۔

اکسیر ۱ } کمزوری و ضعف کی بے نظیر دوائی ہے۔ مقوی مبہی دافع جریان وغیرہ ہے۔ بوڑھے کو جوان بناتی ہے۔ قیمت ۶۴ گولی چار روپے۔ نمونہ [illegible]

کرن جوانی } اسمیں حیوانی غدود یا ان کے رس نہیں [illegible] پھر بھی تمام اعضائے رئیسہ اور غدود پر [illegible] اثر ہوتا ہے اور جوانی کی کرنیں جسم میں دوڑنے لگتی ہے۔ ضعف باہ اور متعلقہ امراض نیز نزلہ۔ زکام۔ سستی اعصاب وغیرہ دور ہوتی ہیں۔ رنگت نکھرتی اور جھریاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔
قیمت یکصد گولی چار روپیہ۔ ۲۴ گولی ایک روپیہ

طلاء ۱۲ } یہ طلاؤں کا بادشاہ ہے۔ اس طلاء کے برابر تمام نقائص کو دور کر کے رگ رگ و پٹھے پٹھے کے اندر روح پھونکنے والا کوئی دوسرا طلاء نہیں ہے۔ قیمت چھ روپے نمونہ ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

سوماوتی } عورتوں کے سفید پانی جریان۔ لیکوریا۔ سیلان رطوبت کی اکسیر دوائی ہے۔ قیمت دو روپے۔ نمونہ [illegible]

بال سکھ } بچوں کی امراض بدہضمی، قبض، دست، کھانسی وغیرہ کیلئے بینظیر ہے۔ قیمت ایکروپیہ۔ نمونہ [illegible]

سار سار شٹ مرکب۔ یہ دوائی خون کو صاف کر کے جسم کو کندن کی طرح کر دیتی ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپے نمونہ [illegible]

المشتہر [illegible]

[illegible]

زمانہ

نمبر۱۰ — اکتوبر ۱۹۳۸ء — جلد۴

شاہ ظفر کا فارسی کلام

(از حضرت مائل صدر انجمن اُردو بھوپال)

دنیائے ادب پر شاہ ظفر کی شاعرانہ عظمت کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ سلطنت پہ اُن کا شاہی اقتدار خواہ کیسی ہی خستگی کی حالت میں کیوں نہ رہا ہو لیکن اقلیم سخن پر اُن کی شہنشاہی سے کسی کو انکار نہیں۔ عام طور پر جب کوئی بادشاہ تخت حکومت پر جلوہ گر ہوتا ہے۔ اُس کے نام کا سکہ ڈھالا جاتا اور خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ جب تک یہ بادشاہ سریر سلطنت پر متمکن رہتا ہے اُس کے نام کا سکہ و خطبہ جاری رہتا ہے مگر اورنگ شاہی سے علیحدہ ہوتے ہی یہ چیزیں دوسری ہستی کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔ بہادر شاہ کی تخت سے علیحدگی اور اُن کے خاندان سے سلطنت کو گئے ہوئے ایک مدت گزر گئی لیکن دنیائے شاعری میں اُن کے نام کا سکہ اب تک اُسی شان اور ساکھ کے ساتھ چل رہا ہے اور اُس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔

بہادر شاہ کا دیوان چار جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ مگر شروع سے آخر تک جو یکساں سلاست اور روانی اس میں پائی جاتی ہے وہ کسی سخنور بادشاہ کے کلام میں درکنار بہتر سے بہتر اساتذہ کے یہاں بھی مشکل سے نظر آئیگی۔ ان تمام بادشاہوں میں جنھیں شعر و سخن سے دلچسپی رہی ہے اور جن کے بڑے بڑے ضخیم دیوان یادگار ہیں کسی کے کلام پر " کلام الملوک ملوک الکلام " کے الفاظ اس مکمل طور سے صادق نہیں آسکتے۔ اس کے علاوہ بجز بہادر شاہ کے یہ رتبہ بھی کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوا کہ شعراء کے زمرہ میں

ں کا کلام بطور سند پیش کیا جاتا ہو۔ اس سے بڑھکر یہ کہ صحت الفاظ اور درستی زبان کے باب میں
ں کا کلام اس بلند رتبہ پر پہونچا ہوا ہے کہ اس کے سامنے تمام مستند شعرا کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ اکثر
سے مواقع پیش آئے ہیں کہ اُن کے یہاں کوئی لفظ بعض اساتذہ کے اصول کے خلاف استعمال ہوگیا ہے
بان کے کسی معاملہ میں جلیل القدر شعراء سے اُنھوں نے اختلاف کیا ہے تو بجائے اس کے کہ اُسے
ا قرار دیا جاتا یا نظر انداز کر دیا جاتا، فوراً وہ مسئلہ مختلف فیہ تسلیم کر لیا گیا۔ ادب اُردو پر نظر رکھنے والے حضرات
سے اکثر مقامات سے واقف ہونگے۔ ہم یہاں مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں

ماضی قریب کے مشہور شاعر حکیم عابد علی صاحب کوثر خیرآبادی مغفور نے جب اپنے اُستاد جناب
ی امیر احمد صاحب آمیر مینائی سے ایک خط کے ذریعہ بعض الفاظ و محاورات کی تحقیق اور صحت کرنا
ہی، تو آمیر مینائی نے اس خط کا طویل جواب لکھا اور اس میں ایک جگہ ظفر کا کلام بطور نظیر پیش
ں خط کے اُس حصہ کی نقل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ لفظ دُشنام کی بابت آمیر مینائی
یہ فرماتے ہیں:۔

"دشنام زیادہ تر مؤنث ہے، مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر کہا ہے، لہذا مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے۔

ناسخ:۔ کسی نے جو حیدر کو دشنام دی   تو گویا پیمبر کو دشنام دی

ولہ   بارہا میں گیا ہوں نزد امام   کبھی مجھکو نہ دی کوئی دشنام

ظفر: ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے   خط پہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے

ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہمکو   کاہیکو سننے کو دشنام کسو کے آتے

خط آمیر مینائی بنام کوثر خیرآبادی
رام پور ۸۔ مارچ ۱۸۹۸ء

اس اقتباس سے ثابت ہوتا ہے کہ آمیر مینائی کے دل پر بہادر شاہ کی شاعرانہ عظمت کس قدر
الب تھی۔

مگر یہ تو بہادر شاہ کے اُردو کلام کی بابت ہے۔ فارسی زبان میں اُن کا ایک شعر بھی کہیں مشہور
یں ہے اور نہ آج تک کسی کی زبان سے سُنا گیا، نہ اُن کی فارسی گوئی کے متعلق کسی تذکرہ نویس
نے کسی رائے کا اظہار کیا، اور نہ اُن کا فارسی کلام کہیں شائع ہوا۔ جب کبھی میں اُن کی کلیات کو
یکھتا تھا تو ہر مرتبہ یہی خیال ہوتا تھا کہ ایسا قادر الکلام شاعر جس نے پنجابی جیسی غیر شاعرانہ زبان
ں دادِ سخن دی، کیا سبب ہے کہ فارسی زبان کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکا۔ خصوصاً جب کہ فارسی

میں اُسے دستگاہ کامل حاصل ہو۔ اس سے زیادہ تعجب اُس وقت ہوتا تھا جب بہادرشا
کے عہد اور اُس ماحول پر نظر کرتا تھا، کیونکہ بہادرشاہ کا عہد وہ قابل یادگار زمانہ ہے جب ہندوستا
میں فارسی شاعری نے آخری مرتبہ سنبھالا لیا تھا۔ بجز ذوق کے جنھوں نے اپنی تمامتر توجہ اُردو
طرف منعطف رکھی۔ اُس دور کے قریب قریب تمام مستند شعراء کو فارسی زبان سے خاص شغف
قتیل اور مولانا صہبائی کا تو تمام سرمایہ اسی زبان میں ہے۔ غالب کو بھی جن کی موجودہ شہرت اُرد
دیوان کی وجہ سے ہے فارسی زبان ہی کے کلام پر ناز تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں:-

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

مومن خاں کی بابت بھی مشہور ہے کہ ان کا ایک مکمل دیوان فارسی میں موجود ہے، لیکن اگر یہ
بھی ہو تب بھی اُن پر فارسی رنگ اس قدر غالب ہے کہ اُردو کلام میں اُنھوں نے جس کثرت سے
فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں، اس کی مثال دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ چنانچہ اُن سے شا
کا جو سلسلہ چلا وہ بھی اس وصفِ خاص سے متصف ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے فارسی
شاعری کے لئے اپنا تخلص حسرتی رکھا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ سرسید خاں نے بھی جنھیں شاہی تقرب او
اس ماحول میں رہنے کی وجہ سے شاعری سے کافی لگاؤ تھا فارسی زبان میں طبع آزمائی کی ہے۔

اِن تمام باتوں پر غور کر کے کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ بہادرشاہ نے جو اسی ماحول میں
گھرے ہوئے اور اسی دورِ شاعری کے گلِ سرسبد تھے، فارسی میں کچھ بھی نہ کہا ہو۔ مجھے اس بات کا
اکثر خیال رہتا تھا۔ آخر ایک دن "نگارستانِ سخن" مؤلفہ نواب نورالحسن خاں صاحب مرحوم میں
جب شاہ ظفر کے ذیل میں یہ عبارت میری نظر سے گذری:-

"دیوان اُردوے او در چہار مجلد مطبوع گردیدہ، مگر کلام دری او ہنوز لباسِ طبع نپوشیدہ۔"

اُس وقت ظفر کی فارسی گوئی کی بابت یقین کامل ہو گیا۔ اساتذۂ سلف کے نادر و نایاب کلام کی تلاش
اوقاتِ فرصت میں میرا عزیز ترین مشغلہ ہے، اس لئے اُسی وقت سے بہادرشاہ کے فارسی کلام کی
جستجو شروع کر دی جس قیمت، جس کوشش اور جس ذریعہ سے ممکن ہو سکا ظفر کا جستہ جستہ
فارسی کلام فراہم کیا۔ رفتہ رفتہ ایک مختصر سی نوٹ بک مرتب ہو گئی مگر تلاش جاری رہی۔ جہاں جہاں
اُمید تھی خط لکھے، اربابِ ادب کو توجہ دلائی، اشیائے قدیم کے سرمایہ داروں سے ملاقات کی
لیکن جو کچھ میرے پاس تھا اُس سے زیادہ کہیں پتہ نہیں لگا۔

حسن اتفاق سے گزشتہ سال بھوپال میں نادرات کے ایک سوداگر تشریف لائے، جونہی
مجھے معلوم ہوا فوراً جا کر اُن سے ملا، ستر سال کے قریب سن تھا، اپنے تئیں سلطان شہید حضرت ٹیپو
علیہ الرحمہ کی اولاد میں بتلاتے تھے۔ ضعیفی اور ضعیف حالت کی وجہ سے بد حواس ہو رہے تھے اور گراں
فروشی میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ اُن کے پاس قریب ایک درجن کے کتابیں تھیں۔ اُنھیں میں
ایک کتاب "آئینِ عساکر" کے نام سے تھی۔ کہتے تھے خود سلطانِ شہید کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ انھیں
میں چار جز کے قریب متفرق اوراق تھے جن پر ت۔ ج۔ ن۔ ے۔ کی ردیفوں کی بعض غزلیں تھیں اور
ظفر کے تخلص سے تھیں، جونھیں ان پر نظر پڑی، میں نے نہایت اشتیاق اور غور کے ساتھ انھیں دیکھنا
شروع کیا۔ بڑے میاں نے یہ دیکھکر کان کھڑے کئے، کڑک کر کہا" دیکھتے کیا ہو شاہ ظفر کی غزلیں میں
جو دنیا میں کہیں نہ ملیں گی" میں نے اُن سے قیمت دریافت کی تو چھ ہزار روپئے بتائے، نقل کی
درخواست کی، تو فی صفحہ ایک صد روپیہ طلب کیا۔ آخر نہایت کوشش کے بعد اس بات پر راضی ہوئے
کہ جو کلام میں نے جمع کیا ہے اُن اوراق سے اُس کی تطبیق کرلوں۔ ان اوراق کی جن ردیفوں کے
اشعار میرے پاس موجود تھے میں نے اُنھیں تلاش کیا، اکثر اشعار تھوڑے بہت فرق کے ساتھ
مل گئے۔ پھر اپنے مجموعے اوران اوراق کی صحت کا مجھے یقین ہوگیا۔ بہت کوشش کی گئی کہ
بڑے میاں کی کچھ کتابیں نکل جائیں لیکن کتابیں تو ایک طرف گراں فروشی کے سبب اُن
کی کسی چیز کا سودا نہ ہوسکا۔ میں نے چاہا کہ بعض علمی اداروں کو ان کے علمی خزانہ کی اطلاع دوں
مگر اُنھوں نے کسی طرح اسے گوارا نہیں کیا۔ کہا میں خود جاکر ذاتی طور پر قدر دانانِ علم سے ملتا
ہوں اور زبانی سودا کرتا ہوں۔ یہاں سے گوالیار کہہ کر گئے تھے، معلوم نہیں کہاں گئے، اب کہاں
ہیں اور کلامِ ظفر کا کیا حشر ہوا۔

کلامِ ظفر کی کامل صحت کرنے کے بعد اس خیال سے کہ دنیا کی کوئی چیز ایک حالت پر قائم
نہیں رہتی، جو کچھ میرے پاس ہے اندیشہ ہے کہیں وہ بھی تلف نہ ہوجائے، میں نے ارادہ کیا ہے
کہ اس کو وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرینِ "زمانہ" کردوں۔ شاید کبھی نہ کبھی کسی ایسے شخص کی نظر پڑجائے
جو اس میں کچھ اور اضافہ کرسکے۔ بہرحال اس وقت ایک غزل درج کررہا ہوں
ارباب علم سے درخواست ہے کہ شاہ ظفر کا فارسی کلام یکجا کرکے اُس کی اشاعت میں کوشش
فرمائیں۔ رفتہ رفتہ ایک قابل قدر مجموعہ تیار ہوجائے گا اور یہ ایک بڑی علمی خدمت
ہوگی۔ غزل مذکور یہ ہے:-

غزل شاہ ظفر

بُتے، سرکشے، کافرے، کجکلاہے — بُرخ آفتابے، برخسار ماہے
معطر کنِ مغزِ جانِ دو عالم — بعنبر فشانیِ زلفِ سیاہے
بہر گام در راہ مہر و محبت — دو دیدہ بدنبال او دادخواہے
نہ در خاکساری چو من بے نوائے — نہ در ناز و تمکیں چو او پادشاہے
برم تحفہ پیشش او ازکجا من — نہ در دیدہ اشکے، نہ در سینہ آہے

فگند از سرِ لطف آں شاہِ خوباں
ظفر برمنِ بے بضاعت نگاہے

کہاں ہے؟

(از حضرت احسان دانش صاحب)

قسمت میں خوشی اے دلِ ناکام کہاں ہے — کل ناز تھا جس پر وہ گل اندام کہاں ہے
جب تھی مرے آغوش میں وہ خلدِ محبت — وہ دورِ طرب گردشِ ایام کہاں ہے
جس نامہ و پیغام سے بیدار تھی قسمت — قسمت میں وہ اب نامہ و پیغام کہاں ہے
محروم ہیں جس مست نگاہی سے نگاہیں — وہ روحِ چمن بادۂ بے جام کہاں ہے
گلزار میں سامانِ طرب اب بھی ہے لیکن — پہلا سا وہ ساغر کدۂ عام کہاں ہے
ہنستا ہوں کہ کس بات پہ شاعر کو یقیں تھا — روتا ہوں کہ وہ لغزشِ ہر گام کہاں ہے
اب صبح کے سینے میں نہیں رقصِ تجلی — اب عطر فشاں ہر نفسِ شام کہاں ہے

فریاد سے معمور ہے آغازِ تمنا
احسان نہ جانے مرا انجام کہاں ہے

جنون و حکمت کی کشمکش

(از سید اعظم حسین اعظم، ایڈیٹر "سرفراز" لکھنؤ)

بشر کا یہ کاروانِ بستہ، رہیگا یوں ہی خراب و خستہ
جو دشتِ غم میں ہے پا شکستہ وہ کیا سر شاہراہ ہوگا

وہ روز تبدیلیاں ہوں لیکن، وہی تو ہونگی جو ہو چکی ہیں
گناہ اک دن ثواب ہوگا، ثواب اک دن گناہ ہوگا

بنے گی صورت نئی نہ کوئی، اُلٹ پلٹ کر وہی رہے گی
جو کاہ ہے بڑھ کے کوہ ہوگا، جو کوہ ہے گھٹ کے کاہ ہوگا

نگارِ قسمت بنے رہیں گے یہ خاک کے خوشنما کھلونے
مٹیں گے بن بن کے روز لاکھوں، نہ پھر بھی کچھ انتباہ ہوگا

فضائے خاکی کی تیرگی میں کٹے گی میعاد زندگی کی
نگاہِ اُمید میں بظاہر جہانِ صد مہر و ماہ ہوگا

جو بڑھنا چاہیگی حد سے کچھ بھی معاً وہ تہذیب نیست ہوگی
اسی طرح انقلاب ہوگا زمیں پہ اور گاہ گاہ ہوگا

حدودِ نوعی کی بندشوں سے نکل کے آگے نہ بڑھ سکے گا
جنون و حکمت کی کشمکش میں دماغِ انساں تباہ ہوگا

رباعیات جوش

میں ڈوب کے غرقِ سرگرانی نہ رہا
کیا لہر اُٹھے بحر میں پانی نہ رہا
سمجھا جو حیات کو تو بخشی گئی موت
جب موت عطا ہوئی تو فانی نہ رہا

ہاں موت و حیات کے سمجھتا ہوں میں راز
آغاز انجام ہے، تو انجام آغاز
دیتا ہے زمانہ جب اجل کی دھمکی
دل سے آتی ہے قہقہوں کی آواز

وِشنوگپت

ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے جرنلسٹ

گندھرپ ورمن کی وصیت

آوانتی کا بلند حوصلہ حکمران گندھرپ ورمن جسکی حکومت راجدھانی سے چالیس پچاس کوس آگے نہ مانی جاتی تھی، مایوسیوں اور فکرمندیوں کے کٹھن دن بسر کرکے بیسوں ارمان سینہ میں دبائے پرلوک سدھارنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ چہرہ پر رنج اور تردد نمایاں تھا۔ بار بار ٹھنڈی آہیں بھرتا تھا۔ راج وئید رات دن راج محل میں رہتے اور دوائیں بنا بنا کر پلاتے تھے۔ رانی کو گذرے کئی برس ہو چکے تھے۔ گدی کا وارث موجود تھا۔ اس لئے دوسرا بیاہ نہ کیا تھا کہ کہیں اولاد ہو اور بھائیوں میں گدی کیلئے تلوار چلے۔ اُس کے سر میں یہی سودا سمایا ہوا تھا کہ ظالم ہنوں کو کس طرح ملک سے نکالا جائے تاکہ کھشتری بہو بیٹیوں کی آن اور ملک کی دولت محفوظ رہ سکے۔ اُس کا یہ پکا یقین تھا کہ اس مہم کو سر کرنے کے لئے ہندو راجاؤں میں ایکا ہونا اشد ضروری ہے۔ اس لئے وہ عرصہ سے اس کے لئے جوڑ توڑ کر رہا تھا کہ مرض نے آن گھیرا اور اُس کی تمنا پوری نہ ہو سکی جس کا اُسے بیحد افسوس تھا۔

جب اُسے اِس بات کا یقین ہو گیا کہ اب میں کوئی دِن کا مہمان ہوں تو اُس نے اپنے وفادار اور معاملہ فہم وزیر ایشان ورمن کو پاس بُلاکر یوں مخاطب کیا۔

گندھرپ ورمن (حسرت کیساتھ) منتری جی۔ ہم اب پرلوک جانیوالے ہیں۔ آپ نے جو جو اپکار راج پر کئے ہیں میں اُس کا دھنباد نہیں دے سکتا۔ بھگوان آپ کو اس کا پھل پرلوک میں دینگے۔ اس وقت آپ سے ہماری انتم پرارتھنا ہے۔ ہم تو سورگ میں رانی سے جا ملیں گے۔ پرنتو راجکمار وشنوگپت کو آپ کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ آپ پرن کیجئے جو کام ہم سے نہ بن سکا۔ آپ وشنوگپت کو سکھا پڑھا کر کرائیں گے۔ ابھی سے اُسے شکشا دیجئے تاکہ وہ آپ سے آپ اس کام کا بیڑہ اُٹھائے۔ اُس سے ہمیشہ یہی کہتے رہئیگا کہ دُشٹ ہنوں کی اتیاچاروں کا ڈنڈ دئے بغیر تمہارے پتا پرلوک سدھار گئے۔ اس لئے اب یہ تمہارا فرض ہے کہ تم ان دُشٹوں کو مار کر نکال دو اور ماتری بھومی پر اُپکار کرو۔ اُس سے ہماری آتما سُکھی ہوگی اور بھارت بھومی بھی آپ کا اُپکار مانے گی۔

ایشان ورمن نے آبدیدہ ہوکر کہا "مہاراج آپ یہ کیا کہتے ہیں۔ مجھ سے راج کی جو سیوا ہوتی ہے، وہ تو میرا فرض تھا۔ دشٹ ہنوں کے اتیاچار کے لئے آپ چنتا نہ کیجئے۔ میں راجکمار کو سکھا پڑھا کر ہنوں کو ڈنڈ دلا دُونگا۔ بھگوان کی دیا سے آپ کی آشا جلد ہی پوری ہوگی۔"

جاں بلب گندھرپ ورمن نے اپنے لختِ جگر کو جو محل کے پاس باغ میں کھیل رہا تھا اپنے پاس بُلا کر چھاتی سے لگایا۔ جوشِ محبت میں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ گلے میں کچھ اٹکا سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے بات نہ کر سکا مگر اپنے جان نثار منتری کی طرف دیکھکر بڑی کوشش سے وہ اتنا بول سکا۔ "بیٹا! بھگوان تیرا کلیان کریں۔ آگے منتری جی کو میری جگہ سمجھ کر اُنکی آگیا کا پالن کرنا۔" یہ کہہ کر آدانتی کا حکمران بہت رویا۔ راج وید نے منع کیا کہ اس سے آپ کا مرض بڑھ جائے گا۔ مگر وید کو راجہ کے دل رنج کا کیا پتہ تھا۔ باپ بیٹے کی یہ آخری ملاقات تھی۔ کہ اُس کے دو چار گھڑی بعد اُس کی روح اس سنسار کو تیاگ کر پرلوک سدھار گئی۔ اہلکاروں نے مناسب طریقہ سے کریا کرم کیا۔ پھر ایشان ورمن تمام بیش بہا جواہرات اور چیزیں سمیٹ اور وشنوگپت کو ساتھ لے کر سنبھل گڈھ چلا گیا، جو راجدھانی سے پچاس ساٹھ کوس شمال میں تھا۔ اُسے یہ اندیشہ پریشان کر رہا تھا کہ کہیں کسی نہ کسی روز ہُن اَوانتی پر نہ چڑھ آئیں، اور سب کچھ لوٹ کر چلتے بنیں۔

ہرفن مولا راجکمار

سنبھل گڈھ پہونچتے ہی ایشان ورمن نے اپنے دیس کے بہترین کھشتری اُستاد وشنوگپت کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کئے۔ شہسواری، تیراندازی۔ تیغ زنی۔ پہلوانی وغیرہ فوجی فنون کے علاوہ پنڈت وید شاستر پڑھانے کو مقرر ہوئے۔ ایشان ورمن کے لے دے کے ایک لڑکی تھی، جس کا نام اندراوتی تھا یہ بھی وشنوگپت کے ساتھ تعلیم پانے لگی۔ چند ہی برس میں لڑکے لڑکی نے علوم و فنون سیکھ لئے۔ دونوں بلا کے ذہین، بلند حوصلہ اور ملک و قوم کی محبت سے سرشار تھے۔ رات کے وقت ایشان ورمن دونوں کو اپنے پاس بٹھا کر سنگدل ہنوں کے جور و ستم کی داستانیں سُنایا کرتا تھا۔ پنڈت دن کے وقت اتہاس کی جگہ ہنوں کی ستم رانیوں کے افسانے بیان کیا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹی عمر ہی میں ہونہار وشنوگپت کے دل میں ہنوں سے بدلہ لینے اور انھیں ملک بدر کرنے کا خیال پیدا ہوگیا۔

جب وشنوگپت سنبھل گڈھ پہونچا تھا تو اُس کی عمر دس سال تھی، وہ بڑا ذہین اور سمجھدار لڑکا تھا اپنے سے تگنی عمر کے آدمیوں کی طرح جچی تُلی باتیں کرتا تھا جسمانی حیثیت سے بھی اپنی عمر کے لڑکوں سے کہیں زیادہ شہ زور اور تنومند تھا۔ اُس کا ڈیل ڈول پندرہ سولہ برس کے لڑکوں سا معلوم ہوتا تھا

اُس کا سر بڑا، پیشانی کشادہ، ناک سیدھی اور اونچی اور ٹھوڑی دوہری تھی۔ اُس کے دونوں پہلو مضبوط اور بھاری تھے۔ اور کان خلاف معمول بڑے بڑے تھے۔ گردن موٹی، جسم گٹھا ہوا اور سڈول تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے بڑے بڑے کارنمایاں انجام دینے کو پیدا کیا تھا۔ بچپن ہی سے اُس کے چہرہ سے جلال ٹپکتا تھا اور دیکھنے والے گرویدہ اور مفتون ہوجاتے تھے۔ ایشان ورمن کی بیٹی اندراوتی وشنوگپت کی ہم عمر ہونے کے علاوہ بڑی حسین، تیزطرار، بلند حوصلہ اور پرلے درجہ کی ذہین تھی۔ اُسمیں بعض باتیں لڑکوں جیسی تھیں۔ یتیم راجکمار اور اُس لڑکی میں بڑی محبت تھی، جیسا کہ ایک ساتھ کھیلنے والے لڑکے لڑکیوں میں ایک دوسرے کیساتھ پائی جاتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اُن دونوں کی محبت بڑھتی چلی گئی۔

وشنوگپت پرلے درجہ کا ذہین اور نڈر تھا۔ اُس نے چند ہی سال میں فوجی کرتبوں اور علموں میں کمال پیدا کرلیا۔ بلا کا شہ سوار تھا۔ دُور پار کے تمام شہ سواروں کو کئی بار مات دے چکا تھا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا تیر اندازی و نشانہ بازی میں یکتائے روزگار تھا۔ تلوار کا ایسا دھنی تھا کہ پرانے اُستاد پھرتی اور کارستانی میں اُس سے ہار مان چکے تھے۔ کشتی لڑنے میں اُس نے دُور دُور نام پیدا کر رکھا تھا۔ اچھے اچھے پہلوانوں کو پچھاڑ چکا تھا۔ قصہ کوتاہ صدہا کوس تک کوئی صاحب فن وشنوگپت کو زک دینے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اندراوتی ہمیشہ اُس کے ساتھ سیر کو جایا کرتی تھی۔ کھلے میدان میں بے تحاشا گھوڑے دوڑایا کرتے تھے۔ اندراوتی بھی تلوار اور نیزہ چلانے میں اچھے اچھے سورماؤں کے دانت کھٹے کرچکی تھی۔ وشنوگپت کے ساتھ کوسوں کا چکر لگا کر لوٹتی تھی۔

ایشان ورمن کا دل بڑا خوش تھا کہ وشنوگپت باپ کی حسب منشا لائق بنتا جاتا تھا۔ اس کی باتوں سے اُسے یہ پختہ یقین ہوگیا تھا کہ گندھرپ ورمن کی دلی آشا ضرور پوری ہوگی۔ ہنوں کے ظلم کے افسانے سُن کر کمسن راجکمار تلوار میان سے نکال کر غصّہ سے کہتا۔ "منتری جی، میں اگر دشٹ ہنوں کے ایتاچاروں کا ڈنڈ نہ دوں۔ تو اپنا نام بدل ڈالوں گا۔ آپ کوئی چنتا نہ کریں"۔ یہ باتیں سُن کر وفادار و بلند حوصلہ منتری کا دل باغ باغ ہوجاتا تھا کیونکہ اُس کی کوشش بارآور ہو رہی تھی۔ راجہ آدتیہ کا اکلوتا بیٹا ہر فن میں طاق، ہر ہنر میں یکتا، پرلے درجہ کا نڈر و بلند حوصلہ تھا۔ اور گندھرپ ورمن کی آخری تمنا برآنے کی پوری اُمید بندھ رہی تھی۔ پرماتمانے اُسے وہ تمام طاقتیں عطا فرمائی تھیں، جو جان جوکھوں کے کام کے لئے ضروری ہیں۔

اندراوتی ہنوں کے بس میں

اِس طرح وشنوگپت اٹھارہ سال کا شہ زور، قدآور، وجیہہ نوجوان ہوگیا۔ اور اندراوتی بھی

جوان ہوکر حسن کی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ اُس کا قد کسی قدر لمبا، چھریرا بدن، آنکھیں بڑی موہنی، بال کالے اور لمبے تھے۔ اُس کے حسن دلفریب کا دُور دُور کے راجاؤں کی زبان پر چرچا تھا۔ سنبھل گڈھ اور اُس کے آس پاس کے دس بیس کوس کے حلقہ کے شوقین اور سمجھدار لوگ کہتے تھے کہ دیکھئے یہ بجلی کہاں گرتی ہے کہتے ہیں رنگ، روپ بلائے جان ہوتا ہے۔ اندرآوتی کا لاثانی روپ اُسکی اُٹھتی جوانی کی شامت بن گیا۔

وشنوگپت بالغ ہونے پر رات دن اِسی فکر میں مبتلا رہتا تھا کہ اپنے باپ کی آخری وصیت کس طرح پوری کرے، اور ظالم ہنون کو آریہ ورت سے نکال کر کس طرح سُرخرو ہو۔ اِس فکر سے وہ تنہائی پسند ہوگیا۔ سب سے کھچا کھچا رہتا تھا۔ سیر وشکار میں سوائے ایک جان نثار کے اور کوئی ساتھ نہ ہوتا۔ اِندرآوتی سے بھی دُور رہتا۔ جس سے اُسے بہت رنج ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ لڑکیوں کی دُنیا خیالی ہوتی ہے۔ انھیں کھانے پینے، بن سنور کر ہنسنے کھیلنے کے سوا اور کوئی فکر نہیں ہوتی۔ بیاہ کے بعد گرہستی کے جنجال میں پھنس جاتی ہیں۔ لڑکوں کے سر پر گھر بار کا بوجھ چھوٹی ہی عمر سے پڑ جاتا ہے۔ وشنوگپت اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہنوں کی سرکوبی اور اپنے ملک کی سیوا سمجھتا تھا۔ رات دن اسی فکر میں رہتا تھا۔ اندرآوتی کے ساتھ کھیلنے کودنے سے جو آنند بچپن سے ہوتا چلا آتا تھا، وہ جوانی میں کرکرا ہوگیا۔ اب اُس کے دماغ میں اور ہی سودا سمایا ہوا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وشنوگپت خلاف معمول سویرے ہی اُٹھ کر باہر چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد اندرآ کو نوکروں کی زبانی اُس کے باہر جانیکا پتہ لگا۔ تو اپنی گجراتی گھوڑی پر سوار ہوکر اُس کا پیچھا کیا، مگر بدقسمتی سے دوسری سمت چلی گئی۔ اِس طرح اُس کے نزدیک پہونچنے کی بجائے دم بدم دُور ہوتی چلی گئی، وہ سنبھل گڈھ کے جنوب مشرق کی طرف سرپٹ جارہی تھی۔ مگر وشنوگپت کا کھوج نہ پاکر سخت پریشان ہوئی۔ نراش ہوکر لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔ دل میں سوچ رہی تھی کہ وشنوگپت کہاں گم ہوگیا ہے۔ دائیں بائیں کے جنگل میں پُراشتیاق نگاہوں سے اُسے ڈھونڈنے لگی کہ اِتنے میں سامنے سے چند سوار آتے دکھائی دئے گمان ہوا کہ کھشتری سورما چلے آرہے ہیں، لیکن چند ہی منٹوں میں ظاہر ہوا کہ یہ دشٹ ہُن ہیں، بہت تلملائی۔ مگر ہمت والی اور چتر تھی۔ اِس لیے جلد سنبھل کر اپنے بچاؤ کی تجویز سوچنے لگی۔ اِتنے میں سب سوار اُس کے قریب پہونچ گئے۔ اگلے جوان نے اِس حسن کی پتلی کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "اِسے پکڑ کر اپنے سردار کے پاس لے چلو، خوب انعام ملیگا۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ چوکڑیاں بھرتی ہوئی ہرنی نکل جائے۔" سب سپاہی چوکنے ہوگئے۔ دوسرا بولا۔ "ارے اب بھاگ کر کہاں جاسکتی ہے؟" اُس کے بعد سواروں نے چاروں طرف سے اندرآ کو گھیر لیا۔ اور اگلے سپاہی نے کہا۔ "تم بھاگ کر نہیں جاسکتیں، اِس لئے سیدھی طرح

ہمارے ساتھ چلی چلو۔"

اندرا گھائل شیرنی کی طرح گرج کر بولی " تم اپنے کو سورما کہتے ہو! ایک بے بس عورت پر ظلم کرتے شرم نہیں آتی؟ اگر تم سورما ہو تو دو دو ہاتھ کر لو۔" بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اندرا نے تلوار و ڈھال سنبھالی اور بپھر کر مقابلہ کے لئے تیار ہو گئی۔ سب سے پہلے اگلے سوار پر جھپٹ گئی۔ اِتنے میں اُسکے پانچوں ساتھی اُس پر ٹوٹ پڑے۔ آخر عورت ذات تھی، اور اُس کے مقابل چھ سوار تھے۔ مگر اُس نے پروا نہ کی، اور برابر لڑتی رہی۔ اُس کا بھرپور وار خالی نہ جاتا تھا۔ دو ہی منٹ میں دو سپاہی کٹ کر نیچے گر پڑے، قریب تھا کہ تیسرے سوار کے پیٹھ پیچھے کے وار سے اندرا کٹ کر ڈھیر ہو جائے کہ اِتنے میں اُس نے دردناک چیخ ماری اور تڑپ کر نیچے جا گرا۔ اُس کے ساتھی اس کی یہ بہادری دیکھکر سخت حیران ہوئے مگر اُن کی حیرانی دور نہ ہونے پائی تھی کہ گھوڑے کی ٹاپوں کی آہٹ سُن کر باقیماندہ لوگ اُدھر تاکنے لگے۔ پلک جھپکتے میں ایک سورما اُن کے سر پر آ دھمکا۔ آتے ہی ایک ہُن کو جو اُس کے راستہ میں حائل تھا گاجر مولی کی طرح کاٹ کر دھر دیا، اور ایک ایک کر کے پھر اور ہنوں کو کاٹ گرایا۔ اور اندرا سے خفگی کے لہجہ میں بولا۔" آج کون جن سر پر سوار ہو گیا تھا کہ گھر سے اکیلی نکل کھڑی ہوئیں؟"

اِندرا ندامت سے بولی کہ" اگر تم پل بھر اور نہ آتے، تو میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھتی۔ تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔"

وشنو گپت (استقلال سے) "تم میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتیں کہ تم یہاں کیوں آئیں؟ کیا تمہیں پتہ نہیں کہ ہُن لڑکیوں کو پکڑ کر اپنے راجہ کے پاس لیجاتے ہیں؟"

اندرا آبدیدہ ہو کر بولی کہ" ادھر تم مجھ سے کھچے کھچے رہتے ہو۔ اِس لئے آج صبح سویرے ہی تمہارے ساتھ چلنے کی ٹھان کر باہر آئی۔ مگر نوکروں نے بتایا کہ تم سویرے ہی باہر نکل گئے۔ میں تلملا کر تمہارے پیچھے چل کھڑی ہوئی، لیکن دوسری سڑک پر جا پڑی، اور تم دوسری سڑک پر گئے تھے۔ اِس وجہ سے اُن دُشٹوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ تم نے پران بچا کر بڑا اُپکار کیا ہے۔

راجکمار" میں لوٹ کر گھر آیا۔ تو نوکروں نے تمہارے آنے اور فوراً جانے کا حال بتایا۔ اس لئے میں بھی اِدھر بھاگ آیا۔ مجھے ہنوں کا بڑا ڈر تھا۔ اور میرا خیال ٹھیک نکلا۔ اگر پل بھر نہ آتا تو تم اُن کے ہاتھ پڑ گئی تھیں۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ دھنباد۔ آگے پھر کبھی اکیلے باہر نہ جانا۔ نہیں تو تمہیں اُن دشٹوں کے ہاتھ سے چھڑانا بڑا کٹھن ہو گا۔

وشنو گپت کا دل آج بیحد خوش تھا۔ ہنوں کی سرکوبی کے منصوبہ کی تکمیل کا تنگن بہت اچھا رہا۔

یہ آنیوالے زمانہ کی عظیم الشان فتح کا پیش خیمہ تھا۔ اس سے پہلے اُس کی ہنوں سے کبھی مٹھ بھیڑ نہ ہوئی تھی اُس نے پلک جھپکتے میں چار ہُن گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دئے تھے۔ اس کے علاوہ اندراوتی کے ہنوں کے ہاتھ پڑنے سے وشنوگپت پر پہلی بار یہ بات روشن ہو گئی کہ ہنوں کے ہاتھ سے بہو بیٹیوں کی آبرو ہر وقت خطرہ میں ہے۔

چندراوتی

گو وشنوگپت بچپن ہی سے ہنوں کے جور و ستم کی بیسیوں داستانیں سنتا چلا آیا تھا۔ مگر اُس کے دل پر اس واقعہ کے پیشتر اُن کی شیطانی سیرت کا اتنا گہرا اثر نہ ہوا تھا۔ یہ اُس کے محسن الیشان ورمن کی لخت جگر تھی۔ جس سے اُس کو سگے بھائی کی طرح پریم تھا۔ اِس لئے اُسی دن ہنوں کی بیخ کنی کا عہد کیا اور بڈھے منتری اور اُس کی بیٹی پر بھی اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ بڈھا وزیر بڑا خوش ہوا، اور دعائیں دینے لگا۔

بہت غور وفکر کے بعد یہ طے پایا کہ سب سے پہلے کھشتری راجاؤں اور سورماؤں میں اتفاق باہمی اور دیس بھگتی کا بھاؤ پیدا کیا جائے۔ چونکہ ہنوں کے مخبر جگہ جگہ تعینات تھے جنمیں برہمن، پجاری اور پروہت بھی شامل تھے۔ اِس لئے اُس نے بنجارے کا سوانگ بھرا۔ دو گھوڑوں پر مال لاد کر گاؤں گاؤں پھرنے لگا جہاں کہیں کھشتری سورما ملتا۔ اُس سے وہ کہتا کہ "دشٹ ہُن آپ کی بہو بیٹیوں کو اُٹھالے جاتے ہیں۔ آپ کو شرم نہیں آتی۔ کیا اس سے تمہاری قوم کو کلنک نہیں لگتا؟ تم کیسے سورما ہو؟" جب وہ یہ جواب دیتے کہ "اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا"۔ تو وشنوگپت کہتا کہ "ابھی پرن کرو اور اپنا تن من دھن دیس اور جاتی کے ارپن کر دو۔ اپنا نام لکھا دو اور جب ہمارا سندیشہ پاؤ، فوراً چلے آؤ۔"

چنانچہ اِس طرح چند ہی مہینوں کے اندر وہ آس پاس کے تمام علاقے میں گھوم آیا۔ اور اُس نے پانچ پانچ، دس دس گاؤں کا ایک صدر مقرر کر دیا۔ بیسیوں سورما جان نثار وشنوگپت کی طرح دُور دُور نکل گئے اور ہزاروں منچلے جوان بھرتی ہو گئے۔ غرض دو مہینے کے اندر سینکڑوں جوان جنگلوں میں جا کر تیراندازی، شہ سواری اور تلوار چلانے کی مشق کرنے لگے۔ اور ڈیڑھ سال کے عرصہ میں بیس تیس ہزار دیس بھگت وشنوگپت کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ وشنوگپت بڈھے بنجارہ کے بھیس میں سنبھل گڈھ کے شمال مشرق کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کا نوکر اُس سے بچھڑ گیا تھا۔ پہر دن باقی تھا اور جاڑے کا موسم تھا کہ اُس نے یکایک دیکھا، جنگل میں پانچ سات ہُن سواروں نے ایک حسین کماری کو گھیر رکھا ہے۔ دیکھتے ہی ایڑ لگا کر وہ سواروں پر جا دھمکا۔ لڑکی ایسی تھی کہ اُسے دیکھ کر وہ بیحد خوش ہوا۔ اس سے پہلے اُس نے اِندراہی کو دیکھا تھا۔ مگر

وہ بہن کی طرح تھی۔ اِس حسینہ کو دیکھتے ہی اُس کے سینہ میں آناً فاناً عشق کا لطیف جذبہ پیدا ہوگیا۔ وہ اُسے سب سے سُندر اور روپ متی معلوم ہوئی، اور اِس نے اُسے بچانے کا ارادہ کرکے ظالموں سے للکار کر کہا کہ "تم اِس کنیا کو کیوں دُکھ دے رہے ہو؟ یہ سورویروں کا کام نہیں۔"

ہُن سردار بڑے گھمنڈ سے بولا "اپنی جان کی سلامتی چاہتا ہے تو راستہ ناپ، سرکاری کاموں میں دخل دینا تیرا کام نہیں۔"

بنجارہ (اشرفیوں کی تھیلی دکھاکر) ایسے نہ مانو تو یہ توڑا لے لو، اور اِس لڑکی کو چھوڑ دو۔"

سردار نے سنگدلی سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "اِس بڈھے کی تھیلی بھی چھین لو، اور اِس چھوکری کو بھی پکڑ لے چلو۔"

مگر اِس اچانک اور بیباکانہ دخل اندازی سے ہُنوں کے ہاتھ پھول ضرور گئے تھے، حسینہ دامن چھوڑا کر بڈھے کے پاس جا رہی۔ اور دم زدن میں اُس کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ بڈھے نے تلوار نکال کر ان دونوں ہُنوں کو کاٹ گرایا، جو اُسے اور سُندری کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھے تھے۔ پھر ایک ہی وار سے سردار کو بھی جہنم رسید کیا۔ اُس کے گرتے ہی دوسرے سواروں کے چھکّے چھوٹ گئے۔ بنجارہ نے موقع غنیمت جان کر دو اور سواروں کو کاٹ کر دھر دیا۔ باقی جو دُور کھڑے تھے وہ جان لے کر بھاگے۔ اُدھر بنجارہ حسین لڑکی کو لے کر اُڑ گیا۔ اور شام کے وقت ایک دھرم سالہ میں جا پہونچا۔ جہاں اُسکا نوکر اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ دو کمرے لے لئے۔ اندر کے کمرے میں سُندری کے رہنے کا انتظام کر دیا، اور باہر کے دالان میں آپ ٹھہر گیا۔ باہر ڈیوڑھی میں احتیاطاً ایک چوکیدار بھی تعینات کر دیا۔

جب سب سو گئے، تو دیا ہاتھ میں لئے بڈھا سُندری کے کمرے میں گیا۔ وہ سوئی نہ تھی۔ اُس کے دل میں دن کے عجیب و غریب جذبات کا ہجوم تھا اور کسی خیال میں چپ چاپ پلنگ پر بیٹھی تھی، طاق میں دیا جل رہا تھا۔ بڈھے کی آہٹ سُن کر پہلے تو ڈر گئی۔ مگر فوراً ہی اُس کے گلاب جیسے چہرہ پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اُس نے بڈھے سے کہا کہ "آیئے مہاراج!"

بنجارہ اندر داخل ہوا۔ دو چراغوں کی روشنی میں حسینہ کا حُسن اور بھی دمک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سُندری حُسن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بڈھے بنجارہ نے اُس سے پوچھا کہ "آپ کون ہیں؟ کس کی پُتری ہیں؟"

سُندری نے جواب دیا کہ "مہاراج! میں راجہ رنگ دیجے کی پُتری چندراوتی ہوں۔"

بنجارہ۔ "آپ ہُنوں کے ہاتھ کیسے پڑ گئیں؟"

سندری (کسی قدر پس و پیش سے) "میرے پتا میرا بیاہ ایک بڈھے باداسے کرنا چاہتے ہیں۔ آج کی لگن تھی۔ میں اپنی انّا اور اُس کے بیٹے کی مدد سے راج محل کے پچھواڑے سے نیچے اُتر آئی اور گھوڑے پر چڑھ کر بھاگ نکلی۔ دوڑتے دوڑتے گھوڑے کا دم ٹوٹ گیا۔ اور وہ دھم سے گر پڑا۔ مگر میں بچ گئی۔ اور پیدل چل کھڑی ہوئی کہ دُشٹ ہنوں نے آکر گھیر لیا۔ اگر آپ نہ آتے تو معلوم نہیں میرا کیا حال ہوتا۔ میں آپ کا یہ اُپکار جنم جنم نہ بھولوں گی۔"

بنجارہ "اگر ماتا پتا کا دیا ور منظور نہیں تو آپ اور کیسا ور چاہتی ہیں؟"

چندراوتی (دلیری سے) "میں سورویر ور چاہتی ہوں۔ جو دُشٹ ہنوں کو مار کر دیس اور جاتی کا بھلا کرے۔"

بنجارہ (لگاوٹ سے) "اگر وہ سورما ور مجھ ایسا بڈھا ہو، تو کیا اُسے سویکار کر لوگی؟ میں نے بھی ہنوں کے ناش کا پرن کیا ہے۔"

چندراوتی نے شرم سے سر جھکا لیا۔ مسکراہٹ جاتی رہی اور اُسکی جگہ متانت نے لیلی۔

بنجارہ نے دوبارہ پوچھا "آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں آپ کو ہنوں سے چھڑانے کا صلہ چاہتا ہوں۔ آپ بالکل آزاد ہیں، جہاں جانا چاہیں میں آپ کو پہونچا دوں گا۔ میں بے انصافی و خود غرضی سے کام نہ لونگا۔ میں یہ بھی خوب جانتا ہوں کہ آپ جو ایک بڈھے ور سے بھاگ کر آئی ہیں، تو دوسرے کے پھندے میں کب پھنسیں گی؟"

چندراوتی نے شرماتے ہوئے کہا "آپ نے ہنوں کے سامنے آج بڑی بہادری دکھائی۔ آپ کا رنگ ڈھنگ اور آپ کی باتیں تو بنجارہ ایسی نہیں، بہرحال آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ اور میری زندگی آپ ہی کی بچائی ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ اب کہاں جاؤں؟"

یہ کہہ کر چندرا نے سر جھکا لیا۔ چہرہ پر حسرت برس رہی تھی، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ بنجارہ نے موقع غنیمت جان کر اپنی بناوٹی ڈاڑھی اور مونچھیں الگ کر دیں اور ایک قدم آگے بڑھ کر چندرا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ چونک اُٹھی۔ جب آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو بڈھے کی بجائے ایک خوبصورت جوان دکھائی دیا۔ تب اُس کی حیرت اور خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ پل بھر میں دُنیا ہی پلٹ گئی۔ اُس کا رنج کافور ہو گیا۔ وشنوگپت میں اُس کو اپنا جودھا نظر آیا۔ جس سے اُس نے بیاہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی، جھٹ اُٹھی اور اپنے ہاتھ وشنوگپت کے دونوں کندھوں پر دھر دئے اور دُلار سے اپنا سر اُس کے سینہ پر اس طرح دھر دیا کہ اس کے کان اُس کے دل کی دھڑکن سُننے لگے۔ وشنوگپت نے اُسے چھاتی سے لگا لیا۔

چندرا خوشی کے مارے بھگوان کو لاکھ لاکھ دھنباد دینے لگی۔ جس نے اُسکی سہائتا کے کارن

سورما بھیجا۔ پھر سنبھل کر بولی کہ "میں آپ کی ہوں اور آپ میرے ہیں، دشٹ ہنوں کا ناش کرنا ہم دونوں کا فرض ہے۔

وشنوگپت (گلے سے لگاتے اور دُلار کرتے ہوئے) چندراوتی! بدھاتا نے آج ہم کو یہاں ملا دیا ہے۔ مجھے تمہارے جیسی سُندری ہی چاہئے تھی، جو اس جوکھم کے کام میں جی جان کا ساتھی بن کر میرا اتساہ بڑھائے۔ جس وقت میں نے تمہیں ہنوں کے گھیرے میں دیکھا تھا اُسی وقت میرے دل میں تمہاری محبت پیدا ہو گئی تھی۔

چندراوتی (پیچھے ہٹ کر) "آپ یہ تو بتایئے کہ آپ کس بنش سے ہیں؟"

وشنوگپت (متانت سے) "میں آوانتی کے راجہ سورگیہ گندھرپ درسن کا بیٹا ہوں۔ اور میرا نام وشنوگپت ہے۔"

چندراوتی (بیخودی سے دوبارہ گلے لگ کر) "راجکمار! دو برس سے آپ کی بہادری کی شہرت سُن رہی ہوں اور آپ کو اپنے دل کے مندر کا دیوتا بنائے بیٹھی ہوں۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آج آپ کے ہاتھ سے میں ہنوں کے پنجے سے رہا ہوئی۔"

وشنوگپت نے اُسے گلے لگا کر پیار کیا اور مرتے دم تک پریم کرنے کا عہد کیا۔ پھر آیندہ کے منصوبہ پر بحث کر کے اپنے اپنے کمرے میں سو رہے۔

ٹورنامنٹ کا معرکہ

جب صبح ہوئی تو وشنوگپت نے چندراوتی کو ساتھ لے کر سنبھل گڈھ کی راہ لی۔ اُسے ایشان درمن کے سپرد کیا۔ اُسے پتہ لگا کہ گوالیار کے ہُن گورنر نے کھیل تماشوں کے جلسہ کا اعلان کر رکھا ہے۔ اُسمیں بلا امتیاز سبھی شامل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے عالی حوصلہ جان نثاروں کے ساتھ گوالیار جانیکا فیصلہ کیا۔ اِس مقصد سے تمام چیدہ سورماؤں کو بُلا بھیجا۔ دو چار دن کے اندر سو کے قریب بہادر فن سپہ گری کے اُستاد سنبھل گڈھ میں جمع ہو گئے، جنھیں لے کر وہ گوالیار کو چل دیا۔ وہاں پر کوئی ہُن سورما وشنوگپت کے دیس سیوکوں سے تلوار اور نیزے کے ہُنر میں سبقت نہ لے جا سکا۔

آخرکار گورنر کے نقیب نے یہ اعلان کیا "ہمارے سب سے بڑے سورما کھشتری سورماؤں سے دو دو ہاتھ کرنے کے خواہاں ہیں۔ جس کسی میں ہمت ہو، اکھاڑے میں اُتر آئے"۔ اعلان سُنتے ہی وشنوگپت جو کھشتری سورماؤں کا سرگروہ تھا۔ چار آئینہ، جوشن اور ہتھیار سنبھال اور اپنے شاندار گجراتی گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی شان کے ساتھ اکھاڑے میں اترا۔ اُس کا ڈیل ڈول دیکھ کر تماشائی سراہنے لگے۔ اُدھر

جو ہُن سورما نکلا، وہ بھی بڑا قدآور جوان اور سر سے پاؤں تک مسلح تھا۔ کھیل کا میدان بہت کشادہ تھا دونوں سورما اکھاڑے کے دونوں کونوں میں دو دو ہاتھ کرنیکے لئے بیتاب کھڑے تھے۔ اشارہ پاتے ہی گھوڑے ڈپٹائے اور پل بھر میں عین وسط میں مقابلہ ہوا۔ ہُن کا بھالا وشنوگپت کے سینے پر پورے زور سے پڑا۔ بڑا دھماکا ہوا، مگر ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہوگئے۔ اُدھر وشنو کے بھالے کے صدمہ سے ہُن اپنے گھوڑے سے نیچے جا گرا۔ مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ پھر وشنو گھوڑے سے کود کر ایک پل میں تلوار نکال ہُن کے سر پر جا دھمکا۔ وہ بھی تلوار نکال کر مقابلہ کے لئے تیار ہوگیا۔ دونوں نے تلوار کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اُس کے بعد ہُن نے چڑ کر کھشتری جودھا پر وار کیا۔ جسے اُس نے اپنی تلوار پر لیا۔ ہُن کی تلوار کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ وشنوگپت نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ کہ مخالف نہتا تھا۔ ہُن شیر کی طرح جھپٹ کر آیا۔ وشنو نے اُسے اوپر اُٹھا کر زور سے زمین پر دے مارا اور وہ بیہوش ہوگیا۔

اِس طرح کھیل میں کھشتری بہادروں کی جیت ہوئی۔ جس سے اُن کے حوصلے آسمان پر جا رہے تماشائیوں میں کھشتریوں اور دیگر ہندو جاتیوں کے لوگ بڑی بھاری تعداد میں موجود تھے۔ اس طرح لوگوں کے دلوں سے ہنوں کی دہشت جاتی رہی۔ غرض اِس ٹورنامنٹ کے معرکوں سے وشنوگپت اور اُس کے رفیقوں پر یہ روشن ہوگیا۔ کہ ہُن سورما میدانِ کارزار میں ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس سے اُن کی ہمت دہ چند بڑھ گئی۔ ہُن عیاش تھے۔ رات دن پینے میں مصروف رہتے تھے۔ ڈٹ کر لڑنے اور میدانِ جنگ کے دُکھ جھیلنے کا مادہ عیاشی سے برباد ہوچکا تھا۔

وشنوگپت اپنے سورماؤں کے گروہ کے ساتھ جسمیں بیسیوں اور نوجوان جو تماشا دیکھنے کو آئے تھے ٹورنامنٹ میں کھشتری کی بہادری سے اثر پذیر ہوکر شامل ہوگئے تھے، سنبھل گڈھ کو لوٹ گیا اور پہونچتے ہی چاروں طرف ہرکارے دوڑا دئے۔ کیونکہ اُسے یہ اندیشہ ستا رہا تھا۔ کہ جن سورماؤں نے ٹورنامنٹ میں ہُنوں کو نیچا دکھایا تھا۔ اُن پر وہ لوگ ظلم کئے بغیر نہ رہیں گے۔ اس لئے بلا توقف کارروائی کرنا لازم تھا۔

جنگِ آزادی

وشنوگپت کی درخواست پر تمام سورما سردار اور راجے جنھوں نے ہُنوں کی سرکوبی کا حلف اُٹھا رکھا تھا سنبھل گڈھ میں جمع ہوگئے۔ آخر سب کی رائے سے یہ قرار پایا کہ بلا توقف جنگ آزادی کا اعلان کردیا جائے۔ جائزہ لیا تو بیس ہزار گھوڑ چڑھے اور دس ہزار پیدل جان نثار غنیم کی بیخ کنی کیلئے بیتاب تھے اور یہ بھی طے پایا کہ سب سے پہلے وشنوگپت کے باپ دادا کی گدی پر دوبارہ قبضہ کیا جائے تاکہ اُسے صدر قرار دے کر ماتوہ کے علاقے کو ہُنوں سے پاک کیا جائے۔ دس ہزار مسلح سوار اکٹھے کرکے وہ

رات دن کوچ کرتا ہوا آوانتی پر اچانک ٹوٹ پڑا۔ ہُن حاکم وہاں پر نہ تھا بلکہ گوالیار میں اپنے سردار اعلیٰ کے ہاں کسی ضروری کام کے لئے گیا ہوا تھا۔ اس لئے خون بہائے بغیر ہی قبضہ ہو گیا۔ سنبھل گڑھ سے چلنے سے پہلے اُس نے اپنے وفاداروں کو آوانتی پہونچنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اس لئے وہ رات دن کڑی منزلیں طے کرکے وہاں پر جارہے اور اُن قلعوں میں تعینات ہو گئے جہاں ہنوں کے حملہ کا اندیشہ تھا۔ وشنوگپت نے دُور دُور کے تمام راجاؤں کو آوانتی آنے کی دعوت دی، تاکہ ہنوں کو نکالنے کا جتھا بنایا جائے چنانچہ دُور دُور کے راجہ آئے اور لڑائی کے متعلق خوب گرما گرم بحث چھڑی۔ سن رسیدہ راجہ جو معاملات کی اونچ نیچ سے خوب واقف تھے، کہنے لگے کہ "ہماری طاقت اتنی نہیں کہ ہم میدان میں غنیم کو زیر کرکے فتحیاب ہو سکیں۔ ہُن راج بہت وسیع ہے اور اُن کی فوج بھی بیشمار ہے۔ اس لئے لڑائی میں ہماری فتح کی کوئی اُمید نہیں، اس لئے جنگ چھیڑنے میں ہر طرح کی جوکھم ہے"۔ لیکن نوجوان سورماؤں نے نہ مانا اور کثرت رائے وشنوگپت کے حق میں تھی۔

جنگ آزادی کے حامیوں نے بڑے حوصلہ سے اپنے عالی حوصلہ سردار کی جے جے کے نعرے لگائے۔ اور سبھوں نے حسب حیثیت سپاہ اور سامان دینے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ دس پندرہ دن کے اندر اندر ہزارہا سوار اور پیادے کیل کانٹے سے لیس آوانتی میں جمع ہو گئے۔ بھڑوچ کا حکمران شیر دل ارون سنگھ اس لشکر کا سپہ سالار مقرر ہوا۔

آوانتی راج کے مشرقی مقامات کی حفاظت کے لئے کافی فوج پیچھے چھوڑ کر بیس ہزار گھُڑچڑھے اور دس ہزار پیادے لیکر وشنوگپت گوالیار پر چڑھ گیا۔ جو بندھیلکھنڈ اور مالوہ کے ہُن اضلاع کا صدر تھا ہُن گورنر کے جاسوسوں نے اُسے پہلے ہی سے وشنوگپت کی سرکشی سے مطلع کر دیا تھا۔ اُس نے مختلف اضلاع اور مقامات کے ہُن سرداروں کی سپاہ تیار کرکے مغربی مالوہ پر چڑھائی کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا مگر اُسے یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ وشنوگپت فوج لے کر گوالیار پر چڑھ آئیگا۔ وہاں پر مختصر لڑائی کے بعد وشنوگپت نے قبضہ کر لیا۔ اور وہیں سے مالوہ، دکن اور گجرات وغیرہ کے راجاؤں کے نام فتح نامے ارسال کئے۔ جنہیں سارے مالوہ پر قبضہ کر لینے کا ذکر تھا۔ چند ہی روز میں اس شاندار فتح کی خبر جنگلی آگ کی طرح جنوبی راجپوتانہ، گجرات اور مالوہ کے باہر دکن اور آجکل کے ممالک متوسط میں بھی پھیل گئی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ جو کم ہمت راجے ہُنوں کی سرکوبی محال سمجھتے تھے، وہ بھی وشنوگپت کے حامی بن گئے۔ اور اپنی اپنی سپاہ لے کر اُس کی مدد کو آپہونچے۔

مالوہ کے علاقہ کا انتظام مکمل کرکے اور بہادر ارون سنگھ کو بندھیاچل کے بعض قلعے جو ہُنوں کے

قبضے میں تھے اسر کرنے کا نازک کام سونپ کر آپ متھرا کی طرف بڑھا۔ جو اُسوقت سارے میدان گنگا مشرقی راجپوتانہ اور آجکل کی دہلی کے خطہ کی ہُن راجدھانی تھی، گوالیار کا صوبہ دار شکست کھا کر متھرا کے ہُن والیسرائے کے پاس چلا گیا تھا۔ اس لئے وہاں پر سخت معرکہ ہونے کی توقع تھی۔ متھرا کے والیسرائے کو وشنوگپت کی فتح کا سارا حال معلوم ہو چکا تھا۔ اُس نے آس پاس کے علاقہ کی ساری فوج اکٹھا کی۔ اُدھر اپنے آقائے گرامی قدر کو اِس سرکش کا سارا حال لکھ بھیجا۔ اور لشکر جرار کی کمک کی درخواست کی۔ لیکن راجہ شاکلیہ نے لشکر بھیجنے سے انکار کیا۔ اِس پر والیسرائے نے جتنی فوج وہ سمیٹ سکا، اکٹھی کر کے لڑنے کا تہیہ کیا۔

راجہ وشنوگپت اِس بات کو خوب جانتا تھا کہ جنگ میں پھرتی اور چابکدستی ضروری شے ہے۔ اِس لئے سپاہ اور سامان بہم پہونچا کر بڑی جلدی سے متھرا پر ٹوٹ پڑا۔ ہُن والیسرائے کو ہر روز وشنوگپت کی آمد آمد کی خبریں پہونچتی رہتی تھیں۔ اُس نے مقابلہ کے لئے ساری فوج اور سامان جنگ اکٹھا کر رکھا تھا۔ دو دن تک بڑا گھمسان معرکہ ہوا۔ وشنوگپت اور اُس کے رفیق اپنی آن اور جان کیلئے سرفروشیوں سے کام لے رہے تھے مگر ہُن بھی اپنے بادشاہ کا اقتدار برقرار رکھنے کیواسطے جانیں قربان کر رہے تھے۔ دونوں گروہوں کے مقاصد جدا تھے۔ دیس بھگتی اور قومی و ملکی آن کے مقابلہ میں ظلم و ستم اور خودغرضی صف آرا تھی۔ بہرحال ہُنوں نے متھرا کے معرکہ میں سخت شکست کھائی۔ ہُن والیسرائے پہلے ہی دن لڑائی کا رنگ دیکھ کر سواروں کے ایک دستے کیساتھ آدھی رات کو متھرا سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور راتوں رات دِلّی کی طرف نکل گیا۔ وشنوگپت اور اُس کے جانباز ساتھیوں نے ہُنوں کے سامان، خزانے اور ہر قسم کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اس دو ٹوک معرکہ سے دوآبہ گنگ اور مشرقی راجپوتانہ اور اندرپرست کا خطہ ہُنوں کے ناپاک وجود سے پاک ہو گیا متھرا کے معرکہ کے بعد وشنوگپت کے دِل میں مزید فتوحات کا خیال پیدا ہوا۔ اُس نے آریہ ورت اور دکن کے تمام راجاؤں کے نام فتحنامے ارسال کئے۔ چاروں طرف جشن منائے گئے۔ اُسے مبارکبادیں آئیں۔ لشکر خزانے امداد کے لئے بھیجے گئے۔

کیروڑ کا معرکہ عظیم

وشنوگپت ناتجربہ کاری کے باوجود بھی خوب جانتا تھا کہ ہُنوں کا شہنشاہ مہرگل اپنی سلطنت ہند کو جو اِٹنا در سے بندھیاچل تک اور مشرقی راجپوتانہ اور مالوہ سے کاشی تک پھیلی ہوئی تھی، بچانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا۔ اور اپنی ساری سپاہ اور بڑے سامانوں سے آخری فیصلہ کُن معرکہ کیلئے میدان میں اُترے گا۔ اِس لئے اُس نے متھرا کے معرکہ کے بعد ہی ایک طرف تو انتظامی کارروائیاں

شروع کردیں۔ فتح شدہ صوبوں کے انتظام کے لئے لائق اور ہوشیار حاکم مقرر کئے۔ دوسری طرف لشکر اور سامان جنگ فراہم کرنا شروع کردیا۔ دُور دُور کے راجہ فوج اور سامان لے کر اُس کے پاس چلے آئے اور نئے علاقوں سے بھی ہزارہا کھشتری جوان اُس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے۔ اِس طرح ڈیڑھ دو لاکھ سپاہ جمع ہو گئی۔

جاسوسوں نے وشنوگپت کو یہ پرچہ دیا کہ ہُن راجہ نے پشاور اور وسطی پنجاب کے لشکروں کو ملتان کی طرف بڑھنے کا حکم دیا ہے اور یہ بھی خبر دی کہ مہرگل نے اپنے بہنوئی شاہ ایران کو اپنی مدد کے لئے طلب کیا ہے۔ اِس لئے وسیع پیمانہ پر تیاریاں کرکے وہ ملتان کی طرف روانہ ہوا۔ اُس کے زیرکمان چار ہزار جنگی ہاتھی، پچاس ہزار سوار اور ستّر ہزار پیادے کیل کانٹے سے لیس اور ہر قسم کا سامان تھا۔ کئی ہفتوں کے کوچ کے بعد وشنوگپت کروڑ کے وسیع میدان کے جنوبی حصے میں جا پہونچا۔ جو آجکل ملتان اور شہر بھاولپور کے مابین لق و دق ہموار خطہ ہے۔ اُس کا مقابلہ اس زمانہ کے دُو سب سے زبردست تاجداروں سے تھا۔ سلطنت ایران کی شوکت ہنوں کی سلطنت سے کچھ ہی کم تھی۔ ان دونوں کے زیرکمان تیس لاکھ فوج تھی۔ گویا ایک کھشتری سورما کا سامنا تیس تیس ہُنوں سے تھا۔

وشنوگپت کے سپاہی ارون سنگھ نے سب سے پہلے چار ہزار ہاتھیوں کو آگے دھکیلا۔ اور اُنکی آڑ میں رسالے آگے بڑھے۔ اُدھر ہنوں نے بھی ہاتھی آگے بڑھا کے مقابلہ شروع کیا۔ کھشتری سواروں نے آسمان کو چیرنے والے نعروں سے جو حملہ کیا تو پہر بھر میں ہُنوں کی صفیں صاف کرکے دھر دیں۔ جنگی ہاتھیوں کو تھوڑی دیر میں زیر کرلیا، کئی مرگئے۔ کئی زخمی ہوئے۔ بہت سے مقابلہ کرنے سے بھاگ گئے۔ مہرگل کو ان ہاتھیوں پر بڑا گھمنڈ تھا۔ مگر اُنھوں نے پیٹھ دکھائی۔ پانچ دن تک لگاتار معرکہ ہوتا رہا۔ اور ہر میدان میں ہُن ہارتے اور شکست کھاتے رہے۔ ہزارہا ہُن مجروح و مقتول ہو گئے۔ اِدھر سورما کھشتری اپنی جانیں نچھاور کررہے تھے۔ اُدھر ہن بھی جانیں لڑا رہے تھے۔

دُنیا میں ہمیشہ وہی اصول آخرکار فتحمند ہوتا ہے جس کی بنیاد حق و انصاف پر قائم ہوتی ہے۔ جور وستم کا غلبہ چند روز رہتا ہے مگر عدل و انصاف اور امن و سکون سالہا سال تک غالب رہتے ہیں۔ یہی کیفیت کروڑ کے معرکہ عظیم میں بھی دیکھنے میں آئی۔ لڑائی کا رنگ دیکھ کر شاہ ایران پانچویں دن تیسرے پہر چپکے سے میدان سے کھسک گیا۔ اُس کے بعد تین دن تک اور میدان گرم رہا۔ کھشتریوں نے ہنوں کا بُری طرح صفایا کیا۔ آٹھ دن کے بعد معرکہ وشنوگپت کی دوٹوک کامل فتح پر ختم ہوا۔ تمام بڑے بڑے ہن سردار اور سپہ سالار کھیت رہے۔ مہرگل شکست کھانے کے بعد بھیس بدل کر میدان سے بھاگنے کو تھا کہ ایک کھشتری

کے ہاتھ پڑ گیا۔ اُس کے ساتھی تو بھاگ گئے مگر وہ گرفتار ہوکر وشنوگپت کے سامنے آیا۔ اُس نے زمین پر لیٹ کر اپنے عالی حوصلہ فاتح کو پرنام کیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں چومے اور جتنا انکسار ہو سکتا تھا، کیا۔ وشنوگپت نے کھشتری دھرم کے مطابق پناہ گزین دشمن کو معاف کردیا۔ اور اپنی فوج کا ایک دستہ اُس کے ہمرکاب کرکے اُسے عزت کے ساتھ شاکلیہ (سیالکوٹ) پہونچا دیا۔ اُدھر شیر دل اردن سنگھ نے بھگوڑے ہنوں کا بڑی مستعدی سے پیچھا کیا۔ ہزارہا ہن تہ تیغ کر ڈالے تیس[۳۰] لاکھ ہنوں میں سے بمشکل تمام بیس[۲۰] ہزار جوان جان لے کر میدانِ کارزار سے بھاگے تھے۔ جو ہن سردار بچ نکلے تھے، وہ بھاگ کر اٹک پار جا رہے۔ وشنوگپت نے مہرگل کو رخصت کرنے سے پہلے فہمائش کی کہ آیندہ وہ اٹک سے اِدھر آنیکا ارادہ نہ کرے۔

میدان جنگ میں بیٹھے بیٹھے وشنوگپت[۱] نے پنجاب کے اضلاع کا نیا انتظام کیا۔ اُدھر ملتان کے مغرب کا علاقہ جو سکھر تک ہاتھ آگیا تھا۔ اُس کا انتظام بھی لازم تھا۔ اپنے جان نثاروں میں سے اُن آدمیوں کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کردیا۔ جنھوں نے ہنوں کی سرکوبی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ اُسکے بعد پھریرے اُڑاتا آوانتی میں واپس گیا۔ جہاں چندراوتی اس کی عظیم الشان فتوحات کی خبریں سُن سُنکر پھولی نہ سماتی تھی۔ اُن دونوں کا بیاہ شاہانہ دھوم دھام سے ہوگیا۔

---

[۱] شمالی ہند میں ہن راج ۵۱۰ء سے ۵۳۲ء تک رہا۔ وشنوگپت نے ۵۲۴ء میں اعلانِ آزادی کرکے پانچ برس میں ہنوں کی بیخ کنی کی۔ منڈسور کا ستون ۵۳۳ء میں کندہ کرکے نصب کرایا تھا۔ کرور کے عظیم معرکہ کے بعد آریہ ورت کے لوگوں نے اُسے جشو دھرمن پکارنا شروع کردیا تھا۔ پھر اُس نے سارے بھارت ورش کو فتح کیا۔ اِس وجہ سے کشمیر سے وکشن پتھ تک۔ اُدھر کام روپ سے کاٹھیاواڑ تک اُسی کا ڈنکا بجتا تھا۔ اُس نے سندھ کے راستے سے بلوچستان میں کیقباد شاہ ایران کو ایک سخت معرکہ کے بعد شکست دے کر اُسے مہرگل کی حمایت کی سزا دی۔ وشنوگپت جشو دھرمن آخری کھشتری چکرورتی تاجدار تھا۔ جس نے گپت بنش اور موریہ کل کی شان و شوکت کی یاد تازہ کی تھی۔ اس کے سو سال بعد ہرش وردھن نے شمالی ہند میں دریائے نربدا کے اِدھر اور پلکیشی چالوکیہ نے جنوبی ہند میں نمایاں عظمت حاصل کی۔ اُس کے بعد ہندوستان کی چکرورتی شوکت ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ گو کئی بہادر اور عالی حوصلہ ہندو تاجدار گاہے ماہے سولھویں صدی تک عظمت و شوکت سے راج کرتے رہے۔

میرے وطن!

(از مسٹر جگن ناتھ آزاد بی۔ اے خلف جناب محروم)

اے مری آنکھوں کے تارے! اے مرے پیارے وطن! ناز شِ اقطاعِ عالم! زینت بزمِ کہن!
گو خزاں نے لوٹ ڈالے ہیں ترے سرو و سمن خارزاروں میں ہوئے تبدیل گو تیرے چمن
پھر بھی اے میرے وطن! مجھکو محبت تجھ سے ہے

کشتۂ تقدیر، اے ہندوستاں، میرے وطن اِک زمانہ وہ بھی تھا تو جب کہ تھا فخرِ زمن
اب ہے اِک مدت سے گو دشمن ترا چرخِ کہن اور ہیں اقوامِ عالم آج تجھ پر خندہ زن
پھر بھی اے میرے وطن! مجھ کو محبت تجھ سے ہے

تھی کبھی تیری زمیں ہمسایۂ چرخِ بریں تجھ میں اب وہ شان پہلی سی نہیں شوکت نہیں
امن و راحت سے پرے ہیں آج گو تیرے مکیں اور ہے گہوارۂ جنگ و فتن تیری زمیں
پھر بھی اے میرے وطن! مجھ کو محبت تجھ سے ہے

اِک جہنم کا نمونہ ہے، دہانِ گور ہے بمبئی ہے یا اِلٰہ آباد یا لاہور ہے
فرقہ وارانہ فسادوں کی ہوا کا زور ہے تیری محفل میں جہاں سے گو نرالا شور ہے
پھر بھی اے میرے وطن! مجھکو محبت تجھ سے ہے

خطۂ دوزخ سے تو گو آج ہم آہنگ ہے زندگی انساں کی گو تیری زمیں پر تنگ ہے
گرچہ تو زیرِ طلسمِ ساحرِ افرنگ ہے اور اذاں ناقوس کے نعروں سے محوِ جنگ ہے
پھر بھی اے میرے وطن! مجھ کو محبت تجھ سے ہے

آج تو گو حسرت و ارمان کی تصویر ہے نارسا نالے ترے، فریاد بے تاثیر ہے
دُور تیرے دل سے آزادی کی گو تدبیر ہے گردشِ تقدیر تیرے پاؤں کی زنجیر ہے
پھر بھی اے میرے وطن! مجھ کو محبت تجھ سے ہے

خطۂ انگلینڈ ہے اُونچے ارادوں کے لئے کشورِ ہسپانیہ ہیم جہادوں کے لئے

جرمنی ہے آج کل سرہنگ زادوں کے لئے اور ہے تیری زمیں باہم فسادوں کے لئے
پھر بھی اے میرے وطن! مجھ کو محبت تجھ سے ہے

اے غلام آباد! کب ہندو ترا ہندو ہے آج اور مسلمانوں میں کب اسلام کی خوشبو ہے آج
کونسا گل ہے ترا جس میں وفا کی بو ہے آج صفحۂ گیتی پہ پامالِ فلک اک تو ہے آج
پھر بھی اے میرے وطن! مجھ کو محبت تجھ سے ہے

آج ہر وہ ملک جس کو زندگی سے پیار ہے دیکھ میدانِ ترقی میں صبا رفتار ہے
اس جگہ ہندو سے مسلم برسر پیکار ہے ریش سے پیچھے طرح اُلجھا ہوا زُنار ہے
پھر بھی اے میرے وطن! مجھکو محبت تجھ سے ہے

مانگتا ہوں یہ دعا ہندوستاں! تیرے لئے ہر گھڑی سینہ سپر ہو ہر جواں تیرے لئے
بارشِ رحمت کرے ابرِ رواں تیرے لئے ہر ستارہ ہو سعادت کا نشاں تیرے لئے
کیونکہ تہذیبِ جہاں کی شان و شوکت تجھ سے ہے۔

وائے نادانی

(از منشی جگدیش سہائے سکسینہ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

راحت کونین وصل جسم و جاں سمجھا تھا میں زندگی کو سود، مرنے کو زیاں سمجھا تھا میں
اک جمالِ غیر فانی کی یہ دیتی تھی خبر اپنی ہستی کو فقط وہم و گماں سمجھا تھا میں
داغِ دل کو دیکھکر شرما گئے جنت کے پھول حیف! اسکو اک متاعِ رائیگاں سمجھا تھا میں
اس کے اندازِ بیاں پر گفتگو قرباں ہوئی اپنی خاموشی کو یارب بے زباں سمجھا تھا میں
گل تھا آغشتہ بخوں کاوش سے نوکِ خار کی اسکو اک جامِ شرابِ ارغواں سمجھا تھا میں
اک فریبِ زندگی تھا یہ بھی اے اہلِ جہاں جسم کے آرام کو آرامِ جاں سمجھا تھا میں
قلب میں رہنا بھی ان کا کم نہ تھا فریاد سے لب تلک شکووں کے آنے کو فغاں سمجھا تھا میں
سوزشِ غم سے تھا قائم سوز و سازِ زندگی
وائے نادانی کہ اس کو جانستاں سمجھا تھا میں

شوروغل

(مشہور جرمن فلسفی شوپنہار کے خیالات)

کینٹ نے فطری قوتوں کی تعریف میں ایک قصیدہ تصنیف کیا ہے، لیکن میں اُن کے لئے ایک مرثیہ لکھنا پسند کرتا ہوں، اعتدال سے زیادہ قوت کا اظہار میری تمام زندگی میں روزانہ باعثِ تکلیف ثابت ہوا ہے جو کسی چیز کے کھٹکھٹانے، ہتھوڑا چلانے اور چیزوں کو ادھر ادھر پھینکنے کی صورت میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو ان چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ ان کو شوروغل کا احساس ہی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ان لوگوں کو نہ دلائل نہ تخئیل نہ شاعری، اور نہ علم و ادب سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغ کے ریشے لطیف و نازک نہیں ہوتے بلکہ موٹے، کھُردرے اور غیر حساس ہوتے ہیں۔ دوسری طرف یہی شوروغل ایک عقلمند اور ذہین شخص کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ تقریبًا تمام بڑے بڑے ادیبوں اور مصنفوں کے سوانح حیات میں اس بات کی شکایت پائی جاتی ہے۔ کینٹ۔ گوئٹے۔ لشن برگ اور جین پال ہر ایک کو شوروغل سے سخت نفرت تھی اور اگر کسی مصنف نے اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے تو وہ ارادۃً نہیں بلکہ کسی وجہ سے اسے اس بارے میں اظہار خیالات کا موقع ہی نہیں ملا۔

اس شوروغل سے تنفر کو میں اپنے طور پر حسب ذیل الفاظ میں بیان کروں گا۔ اگر تم ایک بڑے ہیرے کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو تو اس کی وہ ساری قیمت جاتی رہیگی جو اس کی مجموعی یا ثابت حالت میں تھی۔ اسی طرح اگر ایک فوج چھوٹے چھوٹے دستوں میں تقسیم کر دی جائے تو اس کا سارا زور ضائع ہو جائیگا۔ بعینہ ایک اعلیٰ دماغ کا نظام کسی گڑبڑ سے درہم برہم ہو کر اپنی ساری خصوصیت کھو کر ایک معمولی ذہن کی طرح ہو جاتا ہے۔ اُس کا دھیان موجودہ مسئلہ سے ہٹ کر ادھر اُدھر بٹ جاتا ہے، کیونکہ اس کی ساری قابلیت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو کسی ایک ہی کام میں لگا سکے۔ جیسے ایک لینس (Lens) روشنی کی ان تمام شعاعوں

لہ اس مضمون کے شائع ہوتے ہی دسمبر ۱۹۲۵ء میں نیورمبرگ میں فضول چابک لگانے کی قطعی ممانعت کر دی گئی تھی۔

کو جو اس پر پڑتی ہیں، ایک ہی نقطہ پر یکجا کر دیتا ہے۔ شور و غل سے جو خلل واقع ہوتا ہے وہ اس بات میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہر ممتاز و اعلیٰ دماغ نے اس سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ خلل کسی قسم کا ہو وہ بیچ میں آکر اُن کے خیالات کی دنیا کو برہم کر دیتا ہے لیکن سب سے زیادہ قابل نفرت خلل شور و غل سے واقع ہوتا ہے۔ عام آدمیوں کا اس قسم کی باتوں سے کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ یورپ کی تمام قوموں میں جو سب سے زیادہ ذہین اور عقلمند ہستیاں ہیں انھوں نے حضرت عیسیٰ کے دس فرمانوں میں اس گیارھویں فرمان کا اضافہ کیا ہے:- کہ

"کبھی کسی کے مخل نہ ہو"

شور و غل سب قسم کے خلل سے زیادہ "نامعقول" ہے کیونکہ یہ دنیا تخئیل کو برہم کرنے والی چیز ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز ایسی نہ ہو جس میں خلل واقع ہو سکے تو پھر ضرور شور و غل بھی خاص طور پر کچھ تکلیف دہ معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اکثر ایسا واقع ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ میں اچھی طرح سے اس سے باخبر ہو سکوں ایک مسلسل مگر ہلکا سا شور و غل مجھکو پریشان کرنے لگتا ہے جس سے میرا مزاج برہم ہو جاتا ہے کیونکہ مجھ کو اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ کسی طرف خیال جمانے میں زیادہ محنت صرف کرنا پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے پاؤں میں پتھر باندھ کر چل رہا ہوں۔ آخر کار مجھکو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؛

تمام شور و غل میں سب سے زیادہ قابل نفرین اور نا قابل معافی چابک کی آواز ہے جو اس وقت ایک دوزخی چیز ہو جاتی ہے جب وہ کسی شہر کی تنگ گونجنے والی گلی میں ہو۔ میں اس سے اس لئے نفرت کرتا ہوں کہ وہ امن و امان کی خاموش زندگی کو ناممکن بنا دیتی اور تمام پرسکون تخئیل کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ چابک بازی کی اجازت دینے سے مجھکو انسان کی غیر حساس اور لایعنی فطرت کا صاف طور سے ثبوت ملتا ہے۔ کوئی شخص بھی جس کا دماغ قوت تخئیل سے بہرہ ور ہے ہرگز اس تکلیف کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے جو یکایک اس کرخت تڑاخے کی آواز سے ہوتی ہے جو دماغ کو معطل اور تخئیل کے تسلسل کو منقطع کر کے خیالات کو فنا کر دیتا ہے۔ جتنی مرتبہ یہ شور و غل ہوتا ہے ہر مرتبہ وہ صدہا لوگوں کے خیالات کو درہم برہم کر دیتا ہے جو اپنے دماغوں کو کسی نہ کسی مسئلہ کے حل میں لگائے رہتے ہیں۔ یہ کوئی بات نہیں کہ وہ چیز اپنی جگہ [illegible]

کیونکہ اس کے خیالات اس طرح منقطع ہو جاتے ہیں جس طرح کسی قاتل کے وار سے سرتن سے جدا ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی آواز چاہے وہ کتنی ہی تیز ہو کبھی اس طرح دماغ میں ضرب نہیں لگا سکتی جس طرح کہ چابک کی آواز۔ تم غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ چابک ایک ڈنک کی طرح ہے۔ جو عین تمہارے دماغ میں ضرب لگاتا ہوا محسوس ہوتا ہے دماغ پر اس کا بالکل وہی اثر ہوتا ہے جیسے کہ ایک چھوئی موئی کا درخت محض انسانی انگلی کے چھو جانے سے تھوڑی دیر کے لئے بالکل مرجھا جاتا ہے۔

مفادِ عامہ کے اعلیٰ اصولوں کا احترام کرتے ہوئے میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جو شخص کنکر، پتھر یا گوبر کوڑا کرکٹ سے بھری ہوئی گاڑی لے جاتا ہے آخر وہ کس طرح سے اس بات کا مستحق ہے کہ ہزارہا انسانوں کے خیالات کو پیدا ہوتے ہی فنا کر دے۔ بہر حال یہ امر واقعہ ہے کہ یہ شخص نصف گھنٹے کام کے دوران میں ہزارہا خیالات کا خون کر دیتا ہے۔ ہتھوڑوں کی کھٹ کھٹ، کتوں کی عف عف اور بچوں کا شور وغل بہت ہی وحشت انگیز آوازیں ہیں۔ لیکن تمہارے خیالات جس قدر چابک کی آواز سے منتشر ہو جائیں گے۔ یہ ناگوار کردار پُرسکون تخیل کے اُس خوشگوار لمحہ کو فنا کر دیتی ہے جس سے ہم وقتاً فوقتاً لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اگر گاڑی بان اپنے گھوڑے کو ہانکنے کے لئے اس مکروہ آواز کے علاوہ اور کوئی دوسرا طریقہ اختیار نہیں کر سکتا تو وہ قابل معافی ہے لیکن واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ یہ چابک کا منحوس تڑاخہ صرف غیر ضروری ہی نہیں بلکہ فضول ہے۔ اس کا مقصد صرف گھوڑے کی ذہانت پر اثر ڈالنے کا ہے۔ لیکن اس مسلسل پھٹکار سے جانور اس آواز کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے جس کی وجہ سے سزا کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے گھوڑا ذرا بھی تیز نہیں ہوتا۔ تم کو اس کی بہترین مثال فٹن چلانے والے کے مسلسل چابک کے تڑاخوں میں ملتی ہے۔ جب وہ فٹن کو میلہ کے اندر آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ اگر وہ گھوڑے کو ذرا سا چابک چھوا دیا کرے تو اس پر کہیں زیادہ اثر ہو۔ بہر حال اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ اس آواز کا صرف یہ مقصد ہے کہ گھوڑے کو یہ معلوم رہے کہ گاڑیبان موجود ہے تو اس کا سواں حصہ ہی کافی ہے کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ جہاں تک بصارت اور سماعت کا تعلق ہے جانور دھندلی سی دھندلی شئے کو بھی دیکھ لیتے اور ہلکی سی ہلکی آواز کو سُن لیتے ہیں۔ ہم جن چیزوں کو محسوس بھی نہیں کر سکتے وہ ان کو دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔ جس کی سب سے زیادہ حیرت انگیز مثال سکھائے ہوئے کُتوں اور کینری چڑیوں میں ملتی ہے۔

اس بدعت کو پولیس کے ذریعہ بند کرنے کی سفارش کرنے کے بعد فلسفی موصوف لکھتا ہے، کہ

عام لوگوں کو اس بات کی طرف توجہ دلانا کہ اُن سے ایک اعلیٰ تر جماعت دماغی کام میں مصروف ہے کوئی بُری بات نہ ہوگی۔ کیونکہ سڑک کے کنارے رہنے والوں کے لئے ہر قسم کی دماغی مصروفیت ایک جانکاہ تکلیف اور سوہان روح ثابت ہوتی ہے۔ وہ شخص جو فٹن یا گاڑیوں کے خالی گھوڑوں کو لیکر آباد شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے کئی گز لمبے چابک کو اپنی پوری طاقت سے تڑخاتا ہے۔ اس کا مستحق ہے کہ اسے فوراً نیچے گرا کر اس کے سر اقدس پر پانچ جوتے لگا دیئے جائیں۔ دنیا کے تمام قانون ساز جو ہر قسم کی جسمانی سزا کی منسوخی کے حامی ہیں۔ مجھے اس سزا کا مخالف نہیں بنا سکتے قاصدوں حمالوں اور گاڑیبانوں کے ساتھ نہایت خوشی سے انصاف کا برتاؤ کیا جائے۔ لیکن ان کو اس بات کی کبھی اجازت نہ دینا چاہیئے کہ وہ اپنی شوخی یا بے خیالی سے شور مچا کر اعلیٰ انسانوں کی کوششوں میں روڑے اٹکائیں۔

بقول ٹامس ہوڈ بعض لوگوں کو فضول شور و غل کرنے میں کچھ لطف حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر ان سے پوچھئے تو وہ اس سے صاف انکار کر دیں گے۔ بات یہ ہے کہ اس بارے میں ان کے احساسات کند اور مردہ ہو چکے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب کبھی وہ فضول شور و غل یا اسی قسم کی آوازیں سُنتے ہیں تو اس سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ ان کے پڑھنے یا سوچنے میں بھی مخل نہیں ہوتی ہیں، اور یہ صرف اس لئے کہ وہ اس پر توجہ ہی نہیں دیتے اور نہ کسی بات پر کبھی غور کرتے ہیں۔ بلکہ غور و خوض کرنے کے بجائے مزے سے سیگرٹ پی پی کر دھواں اُڑانے لگتے ہیں۔ لوگوں کو غیر ضروری شور و غل کرنے کی جو عادت پڑ گئی ہے وہ قابل سرزنش ہے۔ مثلاً دروازوں کو دھڑسے بند کرنا جو سخت بداخلاقی اور بیہودہ حرکت ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ لوگوں کو عموماً غور و خوض سے بیزاری ہے۔ اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ معمولی شور و غل اور فضول ڈھول اور نقارے بجانے والوں پر دھیان ہی نہ دیا جائے۔

رباعیات

ہر دھرم یہ کہتا ہے کرو خدمتِ خلق
ہر دیں کا تقاضا ہے کرو خدمتِ خلق
کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ماہر
خالق کا یہ منشا ہے، کرو خدمتِ خلق

*

مَیں رُوح کو شاد کام کر لیتا ہوں
تسکین کا اہتمام کر لیتا ہوں
جاتا ہوں جو کعبے کی طرف اے ماہر
بُت خانے کو بھی سلام کر لیتا ہوں

یادش بخیر

(از حضرت سرشار کسمنڈوی)

وہ سادہ چتونیں، وہ سُکر زا انگڑائیاں اُنکی — تبسم میٹھا میٹھا، پُرسکوں رعنائیاں اُن کی
دل آزاری سے واقف ہی نہ تھیں برنائیاں اُنکی — مجھے کیونکر نہ یاد آئیں کرم فرمائیاں اُن کی

کبھی وہ دن بھی تھے جب خود کو خوش قسمت سمجھتا تھا — اسی دوزخ نما دُنیا کو مَیں جنت سمجھتا تھا
اُنھیں لمحوں کو جانِ لذتِ عشرت سمجھتا تھا — نگاہوں میں ڈھلا کرتی تھیں جب رعنائیاں اُن کی

فضائیں کائناتِ دو جہاں کی جگمگاتی تھیں — کہ ہر سُو بجلیاں ہی بجلیاں سی تلملاتی تھیں
نگاہیں دیکھنے والوں کی پہروں لڑکھڑاتی تھیں — سراپا نور ٹپکتی تھیں جہاں پرچھائیاں اُن کی

جوانی جنتُ الفردوس تھی، غرقِ تبسم تھی — محبت دلنشیں انداز میں محوِ ترنم تھی
یہ دل کیا، روح میری لذت اندوزِ تکلم تھی — مرے ہی واسطے تھیں وقف جب رعنائیاں اُنکی

ہر اِک انداز میں اِک دلنشینی کار فرما تھی — نظر میں فطرتِ سادہ کی اِک معصوم دنیا تھی
مری وارفتگی شوق تصویرِ تمنا تھی — تصنع سے بری تھیں جب کرم فرمائیاں اُن کی

نگاہوں میں شرابِ آرزو اکثر اُبلتی تھی — حجابِ ناز میں اِک شوخی تسکیں مچلتی تھی
ادائے ناز ہر اندازِ دلکش میں نکلتی تھی — نہ تھیں نا قابلِ برداشت عشوہ زائیاں اُنکی

توقع کے خلاف آ آکے کچھ باتیں بنا جانا — غرورِ حُسن کا دلچسپ اِک منظر دکھا جانا
سرِ بالینِ غم نظریں بچا کر مُسکرا جانا — مَیں کیونکر بھول سکتا ہوں ستم آرائیاں اُن کی

کبھی وہ سیرِ گلگشتِ چمن جب آ نکلتے تھے
بصد اندازِ تمکیں مسکراتے تھے ٹہلتے تھے
فضائے دلنشیں سے جانفزا نغمے اُبلتے تھے
قیامت تھیں وہ رومانی تبسّم زائیاں اُن کی

وہی میں ہوں کہ اب آزردۂ رسمِ محبت ہوں
اسیرِ رنجِ حرماں، شکوہ سنجِ دردِ فرقت ہوں
بظاہر مطمئن ہوں اور شریکِ بزمِ فطرت ہوں
مگر رہ رہ کے یاد آتی ہیں بزم آرائیاں اُن کی

کوئی کہتا ہے اب وہ طور پر بجلی گراتے ہیں
کسی کا قول ہے دیر و حرم میں پائے جاتے ہیں
غرض ہر جا نئی ترکیب سے جلوے دکھاتے ہیں
کبھی میرے لئے تھیں وقف خود آرائیاں اُن کی

نہ پوچھو میں نے راہِ عشق طے کی کس طرح کیونکر
جفائے حُسن کا شکوہ نہ آیا کیوں مرے لب پر
مری آنکھیں فقط تنقیدِ بیجا کی نہیں خوگر
نظر آتی ہیں ہر شے میں مجھے اچھائیاں اُن کی

افکارِ پریشاں

حضرت جگرؔ بریلوی

یہ بھی ہے تکملۂ جلوۂ پنہاں ہونا
چاکِ دل چاکِ جگر چاکِ گریباں ہونا
ختم اسی پر ہے بس انسان کا ہنگامۂ زیست
کبھی خنداں کبھی گریاں کبھی حیراں ہونا
ناخنِ عشق کی محتاج گرہ حُسن کی تھی
چاکِ دامانِ گل سے ہے گلستاں ہونا
جمع کرتا ہوں پھر اجزائے پریشانِ حیات
یاد آیا مجھے محوِ غمِ پنہاں ہونا
اہلِ محفل ہے فقط شمع کی لَو دینے تک
شعلہ کا کسوتِ پروانہ میں پنہاں ہونا
اپنے دل سے کوئی کس طرح بنا ہے یارب
جس کو بسنا ہی مبارک ہو نہ ویراں ہونا
صورتِ نغمہ و نکہت ہو کہ ہو صورتِ گل
شرح بے ربطیِ خاطر ہے پریشاں ہونا
حُسن اگر جلوۂ صد رنگ پہ موقوف نہیں
کیوں ہے یہ عارض و چشم و لب و دنداں ہونا
ہے جگرؔ داد طلب عشق کی مجبوری بھی
ہائے ناکردہ گناہوں پہ پشیماں ہونا

بھوپال کے سنگ مرمر

(از رائے زادہ منشی گوبند پرشاد آفتاب بی-اے)

ریاست بھوپال بندھیاچل کے سلسلۂ کوہستان میں اپنے خوشنما مناظر اور فطرت کی حسین آرائشوں کے باعث جس قدر دل پسند اور نظر فریب ہے اُسی قدر وہ قدرت کے پوشیدہ خزانوں سے معمور اور طرح طرح کی معدنیات سے بھرپور ہے۔

یہ ریاست قرون قبل از تاریخ کے بیس ہزار فٹ دَل والی سنگین سطحوں کو اپنی وادیوں کی آغوش میں سلائے ہوئے سادہ تعمیری پتھروں کی اس قدر بہتات رکھتی ہے کہ جس سے ایک نئی دنیا از سر نو تعمیر ہو سکتی ہے۔ زمانۂ مابعد میں قدرت کی فیاضیوں نے یہاں کے تعمیری سامان میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ ریاست بروائی کی آتشین مادّوں سے بنی ہوئی سنگلاخ سطحوں نے بھوپال میں آرائشی پتھروں کی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔

افسوس کہ دو ہزار برس سے یہ ملک تاریخی انقلاب کی بیدردیوں کا شکار ہو کر اس قدر ویران اور برباد ہو گیا ہے کہ کوسوں تک پھیلی ہوئی شاندار آبادیاں کھنڈرات کی صورت میں منتقل ہو کر نگاہِ ظاہر سے مخفی ہو گئی ہیں۔ اور جہاں کبھی رعایا پروری کی سرسبزیاں بہار دکھا رہی تھیں وہاں اب صحرائی جانوروں اور خال خال صحرائی آدمیوں کے نشیمن اور جھونپڑیاں نظر آتی ہیں۔

شاندار عمارتوں کے اس اُجڑے ہوئے سہاگ پر تازیانۂ عبرت ہوشنگ شاہ کی فوج قلزم موج نے لگایا جب بھوج پور کے عظیم الشان اور گیسو دراز بند تالاب بھوپال کو منہدم کرکے عساکر ہوشنگیہ نے اپنے دشمنوں کے ملک کو تباہ کرنے کے لئے طوفان نوح برپا کیا تھا۔ چنانچہ اکبر اعظم نے ہاتھیوں کی شکارگاہ کے لئے اگر ریاست بھوپال کو انتخاب کیا تھا تو شاہجہاں نے مہاراجہ جھجار سنگھ اور بکرماجیت جیسے شاہان والاتبار کی جائے پناہ بھوپال میں گھس کر ان کو یہاں کے جنگلوں میں قتل کیا اور اُن کے چاہ دوز خزانوں کو برآمد کرکے کروڑوں روپیہ دہلی روانہ کیا تھا اور بعد ازاں قلعہ گھونہ کو فتح کرکے رہی سہی صحرائی اقوام کے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا۔

اسی مقام کا آرائشی سامان تعمیر زیر زمین سے فقط صنعت انسانی دماغ سے فراموش کردہ شاہجہانی کے صرف میں بالکل اسی طرح آیا جس طرح کسی ویرانے کا چراغ سحری آخری بار بجھنے کے پہلے اپنی لو دے جائے۔ چنانچہ روضۂ تاج محل میں آج تک بھوپال کا قیمتی پتھر ریاست بھوپال کی اُس کھدائی کی یادگار ہے جس کو بہت دن تک کام ہونے کی وجہ سے کان شاہیہ کے نام سے شہرت حاصل ہے۔

مگر اس کے بعد سنگی صنعت کا ریاست بھوپال میں چراغ گُل ہوگیا اور یہاں بندیلکھنڈ کی مفرور اقوام اور راجپوتانہ کی مرہٹہ گردی سے ستم رسیدہ مخلوق نے آکر لق و دق جنگل کے برگ و بار میں آکر ایسی پناہ لی کہ آج تک آباد ہیں۔ ان غریبوں کو آج تک اپنی زراعتی ترقیوں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملی کہ زراعتی سطح کے نیچے زراعتی پیداوار سے زیادہ قیمتی وسائل پوشیدہ کو برآمد کرتے۔

دور جدید کی بہترین تعمیر کا بیش بہا نمونہ جو برطانیہ کے جواہر ریز دماغوں نے نئی دہلی کی عالی شان عمارات بنا کر پیش کیا ہے۔ رائے بہادر دھرم سنگھ صاحب مرحوم کے فراہم کردہ مواد سنگی کا رہین منت ہے جس کو مرحوم کے انتقال سے چند روز قبل مجھے مرحوم کے صاحبزادے نے اپنے اُکھڑتے ہوئے کارخانہ میں ملاحظہ کرایا تھا۔ یہاں بارہ کھمبے ہیں میں نے وہ تمام اقسام کے پتھر بنی ہوئی حالت اور قدرتی حالت میں بھی معائنہ کئے تھے جو اس قابل قدر ہستی نے بڑی کھوج اور وسیع جستجو کے بعد ہندوستان کے طول و عرض سے لا لاکر جمع کئے تھے۔ لیکن جب بھوپال کے پتھروں کے چند نمونے میں نے یہاں کے کاریگروں اور انجینروں کو ملاحظہ کرائے تو سب کے سب دست تاسف ملتے تھے کہ نئی دہلی کی تعمیر کے وقت ایسے حسین اور قیمتی پتھر پیش نظر نہ ہوئے ورنہ اس شاندار تعمیر کا نقشہ ہی بدل گیا ہوتا۔ اور ریاست بھوپال اپنے قدرتی ذرائع کی فراوانی کا صلہ کئی کروڑ روپیہ کی آمدنی سے حاصل کر لیتی۔

یہاں نئی دہلی میں سنگ سرخ اور سنگ سفید کے حسن اتصال سے جو دلفریبیاں پیدا کی گئی ہیں اُن سے کئی گُنا زیادہ نظر فریب حُسن صنعت بھوپال کے سادہ پتھر اس لئے پیدا کرسکتے ہیں کہ دہلی میں فقط دو رنگ سفید اور سُرخ استعمال کئے گئے ہیں لیکن ریاست بھوپال میں قوس قزح کے ساتوں رنگ کے پتھر پیدا ہوتے ہیں جن کے میل سے انسانی دماغ کہیں بہتر صناعیاں اختراع کرسکتا ہے۔

سادہ اقسام سنگ تعمیر | ریاست بھوپال میں مندرجہ ذیل اقسام کے سنگ تعمیر بہتات سے پائے جاتے

ہیں، مگر یہ وہ اقسام ہیں جو اہم ہیں اور غیر اہم (مگر کم مفید اور کم خوشنما نہیں) اقسام کے پتھر دوسرے بہتیرے ہیں جن کو بخوفِ طوالت نظرانداز کیا جاتا ہے۔

(۱) سفید پتھر
(۲) سرخ پتھر
(۳) زرد پتھر
(۴) بنفشئی پتھر
(۵) سبز پتھر
(۶) نیلا پتھر
(۷) نارنجی پتھر
(۸) سفیدی و سبزی آمیز پتھر
(۹) سفیدی و سُرخی آمیز پتھر
(۱۰) کاسنی و سفیدی آمیز پتھر
(۱۱) سیاہ و سفید آمیز پتھر
(۱۲) سرخی و سبزی آمیز پتھر
(۱۳) سیاہ پتھر
(۱۴) جامنی پتھر
(۱۵) سرخ و سفید چھینٹ نرم جو کھدائی کے کام میں آتا ہے

ایسے پتھر بہت ہیں جن میں لہرئیے بنے ہوئے ہیں یا جن میں مختلف قسم کے ابرے ہیں اور ایسے بھی پتھر وہاں ملتے ہیں جن پر درخت اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں جن کو شجری پتھر کہتے ہیں اور ایسے پتھر بھی ہیں جو سنگ طباعت کے کام میں آسکتے ہیں یا جن سے قلعی اور چونہ بن سکتا ہے یا جن سے مختلف قسم کی ریت تیار ہوسکتی ہے، یا جو سیمنٹ میں ملائے جاکر مختلف قسم کی نرمی اور سختی پیدا کرسکتے ہیں، یا جن سے خود سیمنٹ بنائی جاسکتی ہے۔ یا جن سے جلد سخت ہونے والی سیمنٹ بنائی جاسکتی ہے یا جن سے رنگ مال تیار کئے جاسکتے ہیں یا جن سے شیشہ سازی کا کارخانہ جاری کیا جاسکتا ہے۔

آرایشی سنگ مرمر یوں تو آرایش کے لایق بہتیرے پتھر ریاست بھوپال میں دستیاب ہوتے ہیں اور ان کا تذکرہ یہاں بخوفِ طوالت نظرانداز کیا جاتا ہے۔ لیکن عام اور دل پسند اقسام جو اپنے آب و رنگ کے اعتبار سے سنگ مرمر کے بازار میں عمدہ قیمت لاسکتے ہیں اور بہت اہم ہیں مندرجہ ذیل اقسام کے یہاں پائے جاتے ہیں:۔

(۱) سفید شفاف سنگ مرمر
(۲) سفید سنگ مرمر
(۳) سفید سیاہ ابرے دار سنگ مرمر
(۴) سفید موتیا سنگ مرمر
(۵) سفید خاکی سنگ مرمر
(۶) سبز سنگ مرمر
(۷) گہرا سبز سنگ مرمر
(۸) سبز سرخ ابرے دار سنگ مرمر

(۹) سبز زرد ابرے دار سنگ مرمر
(۱۰) سبز کاہی سنگ مرمر
(۱۱) سبز سیبی سنگ مرمر چاندی کی جھلک والا
(۱۲) انگوری سنگ مرمر
(۱۳) سرخ سنگ مرمر
(۱۴) گلابی سنگ مرمر
(۱۵) نارنجی سنگ مرمر
(۱۶) نارنجی سنگ مرمر چاندی کی جھلک والا
(۱۷) زرد سنگ مرمر
(۱۸) زرد سنگ مرمر سیاہ ابرے والا
(۱۹) نیلا سنگ مرمر
(۲۰) آبی سنگ مرمر
(۲۱) آبی سنگ مرمر گول ابرے والا۔
(۲۲) آبی سنگ مرمر شجری
(۲۳) سیاہ سنگ مرمر
(۲۴) کتھئی سنگ مرمر
(۲۵) خاکی سنگ مرمر شفاف لکیر والا
(۲۶) پچرنگا سنگ مرمر
(۲۷) سرخ سفید ابرے والا سنگ مرمر
(۲۸) لحمی رنگ سنگ مرمر
(۲۹) سرخ و سپید
(۳۰) لیشبی سنگ
(۳۱) سیاہ و سفید چھینٹے دار

ان اقسام میں سب نہایت عمدہ پالش لاتے ہیں اور بعض ان میں بہت سخت اور بعض نہایت نرم ہیں۔ ان کے ٹکڑے سیمنٹ کے ساتھ آمیز ہوکر مصنوعی سنگ سازی میں لوچ لگا سکتے ہیں، اور لکڑی کے فرنیچر میں ملاکر استعمال کرنے سے مختلف قسم کے آرایشی سامان بوپال کار آمد ہو سکتے ہیں۔

اس دور جدید میں جبکہ فن سنگ تراشی نہ صرف اپنی تیز دستیوں کا رہین منت رہا ہے بلکہ مشینوں کی ایجادوں سے اہرام مصر کی صناعیاں اور بابل کی کاریگریاں جو مدتوں میں پایۂ تکمیل کو پہونچی تھیں اب چند دنوں میں مکمل ہو جاتی ہیں، ان گنج قارون کے مساوی القیمت وسائل قدرتی سے اگر اب فائدہ نہ اٹھایا جائیگا تو کب اٹھایا جائیگا۔

اشعار

مری تردامنی پر پارسائی رشک کرتی ہے
گناہوں نے مرے چمکا دیا ہے بزم عصیاں کو

دل برباد کی حد سے قدم باہر نہ لے جانا
سکھاتی ہے یہ مایوسی مرے امیدوار ماں کو

جگادی خفتگان خاک کی سوئی ہوئی قسمت
مرے قدموں نے بخشی زندگی گور غریباں کو

ستارۂ تخریب

(مشہور بنگالی شاعر قاضی نذرالاسلام کی مشہور نظم کے دوسرے بند کا ترجمہ)

(از حضرت تسنیم خوجیانوالی)

[illegible] کی ریا، معبود کی ہشیاریاں توبہ ۔۔۔ فریب مذہب و ملت کی یہ چنگاریاں توبہ
[illegible] ہوں میں اس سارے نظام کارزما کو ۔۔۔ اُڑا دیتا ہوں ٹھوکر سے زمانِ بے سروپا کو
[illegible] سے میں اس نظمِ جہاں پر مسکراتا ہوں ۔۔۔ میں اس کہنہ زمین و آسماں پر مسکراتا ہوں
ہر اشارہ ہے غریبوں کیلئے آئیں ۔۔۔ نجیبوں کو ہے جس کا ہر تکلم دعوتِ آئیں
زمانہ یہ لہو سے بیکسوں کے جو نہاتا ہے ۔۔۔ یونہی جو خون سے مزدور کے ہولی مناتا ہے
میں دہنِ آز سرمایہ کا خاکِ خوں سے بھر دونگا ۔۔۔ برابر دہر میں ہر اک بلند و پست کر دونگا
مگر وہ اندھی طاقت جس کو تم مختار کہتے ہو ۔۔۔ محبت جانتے ہو محرمِ اسرار کہتے ہو
میں اس کے ذوقِ طفلانہ سے رکھتا ہوں شناسائی ۔۔۔ مجھے معلوم ہے اس کا نظامِ عالم آرائی
[illegible] بے حقیقت مشغلوں سے ڈر نہیں سکتا ۔۔۔ مرا سر کٹ نہیں سکتا مرا دل مر نہیں سکتا
بنائی جا سکتی [illegible] دیتا ہے دعوت انقلابوں کو ۔۔۔ میں تعبیرِ مجسم بخشتا ہوں اپنے خوابوں کو
دغا کی آندھیوں کے فتنے مجھ سے جاگ اُٹھتے ہیں ۔۔۔ زمیں کی گود سے خوابیدہ کالے ناگ اُٹھتے ہیں
بجھا دیتا ہے دوزخ کے چراغوں کو نفس میرا ۔۔۔ سکھا دیتا ہے جنت کے ایاغوں کو نفس میرا
میں نفرت سے قضا کے خونی منہ پر تھوک دیتا ہوں ۔۔۔ میں کشتی چاند کی طوفان پہ بادل کے کھیتا ہوں
میں ہر اک بدلہ نا انصافیوں کا اب چکاؤں گا ۔۔۔ میں فطرت کو بلاؤں گا مقابل پر بلاؤں گا
میں ایک ہی پھونک سے خورشید کی مشعل بجھا دونگا ۔۔۔ میں ایک ہی شعلے سے سارے سمندر کو سُکھا دونگا
میں اپنے صورِ اسرافیل کو جس دم بجاتا ہوں ۔۔۔ صدائے واپسیں اس کی ہر اک نالے میں پاتا ہوں
بہم لڑتے ہیں لشکر اور طبلِ جنگ بجتے ہیں ۔۔۔ شرابِ خوں برستی ہے تو عود و چنگ بجتے ہیں
سلا دیتا ہوں گہری نیند میں ان بجلیوں کو ۔۔۔ ستارے رشک سے تکتے تھے جن کی سیمیں راہوں کو
شرابِ خلد اور [illegible] ۔۔۔ [illegible] دعوت [illegible]

تباہی کا ستارہ ہوں میں اِک سوزِ قیامت ہوں
میں قاصد اہرمن کا ہوں پیامِ موت و آفت ہوں
مجھے افلاک پر قدسی نقیبِ حشر کہتے ہیں
میں ہر اک دور میں آتا ہوں پیغامِ قضا لیکر

میری بزمِ خلوت میں بھی آ

(از حضرت شایق وارثی)

ایکہ تیرے سامنے شرمندہ گلشن کی بہار
اے سراپا حسن و خوبی اے نگارِ رنگ و بو
اے کہ تیرے عشق میں بلبل کا دل ہے بے قرار
اے کہ ہر اہلِ گلستاں کو ہے تیری آرزو

اے چمن آرائے فطرت شاہدِ رنگیں ادا
تیری رعنائی سے ہیں نسرین و لالہ فیضیاب
اے کہ شمس ضوفشاں آئینہ تیرے حسن کا
کر رہا ہے اکتسابِ نور تجھ سے ماہتاب

اے کہ تو ہے باعثِ آرائشِ بزمِ جہاں
اے کہ رشکِ شمعِ روشن، اے کہ تصویرِ وفا
ذرّے ذرّے سے عیاں ہے تیرا حسنِ زر فشاں
اے مجسّم حسن! "میری بزمِ خلوت میں بھی آ"

آ کہ حسن و عشق میں ہو جائے باہم اختلاط
آ کہ دونوں ملکے گائیں نغمۂ عیش و نشاط

"اُردو۔ہندی۔ہندوستانی"

از "حق پرست"

زمانہ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۳۲ء میں جناب منشی شیام موہن لال صاحب جگر بریلوی کا ایک نہایت قابلانہ اور پراز معلومات مضمون مقدمۂ مندرجۂ عنوان پر شائع ہوا ہے۔ چونکہ فاضل مضمون نگار نے اس مضمون کے متعلق اختلاف رائے کے اظہار کی دعوت دی ہے۔ لہٰذا یہ ناچیز بھی سطور ذیل میں اس فراخ حوصلگی سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ شاید میں یہ جسارت نہ کرتا مگر میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آچکا ہے کہ ہم حقائق کو دیکھیں اور صاف صاف دیکھیں خواہ وہ کتنے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں درحقیقت افراد کی زندگیوں کی طرح قوموں کی زندگی بھی محض خوش آیند واقعات کا تسلسل نہیں ہوتی۔ ناخوشگوار اور تکلیف دہ بلکہ مہیب اور خطرناک واقعات بھی درپیش ہوتے ہیں اور زندگی کی شرط یہ ہے کہ ان سے آنکھ نہ میچی جائے بلکہ تدبر اور سرگرمی سے اُن کے ازالہ کی کوشش کی جائے

اپنا زاویۂ نگاہ پیش کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مضمون نگار کے مضمون کے اُس جزو کا خلاصہ پہلے پیش کر دیا جائے جس کے متعلق اس ناچیز کو کچھ عرض کرنا ہے۔

اس جزو کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی داروگیر کے بعد جب مسلمانوں کا تسلط یہاں ہوگیا تو ہندو اور مسلمانوں کے تمدن و معاشرت میں قدرتی لین دین کی بنیاد پر ایسی تبدیلیاں واقع ہوئیں جو ایک واحد قومیت کی بنیاد ڈالنے والی تھیں۔ اس کی ایک خاص صورت اردو زبان کی پیدائش تھی جس کی تخلیق میں ہندو اور مسلمان دونوں کا حصہ تھا بلکہ ایک نقطۂ نظر سے ہندوؤں نے اس کی داغ بیل ڈالی، اس کو پروان چڑھایا اور ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلایا۔ ہندوؤں نے اچھے اچھے شاعر اور نثر نگار پیدا کئے اور جوش کے ساتھ ادبِ اُردو کی ترقی میں کوشاں رہے۔ اس طرح اس زبان پر ہندوؤں کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مسلمانوں کا۔ لیکن مسلمان بھائیوں نے اس معاملہ میں بے اعتنائی برتی۔ نہ ہندو شعرا اور مصنفوں کی کوئی حوصلہ افزائی کی اور اون کی کارگذاریوں کی داد دی بلکہ مصنفین اور شعرا کے تذکرے لکھے تو ہندوؤں کو صاف اُڑا دیا۔ اسی وجہ سے ہندو

اب اس سے منہ موڑ کر ہندی کی جانب متوجہ ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں چونکہ ایک واحد قومیت کی ضرورت ہے، جس کے اظہار خیال اور آپس کے بیوہار کے لئے ایک عام زبان کی ضرورت ہے اس لئے ہندو اور مسلمانوں کو اپنی اپنی جداگانہ کوششوں سے باز آنا چاہیے جن کے ذریعہ مسلمان اُردو میں فارسی عربی الفاظ کی بھرمار سے اس کو واقعی اپنے لئے مخصوص کر رہے ہیں، اور ہندو سنسکرت کے الفاظ کی بیجا و بیجا جھونکا جھونکی سے ایک ایسی چیز پیدا کر رہے ہیں جس کو مسلمان اپنا نہیں سکتے۔ لہذا مسلمان اپنی عربی فارسی کی بھرمار کو چھوڑیں اور ہندو اپنی اس ہندی کی کوشش سے باز آئیں اور اُردو پر اُن کا جو حق ہے اُس کو بخوبی جتائیں، اس طرح ایک واحد ہندوستانی زبان رائج ہو جائے گی۔"

ظاہر ہے کہ اس مضمون کی بنیاد ایک واحد قومیت کا مفروضہ ہے جس نے فاضل مضمون نگار کو یہ آس بندھائی ہے کہ اُردو ایک ایسی شکل اختیار کریگی جس کو 'ہندستانی' نام دیا جاسکے گا اور جو ہندو اور مسلمان دونوں ہی کے تمدن اور معاشرت، جذبات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ بن سکے گی۔

راقم الحروف بھی تہ دل سے چاہتا ہے کہ یہ خوش آیند خیال پورا ہو سکے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مفروضہ بنیادی حیثیت سے صحیح نہیں ہے اور بعض ٹھوس حقایق کو نظر انداز کرتا ہے۔

متحدہ قومیت اور مشترکہ زبان کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہمیں پہلے اسلام کے طبعی خصوصیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسلام نے صرف روحانیت سے کام نہیں رکھا بلکہ تمدن اور طرز معاشرت کو بھی مذہب میں داخل کیا۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ کھانے پینے۔ بول چال۔ خوراک۔ پوشاک سب ہی کے بارے میں خاص اور قطعی قواعد وضوابط مرتب کئے، جن کی بدولت مسلمان صرف اپنے عقائد وکیرکٹر ہی سے نہیں بلکہ ظاہری صورت اور شکل اور دوسرے تمدنی اسباب سے پہچانا جاتا ہے چنانچہ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے متمیز رکھنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ عملی زندگی میں یہ تمیز ہمیں بہت واضح نظر آتی ہے جو دوسرے مذاہب میں بڑی حد تک مفقود ہے۔ مزید وضاحت کے لئے عیسائیت کی مثال لیجئے۔ اگر عیسائی جرمن ہے تو جرمن ڈھنگ کا نام رکھ سکتا اور جرمن طرز معاشرت کا پابند رہ سکتا ہے، اسی طرح ایک ہندی عیسائی اپنا ہندی نام قایم رکھ سکتا اور مذہبی نقطۂ نظر سے اوامر و نواہی کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ اپنے سابقہ ڈھنگ ہی پر زندگی بسر کر سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عبادت کی خصوصیات اور مذہبی پابندیوں کے سوائے اُس کی بول چال، رہن

سہن، کسی بات میں بھی اپنے ہندوستانی پڑوسیوں سے مختلف نظر آنے کی ضرورت نہیں
اس کے برعکس اگر کوئی ہندو کل مسلمان ہوجائے تو قبول اسلام کے ساتھ ہی نہ صرف اُس کا نام اُس کا رنگ ڈھنگ۔ رہن سہن۔ بول چال بدل جاتے ہیں بلکہ اس کی ذہنیت میں بھی اس درجہ فرق آجاتا ہے کہ اس کو اپنے ہندو آبا و اجداد کو تسلیم کرنے میں بھی عار ہوتا ہے۔ اور وہ اس تہذیب و تمدن کو جو اس ملک میں اُس کے بزرگوں کی یادگار رہے غیریت اور بیگانگی بلکہ معاندانہ نظروں سے دیکھنے لگتا ہے۔ جبتک وہ نومسلم ہے یعنی جب تک لوگ اُسے نومسلم سمجھتے ہیں اُس کو طوعاً و کرہاً اپنے قدما کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ مگر ان پر وہ کسی حالت میں فخر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ مثلاً مسلم راجپوت جن کی خاصی تعداد ہے اپنے راجپوت آبا و اجداد کی اُن جانبازیوں پر فخر کرنے اور اُن کی یاد قائم رکھنے کے بجائے۔ جن میں ایسے سیکڑوں نام لئے جا سکتے ہیں جو ایثار قربانی اور جانبازی میں مسلم شہیدوں سے کسی طرح کم نہیں، وہ صرف مسلم شہدا کے مرثیئے پڑھتے اور انھیں کا سوگ مناتے ہیں۔ اُن کے جذبات کو اس خیال سے ٹھیس نہیں لگتی کہ مسلمان فاتحوں نے اُن کے آباو اجداد کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا غرض ایک نو مسلم بالکل ایک دوسری دنیا میں آجاتا ہے۔ جس میں قدیم رشتے ناتے اس ڈھنگ سے مٹ جاتے ہیں کہ وہ ان واقعات کو اسلامی زاویہ نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں آج زیادہ نہیں تو کم سے کم نوّے فیصدی ضرور وہ لوگ ہیں جن کی رگوں میں ہندو خون دوڑ رہا ہے لیکن ان سب کے جذبات اس ملک کے غیر مسلم باشندوں اور اس ملک کی تہذیب و تمدن وغیرہ کے متعلق ایسے ہی مخالف ہیں جیسے ابتدائی مسلمان فاتحوں کے تھے۔ یہ اپنے آپ کو ہندو مفتوحوں کی اولاد نہیں بلکہ مسلمان فاتحوں کے وارث سمجھتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے وہ آج پولیٹیکل میدان میں بھی اپنی جداگانہ اور ممتاز حیثیت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

غرض اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے حلقہ بگوشوں پر ایسا جادو ڈالتا ہے کہ وہ اپنے ماضی کو یک قلم بھول جاتے اور اپنی ملکی اور قومی تہذیب اور تمدن کی خصوصیات کو فنا کر دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں یہ ممکن نہ تھا کہ زبان کے معاملہ میں بھی وہ اپنی ہستی علیحدہ قائم نہ کرتے
[illegible]

ان کی اپنی خاص اور عالی شان تہذیب تھی۔ ایسے ممالک کی زبان کو یکسر مٹا دینا دائرۂ امکان سے باہر تھا۔ لیکن اسلام کے لئے یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ زبان کے معاملہ میں اپنی علحدہ متمیز ہستی نہ قائم کرتا۔ چنانچہ اُس نے فارس کی فارسی کو اور ہند کی ہندی کو ایسی صورت دی جو بالکل مسلمانی تھی۔ مولینا شبلی مرحوم اپنے "شعرالعجم" کے صفحہ (۱۷) پر فارسی شاعری کی ابتدا پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت عمرؓ کے بعد سے حجاج بن یوسف کے زمانہ تک تمام دفاتر فارسی زبان میں تھے۔ حجاج کے زمانہ سے عربی ہوگئے لیکن ملک کی اصلی زبان وہی رہی۔ رفتہ رفتہ فارسی۔ عربی مخلوط ہوکر اُردو کی طرح ایک جدید زبان پیدا ہوگئی اور وہ گویا خاص اسلامی زبان تھی۔"

مَیں نے اوپر کے اقتباس میں قابل توجہ الفاظ کو جلی کر دیا ہے۔ آج منشی شیام موہن لال صاحب جگر اور اُن کے ہم خیال بزرگ اگر اُردو کے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ ہندوؤں نے اس کی داغ بیل ڈالی، اس کو پروان چڑھایا اور ملک کے اطراف وجوانب میں پھیلایا تو میں اس کو محض خوش اعتقادی خیال کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ فاتح قوم کی اقبال مندی ایسی ہوتی ہے کہ اُسکی ہر ادا پیاری لگتی ہے اور مفتوح خواہ مخواہ اس کا اتباع کرنے لگتے ہیں، خصوصاً وہ طبقہ جو فتح کے بعد اس کے انتظام وتسلط میں فاتحوں کا ساتھ دیتا ہے۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد یہ خدمات زیادہ تر کایستھوں نے انجام دیں اور اُنھوں نے مسلمانوں کی پیروی میں وہ جوش و خروش دکھلایا کہ آج تک یہ آدھے مسلمان کہلاتے ہیں۔ کھان۔ پان بول چال نشست و برخاست سب ہی میں انھوں نے فاتحوں کے رنگ اختیار کئے پڑھے لکھوں میں انھیں میں سے زیادہ تر مسلمان ہوئے دراصل یہ تو قوم کی قوم کبھی کی مسلمان ہو چکی ہوتی لیکن ہماری ماتائیں اور دھرم پتنیاں ہی واقعی ہماری دھرم پتنی (دھرم کی قائم رکھنے والی) ثابت ہوئیں۔

حاصل کلام یہ کہ اُردو کی داغ بیل ڈالنے والے ہم نہیں مسلمان ہی تھے۔ ہم صرف اُن کے مزدوروں کا کام کرتے رہے۔ اور اگر ہم نے ان کی کچھ نقالی کی تو اس کی وہی قدر ہوئی جو نقالی کی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ لالہ بھائیوں کی اُردو کے لطیفے مشہور ہیں کہ یہ کس طرح چھپکلی کو "خاموش غنچی" بکرے کو پور بیا لہجہ میں "بوز نوا" وغیرہ وغیرہ مسخر خیز اصطلاحات استعمال کرتے رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوؤں میں بعض صاحب کمال ہوئے ہیں (جیسے آج انگریزی میں بھی ہیں) اور علم کے ہر شعبہ میں وہ وہ چیزیں لکھی ہیں کہ ایک دنیا نے اُن کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن کیا اس سے یہ استدلال ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری زبان ہے۔

اب پیشتر اس کے کہ اس امر پر کچھ عرض کیا جائے کہ آیا واقعی اہل ہنود عام طور پر اُردو میں ویسی سلاست اور ویسا ہی کمال حاصل کرسکتے ہیں جیسا کہ مسلمان بھائی۔ میں اسلام کی دوسری خصوصیت کا ذکر کرونگا جس کا اس مضمون سے گہرا تعلق ہے۔ یہ خصوصیت ہے "تبلیغ" جو ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس کے لئے یہ بات بھی ضروری تھی کہ اپنی متمیز علحدہ ہستی قائم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ یہاں ایک زبان بھی ایسی پیدا کی جائے جس میں اسلامی جذبات اور خیالات، تہذیب و تمدن کے اظہار کی صلاحیت ہو۔ کیونکہ عربی یا فارسی جیسی اجنبی زبانوں سے یہاں عوام میں کام چلنا مشکل تھا۔ لہذا گو دفتری زبان فارسی رہی لیکن عوام کے ساتھ بیوہار کے لئے خواہ مخواہ وہی زبان رہی جو ملک میں رائج تھی۔ چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ ابتدائی دور میں مسلمان اساتذہ جب فارسی سے فرصت پاتے تو ہندی میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ رحیم خاں خانخاناں وغیرہ چوٹی کے ہندی شعرا میں ہوئے ہیں۔ ہندی میں مختلف حصص کی مختلف بولیاں (Dialects) تھیں۔ اودھی۔ پوربی برج بھاشا وغیرہ۔ لیکن شاعری کے لئے برج بھاشا عام ہوچکی تھی۔ اور یہ مہاراشٹر اور تلنگانہ تک میں پہونچ چکی تھی۔ چنانچہ سنگیت ودیا (علم موسیقی) کے طالب علم کو سُروں کی مشق کے بعد پہلا گانا جس کی مشق کرائی جاتی تھی برج بھاشا ہی کا ہوتا تھا۔ مسلمان شعرا نے بھی پہلے دور میں جو کچھ کہا برج بھاشا ہی میں کہا۔ لیکن اسلام نے یہ محسوس کیا کہ اس زبان میں اسلامی تہذیب و تمدن، جذبات و خیالات کے حمل کی صلاحیت نہیں جس کی وجہ سے مسلمان شاعروں نے بھی جو کچھ لکھا اُس میں اُنھیں مجبوراً یہیں کے تشبیہات اور استعارات سے کام لینا پڑا۔ ایسی زبان سے تبلیغ میں مدد نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مذہبی تعلیم و تدریس کے لئے عربی اور فارسی کتابوں کا مطالعہ ضروری تھا۔ اس مطالعہ اور درس و تدریس کا قدرتی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی مستعملہ ملکی زبان میں رفتہ رفتہ عربی اور فارسی کے الفاظ آتے گئے اور ان میں خود بخود اضافہ ہوتا گیا۔ اہل ہنود کے اس طبقہ میں جسے مسلمانوں سے واسطہ پڑتا تھا ان نئے الفاظ کے سمجھنے کی خود بخود صلاحیت آتی گئی۔

اس دورِ تبدل و تغیر نے ایک بات اور پیدا کی جو نہایت معرکہ کی تھی۔ اہل ہنود کی بولیاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے علحدہ علحدہ ہونے کے اسباب یہ تھے کہ ہندوؤں میں نقل و حرکت کا مادہ نفی کے برابر ہوگیا تھا اور اُن کی طبیعتوں میں اولوالعزمی و مہم آزمائی کا مادہ جو نئے خیالات

---

[1] شاید اسی وجہ سے نظیر اکبرآبادی جیسے قادر الکلام شاعر کو رفتہ رفتہ قعر گمنامی میں ڈالدیا گیا کیونکہ انکی شاعری میں ہندو دھرم کی بیحد تعریف و توصیف ہے۔ [2] (Direct Method) [3] Dialects.

اور نئے پوز بات سے پیدا ہوتا ہے اب مفقود ہوگیا تھا۔ لوگ اپنی اپنی چار دیواری میں سڑتے رہتے تھے چنانچہ جب مسلمان فاتح یہاں آئے تو ہندوؤں میں اس درجہ جمود پیدا ہوچکا تھا کہ فاتحوں کے سر پر پہونچنے تک اُن کی آمد کی اُنھیں خبر نہ ہوتی تھی۔ شاید دیگر اسباب کے علاوہ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کی بول چال علحدہ علحدہ تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے جذبہ تبلیغ نے اُنھیں ہندوستان کے کونے کونے تک پہونچا دیا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت اُن کے لئے ایک معمولی بلکہ قدرتی بات تھی۔ اُن کی اس نقل و حرکت نے ہندی زبان کو بھی ایک ہموار و یکساں (Uniform) شکل دیدی۔ "میں کھاوت ہوں"۔ "میں کھاؤں ہوں" "میں کھاؤں چھوں" وغیرہ وغیرہ نے اب صرف ایک صورت اختیار کرلی "میں کھاتا ہوں"۔ اِس طرح ہندی میں کھڑی بولی کی تخلیق ہوئی جس کے لئے ہندو مسلم (Genius) مرہون منت ہے۔ چنانچہ اس کھڑی بولی کے پہلے لکھنے والوں میں ملک محمد جائسی جیسے مسلمان حضرات ہی ہوئے ہیں

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس زبان میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی بھرمار ہونے لگی اور یہی وہ ہندی ہے جس نے بالفاظ مولانا شبلی مرحوم مسلمانی شکل اختیار کی اور اُردو کہلائی۔

بہرحال ڈاکٹر گریہم بیلے۔ ڈاکٹر عبد اللطیف۔ مولانا عبد السلام ندوی وغیرہ جن کے حوالے مضمون زیر بحث میں شکایتاً دیئے گئے ہیں اور جو اُردو کو خالصۃً مسلم سرمایہ بتاتے ہیں بالکل صحیح ہیں۔ اس متواتر اعادہ کے باوجود کہ اُردو زبان دراصل مسلمانوں کی پیدا کی ہوئی ایک اسلامی زبان ہے۔

ایک طرف ہندوؤں کا وہ طبقہ ہے جو حقایق سے آنکھ میچ کر اُردو سے خواہ مخواہ چپٹا جاتا ہے اور دوسری طرف وہ مسلمان لیڈر اور مسلم صحیفے ہیں جو ایڑی چوٹی کا زور اس کوشش میں صرف کر رہے ہیں کہ ہندو کسی طرح یہ تصور کرلیں کہ اُردو ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔

اب غور طلب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ جو زبان مذہبی ضروریات سے پیدا ہوئی ہو اُس کے لئے یہ قدرتی امر ہے کہ مذہبی تاثرات سے وابستہ رہے۔ آج انگریزی زبان کو لیجئے، چونکہ وہ مذہب کی نہیں بلکہ ایک خاص تہذیب کے تاثرات کی حامل ہے لہذا انگریزی خواں عموماً اُسی تہذیب میں رنگ جاتے اور وہی طور و طریق اختیار کرتے ہیں۔ میں نے اوپر کسی قدر صراحت کے ساتھ یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح کایستھ لوگ اُردو فارسی کے اثر میں رفتہ رفتہ اپنے مذہبی تاثرات سے دُور ہوتے گئے اور بالآخر اُن میں سے بہت لوگ مسلمان ہوگئے اور

بعض دیگر برادریوں نے بھی کایستھوں کی پیروی کی مثلاً کاشمیری پنڈت (جن کے ممتاز نام لیوؤں میں علامہ سر اقبال گذرے ہیں) کھتری، اگروال۔ بھار گو وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اردو کی ترویج سب اسلامی اثر اور اقتدار کی تقویت اور مذہب اسلام کی تبلیغ ہوئی اور ہوگی۔ اس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ مسلمان لیڈر کیوں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ اردو کا رواج عام ہو جائے۔

اب رہا یہ امر کہ اہل ہنود کا ایک طبقہ کیوں اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ اسلامی حکومت کے دور میں ملازم پیشہ لوگوں کے لئے فارسی اور بعد میں اردو کا سیکھنا روزی کا ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ یوں بھی فاتحوں کی قوت و اقتدار ایک بے پناہ طرحداری رکھتی ہے اور جن طریقوں اور اداؤں کو تہذیب کہا جاتا ہے وہ انھیں صاحبان قوت و اقتدار کے طور و طریقے ہوتے ہیں۔ اس کا تتبع قدرتاً سب ہی کرنے لگتے ہیں۔ خصوصاً وہ جو ان کے قریب ہوتے ہیں، مثال کے لئے آج انگریزی طریقوں کے رواج کو دیکھ لیجئے۔ غرض اس زبان کا اختیار کرنا جہاں ایک طرف ملازمت وغیرہ کا دروازہ کھولتا تھا وہاں دوسری طرف تہذیب کا صداقت نامہ بھی تھا جس سے ہندو اور مسلمان ہچشموں میں تفخر و امتیاز حاصل ہوتا تھا۔

پہلے دور میں تو اس طبقہ کی اکتسابی سرگرمیاں ضرورت کے تحت تھیں اور زیادہ تر سوچی سمجھی ہوئی تھیں لیکن بعد کی نسلوں میں ماحول کے زیر اثر یہ ایک قدرتی عمل ہو گیا۔ اس پر غضب خود اس زبان کی طرحداری تھی۔ نسلاً بعد نسلاً ہم انھیں تاثرات کو قبول کرتے چلے آئے حتیٰ کہ اس طبقہ کے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت ہم اب بھی اس کے دامن کو پکڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں اردو کے ہندو مؤیدوں پر یہ الزام نہیں لگاتا کہ وہ قصداً قومی مفاد کے خلاف غداری کر رہے ہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہونگا کہ مسلم دبدبہ سے اگر وہ مرعوب نہیں تو متاثر ضرور ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہم میں سے وہ لوگ جن کا تعلق صوبۂ متحدہ اور پنجاب سے ہے اور جو نسلاً بعد نسلاً اردو فارسی کے تاثرات میں پرورش پاتے رہے ہیں اس زبان میں وہ خوبی اور کمال حاصل نہیں کر سکتے جو اس کے حقیقی مالکوں مسلمانوں کا حصہ ہے۔ مہاراشٹر۔ تلنگانہ۔ گجرات وغیرہ کے لوگوں کی بات تو دور رہی اس کی وجہ یہ ہے کہ گو ہم میں مذہبی احساس رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا تاہم کچھ نہ کچھ باقی ضرور رہا اور مذہبی رسم و رواج۔ تیج۔ تیوہار وغیرہ کی بدولت ہماری زبان اکثر سنسکرت کی

طرف جھک جاتی ہے۔ ہماری عورتوں کے مذہبی جذبات نے بھی گھروں کے اندرونی ماحول کو اُردو فارسی اور مسلمانی طور و طریق کے اثرات سے محفوظ رکھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زبان پر گھر میں کچھ اور تاثرات رہتے ہیں اور باہر کچھ اور۔ اس طرح تسلسل[1] و یکسانیت کے قائم نہ رہنے سے ہماری اُردو میں وہ سلاست و روانی اور وہ قدرتی رونق نہیں رہتی جو مسلمان حضرات کی زبان میں ہوتی ہے اس لئے کہ وہاں گھر اور باہر ایک ہی اثر کام کرتا رہتا ہے۔ کوئی غیر چیز خلل انداز نہیں ہوتی۔ مگر ہندوؤں کی زبان جب وہ اُردو لکھنے یا بولنے لگتے ہیں تو غیر متوازن اور بھدّی ہو جاتی ہے۔ حضرت نیاز فتحپوری اگر یہی بات صاف صاف اس طرح کہتے ہیں کہ "ہندوؤں کو لکھنا نہیں آتا" تو کیا بُرا کرتے ہیں! دراصل ہمیں اُن کا مشکور ہونا چاہیئے کہ جس حقیقت کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی اس کو اُنھوں نے ہمیں دکھانے کی کوشش کی۔ غیر چیز کی تحصیل قدرتاً غیر معمولی طور پر مشکل ہوتی ہے، اور عموماً دل و دماغ پر ایک ایسا بار ڈالتی ہے کہ انسان کی نشو و نما ہی بدل جاتی ہے اس لئے میں اس بارے میں حضرت نیاز فتحپوری سے بالکل متفق ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اُردو سے قطع نظر ہندی کی طرف پوری توجہ دیتے تو ہماری یہ دُرگت نہ ہوتی۔

اب سوال یہ ہے کہ ملک کے مفاد اور سود و بہبود میں ایک واحد قومیت کی مسلّمہ ضرورت کی تکمیل کیونکر ہو، کیا اس واحد قومیت کے لئے یہ ضرورت نہیں کہ ملک بھر میں ایک واحد زبان ایسی رائج ہو جو محض سرکاری اعلیٰ مجالس قانون سازی وغیرہ میں دُھواں دھار تقریروں کا ذریعہ نہ ہو بلکہ عوام کی بیوپاری ضروریات پوری کر سکے۔

یہاں بعض ایسے متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کی مثالیں دی جاسکتی ہیں جہاں مختلف زبانیں رائج ہونے کے باوجود سیاسی نقطۂ نظر سے ایک ہی متحدہ محاذ قائم ہے۔ لیکن میں اُن دُور کی باتوں کا تذکرہ کرنے کے بجائے پاس ہی کی ایک ایسی مثال دونگا جس کو ہم سب بخوبی سمجھ سکیں گے۔ وہ مثال اسلامی دنیا کی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان عربی نہیں، لیکن عراق و عرب و فلسطین کے مسلمانوں کے متعلق جہاں کی زبان عربی ہے ہر مسلمان کو گہری دلچسپی اور ہمدردی ہے۔ زبان کے ایک نہ ہونے کے اور کسی لنگوا فرنکا کے نہ ہونے کے باوجود وہ ایک قسم کی ایسی یگانگت محسوس کرتے ہیں جو بعض اوقات اُن کے خواب و خور کو بھی حرام کر دیتی ہے اور اُنھیں ہر قسم کی قربانی پر آمادہ کرتی ہے۔ ہندوستان ہی میں لے لیجئے

[1] Uniformity

بنگالی مسلمانوں کی زبان بنگالی ہے لیکن اس کے باوجود اُن کا اسلامی جذبہ کسی سے کم نہیں۔ خود مسٹر محمد علی جناح کی مادری زبان اُردو نہیں گجراتی ہے لیکن آج اُن کا جذبۂ اسلامی جس جوش پر ہے ظاہر ہے۔ دوسری جانب انگریزی زبان کو لے لیجئے کہ وہ انگلینڈ آسٹریلیا اور امریکہ جیسے مختلف ملکوں کی واحد زبان ہے۔ اس کے باوجود قومی اختلافات کو یہ مٹا نہ سکی اور اس واحد زبان کے باوجود انگلستان اور امریکہ میں ایک وقت ایسی جنگ چھڑی کہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے بالکل علیحدہ ہوگئے۔

ان مثالوں سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ قومی اتحاد کے لئے ایک واحد زبان کا ہونا ضروری نہیں ہے ایک زبان سے سہولت ضرور رہتی ہے لیکن یہ اتحاد و اتفاق کی ضامن نہیں ہو سکتی متحدہ قومیت یا مختلف فرقوں میں اتحاد و اتفاق کے لئے ایک زبان کی نہیں بلکہ اغراض و مقاصد کی یا یوں کہئے کہ نصب العین کے ایک ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک ہی زبان جاننے والے دو خود غرض آدمی متصادم اغراض و مقاصد رکھنے والے جھگڑا کریں گے۔ لیکن اگر دونوں اپنے اپنے ذاتی اغراض سے بالاتر اور وسیع نظر رکھنے والے ہوں تو ایک مشترک زبان نہ رکھنے پر بھی ان میں اتحاد عمل پیدا ہو جائیگا۔ مثال کے لئے فرض کیجئے کہ کسی محلہ میں آگ لگی ہے جہاں ہندو بھی رہتے ہیں مسلمان بھی اور عیسائی بھی جن کی زبانیں بھی مختلف ہیں لیکن اس وقت سب ہی کے دل میں صرف ایک خیال کام کریگا کہ اس بڑھتی ہوئی آگ سے اپنے محلہ کو کس طرح محفوظ رکھیں۔ چنانچہ اس خیال سے سب میں ایک دوسرے کی امداد کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اسی طرح پلیگ اور ہیضہ وغیرہ وباؤں میں ایک جگہ رہنے والے ہندو مسلمان اور عیسائی سبھی سچے دل سے چاہتے ہیں کہ کوئی شخص وباء میں مبتلا نہ ہو۔ ان مثالوں سے میرا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ اتحاد عمل کے لئے ایک واحد مقصد کی ضرورت ہے۔ یہ واحد مقصد ملک کی فلاح و بہبود کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ حب الوطنی وہ قدرتی جذبہ ہے جس کے ذریعہ ملک میں بسنے والے مختلف عناصر متحد اور متفق ہو سکتے ہیں۔ حب الوطنی انسان میں خود غرضیوں سے بالاتر اُٹھنے کا روحانی جذبہ پیدا کرتی ہے اور ایثار و قربانی کے ذریعہ روح کو صاف پاک کرتی اور برتر و بالا بنا دیتی ہے بلکہ ایک حیثیت سے مذہب کے مقاصد کی بھی تکمیل کرتی ہے کیونکہ وہ خودی اور تنگی کے قعر مذلت سے روح کو اُبھارتی ہے۔ اسی پاک جذبہ میں ہر ہندوستانی کے دل سے یہ نغمہ نکلنے لگتا ہے کہ "ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا" اور پیشتر اس کے کہ ہم ہندو اپنے ویدشاستروں

کے حوالہ سے یہ دعویٰ کرسکے کہ وشو (کائنات) میرا کٹمب (قبیلہ) ہے' اور مسلمان یہ کہ کے
کہ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" اُس کو اپنے آپ کو ایک اچھا شہری و محبِ وطن
ثابت کرنا ہوگا۔ جو ملک کی خاطر خود غرضی کے تنگ دائروں سے بالاتر ہوکر ایثار کرسکتا اور
قربانی دے سکتا ہے۔ ورنہ دنیا بھر کو اپنا وطن بتلانا محض ایک فریب ہے اور اپنے فوری فرائض
ملکی سے گریز کرنے اور خود غرضیوں میں مبتلا ہو جانے کا ایک بہانہ ہے۔

اس بظاہر بے تعلق بحث سے مجھے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ملک اور حب الوطنی کے نام پر
جو زبان کے لئے ایک نیا جھگڑا چھڑ گیا ہے، یہ بھی دراصل خود غرضیوں اور نادانیوں نے ایک
نیا روپ دھارا ہے۔ ہندی اور اُردو کا اپنا اپنا ایک مستقل اور ترقی کن لٹریچر ہے جو بجائے
خود نہایت خوبصورت ہے۔ اُردو مسلمانوں کے لئے رہیگی اور ہندی ہندوؤں کے لئے۔
ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی ایک نئی ہندوستانی زبان کے لئے مٹایا نہیں جا سکتا۔

رہی ایک لنگوا فرنکا کی بات، یہ دراصل پڑھے لکھے عوام سے کچھ بالاتر لوگوں کے لئے
ہوتی ہے۔ اگر یورپ میں فرنچ زبان لنگوا فرانکا تھی یا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ انگلینڈ کے
گلی کوچوں کے مزدور بھی فرنچ سمجھ سکیں۔ نہ یہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔ خیالات اور
جذبات میں ہم آہنگی پیدا کرنے والے ہر فرقہ یا حصۂ ملک کے تعلیم یافتہ چوٹی کے لوگ ہوتے
ہیں جو کسی خاص زبان کے ذریعہ دوسروں کے خیالات جذب کرتے اور اپنی مادری زبان کے
ذریعہ عام لوگوں میں پھیلاتے ہیں۔ اس وقت انگریزی زبان اس قسم کے لنگوا فرنکا کا کام بخوبی
انجام دے رہی ہے اور موجودہ حالات میں اور شاید آئندہ ایک عرصہ دراز تک اس سے بہتر
کوئی دلیسی زبان اس غرض کے لئے نہ مل سکے گی۔ درحقیقت انگریزی زبان اس وقت دنیا کی
لنگوا فرنکا بن رہی ہے۔ ہم اس کی ترقی میں مخل نہیں ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان بھر میں ایک ہندوستانی زبان خود بخود رائج ہو رہی ہے
اور یہی ایک روز لنگوا فرنکا بن جائیگی۔ تو میں عرض کرونگا کہ اُس کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہئیے
زبردستی کی ٹھوسا ٹھوسی سے کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے گا۔ قوم کی چھپی ہوئی Genius اپنی ضرورت
کو انجان طریقہ پر محسوس کرتی ہے اور اُس کی تکمیل کر لیتی ہے' جبر و زیادتی طبیعتوں میں ضد
پیدا کرتی ہے جس سے ایک عرصۂ دراز کے لئے قدرتی رَو رُک جاتی ہے۔

بہرحال موجودہ حالات میں انگریزی کے خلاف پروپاگنڈہ عقلمندی اور دُور بینی سے

بعید ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو اپنی اپنی جگہ ہندی اور اُردو کے فروغ دینے میں منہمک رہنا چاہیئے۔ اپنی زبان کو دوسروں پر لادنے کی کوشش فضول ہے۔ اس بارے میں رواداری ہی سے اچھے جذبات پیدا ہونگے اور ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں گے۔

جذباتِ منوّر

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

ستم دیکھتے ہیں کرم دیکھتے ہیں
ہر انداز میں تجھ کو ہم دیکھتے ہیں

خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں
ان آنکھوں سے کچھ اور ہم دیکھتے ہیں

وہی دیر میں دیر والوں نے دیکھا
حرم میں جو اہلِ حرم دیکھتے ہیں

کریں گے کسی روز تنقید اس پر
ابھی رنگ دنیا کا ہم دیکھتے ہیں

وہیں آشیانہ بناتے ہیں اپنا
جہاں چار تنکے بہم دیکھتے ہیں

لگا دے کوئی آگ دل میں لگا دے
ہم اس ساز میں سوز کم دیکھتے ہیں

ارے ربطِ سنگ و شرر کے مفسر
تری راہ دیر و حرم دیکھتے ہیں

نظر کچھ نہ رکھتے ہیں سود و زیاں پر
نہ اب جانب بیش و کم دیکھتے ہیں

ہمیں بند آنکھوں سے تم دیکھتے ہو
تمھیں بند آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں

حوادث کے دریا میں ہم تابِ ساحل
ہر اک موج کا پیچ و خم دیکھتے ہیں

کبھی ہے ستم در کرم کی نگاہ
کبھی ہم کرم در ستم دیکھتے ہیں

ہماری نگاہوں کو تم دیکھتے ہو
تمھاری نگاہوں کو ہم دیکھتے ہیں

جدا حسن اور عشق کی گو ہیں راہیں
انھیں پھر بھی ہم ہمقدم دیکھتے ہیں

نہ اُٹھے الٰہی زمیں سے نہ اُٹھے
وہ سر جس کو سجدے میں خم دیکھتے ہیں

نہیں آمد و شد یہ بیکار اپنی
کہ سیرِ وجود و عدم دیکھتے ہیں

سر آنکھوں سے تیرا فسانہ لگا کر
منور کا حسنِ رقم دیکھتے ہیں

رُودادِ چمن

(از ادیب مالیگانوی)

پسِ بہار، عجب رنگِ گلستاں دیکھا — چمن کو حسرت و عبرت کا اک نشاں دیکھا

کہاں نسیمِ سحر کی وہ نکہت افشانی — کہ جس کے دم سے معطّر مشامِ جاں دیکھا

گئی نگاہ جو پھولوں کی انجمن کی طرف — لرز گیا دلِ برباد، وہ سماں دیکھا

روش روش نہیں، تصویرِ پائمالی تھی — شجر شجر نہیں، آئینۂ خزاں دیکھا

ورق ورق پہ شگوفوں کے شرحِ غم تحریر — مآلِ حسن، کا ہر گل کو ترجماں دیکھا

سُنا رہا تھا، مجھے بیکسی کا افسانہ — زبانِ برگ کو ہر چند بے زباں دیکھا

وہ دل کشی تھی گلستاں کے ذرے ذرے میں — نثار جس پہ کبھی حسنِ کہکشاں دیکھا

جمالِ سبزۂ و شبنم، شبابِ سرو سمن — بہارِ رفتہ کا ہر اک کو نوحہ خواں دیکھا

اُبل رہے تھے جہاں رنگ و نور کے چشمے — غبارِ خاک کا سکّہ وہاں رواں دیکھا

جو گوشہ رشکِ فردوس ہو چکا ہے کبھی — جہاں چراغِ محبت کو ضو فشاں دیکھا

جہاں تھی گرم کبھی حسن و عشق کی محفل — اسی کو شاکیِ نیرنگِ آسماں دیکھا

چمن میں پھول برستے تھے جن کے نغموں سے — انھیں رہینِ شرر ریزیِ فغاں دیکھا

صدائے نغمۂ عشرت کبھی تھی جنت گوش — نوائے درد کو اب برقِ بے اماں دیکھا

فسردگی کا وہ عالم تھا، لالہ و گل پر — لبِ خموش پہ اک شورِ الاماں دیکھا

شکستِ طرب کا عمل اس قدر تھا دردآگیں — کہ جس سے چشمِ تماشا کو خوں فشاں دیکھا

اجاڑ ہو گئی، بزمِ نشاطِ اہلِ چمن — ہوائے تُند کے جھونکوں میں آشیاں دیکھا

ادیب یہ دلِ بے خانماں کا قصّہ ہے
خزاں کے رنگ میں مَیں نے جسے عیاں دیکھا

للّو کی واپسی

ڈاکٹر ربندر ناتھ ٹیگور کا ایک افسانہ

ترجمہ ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ

۱
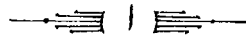
رائے چرن جب پہلے پہل نوکری کے لئے آیا تھا تو اس کی عمر بارہ برس کی تھی اس کا گھر ضلع جیسور میں تھا۔ لمبے لمبے بال بڑی بڑی آنکھیں، سانولا رنگ اور چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ ذات کا کایستھ۔ مالک بھی کایستھ ہی تھا جس کے ایک سال بھر کے بچے کو کھلانے کے لئے وہ رکھا گیا تھا۔

رفتہ رفتہ بچے نے رائے چرن کی گود چھوڑ کر اسکول اور اُس کے بعد کالج اور کالج کے بعد وکالت اور پھر منصفی کا درجہ حاصل کر لیا۔ مگر رائے چرن اب بھی اس کا نوکر بنا رہا۔

اب اس کا ایک مالک اور بڑھ گیا۔ یعنی مالکن بھی آ گئی۔ اس لئے انکول بابو پر رائے چرن کا جتنا حق پہلے تھا اُس کا بڑا حصّہ مالکن کے قبضہ میں آ گیا ہے۔

لیکن مالکن کی وجہ سے رائے چرن کے درجہ میں جو کمی آئی تھی اُسے انکول بابو نے اُس کے سر ایک نئی ذمہ داری ڈالکر پوری کر دی ہے۔ تھوڑا ہی عرصہ ہوا انکول بابو کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اور رائے چرن نے اُسے گرویدہ کر لیا۔

وہ بچے کو بڑی اُمنگ کے ساتھ جھلاتا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اُوپر کو اچھالتا ہے، اُس کے منہ کے پاس جا کر اس طرح سر ہلاتا ہے اور جواب کی پروا نہ کرتے ہوئے ایسے ایسے سوالات کرتا ہے کہ ننھا بچہ رائے چرن کو دیکھتے ہی خوشی کے مارے پھول جاتا ہے جب کبھی ننھا بچہ پیٹ اور گھٹنوں کے بل چلکر چوکھٹ پار کرتا ہے اور کوئی اُسے پکڑنے آتا ہے تو کھلکھلا کر ہنستا ہوا وہ جلدی سے کسی محفوظ مقام پر دبکنے کی کوشش کرتا ہے اور رائے چرن اس کی یہہ غیر معمولی ہوشیاری دیکھکر دنگ رہ جاتا ہے اور ماں کے پاس جا کر غرور اور تعجب کے ساتھ کہتا ہے بہو جی یہ لڑکا کسی دن جج ہوگا اور پانچہزار روپے تنخواہ پائے گا۔

دنیا میں کسی اور کے لڑکے بھی اس عمر میں چوکھٹ پار کر کے غیر معمولی عقل وفہم کا ثبوت دے سکتے ہیں یہ بات رائے چرن کے قیاس سے باہر تھی۔ ہاں جو بچے بڑے ہو کر جج ہونگے وہ ایسا ضرور کر سکتے ہیں اس کا

اُسے پورا یقین تھا۔

آخر کار جب بچے نے ڈگمگاتے ہوئے چلنا شروع کیا تو اسے اور بھی تعجب ہوا۔ اور جب ماں کو ممّا اور بُوا کو اُوا آ، اور رائے چرن کو چنّا کہہ کر بلانے لگا تب رائے چرن اس خوشخبری کو ہر جگہ سناتے پھرنے لگا۔

اس کے لئے سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ بچہ ماں سے ممّا اور بُوا سے اُوا آ کہتا ہے مگر اُس کو کہتا ہے چنّا۔ ننھے ننّھے بچے کو اتنی عقل کہاں سے آئی یہ بتلانا مشکل ہے۔ اس سے زیادہ عمر کا آدمی ایسی غیر معمولی فہم و فراست کا ثبوت نہ دے سکتا تھا۔ اس پر بھی اگر کوئی شخص اس کے جج ہونے میں شک و شبہ کرے تو اُسے بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

کچھ دنوں بعد رائے چرن کو منہ میں رسّی دبا کر گھوڑا بننا پڑا۔ پہلوان بنکر اسکو بچے کے ساتھ کشتی لڑنی پڑی اور کشتی میں ہر دفعہ ہارنا پڑا کیونکہ ہار کر زمین دوز نہ ہو جائے تو اس بیچارے کی شامت آجاتی تھی۔

اسی اثنا میں انکول بابو کا پدما ندی کے کنارے کسی ضلع میں تبادلہ ہو گیا۔ انکول کلکتہ سے اپنے بچّے کے لئے ایک چھوٹی سے گاڑی لے گئے۔ ساٹن کا کرتا اور سر پر زری دار ٹوپی ہاتھ میں سونے کے کڑے اور پیروں میں لچھے پہنا کر رائے چرن چھوٹے بچے کو دونوں وقت گاڑی پر بٹھا کر سیر کو لیجاتا تھا۔

برسات کا موسم آیا۔ بھوکی پدما۔ باغ۔ کھیتوں۔ گاؤں سب کو نگلنے لگی۔ ریت کے پیڑ پودے سب پانی میں آگئے۔ ندی کے کناروں کے ٹوٹنے کی آواز سے ساری فضا گونج اٹھی۔ تیز دوڑنے والے بلبلے سیلاب کے زوروں پر ہونے کی خبر دیتے تھے۔

ایک روز تیسرے پہر بادل امنڈ رہے تھے لیکن بارش کے بظاہر آثار نہ تھے۔ رائے چرن کا ننھا مالک کسی طرح بھی گھر میں رہنا نہ چاہتا تھا۔ گاڑی میں سوار ہو کر ضد کرنے لگا۔ رائے چرن آہستہ آہستہ گاڑی ڈھکیلتا ہوا کھیتوں کے پاس جا پہونچا۔ اس وقت ندی میں ایک بھی ناؤ نہ تھی اور کھیتوں میں بھی کوئی آدمی نہ تھا۔۔۔ بادلوں کے درمیان سے صرف یہ دکھائی دیتا تھا کہ دریا کے اُس کنارے شام کے سکوت میں سورج ڈوبنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس سکوت کو توڑتے ہوئے یکایک لڑکا ایک طرف اُنگلی دکھا کر چلّا اٹھا۔۔۔ چنّو پھو!

پاس ہی کیچڑ سے لتھ پتھ زمین پر ایک بڑے کدم کے درخت کی اونچی شاخوں پر کچھ پھول کھلے ہوئے تھے اور لڑکا اسی طرف للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑے ہی دن ہوئے رائے چرن نے درخت کی ڈالیوں میں گوندھ گوندھ کر کدم کے پھولوں کی ایک گاڑی بنا دی تھی اس کو رسّی میں باندھ کر کھینچنے میں ننھے بچے کو اتنا مزہ ملا کہ رائے چرن کو اس دن منہ میں لگام نہ دینی پڑی گھوڑے سے وہ

یک عنت سائینس کے درجہ پر پہونچا دیا گیا۔
پہلے تو اس کا جی نہ چاہا کہ کیچڑ کو پار کرکے پھول لائے۔ اسلئے اُس نے دوسری جانب اُنگلی اُٹھا کر کہا "دیکھ دیکھ ـــ وہ دیکھ چڑیا ـــ دیکھ تو اُڑ گئی ـــ آہا۔ آری چڑیا۔ للّو کو لڈو دے جا"۔ اس طرح لگاتار انوکھی باتیں کرتا ہوا وہ تیزی سے گاڑی چلانے لگا۔

لیکن جو لڑکا بڑا ہو کر جج ہوگا اس کو اس طرح پُھسلانے کی اُمید رکھنا فضول ہے۔ خاص کر اُس وقت جبکہ چاروں طرف اور کوئی دوسری چیز جاذب توجہ نہ ہو۔ فرضی چڑیا کا بہانہ زیادہ دیر تک نہیں کام دے سکتا مجبور ہو کر رائے چرن نے کہا کہ تم گاڑی میں بیٹھے رہنا میں جھٹ سے پھول لئے آتا ہوں۔ مگر خبردار پانی کے کنارے نہ جانا" یہ کہہ کر وہ دھوتی چڑھاتا ہوا کدم کے درخت کیطرف چلا گیا۔

لیکن چونکہ وہ پانی کے کنارے جانے کو منع کر گیا تھا اس لئے بچّے کا دل کدم کے پھول سے ہٹ کر فوراً ہی پانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دیکھا کہ پانی کَل کَل چھَل چھَل کرکے دوڑا جا رہا ہے گویا کسی بہت بڑے رائے چرن کے ہاتھ سے نکل کر لکھوکھا ٭٭کے ہنستے ہوئے منع کی ہوئی سمت کی طرف تیزی سے بھاگے جا رہے ہیں۔

اس بُری شال کی موجودگی میں لڑکے کا دل ڈانوا ڈول ہو گیا۔ آہستہ سے گاڑی سے اُتر کر وہ پانی کے پاس پہونچا۔ ایک بڑے تنکے کو اٹھا کر اس سے مچھلی پکڑنے کی بنسی بنا پانی میں جھک کر اس سے مچھلی پکڑنے لگا۔ چنچل پانی کَل کَل کے پیارے لفظوں میں لڑکے کو اپنے کھیل میں شامل ہونیکی دعوت دینے لگا۔

یکایک پانی میں کسی چیز کے گرنے آواز ہوئی لیکن برسات میں پدما کے کنارے اس طرح کی کتنی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ رائے چرن نے جھولی بھر کر کدم کے پھول توڑے اور پھر درخت سے اُتر کر مسکراتا ہوا گاڑی کے پاس پہونچا۔ دیکھا تو وہاں کوئی نہیں! دوسرے ہی لمحہ میں رائے چرن کا بدن خوف کے مارے برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہو گیا۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک نظر آنے لگی اور اس کا دل بالکل ٹوٹ گیا اور وہ چلا اٹھا" للّو۔ للّو!"

لیکن "چنا" کہہ کر کسی نے جواب نہیں دیا۔ شرارت کی غرض سے کوئی لڑکا ہنس نہ اٹھا صرف پدما ہی پہلے کی طرح کَل کَل چھَل چھَل کرکے دوڑتی رہی۔ گویا وہ کچھ جانتی ہی نہ تھی جیسے اسے دنیا کی ذرا ذرا سی باتوں کی کچھ پرواہی نہ ہو۔

شام ہونے پر بیقرار ماں نے چاروں طرف آدمی دوڑائے۔ لالٹین ہاتھ میں لئے ہوئے لوگ

ندی کے کنارے پہونچے۔ وہاں دیکھا تو رائے چرن آندھی کی طرح چاروں طرف "للّو، للّو" چلاتا ہوا بھٹک رہا ہے۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ آخرکار گھر لوٹ کر رائے چرن ماں کے قدموں پر دھڑام سے گر پڑا۔ اُس سے بہت پوچھا گیا۔ وہ رو رو کر یہی کہتا رہا "نہیں جانتا ماں"!

اگرچہ بات تو سبھی لوگ جان گئے کہ یہ پدما ہی کا کام ہے مگر گاؤں کے باہر جو بنجارے ٹھیرے ہوئے تھے اُن پر بھی بعض لوگوں کا شبہ ہوا۔ ماں کے دل میں یہ وسواس پیدا ہوا کہ کہیں رائے چرن ہی نے لڑکے کو چُرا نہ لیا ہو۔ اُس کو بلا کر کہنے لگی "تو میرے للّو کو لوٹا دے۔ جتنے روپے مانگے گا میں دوں گی"۔ یہ سُن کر رائے چرن نے ماتھے پر ہاتھ دے مارا مالکن نے اُسے نکال دیا۔

انکول بابو نے بیوی کے دل سے اس بے بنیاد وہم کے دور کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے پوچھا "رائے چرن ایسا نیچ کام کس لئے کرتا"؟

بیوی نے کہا "کیوں کیا ہوا!۔ وہ سونے کے گہنے پہنے تھا"۔

۲

رائے چرن اپنے گھر چلا گیا۔ اب تک اس کے کوئی لڑکا نہ پیدا ہوا تھا۔ ہونے کی کوئی اُمید بھی نہ تھی۔ مگر خدا کی دین زیادہ عمر میں اسکی بیوی کے ایک لڑکا پیدا ہوا اور بچہ پیدا ہونیکے بعد ہی وہ دنیا سے کوچ کر گئی۔ اس بچے پر رائے چرن کو بڑا غصہ آیا۔ دشمن کی طرح دیکھنے لگا۔ اُسے خیال ہوا کہ یہ چالاکی سے للّو کی جگہ لینے آیا ہے پھر سوچنے لگا کہ مالک کے لڑکے کو پانی میں بہا کر اپنے بچے کے ساتھ پُرلطف زندگی گذارنے پر لعنت ہے۔ رائے چرن کی بیوہ بہن نہ ہوتی تو یہ بچہ دنیا میں زیادہ دنوں تک سانس نہ لے سکتا۔

تعجب کی بات تھی کہ اس لڑکے نے بھی کچھ دنوں بعد چوکھٹ پار کرنا شروع کر دیا۔ اور منع کی ہوئی باتوں کے کرنے میں ہی اسے مزا آتا تھا۔ اور تو کیا اس کی آواز، ہنسی رونا سب کچھ للّو سے ملتا ہے۔ رائے چرن جب کبھی اُس کا رونا سنتا تو اُس کی چھاتی دھڑک اُٹھتی۔ معلوم ہوتا کہ للّو ہی کہیں بھٹک بھٹک کر رو رہا ہے۔

پُھلنا۔ رائے چرن کی بہن نے اُس کا نام رکھا تھا۔ پُھلنا "بوا" کو "آوا" کہکر پکارنے لگا۔ اس کی آواز سُنکر ایک دن یکایک رائے چرن کو خیال ہوا کہ معلوم ہوتا ہے کہ للّو میری محبت کو بھول نہیں سکا۔ اور میرے ہی گھر آ کر پیدا ہوا ہے"۔

رائے چرن کے اس خیال کی تائید میں چند ایسے دلائل تھے جن کے لئے اسے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ للّو کے جانے کے بعد ہی بچے کا پیدا ہونا۔ دوسرے اس کی بیوی کے پیٹ سے

اتنے دنوں کے بعد لڑکا ہی پیدا ہونا۔ تیسرے یہ بچہ بھی گھٹنوں کے بل چلتا تھا اور ڈگمگاتا ہوا چلتا تھا۔ بُوا کو "آوا" کہتا تھا۔ غرض آئندہ جج ہونے کے لئے جن جن علامتوں کی ضرورت تھی وہ سب اس میں موجود تھیں۔
اسے بجا یک ماں جی کا بے بنیاد الزام بھی جس سے اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا تھا یاد آگیا۔ وہ دل ہی میں کہنے لگا۔ سچ ہے ماں نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا۔ کہ کسی نے اس کے بچے کو چُرا لیا ہے" اس کے بعد اتنے دنوں تک بچے کے ساتھ لاپروائی کرنے پر وہ بہت پچھتایا۔
اب بچے کو وہ خوب چاہنے لگا۔
اب پُھلنا کو وہ اس طرح پالنے لگا جیسے وہ کسی بڑے گھر کا بچہ ہو۔ ساٹن کا کوٹ خرید دیا زر کار ٹوپی خرید دی بیوی کے گہنے گلا کر کڑے اور کھڑوے بنوائے۔ محلہ کے کسی لڑکے کے ساتھ اس کو کھیلنے نہیں دیتا۔ رات دن خود ہی اس کا ساتھی بن کر کھیلتا رہتا ہے لوگ رائے چرن کے اس برتاؤ سے بڑا تعجب کرتے تھے۔
پُھلنا جب پڑھنے کے قابل ہوا تو رائے چرن اپنی موروثی زمین وغیرہ فروخت کرکے لڑکے کو کلکتہ لے گیا۔ اور بمشکل تمام ایک نوکری تلاش کرکے لڑکے کو اسکول میں بھرتی کرا دیا۔ خود جیسے تیسے گذر اوقات کرتا تھا مگر لڑکے کو اچھا کھانا عمدہ پوشاک اور اچھی تعلیم دینے میں کوئی کسر نہ کرتا۔ دل ہی دل میں کہتا "للو جی تم محبت کے مارے گھر آئے ہو اس لئے تمہاری بے عزتی مجھ سے نہ دیکھی جائے گی"
اسیطرح بارہ برس ختم ہوگئے۔ لڑکا پڑھنے لکھنے میں تیز ہے اور دیکھنے میں بھی اچھا موٹا تازہ سانولے رنگ کا ہے۔ بال پوشاک وغیرہ کی سجاوٹ بناؤ سنگار کی طرف زیادہ توجہ ہے مزاج کا شوقین ہے۔ باپ کو باپ کی طرح نہیں سمجھتا۔ وہ بھی محبت کرنے میں باپ مگر خدمت کرنے کے لئے اس کا نوکر تھا۔
ہاں ایک بات اور کہنا باقی رہ گئی۔ رائے چرن نے لڑکے سے یہ بات پوشیدہ رکھی تھی کہ" وہ پھلنا کا باپ ہے" جس ہوسٹل میں پُھلنا رہتا تھا وہاں کے سب لڑکے گنوار رائے چرن کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور اکثر پُھلنا بھی اس مذاق میں شامل ہوجاتا تھا۔ پھر بھی محبت کے بھوکے رائے چرن کا سبھی لڑکے بڑا ادب کرتے تھے اور پُھلنا بھی اسے دل سے پیار کرتا تھا لیکن اسمیں بہت کچھ دنیا داری کو بھی دخل تھا۔
رائے چرن اب ضعیف ہوتا جاتا ہے۔ اُس کا مالک اُس کے ہر ایک کام میں عیب نکالتا رہتا ہے۔ دراصل وہ کمزور ہوگیا ہے۔ باتوں کا اتنا خیال نہیں رہتا۔ بار بار بھول جاتا ہے۔ لیکن جو پوری تنخواہ دیتا ہے وہ ضعیفی کا عذر کب سُنے گا۔ اِدھر کھیت وغیرہ بیچ کر وہ جو روپئے لایا تھا وہ بھی ختم ہونے کے قریب تھے۔ پُھلنا بھی آجکل کپڑے لتے سے تنگ نظر آتا ہے۔

۳

ایک دن رائے چرن نے یک بیک کام سے چھٹی لے لی اور پھلنا کو کچھ روپئے دے کر کہا کہ میں ایک ضروری کام کے لئے کچھ دنوں کے واسطے گھر جا رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ باراسات پہونچا جہاں ان دنوں انکول بابو منصف تھے۔ اُس وقت تک ان کے کوئی دوسرا لڑکا نہ ہوا تھا اور بیوی اب تک اُس بچّے کی یاد میں آنسو بہایا کرتی تھی۔

ایک دن شام کے وقت بابو صاحب کچہری سے آکر آرام کر رہے تھے اور ان کی بیوی ایک سادھو سے اولاد کی خاطر منت سماجت کر رہی تھیں۔ اتنے میں آنگن سے آواز آئی "جے ہو ماں جی کی۔"

بابو صاحب بولے "کون ہے ؟"

رائے چرن نے آکر نمسکار کیا اور کہا "میں ہوں رائے چرن۔"

بوڑھے کو دیکھکر انکول کا دل پگھل گیا۔ انھوں نے اس کی موجودہ حالت کے بارے میں ہزاروں سوالات کئے اور دوبارہ کام پر بحال کرنے کو کہا۔

رائے چرن نے خشک ہنسی ہنسکر کہا "ماں جی کو پرنام کرنا چاہتا ہوں۔"

انکول بابو اس کو اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ ماں جی نے رائے چرن کا شگفتہ پیشانی سے خیر مقدم نہیں کیا۔ مگر رائے چرن نے اس کا کچھ خیال نہ کرکے ہاتھ جوڑ کر کہا "ماں جی میں ہی نے للو کو چرایا تھا۔ پدما نے نہیں اور کسی نے نہیں۔ اس کا کمینہ احسان فراموش چرانے والا میں ہی ہوں۔

انکول بابو کہہ اٹھے "یہ کیا کہہ رہا ہے تو ! کہاں ہے وہ !

"جی۔ میرے ہی پاس ہے۔ میں پرسوں لادوں گا۔"

* * * * * *

اتوار کا دن تھا۔ کچہری کی تعطیل تھی۔ سویرے ہی سے میاں بیوی دونوں بڑی بےچینی سے رائے چرن کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ دس بجے دن کو رائے چرن پھلنا کو لے کر حاضر ہوا۔

انکول کی بیوی نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ اس کو گود میں لیکر چھاتی سے چمٹا کر۔ چوم کر پیاسی نظروں سے اس کا مکھڑا دیکھ کر روتی اور ہنستی ہوئی بیاکل ہو گئی۔ در اصل لڑکا دیکھنے میں بہت اچھا تھا۔ پہناوے اور رہن سہن کسی میں سے غریبی کی کوئی علامت نہ پائی جاتی تھی۔ چہرے پر معصومیت اور بھولاپن دیکھ کر انکول بابو کی محبت بھی لہریں مارنے لگی۔

پھر بھی انہوں نے سخت لہجہ میں پوچھا۔ "کوئی ثبوت ہے ؟"

رائے چرن نے کہا ایسے کام کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے ؟ میں نے آپ کا لڑکا چرایا تھا اس

بات کو صرف بھگوان ہی جانتے ہیں۔ دنیا میں کوئی دوسرا نہیں جانتا"

انکول بابو نے سوچ سمجھ کر طے کیا کہ لڑکے کو پاتے ہی اُنکی بیوی نے اس کے ساتھ جس محبت کا اظہار کیا اُسکو دیکھتے ہوئے اب ثبوت کے لئے ضد کرنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ جس طرح بھی ہو یقین لانا ہی مناسب ہو اس کے علاوہ ایک بات اور ہے رائے چرن کو ایسا لڑکا مل ہی کہاں سکتا ہے؟ اور بوڑھا نوکر انکو بلا وجہ ٹھگا ہی کیوں دیگا"

لڑکے سے بھی بات چیت کرکے معلوم ہوا کہ بچپن ہی سے وہ رائے چرن کے ساتھ ہے اور اب تک اُسی کو وہ اپنا باپ سمجھتا تھا لیکن رائے چرن نے کبھی اس کے ساتھ وال کا سا برتاؤ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ نوکر کی طرح پیش آتا تھا۔

انکول نے اپنے دل سے شک و شبہ کو دور کرکے کہا "لیکن رائے چرن اب تو ہم لوگوں کا سایہ بھی تم کو نہ مل سکے گا"

رائے چرن نے ہاتھ جوڑ کر کہا "اس بڑھاپے میں کہاں جاؤں گا مالک!

مالکن نے کہا "نہیں نہیں رہنے دو میرا للو خوش رہے! میں اُسے معاف کرتی ہوں"

قانون داں انکول نے کہا "اُس نے جو کام کیا ہے اس کے لئے وہ معاف نہیں کیا جا سکتا"

رائے چرن نے انکول بابو کے پاؤں پکڑ کر کہا "میں نے نہیں کیا بھگوان نے کیا ہے"

اپنا گناہ ایشور کے سر تھوپنے پر انکول اُس سے اور بھی ناراض ہو گئے۔ بولے جس نے اس طرح کی دغابازی کی ہے اُس پر دوبارہ بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں ہے"

رائے چرن نے مالک کے پاؤں چھوڑ کر کہا "میں ایسا نہیں ہوں مالک"!

"پھر کون ہے؟" "میری تقدیر"!

لیکن ان باتوں سے بھلا کسی تعلیم یافتہ شخص کو اطمینان ہو سکتا ہے؟

رائے چرن نے کہا "دنیا میں میرا اور کوئی ہے بھی نہیں"

پھلنا نے جب دیکھا کہ وہ منصف کا لڑکا ہے اور رائے چرن نے اب تک اُسے چھپا رکھا تھا اور اپنا لڑکا کہکر اس کی بے عزتی کرتا رہا ہے تو اسے بے حد غصہ آیا لیکن پھر بھی اس نے دریا دلی سے کہا "پتا جی اس کو معاف کر دیجئے۔ گھر میں نہیں رکھنا چاہتے تو اس کے لئے کچھ پنشن مقرر کر دیجئے"

اس پر رائے چرن نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ بلکہ ایک مرتبہ اچھی طرح بیٹے کا منھ دیکھ، سب کو سلام کیا اور دروازے سے باہر نکل کر دنیا کے ہزاروں آدمیوں میں مل گیا۔

مہینے کے آخیر میں جب انکول بابو نے اس کے گھر کے پتے سے روپیہ روانہ کئے تو وہ واپس آ گئے وہاں کوئی نہ تھا!

— ✻ —

تأثرات

(حضرت اعجاز صدیقی ایڈیٹر "شاعر" آگرہ)

اسیرِ حسن ماہ و مہرِ تاباں ہو نہیں سکتا
میں اُس جلوے کا قائل ہوں جو پنہاں ہو نہیں سکتا

محبت ہے یہ ہر عنوان ہمت آزما لیکن
جسے تجھ پر یقیں ہو وہ پریشاں ہو نہیں سکتا

ضرورت ہے ہر آنسو میں ہو خونِ دل کی آمیزش
فقط پانی کی بوندوں سے چراغاں ہو نہیں سکتا

شریکِ آوازِ دردِ دل نہ ہو جس کی صداؤں میں
ہمارے قافلہ کا وہ حُدی خواں ہو نہیں سکتا

پتہ ملتا ہے بندے میں خدا کا سعیِ پیہم سے
مگر یہ کام اکثر تا بہ امکاں ہو نہیں سکتا

مرے چہرے کی زردی اک لپٹ ہے آتشِ غم کی
غمِ پنہاں کسی صورت نمایاں ہو نہیں سکتا

میں اس دنیا کو خود اک تنگنائے غم سمجھتا ہوں
مجھے ہو شکوۂ تنگیِ زنداں ہو نہیں سکتا

وہ چنگاری ہوں جو شعلہ فشاں ہو تہِ خرمن
فروزاں کر تو سکتا ہوں، فروزاں ہو نہیں سکتا

مجھے افسوس ہے اُس مدعیِ آدمیت پر
کہ جو انساں نما ہو کر بھی انساں ہو نہیں سکتا

ہوئے ہم لالہ زار اک پھول چُن کر کیا قیامت ہے
مگر گلچیں گنہگارِ گلستاں ہو نہیں سکتا

محبت کی خلش میں جو مزا ہے کیا سکوں پسندی
یہ کانٹا دور ہو سکتا ہے درماں ہو نہیں سکتا

یہ ہے شرطِ اسیری یا مرے ذوقِ آزادی
کہ اک یہ بھی چراغِ شامِ زنداں ہو نہیں سکتا

جنوں میں دل سے تا نوکِ زباں کانٹے ہی کانٹے ہیں
یقیناً بخیۂ چاکِ گریباں ہو نہیں سکتا

میں سمجھا آپ سکونِ دل کی اُس سے بھیک لیتا ہوں
جو میرے دل میں رہ کر دل کا درماں ہو نہیں سکتا

جنوں پھولوں اور کانٹے چھوڑ دوں یہ کیا قیامت ہے
ہوائے گل میں اتنا تنگ داماں ہو نہیں سکتا

وہ اے اعجاز عشرت مندِ جشنِ باغ کیا ہوگا
جو فرطِ کیف سے پھولوں پہ رقصاں ہو نہیں سکتا

تنقید کتب

میخانۂ الہام[1]

یہ خان بہادر نواب سید علی محمد شاد مرحوم عظیم آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جسے اُن کے شاگرد رشید حضرت حمید عظیم آبادی نے خاص اہتمام کے ساتھ اپنے ایک مختصر "پیش لفظ" کے ساتھ شائع کیا ہے۔
حضرت شاد مرحوم اُردو شاعری کی دُنیا میں کوئی غیر معروف ہستی نہ تھے جن کے روشناس یا تعارف کرانے کی ضرورت سمجھی جائے۔ آپ کا درجہ اُن محسنین اُردو میں ہے جنھوں نے اُردو زبان کو سنوارا، نکھارا اور چار چاند لگائے۔ زمانہ کے حال پر جناب شاد کی خاص عنایت تھی۔ چنانچہ جب تک زندہ رہے۔ زمانہ کا دامن آپ کے گلہائے کلام سے معمور رہا۔ انتقال کے بعد بھی صاحب مرحوم کے بعض قابل عزیزوں کی عنایت سے آپ کا غیر مطبوعہ کلام وقتاً فوقتاً زمانہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔
حضرت شاد ۱۸۴۶ء میں بمقام عظیم آباد (پٹنہ) پیدا ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں وفات پائی۔ شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے اور شاعری میں خواجہ میر درد کے اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر سب سے زیادہ اثر آپ کے کلام پر میر انیس مرحوم کا پڑا۔ اسی لئے آپ کے کلام کا بڑا حصہ لکھنوی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ورنہ زبان میں مرحوم دہلی یا لکھنؤ کسی کے بھی مقلد نہ تھے۔ یہی باعث ہے کہ بعض بعض جگہ دہلی اور لکھنؤ کے محاروں سے آپ کے محاروں میں اختلاف نظر آتا ہے۔ مثلاً ؎

بارِ سبو وہی اُٹھائے، جس پہ ہو فضلِ میفروش زاہدِ خشک یہ بھی کیا بوجھ ہے جانماز کا

دہلی یا لکھنؤ والے میفروش کیلئے "فضل" کا استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ یہ لفظ خاص طور پر "خدا" کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یا مثلاً ؎

دیکھنا تیر اکن آنکھیوں سے ہے آڑی برچھی یار اِس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ گھاؤ جو اوچھا سا لگا پھر کے پھر دیکھ ذرا

جو زبان شاد مرحوم نے مستزاد کے اِس شعر میں استعمال کی ہے، وہ دہلی یا لکھنؤ کہیں کی نہیں ہے

---

[1] ضخامت بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات۔ قیمت ساڑھے چار روپیہ درجہ اوّل، چار روپیہ درجہ دوم۔ ملنے کا پتہ:- "منیجر صاحب حمید منزل" لودی کٹرہ، پٹنہ سٹی۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

پیغام آرہے ہیں تواتر وصال کے ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا

پہلے مصرعہ میں "تواتر" کا لفظ "متواتر" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو عام طور پر جائز نہیں کہا جا سکتا ہے۔

دو چار شعر پرانے لکھنوی رنگ کے بھی ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

اس کعبۂ مراد کے عارض پہ دی ہے جاں شمع حرم چراغ ہے میرے مزار کا

قدرت ہے اس کی، ورنہ یہ منھ آئینہ کا تھا جھگڑا چکائے شانہ و گیسوئے یار کا

وہ ذبح کرکے یہ کہتے ہیں میرے لاشہ سے تڑپ رہا ہے کہ منھ دیکھتا ہے تو میرا

ٹھہر ٹھہر کے پھرا، کچھ مزا تو لینے دے کہاں چھری تری قاتل، کہاں گلو میرا

لیکن ان جزوی پہلوؤں سے قطع نظر حضرت شاد کا کلام، بلاغت نظام، گرانبہا جواہر پاروں کا خزانہ ہے۔ جنمیں ایک سے ایک درخشاں اور ایک سے ایک یکتا ہے۔ ذیل میں چند جواہر پارے ملاحظہ ہوں۔

فارسی اور اُردو غزلوں میں غالب عنصر تصوف یا تغزل کا ہوتا ہے۔ غزل میں تصوف کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن جس غزل میں تغزل نہ ہو، وہ بلند پایہ نہیں کہی جا سکتی ہے۔ حضرت شاد کے کلام میں یہ دونوں چیزیں (تصوف اور تغزل) موجود ہیں۔ وحدت شہود کا جلوہ کس طرح دکھلاتے ہیں ؎

وہ عالمگیر جلوہ اور وہ حسن مشترک تیرا خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس پہ کس پہ شک تیرا

صانع کو دیکھنا ہے تو صنعت پہ کر نظر آئینہ، آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

ناحق ہما ہمی کی نہ لیں، شیخ و برہمن مسجد جو آپ کی ہے تو بتخانہ آپ کا

خامشی بھی تری طومار ہے یکتائی کا منھ چھپانا ترا آئینہ ہے یکتائی کا

بتایا جاتا ہے دل، دلمیں ہیں بہت گوشے کھلا نہ حال کہ ہے کس جگہ مقام ترا

اشعار ذیل میں تغزل کے گوناگوں جلوے بھی ملاحظہ ہوں ؎

اُن کی نگاہ ناز جو پلٹی تو دیکھنا منھ دیکھتی رہ گئی حقیقت مجاز کا

ساقی کی چشم مست پہ مشکل نہیں نگاہ مشکل سنبھالنا ہے، دل بے قرار کا

وہ آہ کیا جو زباں تک نہ لائے نام تیرا وہ درد کب ہے جو دل کو نہ دے پیام تیرا

غضب نگاہ نے ساقی کی بند و بست کیا شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا چشم تر تو نے تو مجھ کو کھو دیا

زباں پہ مرتے ہوئے، اُس کا نام آہی گیا جو اک لگاؤ سا تھا، اپنے کام آہی گیا

فارسی و اُردو کے شاعروں کا ایک فریضہ واعظ و زاہد کی پگڑی اُچھالنا بھی ہے، چنانچہ حضرت شاؔد اس میں بھی نہیں چوکے۔ فرماتے ہیں ؎

میں کہاں واعظ کہاں، توبہ کرو — جو نہ سمجھا خود وہ کیا سمجھائے گا

شاعروں کا مذہب "عشق" ہی ہوا کرتا ہے اور انھیں نہ کفر کی پروا ہوتی ہے نہ اسلام کی۔ چنانچہ شاؔد مرحوم بھی فرماتے ہیں ؎

تو بھی راحت نہ ملی، ترک جو اسلام کیا — کفر شاکی ہے کہ ناحق مجھے بدنام کیا

آخر میں ایک چھوٹی سی غزل پر یہ تنقید ختم کیجاتی ہے۔ غزل کیا ہے، سلاست زبان، تغزل، فصاحت و بلاغت کا ایک دلفریب گلدستہ کا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اٹھتی جوانی، عضو مناسب، سالونی رنگت، ہائے ستم — آنکھیں رسیلی، باتیں بھولی، چال قیامت، ہائے ستم
بعدِ مسافت، رات اندھیری، شمع نہ مشعل، میں تنہا — ضعف سے گرنا، سانس کا چڑھنا، شدتِ وحشت، ہائے ستم
تیغ کا گرنا، دم نہ نکلنا، ہاتھ جھٹکنا، بانکی ادا — وقت کی خوبی، میرا تڑپنا، اُنکی ندامت، ہائے ستم
شاؔد کو جاکر میں نے بھی دیکھا، کیا کہوں تجھسے، پوچھ نہ کچھ — مُنھ کی اُداسی، رنگ کی زردی، ضعف و نقاہت، ہائے ستم

دیوان میں حضرت شاؔد اور حضرت حمید دونوں کے فوٹو دئے گئے ہیں۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔

کیفِ سخن و بادۂ سخن و سراجِ سخن[1]

حیدرآباد کے مشہور ادیب ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ نے شعرائے دکن کا ایک سلسلہ انتخابات قائم کیا ہے جسمیں دکن کے پُرانے اور مشاق سخنوروں کے کلام کے انتخابات مع سوانحعمری شائع کیجاتی ہے مندرجہ عنوان کی کتابیں اسی سلسلے کی تین کڑیاں ہیں۔

کیفِ سخن میں سید رضی الدین حسن کیفؔی کی سوانحعمری، اُن کا منتخب کلام اور اُس پر تنقید درج ہے۔ کیفؔی صاحب اُردو شاعری کے ساتویں دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ پُرانی قسم کا کلام ہے۔ جس میں تلازمہ اور ابہام کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ روزمرہ کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ نمونہ کے صرف چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

کیوں خفا ہوتے ہو مجھ مست پہ اے حضرتِ شیخ — میں گنہگار خدا کا ہوں، تمھارا تو نہیں
دل میں جو شکل تھی زاہد وہ بتا دی تجھ کو — یہ نہ سمجھا تھا بدل جائے گی نیت تیری

[1] چھوٹے سائز کے آٹھ آٹھ جزو پر چھپی ہیں۔ قیمت ہر ایک کی بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- سید عبدالقادر پبلشرز چارمنار، حیدرآباد دکن۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد۔ کتابستان الہ آباد۔ مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی۔

چمن کا پھول، میخانہ کا شیشہ، چرغ کا تارا — کوئی ٹوٹی ہوئی شے ہو، ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

بادۂ سخن میں ڈاکٹر احمد حسین صاحب مائل کی سوانحعمری، کلام پر تبصرہ اور کلام کا انتخاب درج ہے مائل صاحب ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھے اور آپ کو مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کا شوق تھا۔ بعض اوقات تصوف میں بھی خوب کہتے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

نہ ہو جبتک اشارۂ میں نہ کچھ بولوں نہ کچھ لکھوں — بیان تیرا، دہن میرا، زبان تیری قلم میرا

حج کو جو میں چلا تو بلا کعبہ ہر جگہ — تو کس طرف نہ تھا تیرا جلوہ کدھر نہ تھا

بنوں گا خاک راہ جستجو کی — کہ ہوں پس ماندہ میں اک کارواں کا

جم کا جو بخت سب نے کہا مجھ کو عقلمند — قسمت بگڑ گئی تو کہا بے شعور تھا

تیری کثرت کا یہ غوغا ہے بھٹکتے جاؤ — تیری وحدت کا یہ ایما ہے نگہباں ہوں میں

سراج سخن سید شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب ہے، جس کو پروفیسر عبد القادر صاحب سروری جامعہ عثمانیہ نے مرتب کیا ہے اور دیباچہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے لکھا ہے سراج کے منتخب کلام میں غزل، رباعی، متزاد اور مثنویات سب شامل کر لی گئی ہیں۔ کلام کی زبان ڈیڑھ سو دو سو برس پرانی ہے۔ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو آجکل سمجھ میں بھی نہیں آسکتے۔ مگر فاضل مرتب نے حاشیہ میں اُن کے معنی لکھدئے ہیں۔ اِس کتاب کا مطالعہ اُن لوگوں کے لئے مفید ہوگا۔ جو زبان اُردو کی تدریجی ترقیاں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ تینوں کتابوں کی لکھائی چھپائی کاغذ اور ضخامت تقریباً یکساں ہے۔

بہار[1]

شاعرانہ تخئیل کی کوئی حد نہیں، اِس لئے شاعر کے خیال میں جو جو مضامین آتے ہیں، اُن کی تعداد شمار میں نہیں آسکتی۔ اگر موٹے موٹے مضامین بھی شمار کئے جائیں تو اُنکی تعداد بھی سیکڑوں ہزاروں تک پہونچ جائیگی۔ تاہم بعض وقت مختلف عنوانوں پر متعدد شاعروں کا کلام دیکھنے کو جی چاہتا ہے اور کبھی کبھی اس کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ کسی ایک مضمون کو مختلف سخنوروں نے کس طرح ادا کیا ہے۔ اُردو میں اِس طرز کی بہت کم کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جنمیں مختلف شاعروں کا کلام اِس طرح پیش کیا گیا ہو۔ مگر حال میں مسٹر الیاس احمد ایم۔ اے، ایل ایل بی منصف صوبہ متحدہ نے بڑی تلاش و تجسس کے بعد

[1] لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ چھوٹی تقطیع کے ۲۳۶ صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ معارف پریس اعظم گڈھ

مختلف مضامین کے اشعار یکجا کر کے شائع کر دیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب گویا شعروں کی چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا ہو گئی ہے۔ جس مضمون کا شعر آپ کو درکار ہو فہرست دیکھکر صفحہ کا نمبر نکالئے اور ورق الٹ کر پڑھئے تو مختلف شاعروں کے بہت سے شعر ایک ہی مضمون پر نکل آئیں گے۔ مثلاً ہم کوئی مضمون لکھ رہے ہیں۔ جسمیں ہمیں "انتظار" سے متعلق پھبتے ہوئے شعر کی ضرورت ہے۔ ہم نے انڈکس میں لفظ "انتظار" دیکھ صفحہ ۱۰۷ کھولا تو کیا دیکھتے ہیں کہ "انتظار" کے متعلق دس چیدہ و منتخب شعر درج ہیں۔ جسمیں غالب کا شعر بھی ہے اور حافظ شیراز کا بھی، ذوق کا بھی اور جگر و فانی اور وحشت کا بھی۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ جو شعر اپنے مضمون کے مطابق آپ سمجھیں اُسے کام میں لائیں۔ غرض فاضل مرتب نے ہر مضمون پر سیکڑوں شاعروں کے چیدہ اشعار منتخب کر کے جمع کر دیئے ہیں۔ شروع میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی کا مختصر "تعارف" اور فاضل مرتب کا تمہیدی مضمون ہے۔ "حسن و عشق" بھی دو صفحہ کا ایک فاضلانہ مضمون ہے۔

دلی کی دو سو برس کی تاریخ[1]

اس کتاب کی کیفیت اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ در حقیقت سید حسن برنی ایم اے ایل ایل بی نے جامعہ ملیہ کی اُردو اکیڈیمی کے جلسے میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ جو اب کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ اس چھوٹے سے رسالہ میں فاضل مصنف نے تیموری حملہ سے قبل کی دہلی کے حالات مختصراً درج کئے ہیں۔ انمیں کافی تحقیق و تدقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اور پرانے سیاحوں اور مورخین کی کتابوں کے حوالے اور اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔ اس رسالہ کا مطالعہ عام شائقین اور خصوصاً طلباء کے لئے مفید ہوگا۔ اسکی لکھائی، چھپائی، کاغذ رسمی ہے۔

ذکرِ غالب[2]

مرزا غالب کے دیوان کی بیسیوں شرحیں لکھی جا چکی ہیں اور اُن سب میں التزاماً غالب کی مفصل یا مجمل سوانحعمری بھی درج کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ متعدد سوانحعمریاں بھی شائع ہو چکی ہیں جنمیں خواجہ الطاف حسین حالی کی "یادگارِ غالب"۔ مولوی غلام رسول مہر ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور کا "غالب" اور محمد اکرام صاحب کا "غالب نامہ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، لیکن یہ سب کتابیں اسقدر ضخیم ہیں کہ جو لوگ عدیم الفرصت ہیں وہ اِن ضخیم کتابوں سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ نہیں نکال سکتے۔ اِس لئے

---

[1] ضخامت ۵۴ صفحات، قیمت غالباً ۴؍ ملنے کا پتہ :- جامعہ ملیہ دہلی۔
[2] حجم ۱۰۳ صفحات، قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

ضرورت تھی کہ مرزا غالب کے حالات صحیح مگر پورے پورے ایک مختصر سے رسالہ میں جمع کئے جائیں، جس سے ہر شخص لطف اندوز ہو سکے۔ اس ضرورت کو ہمارے مکرم مسٹر مالک رام ایم۔ اے ایل ایل بی نے نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے پورا کردیا ہے۔ کیونکہ اس چھوٹی سی کتاب میں انھوں نے غالب کی زندگی کے تمام مستند حالات نہایت تحقیق و تفتیش کے ساتھ نہایت دلچسپ پیرائے میں یکجا کردئے ہیں۔ لایق مصنف کو علمی تحقیقات کا ایک خاص شوق ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس کتاب میں بھی جو واقعات لکھے ہیں، وہ مروجہ کتابوں یا شہرت یافتہ بیانوں پر بھروسہ کرکے نہیں لکھے ہیں بلکہ اکثر معاملات کی بڑی کدوکاوش سے تحقیق کی ہے جس سے اس تصنیف کی قدر و قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ اسمیں مرزا غالب کا ایک خاص فوٹو بھی ہے۔ لکھائی چھپائی سب پسندیدہ ہے۔

رسالوں اور اخباروں کے خاص نمبر

"شاہکار" گورکھپور (جدید اردو شاعری نمبر)

ہمعصر "شاہکار" گورکھپور نے جدید اردو شاعری کے متعلق ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جسمیں ۵۲۲ء سے لے کر ۱۸۵۶ء تک مجمل اور ۱۸۵۶ء سے ۱۹۳۶ء تک اردو ادب کی مفصل تاریخ دی گئی ہے۔ اسمیں پرانے زمانہ کے علاوہ دور جدید کے شاعروں کے بھی مختصر حالات مع نمونہ کلام دئے ہیں۔ ترتیب تخلص کے لحاظ سے ابجدوار رکھی گئی ہے۔ اس نمبر کے لئے حکیم ناطق صاحب لکھنوی نے "تخلیق اردو" کے عنوان سے ایک طویل مسدس لکھا ہے۔ جسمیں اردو شاعری کی پوری تاریخ آگئی ہے۔ فاضل شاعر نے گویا کوزہ میں دریا کو بند کردیا ہے۔ مسٹر محمد شفیع ایم۔ اے۔ ایل ایل بی نے دور حاضر کے متغزلین پر خوب مضامین لکھے ہیں۔ خود حکیم عارف بلگرامی ایڈیٹر رسالہ کا مضمون "دور جدید کی شاعرات" ایک قابل قدر مضمون ہے۔ اس نمبر میں بائیس ۲۲ شاعروں اور دو ۲ شاعرات کے فوٹو بھی دئے گئے ہیں۔ جہانتک اردو کے دور جدید کا تعلق ہے۔ اس پرچے میں بڑی قابل قدر معلومات یکجا کردی ہیں، جس کے لئے ہم فاضل ایڈیٹر رسالہ کو تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہے۔ ضخامت ڈھائی سو صفحات، قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مینجر صاحب رسالہ شاہکار گورکھپور۔

"تیج" دہلی کرشن نمبر

یوں تو بہت سے اردو ہندی رسالے اپنے اپنے خاص نمبر نکالتے ہیں، مگر جس خاص اہتمام کے ساتھ

ہمعصر "تیج" دہلی ہر سال اپنا کرشن نمبر شائع کرتا ہے، وہ دوسری جگہ کم نظر آتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کا جو کرشن نمبر شائع ہوا ہے، اُسے مضامین کا ایک بے پایاں دریا کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اسمیں چھوٹے بڑے ایک سو تیس (۱۳۰) مضامین نظم و نثر درج ہیں جنمیں سے اکثر پُر معلومات اور بلند پایہ ہیں۔ نظر فریب ٹائٹل کے علاوہ جس میں کرشن جی کی تصویر ہے (۱) مہاتما بدھ (۲) اشٹ دیو کی پوجا (۳) کُبجا اور کرشن۔ اور (۴) گاندھی جی کی رنگین تصویریں دی گئی ہیں۔ جو فنی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ بہرحال کارپردازان تیج نے اِس نمبر میں اپنے کرشن نمبر کی روایتی شہرت کو پوری کامیابی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ جس کے لئے ہم انھیں پُر خلوص مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔ یہ نمبر بڑے سائز کے ۱۵۴ صفحات پر تمام ہوا ہے۔ اُس پر بھی قیمت صرف چھ آنہ، جو ہمارے نزدیک اُس کی خوبیوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔

ملاپ لاہور جنم اشٹمی نمبر و کرشن نمبر

پنجاب کے اخباروں کو سال میں کئی کئی خاص نمبر شائع کرنے کا عام شوق ہے، لیکن جس سلیقہ کیساتھ روزنامہ "ملاپ لاہور" اپنے خاص نمبر نکالتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ ملاپ نے امسال بھی جنم اشٹمی کے موقعہ پر ایک چھوڑ دو خاص نمبر نکالے، جو سری کرشن جی کے متعلق نظم و نثر مضامین کے دل فریب گلدستے ہیں۔ ان میں بعض بلند پایہ سیاسی مضامین بھی درج ہیں۔ غرض دونوں نمبر تاریخی، مذہبی، سیاسی سب لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ کئی دلچسپ افسانے بھی دئے گئے ہیں۔ رنگین ٹائٹل کے علاوہ کئی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ اُن کی قیمت ۴ ,۲ رہے۔

دِق و سِل

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی نے "دِق و سِل" جیسے امراض کے متعلق رسالہ "ہمدرد صحت" کا یہ خاص نمبر بڑی قابلیت اور عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ہمارے خیال میں تو "دِق و سِل" جیسے مہلک امراض پر اس سے بہتر جامع و مانع کتاب اُردو زبان نہ ملیگی۔ اسمیں اِن امراض کے بارے میں مغربی و مشرقی دونوں فنونِ طب کی تحقیقات کا خلاصہ درج کردیا گیا ہے۔ چنانچہ ۴۵ ڈاکٹروں اور طبیبوں کے اسمیں مضامین درج کئے گئے ہیں اور قریب ساٹھ حکیموں اور وئیدوں کے سوا سو سے زیادہ مجرب نسخے بھی دیدئے گئے ہیں۔ پورا پرچہ دس باب میں تقسیم کیا گیا ہے جسمیں "دِق و سِل" کی تشخیص اور معالجہ پر ہر نقطۂ خیال سے بحث کی گئی ہے۔ آخری باب میں "دِق و سِل" کے متعلق افسانے اور کارٹون بھی دئے گئے ہیں۔ اس طرح اِس نمبر میں سولہ سہ رنگی تصویریں، ستّرہ لیتھو تصویریں، اور تین نقشے شامل ہیں۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ اس پر قیمت صرف ۱۲ ار۔ ملنے کا پتہ:۔ مینجر صاحب "ہمدرد صحت" دہلی

شورشِ آرزو

(از حضرت شائق وارثی)

اے نگارِ شعر و نغمہ! اے عروسِ رنگ و بو
ہر ادائے مست تیری کیف بار و مے فروش
برگ برگِ باغِ ہستی کو ہے تیری آرزو
کائناتِ دل کا ہر ذرہ ترا حلقہ بگوش

تا بکے محمل نشینی، تا بکے شرم و حجاب
تا بکے صحرا نوردی، تا بکے جوشِ جنوں
تا بکے چشمِ محبت زا میں رنگِ اجتناب
تا بکے دامانِ ہستی میں یہ اشکِ لالہ گوں

اے بہارِ گل بداماں، گلشنِ فطرت نواز
آ پیامِ زندگی دے اک فسردہ روح کو
جذب ہوجائیں بیک دیگر بہم ناز و نیاز
اک نئی دنیائے حسن و عشق کی تخلیق ہو

خود بخود ہو جائے آغوشِ تمنا بے قرار
قلب میں انگڑائیاں لیں اشتیاق و آرزو
کاش! تیرا دل بھی ہو میری طرح بے اختیار
کاش! ہو میری طرح تجھکو بھی میری جستجو

پردہ داری کے عوض پردہ دری کی رسم ہو
حُسن کی دنیا میں ہوائے کاش! ایسا انقلاب
کاش! ہو تسکینِ چشم و قلب و جان و روح کو
کاش! ہو جائے ہر اک ناکامِ حسرت کامیاب

اشعارِ منور

نہ اُٹھے یا قدم اُٹھے منور
سفر میں ختم اپنا کر چکا ہوں
اسی سے ہے طبیعت سیر اپنی
پیالہ زندگی کا بھر چکا ہوں
مری ہستی کو تم ہستی نہ سمجھو
مرا جینا ہی کیا، میں مر چکا ہوں

بشیشور پرشاد لکھنوی

رفتار زمانہ

(غیر ملکی)

پچھلے دو ہفتوں میں یورپ میں لڑائی چھڑ جانے کے جتنے امکانات پیدا ہوگئے تھے۔ اتنے پچھلی جنگ عظیم کے بعد سے اب تک کبھی ظہور پذیر نہیں ہوئے، مگر جنگ کی گھنگھور گھٹائیں خون برساتے برساتے رہ گئیں۔ امن عالم کا اُفق اک دم کچھ ایسا ابر آلود ہوگیا کہ سب قوموں کو مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ لیکن وزیر اعظم برطانیہ نے اس موقعہ پر اپنے عزو وقار کے خیال کو بالائے طاق رکھکر جرمنی کا عزم کیا اور ہر ہٹلر سے ملنے کے لئے تین بار ہوائی جہاز میں سفر کیا۔ اور آخر بار میونخ میں وزیر اعظم فرانس اور مسولینی بھی مسٹر چیمبرلین کیساتھ ہٹلر سے ملے۔ ہر چند زیکوسلاویکیا جنگ کرنے کیلئے تیار تھا مگر وزیر اعظم برطانیہ اور وزیر اعظم فرانس نے اُسے ہٹلر کے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کر دینے کیلئے بُری طرح مجبور کیا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ فرانس نے کیونکر یہ رویہ اختیار کیا۔ ابتک یہ ایک راز سربستہ ہے۔ اسمیں شبہ نہیں کہ ایک ملاقات میں مسٹر چیمبرلین نے کسی قدر استقلال سے کام لیا۔ اور ہٹلر کے بڑھتے ہوئے مطالبات پر یکایک مُہر رضامندی ثبت نہیں کی مگر چونکہ وہ طبعاً امن پسند ہیں اور اسوقت جس طرح بھی ہو امن قائم رکھنا چاہتے تھے۔ خواہ اُس کے لئے کتنی ہی قیمت ادا کرنا پڑے، اس لئے بالآخر انھوں ہر ہٹلر کے سارے مطالبات قبول کر کے فی الحال جنگ کا راستہ مسدود کر دیا۔ مگر یہ تا بہ کے و تا بہ کجا عجب نہیں کہ یورپ کے آمادہ بہ جنگ آمران ہر ہٹلر اور مسولینی چند ہی مہینوں بعد پھر کوئی شگوفہ چھیڑ دیں کیونکہ ان خود سر حکمرانوں کو مصالحت پسندی سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں اور اُن کے حوصلوں کی بھی کوئی حد نہیں۔ نیورگ میں ہر ہٹلر نے جو تقریر کی اُسمیں فیصلہ خود اختیاری کا مطالبہ پیش کیا اور اس کے بعد سے وہ اپنے مطالبات سخت سے سخت تر کرتا چلا گیا حتیٰ کہ اُس نے زیکوسلاویکیا کو سر تسلیم خم کرنے کیلئے چند روزہ میعاد مقرر کر دی اور اسمیں گفتگو در کنار چون وچرا کی بھی کوئی گنجائش باقی نہ رکھی۔ زیکوسلاویکیا صرف اتنا چاہتا تھا کہ علاقوں کے خالی کرنے میں مناسب وقت دیا جائے تاکہ سب کارروائی پُرامن اور باضابطہ طریقہ سے انجام پائے اور جو لوگ کہ جرمنی کی حکومت میں رہنا پسند نہ کریں وہ ان علاقوں سے منتقل ہو جائیں مگر اسکی یہ درخواست بھی منظور نہ ہوئی اور پہلی اکتوبر سے دسُّ اکتوبر تک اُسے سب علاقے خالی کر کے جرمنی کے حوالہ کر دینے پڑے۔ غرض فرانس اور انگلستان کی صریح مدد سے یکم اکتوبر ہی سے جرمن فوج کا تسلط شروع ہوگیا۔ سوڈٹین علاقوں میں کروڑوں روپیے کے صرف سے زیکوں نے حفاظتی قلعہ بندی کے سلسلے میں جو عظیم الشان تعمیرات کی ہیں اُن کے ہٹانے کا بھی اُنھیں اختیار نہیں دیا گیا نیز فوجی، اقتصادی اور ٹریفک کے لوازمات، ریل گاڑیاں، گیس ورکس، بجلی گھر وغیرہ یوں ہی درست حالت میں چھوڑ دے

جائیں گے۔ جنگ میں جرمنی کو فتح کامل بھی نصیب ہوتی تو کروڑوں کی لاگت کا یہ سب سامان ہاتھ نہ لگتا۔ لیکن اب تلوار دکھائے بغیر محض جنگ کی دھمکی نے یہ کام کیا کہ آن کی آن میں اُسے ہزارہا میل ملک، کروڑہا روپیہ کی عمارتیں، کل ذرائع آمد و رفت اور چار لاکھ فوج پورے ساز و سامان کے ساتھ یوں ہی مل گئی۔ جب زیکوسلاویکیا کے مہربان حلیف برطانیہ اور فرانس ہی نے دعدہ دغا نہ کیا اور بقول شاعر ؎

باغباں نے آگ دی جب آشیانہ میں مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اس چھوٹے سے مگر بہادر ملک کیلئے اِس کے سوائے اور چارہ ہی کیا تھا کہ وہ ہر جبر و تشدد کو طوعاً اور کرہاً قبول کرے۔ افسوس کہ سلطنت برطانیہ کے برسر اِقتدار طبقہ نے اِسوقت نہ تو حق و انصاف کا خیال کیا اور نہ اپنے عزو وقار کا، صرف ذاتی حیثیت سے امن و امان اور بخیال خویش سلطنت کی جنگ کے خطروں سے حفاظت کا خیال کیا۔ پست خیالات اور وسیع سلطنت اِن دو کا مشکل سے ساتھ نبھتا ہے۔ دیکھئے انگلستان کے موجودہ حکمرانوں کی ذہنیت آیندہ کیا نتائج پیدا کرتی ہے ہٹلر نے مسٹر چیمبرلین سے بیان کیا ہے کہ وہ پبلک میں اعلان کر چکا ہے اب زیکوسلاویکیا کا معاملہ طے ہوجانیکے بعد یورپ میں اُسے اور کوئی علاقہ درکار نہیں لیکن افواہ ہے کہ عنقریب ہی علاقہ جات میمل اور ڈینزگ کے متعلق بھی اُسکے مطالبات تسلی بخش طور پر طے کردئے جائینگے، اور جرمنی اور برطانیہ کے درمیان مصالحت کی خاطر ان علاقوں کا معاملہ بھی جرمنی کے حق میں طے ہوجانا کوئی بڑی بات نہ سمجھی جائیگی۔ ہٹلر اور چیمبرلین دونوں نے ایک باضابطہ معاہدہ پر دستخط کردئے ہیں کہ برطانیہ اور جرمنی کے درمیان کل معاملات باہمی مشورہ سے طے کرلئے جائیں گے۔ اسی طرح وزیر اعظم فرانس نے بھی خواہش ظاہر کی ہے کہ فرانس اور جرمنی کے درمیان بھی دِلوں کی صفائی ہوکر مصالحت ہوجائے۔ بلکہ حکومت فرانس نے اٹلی کی دلجوئی کے لئے ابی سینیا کی فتح بھی تسلیم کرنیکا ارادہ ظاہر کردیا ہے۔ غرض اِسوقت معاہدہ میونخ یورپ کا بہت بڑا تاریخی واقعہ ہوگیا ہے اور اُس کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس سے امنِ عالم کا مستقبل وابستہ ہے لیکن ہماری سمجھ میں جب تک دُنیا کی دیگر بڑی بڑی طاقتیں بھی متفق الرائے ہوکر آپس کی بدگمانیاں دُور نہ کرلیں گی، امن کی اُمید دیرپا نہیں ہوسکتی ہے۔ میونخ کانفرنس مجبوری کی حالت میں ہوئی ہے جسمیں زیکوسلاویکیا کو ذبح کرکے یورپ کا امن قائم رکھا گیا ہے اور روس کو دانستہ اِس کانفرنس سے دُور رکھا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ آیندہ چل کر معلوم ہوگا۔

اسوقت تو جرمنی کے جبر و تشدد کی کامیابی نے پولینڈ اور ہنگری کو شیر کردیا ہے اور وہ بھی زیکوسلاویکیا کے درپے آزار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ اِن دونوں ملکوں کی حکومتوں نے ہر ہٹلر کے بھروسہ پر یہ مطالبہ پیش کیا ہے کہ جو حقوق سوڈیٹن جرمنوں کو دئے گئے ہیں وہی پولوں اور ہنگری نژاد باشندگانِ زیکوسلاویکیا کو بھی دئے جائیں۔ روس نے پولینڈ کو تنبیہ کردی ہے کہ اگر اُس نے زیکوسلاویکیا پر کوئی دست درازی کی تو اُس کے ساتھ عدمِ مزاحمت کا جو معاہدہ ہوا ہے اُسے منسوخ کردیا جائیگا۔ لیکن پولینڈ نے زیکوسلاویکیا کو یہ الٹی میٹم دیا ہے کہ زیکوسلاویکیا

Danzig اور Memel. ✓

کے وہ علاقے جہاں پول آباد ہیں فوراً خالی کر دے جائیں اور یکم اکتوبر کو اپنی فوجیں بھی کوٹاویس پیٹروویس ٹریچن اور بیلسکو سے محیط مربعہ علاقہ میں داخل کر دی ہیں۔ زیک گورنمنٹ کے بہادر اور الوالعزم صدر ڈاکٹر بنیس مجبوراً مستعفی ہوگئے ہیں اور نئی وزارت قائم ہوگئی ہے ؏ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

فلسطین

فلسطین کے حالات روز بروز بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں۔ کشت و خون لوٹ مار کا بازار گرم ہے اور ستم یہ ہے کہ بیگناہوں اور بے زبانوں پر بھی حملہ کرنےسے دریغ نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ جو لوگ درمیانیوں کی حیثیت سے صلح و آشتی کیلئے دخل انداز ہوتے ہیں وہ بھی حملوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ برطانیہ نے یہ کوشش کرکے کہ یہودیوں کیلئے ایک وطن مہیا کر دیا جائے دراصل ایک مشکل پیدا کر دی۔ یہودی جن جن ملکوں میں تھے اپنے حال میں کم و بیش خوش تھے اور اُن ملکوں کی حکومتیں بھی تھوڑا بہت لحاظ رکھتی ہی تھیں۔ کم از کم اُن بیچاروں کی یہ حالت نہ تھی جو فلسطین میں اب ہوگئی ہے۔ مزید ستم یہ ہے کہ یہ دیکھکر کہ فلسطین یہودیوں کا وطن قرار دیا گیا ہے۔ دوسری حکومتیں بھی یہودیوں کو اپنے اپنے ملکوں سے نکل جانے کا حکم دے رہی ہیں۔ فرانس اور برطانیہ کے سوائے اب کوئی اور ملک یہودیوں کی صورت کا روادار نہیں۔ فلسطین میں تیرہ لاکھ کی آبادی ہے جسمیں چار لاکھ یہودی ہیں۔ عرب یہودیوں کی موجودہ تعداد میں مزید اضافہ برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ لطف یہ کہ عرب اور یہودی دونوں فلسطین کی تقسیم کے خلاف ہیں مگر برطانیہ کی یہی پالیسی ہے کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرکے دونوں فریق کو الگ تھلگ کر دیا جائے اور حدود قائم کرکے انگریزی فوج اور برٹش طیارے حد فاصل کی نگرانی کرتے رہیں۔ پیل کمیشن نے یہ اصول طے کر دیا تھا۔ اُس کے بعد دوسرے کمیشن نے اس پر غور کیا کہ تقسیم کی مجوزہ اسکیم پر کس طرح عملدرآمد کیا جائے۔

حجاز کے شاہزادہ ولیعہد نے ریوٹر کو یہ بیان دیا ہے کہ جملہ عرب ممالک کو فلسطین کے معاملہ سے دلچسپی ہے۔ اسلئے وہ بھی اُس کیساتھ بے توجہی یا دست برداری کی پالیسی نہیں برت سکتے۔ اُنکی رائے میں فلسطین عربوں کا ہے۔ اور انھیں کا رہنا چاہئے۔ عراق اور مصر کے نمایندوں نے بھی مجلس اقوام کے موجودہ اجلاس میں اس مسئلہ پر اپنی تشویش ظاہر کرکے اُمید ظاہر کی ہے کہ برطانیہ عربوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کریگا۔

تازہ ترین خبر یہ ہے کہ ہائی کمشنر نے بھی انگلستان جاکر گفت و شنید کی ہے۔

جاپان

چین نے جاپان کے خلاف یہ الزام لگایا ہے کہ جاپان نے ہانکاؤ کو فتح کرنیکی کوشش میں جائز و ناجائز ہر طریقہ سے کام لیا ہے چنانچہ اُس نے روزانہ زہریلی گیس کا استعمال کیا۔ چین کے نمایندہ نے مجلس اقوام کے اجلاس میں یہ بیان بھی دیا کہ ۱۹۳۷ء سے مئی ۱۹۳۸ء تک جاپانیوں نے کھلے ہوئے شہروں پر دو ہزار بمباریاں کیں۔ اِسوقت مجلس اقوام کا اقتدار ہی کیا رہ گیا ہے مگر چین اُسے اب بھی ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا سمجھے ہوئے ہے۔ اور لیگ نے جاپان کے خلاف دفعہ ۱۶ کا اعلان کرکے چین کی اشک شوئی بھی کی ہے۔ اسی قسم کا نوٹس ۱۹۳۲ء میں جاپان کو حملہ

Teschen ـ۳ Kotawice ـ۲ Petrovice ـ۱

منچوریا کے وقت دیا گیا تھا اور اُس وقت اسی وجہ سے جاپان لیگ سے علیحدہ ہوگیا تھا۔ ۱۹۳۸ء کے نوٹس کا اثر اس سے
زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ جاپان نے اخلاقی حیثیت سے لیگ اقوام سے تعاون کرنیسے انکار کردیا ہے۔
یقیناً جاپان ہانکاؤ کو فتح کرلیگا۔ مگر اُسکے ساتھ یہ بات بھی مسلم ہے کہ جاپان کیلئے چین کو بہ آسانی پسپا کردینا محال ہے،
کیونکہ اُس کے پاس آدمیوں اور ذرائع کی کمی نہیں ہے اور اسکی فوج کے استقلال اور تنظیم میں بھی ترقی نظر آرہی ہے۔
سول آبادی میں ابھی تک خوف وہراس کے کوئی آثار نمایاں نہیں ہیں۔ غرض چند ہی سال کے اندر چین کے باشندوں
میں انقلاب عظیم ہوگیا ہے۔ اور وہ اپنی ملکی آزادی برقرار رکھنے کے لئے ضروری قربانیوں کیلئے بھی تیار ہیں۔

(ملکی)

مدراس گورنمنٹ نے اچھوت ادھار کیلئے بڑی سرگرمی سے کوشش کی ہے۔ جنوبی ہند میں یہ مسئلہ خاص طور پر
مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس ضمن میں جسقدر کامیابی مدراس کی کانگریس گورنمنٹ کو ہوئی ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے
یہ ضرور ہے کہ منزل مقصود بہت دور ہے تاہم محکمۂ تعلیم کی برابر یہی کوشش ہے کہ جہاں تک ہوسکے معمولی مدرسوں
میں ہریجن طلبا کے داخلے میں کوئی قباحت نہ ہو۔ اس پر بھی بعض علاقوں میں جہاں ذات کی بندشیں زیادہ سخت
ہیں۔ اچھوتوں کیلئے علیحدہ مدرسے قائم کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ چنانچہ صوبۂ مدراس میں اس وقت بارہ ہزار مدرسے ہیں
جنمیں تعلیم پانے والوں کی تعداد ۴۸ ہزار ہوگی۔ اسی طرح انسداد شراب نوشی کی اسکیم پر بھی بتدریج عملدرآمد ہورہا ہے
سردست مندروں میں اچھوتوں کے داخلہ کا مسئلہ زیر غور ہے۔ جس کے متعلق مدراس گورنمنٹ آیندہ نومبر میں
ایک مسودہ قانون پیش کرنیوالی ہے۔ انسداد شراب نوشی کی پالیسی یہ رکھی گئی ہے کہ پہلے منتخب حلقوں میں یہ کام شروع
کیا جائے۔ چنانچہ وزیر اعظم مدراس کا مندروں میں اچھوتوں کے داخلہ کے متعلق بھی یہی خیال ہے کہ کل صوبہ میں ہرجگہ
کارروائی اختیار کرنے کے بجائے شہر کے ایک محدود حصہ میں اُس پر عملدرآمد کیا جائے۔ مالابار میں جو نتیجہ ظہور پذیر
ہوگا اُس سے پتہ لگ جائیگا کہ مخالفت کی کیا صورت ہے اور کیا یہ مسئلہ واقعی ایسا سنگین ہے جیسا کہ بعض
حلقوں میں بیان کیا جاتا ہے؟ مجوزہ بل نے مالابار میں کھلبلی پیدا کردی ہے۔

۲۷ ستمبر کو سول آزادی کے متعلق بھولا بھائی ڈیسائی کی قرارداد پر نو گھنٹے کی مسلسل بحث مباحثے کے بعد
آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس سے ساٹھ ممبر سوشلسٹ، بائیں بازو والے، کسان سبھا اور کسان زمیندار بطور
احتجاج باہر چلے آئے اور انقلابی نعرے بلند کرتے رہے۔ اس قرارداد کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس کو یہ پتہ چلا کہ بعض
کانگریس والے کسانوں اور مزدوروں کو امن پسندی کے راستہ سے ہٹا کر گمراہ کررہے ہیں۔ لہذا اُن کی روک تھام
انتظام ضروری ہوا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے یہ واضح کردیا ہے کہ اس
قرارداد کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ کارکنان کانگریس کو قید کرادیا جائے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ سول

کے متعلق کانگریس کا نظریہ واضح کردیا جائے کہ شہری آزادی سے کانگریس کی یہ مراد نہیں ہے کہ لوگ تشدد پر آمادہ کئے جاسکیں۔ جیسا کہ بعض اخبارات اشتعال انگیز مضامین لکھکر لوگوں کو فرقہ وارانہ جھگڑوں پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سردار موصوف نے یہ بھی بتایا کہ ساتوں کانگریسی صوبوں کے وزرا نے اس تجویز پر ہر پہلو سے غور وخوض کیا ہے۔

۲۶ ستمبر کے اجلاس کانگریس کمیٹی میں پانچ گھنٹہ کی گرماگرم بحث کے بعد ڈاکٹر کھرے سابق وزیر اعظم صوبہ متوسط کے خلاف کثرت رائے سے تعزیری ریزولیوشن پاس ہوا۔ ڈاکٹر کھرے کو پارلیمنٹری سب کمیٹی کے خلاف متعدد شکایتیں تھیں لیکن وہ خود کمیٹی کے سامنے نہ آئے بلکہ مسٹر ایم، این رائے نے اُن کی پُرزور وکالت کی۔ اُن سے پیشتر گو سردار پٹیل نے اپنی پوزیشن صاف کردی تھی تاہم مسٹر رائے کی تقریر کے بعد وزیر اعظم مدراس نے صاحب موصوف کو دندان شکن جواب دیا۔ ملک کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ ہم متحد ہوکر کہیں کوئی کام نہیں کرسکتے ہیں۔ ڈاکٹر کھرے کے متعلق بھی کانگریس نے جو ریزولیوشن پاس کیا ہے وہ سخت ہے۔ کیونکہ اس کی بنا پر ورکنگ کمیٹی نے ڈاکٹر موصوف کو ڈیڑھ سال کے لئے کانگریس سے خارج کردیا ہے۔ اور اُن سے اسمبلی سے بھی مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا ہے۔ ہم اسے ضرورت سے زیادہ سخت سمجھتے ہیں۔

صوبہ متحدہ

صوبہ متحدہ کی حکومت نے زراعتی بل کے متعلق جو سب کمیٹی مقرر کی تھی اس نے اپنی رپورٹ مکمل کرلی ہے۔ اس کمیٹی میں زمینداروں اور مسلم لیگ کے ممبروں کی بھی نمایندگی تھی۔ چنانچہ زمیندار ممبروں اور مسلم لیگ کے نمایندوں نے چند تجاویز کے متعلق اپنا اختلاف رائے ظاہر کیا ہے اور لیگ اور زمیندار ممبران نے اپنا اپنا اختلافی نوٹ لکھا ہے۔ مسلم لیگ کے نمایندگان سیر کے معاملہ میں زمینداروں کے حق میں مزید مراعات کے خواہاں ہیں نیز کاشتکاروں کو درخت لگانے کے سلسلہ میں جو حقوق حاصل ہیں انھیں اور زیادہ محدود کرانا چاہتے ہیں۔

صوبہ بمبئی

حکومت بمبئی ریونیو ریفارم کی تجاویز پر غور وخوض کررہی ہے۔ منشا یہ ہے کہ مالگذاری میں خواہ مخواہ اضافہ نہ ہوتا رہے اور جب تک اسمبلی سے منظوری نہ لے لیجائے محکمہ مال کو مالگذاری بڑھانے کا اختیار نہ ہو۔ اس ضمن میں اب تک مجلس قانون ساز کو کوئی دخل حاصل نہ تھا مگر اب صوبہ جات میں ذمہ دار حکومتیں ہوجانے سے غالباً ہر معاملہ کا فیصلہ اسمبلی کی رائے کے مطابق ضروری سمجھا گیا ہے۔ حکومت بمبئی کے لئے یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ وہ مالگذاری میں ایک کروڑ روپیہ کی تخفیف کی متحمل ہوسکتی ہے یا نہیں۔ خصوصاً جبکہ انسداد شراب نوشی کی پالیسی کی بدولت صوبہ کی آمدنی میں گھاٹا ہورہا ہے۔ یوں تو ہر اصلاحی اسکیم کو مشکلوں کا سامنا ہوتا ہے، مگر کانگریسی حکومتوں سے اُمید قوی ہے کہ وہ ہر مشکل کا حل نکال لیں گی، کیونکہ سعی صادق اور نیک نیتی کے آگے کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ کانگریسی حکومتیں بھی آمدنی کے دیگر معقول ذرائع نکال لیں گی۔

آرمی بل

کانگریس نے آرمی بل کی پوری طرح سے مخالفت کی، مگر برٹش سرکار نے مسلم لیگ اور بعض دیگر طبقوں کی مدد سے اپنا مجوزہ قانون پاس ہی کرالیا اور ممبران مسلم لیگ نے اِس بل کی حمایت میں دھواں دھار تقریریں کیں۔ اور کچھ ایسا خوف و ہراس دکھایا گویا اِس بل کے پاس ہوئے بغیر اُن کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائیگا۔ دراصل گورنمنٹ ہند نے اپنی حفاظت کے لئے یہ قانون پاس کرایا ہے نہ کہ ان حضرات کی جان و مال کی خیریت کے لئے۔

سندھ کی وزارت

اِسوقت سندھ کی موجودہ حکومت جس کے وزیر اعظم خان بہادر اللہ بخش ہیں معرض خطر میں ہیں اور عجب نہیں کہ جلد ہی اُس پر عدم اعتماد کا ووٹ پاس ہوجائے۔ کچھ دنوں سے سندھ کے سابق وزیر سر غلام حسین ہدایت اللہ صاحب اس کے لئے سرگرم کوشش ہیں۔ اللہ بخش کی وزارت کانگریس کی اعانت سے مرتب ہوئی تھی۔ لیکن کانگریس نے اب اپنی پوزیشن قطعی غیر جانبدارانہ کرلی ہے اور اگر عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی گئی تو کانگریس کسی فریق کی حمایت نہ کریگی۔ تاہم خان بہادر اللہ بخش صاحب نااُمید نہیں ہیں، اور وہ کانگریس کی اعانت حاصل کرنے کیلئے پوری کوشش کر رہے ہیں۔

آسام

آسام میں بھی حال ہی میں کانگریسی وزارت قائم ہوگئی ہے مگر وہاں ابھی دقتیں درپیش ہیں۔ اسمبلی کے وہ مسلمان جو سعد اللہ کی وزارت کے خلاف تھے، اب کانگریسی وزارت کی مخالفت کر رہے ہیں، تاہم یہ آٹھواں صوبہ ہے جسکی حکومت کانگریس کے ہاتھ میں آگئی ہے۔

آئندہ صدر کانگریس

اِس سال کانگریسی گدی پر غالباً مولانا ابو الکلام آزاد رونق افروز ہوں گے۔ سردار پٹیل کا بھی نام لیا جاتا ہے مگر اغلب یہی ہے کہ اِس مرتبہ مولانا موصوف کا انتخاب کیا جائے۔ ہماری رائے میں موجودہ حالات میں یہ انتخاب ہر حیثیت سے مناسب و موزوں ہوگا۔ ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھی جس کے لئے کانگریس اِسقدر سرگرم کار ہے، مولانا موصوف کا انتخاب بہت ممد و معاون ہوگا۔ مولانا کا ایثار، اُن کی حب الوطنی اور معاملہ فہمی سب ہماری تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔

(س۔ ب)

HOW TO STAMP OUT MALARIA.

ملیریا کو کس طرح نیست و نابود کیا جائے

امریکہ کے اخباروں کی سرخیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی جنوبی ریاستوں میں ملیریا کا بہت زور ہو رہا ہے۔ چنانچہ عام طور سے یہ دریافت کیا جا رہا ہے کہ علاج کے دوران میں بیماروں کو کتنی کونین دیجائے، اور یہ علاج کتنے دنوں تک جاری رکھا جائے۔ اور اس کے متعلق تمام ضروری معلومات حاصل کیجا رہی ہیں۔ اسمیں تو اب کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی کہ ملیریا کیلئے کون سی دوا چنی جائے۔ دیگر باتوں کے متعلق البتہ کچھ اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ملیریا کے علاج کے متعلق چند سال سے پہلے کے خیالات بالکل بدل گئے ہیں۔

پہلے تو ٹین یونیورسٹی نیو آرلینس کے ڈین باس نے اس علاج کی تائید و حمایت کی تھی جو عام طور پر کونین کا معیاری علاج کہلاتا ہے اور جس پر اس طریقۂ علاج کے آغاز کے وقت سے اس زمانہ کے بہترین طبیب عمل کرتے چلے آئے ہیں۔ اس معیاری طریقے پر عمل کرنیوالے طبیب اپنے مریضوں کو بخار ٹوٹنے تک دن میں تین تین گھنٹہ بعد پانچ گرین سے دس گرین تک کونین کھلاتے تھے۔ اور اسکے بعد آئندہ آٹھ ہفتے تک دس گرین کونین روز دیتے تھے۔

مگر اب مجلس اقوام کے ملیریا کمیشن اور امریکہ کے محکمہ پبلک ہیلتھ نے کونین کے مختصر علاج کے طریقے کی حمایت کی ہے۔ جو ڈاکٹر اس طریقہ پر عمل کرتے ہیں وہ اپنے مریضوں کو پانچ سات دن تک پندرہ ۱۵ بیس ۲۰ گرین کونین روزانہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر ملیریا دوبارہ ظاہر نہ ہو تو پھر کونین بالکل نہیں دیتے لیکن اگر ملیریا دوبارہ ظاہر ہو تو اسی طریقہ علاج کو دھرایا جائے اور حفظ ماتقدم کی حیثیت سے پھر چھ ۶ گرین کونین روزانہ کھانے کی سفارش کی ہے۔

اگرچہ ملیریا کوئی سخت بیماری نہیں ہے، لیکن امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں ہر سال چار ہزار موتیں ہوتی ہیں۔ غالباً ملیریا سے اس بھی زیادہ موتیں ہوتی ہیں لیکن ظاہر نہیں ہونے پاتی ہیں۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کونین ملیریا کا مجرب علاج ہے اور اس کو اسکی پوری شفا بخش حد تک استعمال کرنا چاہیئے۔

M.E. No. 34.

ملک کے مایۂ ناز ادیب اور شاعر

جناب احسان بن دانش

کی نظموں اور غزلوں کے دو مجموعے "نغیر فطرت" اور "نوائے کارگر" زیر ترتیب ہیں۔ کون نہیں جانتا؟ کہ احسان کا ہر شعر فطرت کا آئینہ دار اور درد کا علمبردار ہوتا ہے۔

دونوں مجموعوں کی قیمت چھ روپیہ ہوگی۔ مگر پیشگی رقم ارسال کرنیوالے اصحاب سے رعایتی قیمت صرف پانچ روپیہ وصول کیجائے گی۔

ملنے کا پتہ: مینجر ذیشان بکڈپو، مزنگ، لاہور

بہار

مولفہ جناب الیاس احمد صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی منصف

گلدستہ بہار فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے یا یوں سمجھئے کہ شعراء کی پاکیزہ زبان میں حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے آغاز عشق سے لیکر انجام عشق تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قایم کئے گئے ہیں۔ اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستے کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی دیوان کی ضرورت ہو۔ علم ادب میں یہ گلدستہ ایک قابل قدر اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے چہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ، اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت علاوہ محصولڈاک صرف عہ، ضخامت ۲۳۶ صفحے۔

ملنے کا پتہ: مینجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ

ہفتہ وار اخبار آزاد کانپور

(جس میں)

ہفتہ بھر کے اہم اور ضروری واقعات پر
آزادانہ رائے زنی ہوتی ہے

لیڈروں کی ضروری تقریروں کا
خلاصہ درج ہوتا ہے

ہندوستان کی ملکی و قومی تحریکوں اور جلسوں کے حالات

اور

سرکاری رپورٹوں کے دلچسپ اقتباسات شائع ہوتے ہیں

ایڈیٹر زمانہ کی ایڈیٹری میں ہر سنیچر کو
دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوتا ہے

قیمت سالانہ تین روپیہ   فی پرچہ ار   نمونہ مفت

خاص رعایت

خریداران زمانہ کے لئے تین ماہ کے لئے ایک خاص
رعایت یہ کیجاتی ہے کہ اُن کے نام آزاد صرف (عہ)
روپیہ سالانہ پر جاری کر دیا جائے گا۔

المشتہر
مینیجر آزاد و زمانہ کانپور یو۔پی

ملک کی مشہور اخبارات کی رائیں

گذشتہ پچیس ۲۵ سال کے اندر ملک کے بہت سے
مشہور و معروف اخبارات نے آزاد کے متعلق جو رائے
لکھی ہے اُنہیں سے بعض کے اقتباسات یہ ہیں:-

زمیندار (لاہور)

"منشی دیا نراین نگم کا آزاد بالکل نرالا ہے۔
اسکی طرز روش تعصب و ناواجب جنبہ داری
کی آمیزش سے پاک ہے۔ وہ ہندو مسلم
معاملات میں آزادی سے بحث کرتا ہے"

بہاری (بانکی پور)

"آزاد ایک بلند پایہ اُردو اخبار ہے اور
بالکل زمانہ کی روش پر نکالا گیا ہے"

ویدک میگزین (گورو کل)

آزاد نہایت لیاقت سے مرتب کیا جاتا ہے
اُس کے مضامین اور ایڈیٹوریل نوٹ
افراط و تفریط کے نقص سے پاک ہوتے
ہیں۔ جذبات کی سنجیدگی اور خیالات کی
بلندی اس کی دوسری خصوصیات ہیں۔

ونکٹشور سماچار (بمبئی)

"آزاد اپنے ڈھنگ کا ایک ہی پرچہ ہے۔
آزادی سے اپنے سنجیدہ خیالات ظاہر کرنے والا
اور طرفداری سے بالکل پاک اخبار ہے۔
قیمت صرف تین روپیہ سالانہ

مکتبہ جامعہ کی ایک نئی شاخ

مکتبہ جامعہ کی بُنیاد علیگڈھ میں ایک دوکان کی حیثیت سے کھولی گئی تھی، لیکن اللہ کے فضل وکرم، کارکنوں کی پیہم جدوجہد اور اربابِ ذوق کی ہمت افزائیوں کی بدولت اب وہ ہندوستان میں اُردو کتابوں کی اشاعت کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے، پہلے اُس نے ایک شاخ دہلی میں شہر والوں کی سہولت کے لئے کھولی، لاہور میں اہلِ پنجاب کی خاطر مستقل اِنتظام کیا گیا۔ اور صوبہ متحدہ کے پایۂ تخت (امین آباد) لکھنؤ میں بھی ایک شاخ یکم اگست سے کھولی گئی ہے۔

اُمید ہے کہ اودھ اور خصوصاً لکھنؤ کے اربابِ ذوق اِس سے فائدہ اُٹھاکر ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔

ایڈیٹر و پبلشر منشی دیا نرائن نگم بی اے
پرنٹر پنڈت سری بلبھ بسیروال پریس کانپور

نومبر ۱۹۳۸ء

مرتبہ، دیا نراین نگم، بی۔ اے۔

جلد ۷۱ نمبر ۵

فہرست

تصاویر:- نوابان اودھ - مولانا شرر لکھنوی - حضرت فراق گورکھپوری

۱- نوابان اودھ
حضرت وصل بلگرامی ۲۶۵

۲- دونوں کا ہمیشہ ساتھ رہے (نظم)
حضرت بسمل الہ آبادی ۲۷۲

۳- مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی
پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔ اے ۲۷۳

۴- شکوہ معقول و فضول (نظم)
پروفیسر ستیہ پرشاد مدہوش ایم۔ اے ... ۲۷۷

۵- کسی بیوفا سے (نظم)
حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی ۲۷۸

۶- قدرت کے کرشمے
مسٹر رام نراین نگم ۲۷۹

۷- تصویر دوست - در میخانہ (نظم)
مسٹر شائق ہندو لکھنوی ۲۸۸

۸- رشی کیش کے مناظر
ڈاکٹر پیارے لال سریواستو یہ لکھنوی ... ۲۸۹

۹- جلوۂ طور (نظم)
جناب سکندر علی صاحب وجدؔ بی۔ اے عثمانیہ ۲۹۲

۱۰- اردو - ہندی - ہندستانی
منشی شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔ اے ... ۲۹۳

۱۱- دریا (نظم)
مسٹر حسن یحییٰ عندلیب۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی۔ ۲۹۹

۱۲- ناچاری
پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ۔ ناشاد۔ ایم۔ اے ۳۰۰

۱۳- پیتالوزی
مسٹر محمد اسحاق۔ ایم۔ اے ۳۰۱

۱۴- تم یاد آتے ہو (نظم)
اختر ہمدمی۔ شاعر الہ آباد ۳۰۷

۱۵- جذبات فیاض (نظم)
حضرت فیاض گوالیاری بی۔ اے ۳۰۸

۱۶- حیوانات کا ماضی و مستقبل
پروفیسر تاج محمد خیال ایم۔ اے ۳۰۹

۱۸- ہستی مطلق (نظم)
مسٹر جگن ناتھ آزاد بی۔ اے ۳۱۲

۱۹- نوجوان بیچاری (افسانہ)
چودھری فدا محمد سکریٹری انجمن ترقی اردو گوجرانوالہ ۳۱۳

۲۰- تنقید کتب
نور مشرق۔ علم خانہ داری۔ فرہنگ عامرہ ... ۳۲۱

۲۱- رفتار زمانہ ۳۲۳

۲۲- علمی خبریں اور نوٹ ۳۲۴

قیمت سالانہ پانچ روپیہ

دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا

فی پرچہ سات آنہ

CROSS WORD COMPETITION NO. 13

Win Guaranteed Cash Prizes.

Rs. **300** will be daid to each entrant sending correct solution.
Rs. **120** will be paid to each entrant sending one error solution.
Rs. **50** will be paid to each eutrant sending two errors solution.
All these prizes are guaranteed.

ENTRANCE FEE: First Entry Rupee One. each subsequent Entry Annas 8 per entry.

Closing Date:
15th November, 1938,

N. B. Entrants living in Bombay may send their entries to reach us on the 2nd day after closing date 15th Nov. 38

1	DO—	swift running
2	MO—SE	animal
3	E — —	animal
4	SAMB — —	stag
5	MO — —	animal
6	SA— — —	animal
7	CA— — —	burden carrier

HOW TO SOLVE:-Substitute each dash in the accompanying diagram with a letter to find out the name of an ANIMAL having 4 legs Consult the Chambers's 20th Century Dictionary for these words and you will easily find them.

RULE:-Send your entries on plain paper with the fees as noted above by M. O. or Postal Orders M. O receipts and self addressed stamped envelopes should be enclosed along with the entries. Entrants sending large number of entries may simply show the alternatives on a single sheet of paper. Entries without prope fees will be disqualified and entrance fee will be forfeited Prizes will be awarded as shown above. Result and prize wil be sent 6 days after closing date, The Manager's decision wi be final and legally binding and is an express condition of entr Other rules as usual. Address your entries and fees to:-

The Manager,

NATIONAL TRADING Co.,

C. DEPARTMENT

Ravaji Building, Chandavarker Road, Kings Circle,

BOMBAY 19.

یونان کا بدترین دشمن

باوجود اس کے کہ صدیوں کی تعلیم کی ترقی سے اِس قدر معلومات حاصل ہوچکی ہیں اور ملیریا کے انسداد کے لئے بڑی بڑی گرانقدر تدابیر اختیار کی جاچکی ہیں تاہم ملیریا ابھی تک اِنسان کا سب سے بڑا دشمن نہیں تو ایک بہت بڑا دشمن ضرور ہے۔ قدیم زمانہ میں جب کونین ایجاد نہیں ہوئی تھی اور ہر بیماری کو خدا کا قہر خیال کیا جاتا تھا ملیریا واقعی انسان کی صحت کیلئے سب سے بڑی بلا تھی جس کے باعث اِسقدر جانیں ضائع ہو جاتی تھیں اور اِس لحاظ سے یہ طاعون سے بھی زیادہ مہلک مرض تھا۔

قدیم مصر و فلسطین میں ملیریا بڑے زور و شور سے پھیلتا تھا۔ لیکن ان ملکوں میں جانوں کا اِس قدر نقصان نہیں ہوتا تھا۔ جیسا کہ یونان میں ہوا کرتا تھا۔

مورخوں کی تصانیف پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں عتیقہ اور خصوصاً ایتھنز میں جو اس زمانہ میں دلدلوں کے درمیان واقع تھا، ملیریا ایسی وبا پھیلی تھی جس نے تمام آبادی کو تباہ و برباد کر دیا تھا یہ گویا اُس کے خاتمہ کی ابتدا تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم ہپوقراطین اعظم جو طب کا باپ مانا جاتا ہے، ملیریا کے متعلق بہت اچھی معلومات رکھتا تھا۔ کیونکہ اُس نے اپنی کتابوں میں مرض ملیریا کے علامات بڑی تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں اور لکھا ہے کہ جو لوگ نشیبی مرطوب اور گرم علاقوں میں رہتے ہیں وہ مریض صورت، کمزور اور مضمحل ہوتے ہیں اور جوان ہی مرجاتے ہیں اور اپنے بچوں کے سن بلوغ تک پہونچنے کا کوئی انتظام نہیں کرسکتے۔ اس کی رائے میں اُن کی بیماری کی وجہ دلدلوں کا پانی پینا ہے۔ اب بھی حالانکہ دو ہزار برس گذر چکے ہیں۔ یونان کو ملیریا کی وبا تباہ و برباد کرتی رہتی ہے لیکن اب اس مرض کے علاج کرنے میں وہ بے بسی باقی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک بہت ہی موثر حربہ یعنی کونین اس کے دفعیہ کے لئے مل سکتی ہے۔

لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ملیریا سے بچنے کیلئے ملیریا کی فصل میں ۶ گرین کونین روزمرہ استعمال کرنی چاہیئے اور اگر ملیریا ہوجائے تو پانچ سات روز تک پندرہ بیس گرین کونین استعمال کی جائے، افاقہ کے بعد کسی دوا کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر مرض پھر عود کرآئے تو اسی طرح سے علاج کیا جائے۔ غرض اب اِس طاقتور دوا کی بدولت ملیریا کی بیخ کنی ممکن ہوگئی ہے۔ اور غالباً قدیم یونان روایتی مرغ قفس کی طرح اپنی ہی جان سے پھر دوبارہ اُبھر کر زیادہ خوبصورت ہوجائیگا۔

محمد بہادر شاہ ظفر۔ خاتم السلاطین مرزا سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کے سوانح حیات اور شاعری پر سیر حاصل تبصرہ، از منشی محمد امیر احمد علوی بی۔اے۔ اس کتاب میں غدر ۱۸۵۷ء کے حالات بھی درج ہیں جس سے کتاب کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ قیمت عہ

کمالِ داغ۔ حضرت داغ دہلوی کے تمام دیوانوں کا انتخاب مع مقدمہ تنقیدی، مرتبہ مولانا حامد حسین صاحب قادری۔ اُردو غزل گوئی پر جدید زاویۂ نگاہ سے تنقید کر کے تغزل کے قدیم و جدید محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں داغ مرحوم کے دیوان گلزار داغ، آفتاب داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ کا بہترین انتخاب ہے۔ قیمت فی جلد عہ

نقش و نگار۔ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی کیفیت آور نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ نہایت خوبصورت جلد اور ڈسٹ کور۔ قیمت عا

فکر و نشاط۔ حضرت جوش کی نظموں کا تیسرا مجموعہ جو حال ہی میں جامعہ ملیہ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ عمدہ لکھائی چھپائی، بہترین جلد۔ غیر مطبوعہ نظمیں۔ قیمت عہ

راماین مسدس۔ مصنفہ جناب منشی راجی مل کپور۔ مصنف نے سری رامچندر کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز میں بیان کیا ہے۔ ہر شعر جلتا ہوا جادو ہے۔ لطف محاکات و بلند پروازیٔ تخیل قابل تحسین ہے۔ قیمت مجلد با تصویر دو روپیہ آٹھ آنہ عا۔ مجلد بلا تصویر دو روپیہ عا، غیر مجلد بلا تصویر ایک روپیہ آٹھ آنہ عہ

خیالاتِ عزیز۔ مجموعہ مضامین مولوی عزیز احمد صاحب جس کی باضابطہ رجسٹری کی گئی ہے۔ حجم ۲۰۰ سو صفحات ٹائٹیل خوشنما رنگین، لکھائی چھپائی اعلیٰ مع تصویر مصنف قیمت مجلد عہ۔ غیر مجلد عہ۔

نقش و نگار۔ مسٹر جلیل قدوائی کی دلآویز اور پر لطف نظموں کا مجموعہ جو ملک کے بڑے بڑے نقادوں سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

بہارِ سخن۔ پانسو چھیاسٹھ ہندو شعراء ماضی و حال کا نفیس تذکرہ ہے جس میں ہندو شعراء کے حالات، انتخاب کلام بترتیب حرف تہجی درج کئے گئے ہیں۔ قیمت عا

ہندو تیوہاروں کی اصلیت۔ اس کتاب میں منشی رام پرشاد صاحب بی۔اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول نے ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور اُن کی جغرافیائی کیفیت نہایت واضح اور آسان زبان میں لکھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کا اخلاقی اور تمدنی نظام اور ہندو تیوہاروں کی ضرورت پر اظہار خیال کیا ہے۔ اُردو ایڈیشن کی قیمت ۹ر، اور ہندی ایڈیشن کی قیمت جس میں اُردو ایڈیشن کے مقابلہ زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔ عہ

نصائح چانکیہ۔ یعنی نامور ہند چانکیہ کے مشہور و معروف نیتی کا ترجمہ، از پنڈت ہنمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام۔ قیمت ۶ر

فلسفۂ جنگ۔ ایک مشہور و معروف روسی تصنیف کے تحت میں فلسفۂ جنگ پر عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ ۴ر

ملنے کا پتہ:۔ **زمانہ بک ایجنسی کانپور**

زمانہ

نمبر ۵ — نومبر ۱۹۳۸ء — جلد ۷۱

نوابانِ اودھ[1]

(از حضرت وصل بلگرامی)

صوبۂ اودھ کو جو عزت و مرتبہ حاصل ہے، وہ ہندوؤں کے خیال سے شاید ہی کسی دوسرے صوبے کو میسّر ہو۔

ایک وہ زمانہ تھا جب اس صوبے میں بڑے بڑے پُرانے مشہور شہر اور خاص خاص تیرتھ کے مقام شامل تھے۔ قنوج اور جونپور کا نام صوبۂ اودھ ہی کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ بودھ سے بہت پہلے شیو جی اور راجہ دیبوداس کا گنگا پر بسایا ہوا شہر کاشی یا بنارس، جو پہلے باراستی کہلاتا تھا، اودھ ہی کی حد میں تھا۔ کرشن کی یادگار اور اُن کے ماموں کنس کی راجدھانی متھرا کا شمار بھی اودھ ہی میں تھا۔ پریاگ یا الٰہ آباد جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی کا سنگم ہے اسی صوبے کا تاریخی شہر اور تیرتھ کا مقام سمجھا جاتا تھا، کپل وستو جو گورکھپور کے قریب ہے، اور بودھ کے پیدا ہونے کی جگہ بتائی جاتی ہے پہلے اودھ ہی کی عزت کا سبب تھا۔ نیمسار جو اب بھی صوبۂ اودھ کے ضلع سیتاپور میں ہے، اودھ کے شروع دور میں آج کل سے زیادہ شہرت اور درجہ رکھتا تھا، یہ جگہ خاص تیرتھ کی ہے، یہاں بہت زیادہ تعداد میں مندر ہیں، اور ایک بہت بڑے گھیر کا نہایت گہرا تالاب جس کو چکر تیرتھ کہتے ہیں اب بھی موجود ہے۔ پہلے یہ صوبہ بہت دُور تک پھیلا ہوا تھا، اس کے اُتر ہمالیہ پہاڑ، پچھم اور دکھن

---

[1] یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے براڈکاسٹ ہوا تھا۔ اب حضرت وصل اور اسٹیشن ڈائرکٹر صاحب کی عنایت سے ہدیۂ ناظرین ہو رہا ہے۔

دریائے جمنا، اور پورب بہار کا صوبہ تھا۔

سب سے پہلے راجہ اکشاکو یعنی سورج بنسی یا یوں کہئیے کہ منو نے اسے آباد کیا، اُس وقت اس کا نام اُتر کوشل یا کوشال رکھا گیا تھا۔ مہاراجہ رامچندر یہیں پیدا ہوئے تھے، اور انھیں نے اپنے خاندان کے سب سے بڑے بزرگ راجہ اکشاکو کے نام کو روشن کرنے کے لئے اس کو اپنی راجدھانی بنایا تھا۔ مہاراجہ رامچندر کے بعد نہ اُن کا خاندان رہا نہ اُتر کوشل یا کوشال کا وجود۔ لیکن راجہ بکرماجیت نے مہاراجہ رامچندر کی یاد کو پھر زندہ کیا۔ پرانے نشانوں سے مٹی ہوئی جگہوں کا پتا لگایا، کثرت سے مندر بنوائے، اور اُس شہر کو جس کا نام و نشان تک نہ رہا تھا پھر بسایا۔ اُس وقت سے یہ شہر اجودھیا کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اجودھیا کا مادہ سنسکرت میں اجودھ ہے جس کے معنی قبضے میں نہ آنے والے کے ہیں، اور آج برہما کا نام ہے، اس لئے اس کا مطلب یہ ہوا کہ "خدا کا وہ شہر جو کسی دوسرے کے قبضے میں نہ آسکے۔" اور بعض اس کا مادہ جدھ بتاتے ہیں یعنی جنگ۔ اور چونکہ اسے بہادر سورج بنسیوں نے آباد کیا تھا اس لئے اس کو اجودھیا کہنے لگے۔ اجودھیا کے بعد اودھ نام پڑا چونکہ اودھ وعدے کو کہتے ہیں، اور مہاراجہ رامچندر چودہ برس بن باس کے بعد واپس آنے کا وعدہ کرگئے تھے اس لئے اودھ نام رکھکر اُس وعدے کی یادگار قائم کی۔

اُس زمانے کی اجودھیا کا اگر صحیح اندازہ کرنا ہے تو والمیک کی رامائن پڑھیئے جس میں اُس نے عجیب انداز سے اجودھیا کی تصویر کھینچی ہے۔ اور اُس کے خدوخال کو جس حسن اور جس خوبی سے دکھایا ہے وہ اُسی کا حصہ ہے۔ اُس وقت کے رہنے سہنے کا طریقہ، اُس وقت کے لباس کا دستور اُس وقت کی شادی بیاہ کی رسمیں، اور اُس زمانے کے کھانے پینے کی چیزیں کیا تھیں اور اُن کا رواج کیا تھا؟ اگر ان کو بیان کیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا۔ صرف عمارت کا حال سُن لیجئے۔ مہابھارت کے زمانے سے پہلے عمارت میں صرف مٹی، پھوس اور لکڑی کو کام میں لاتے تھے، اُس کے بعد چونا۔ اینٹ پتھر وغیرہ نظر آنے لگا، اور پھر تو تانبا، لوہا، سونا، چاندی عمارت کی زینت کے لئے ضروری ہوگئے شاہی محل ٹیلوں پر بنتے، اور قلعے شہر کے درمیانی حصے میں، ان میں سے کوئی طریقہ ایک حالت پر قائم نہیں رہا۔ زمانہ کروٹیں بدلتا رہا، اور اُس کے ساتھ ہر طرز اور ہر رواج میں تبدیلی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ۱۱۳۲ھ ہجری کا وہ زمانہ آیا جب برہان الملک صوبہ اودھ کے حکمران ہوکر آئے۔ یہ پہلے آبادی کے باہر خیموں میں ٹھہرے، پھر پھوس کے بنگلے میں رہنے لگے۔ لوگوں نے اس مقام کو بنگلہ کہنا شروع کیا۔ اس کے بعد اس کا نام فیض آباد ہوگیا۔ برہان الملک کے جانشین صفدر جنگ کے بعد شجاع الدولہ

نے ۱۷۷۵ء سے فیض آباد کو فیض آباد بنا دیا۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ نے لکھنؤ کو رونق و ترقی دی، لکھنؤ کا اصل نام لکشنا وتی، یا لکشنا پوری بتایا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مچھی بھون بنانے والے راج کا نام لکھنا تھا جس کی نسبت سے اس کا نام لکھنا وتی یا لکھنوتی یا لکھنا ؤ پڑ گیا، جو بعد میں لکھنؤ ہو گیا۔ لیکن اکثر تاریخ لکھنے والوں کی رائے ہے کہ اسے مہاراجہ لچھمن نے جو مہاراجہ رامچندر کے بھائی تھے، آباد کیا تھا۔ مہاراجہ لچھمن نے اس کی بنیاد پکے پل کے قریب ڈالی تھی، پہلے اس کو لچھمن پور کہتے تھے جو بدلتے بدلتے لکھنؤ ہو گیا۔ یہاں بلندی پر جو آبادی تھی، وہ لچھمن ٹیلا کہلاتی تھی، جو آج شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلا مشہور ہے۔

مسلمان سب سے پہلے یہاں سید سالار مسعود غازیؒ اور اُن کے بعد ۱۲۰۲ء میں بختیار خلجی کے ساتھ آئے، اور جہاں اب مچھی بھون ہے، ایک قلعہ بنوایا۔ شہنشاہ اکبر کے عہد میں یہ شہر لکھنؤ کہلایا۔

اُوپر بیان ہو چکا ہے کہ ۱۱۳۲ھ میں برہان الملک صوبۂ اودھ کے حکمران ہو کر آئے، ان کا نام میر محمد امین تھا۔ یہ ۱۷۰۸ء میں نیشاپور سے عظیم آباد آئے، وہاں سے دہلی گئے، زمانہ موافق تھا اور قسمت یاور، ترقی کے موقعے ملنے لگے۔ یہاں تک کہ محمد شاہ کا زمانہ آیا، محمد شاہ نے ان کی وفاداریوں اور جاں فروشیوں کو دیکھکر پہلے سعادت خاں بہادر اور بعد کو بُرہان الملک کا خطاب عطا فرمایا۔ یہاں تک کہ صوبۂ اودھ کی حکومت ان کے سپرد کر دی۔ میر محمد امین سیدھے لکھنؤ آئے لکھنؤ کے سرکش شیخ زادوں کو بڑی حکمت عملی سے قابو میں کیا۔ اور مچھی بھون کے اُس قلعہ پر جسکو اُنھوں نے بڑے اہتمام سے بنوایا تھا، قبضہ کر لیا۔ اس طرح لکھنؤ پورے طور پر برہان الملک کا ہو گیا۔ اِس سے فارغ ہو کر برہان الملک اجودھیا گئے۔ بنگلے کی بنیاد ڈالی۔ اور اسی کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ برہان الملک کو چھ برس اودھ پر حکومت کرتے گزرے تھے کہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے کی وجہ سے محمد شاہ نے اُنھیں دہلی بُلا لیا۔ اِن واقعات کی تفصیل تاریخوں میں موجود ہے جس روز نادر شاہ قتل و غارت کرکے اور ہندوستان کی دولت لُوٹ کر دہلی میں داخل ہوا ہے اُسی روز اور اُسی تاریخ یعنی اُنیسویں ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ کو منگل کے دن برہان الملک نے انتقال کیا، اور دہلی ہی میں دفن ہوئے۔

برہان الملک کے انتقال کے بعد اُن کے بھانجے اور داماد، مرزا مقیم صفدر جنگ کو نادر شاہ نے محمد شاہ سے صوبۂ اودھ کی وزارت کا خلعت دلوایا۔ صفدر جنگ اودھ میں پانچ سال سے

پھر یہ بھی دہلی بلا لئے گئے۔ ان کے دیوان یا بخشی راجہ نول رائے اُن کی قائم مقامی کرتے رہے وہاں برابر ترقیاں پانے کے باوجود صفدر جنگ کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوا۔ گنگا و جمنا کے دوآب کے درمیان مرہٹوں نے قدم جما لیا۔ احمد خاں بنگش سے لڑنا پڑا۔ راجہ نول رائے مارے گئے۔ بنگش کے ساتھ افغانوں اور روہیلوں نے بھی سر اُٹھایا۔ آخر شیخ زادگان لکھنؤ کی مدد سے صفدر جنگ نے پٹھانوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔ دو سال بعد بنگش سے بھی صلح ہو گئی۔ صفدر جنگ پھر اپنے صوبے میں آئے۔ زیادہ زمانہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ اکتوبر ۱۷۵۲ء یا ۱۷۵۳ء کو پاپر گھاٹ میں سلطان پور کے قریب دنیا سے چل بسے۔ گلاب باڑی فیض آباد میں دفن کئے گئے۔ بعد کو ان کی لاش دہلی میں منتقل کی گئی، جہاں آج بھی صفدر جنگ کا مقبرہ ایک خوشنما عمارت کی صورت میں نظر آ رہا ہے۔

صفدر جنگ کے بعد شجاع الدولہ وزیر ہوئے۔ ان کے زمانے میں ایسی ایسی خونریز لڑائیاں پیش آئیں جو کبھی تاریخ کے صفحوں سے نہیں مٹ سکتیں، پانی پت کی زبردست جنگ اس کی گواہ ہے۔ اس کے چار سال بعد بکسر کی لڑائی ہوئی، شجاع الدولہ کو صلح کرنا پڑی۔ ۱۱۷۹ھ میں یہ پھر فیض آباد واپس آئے، اور اپنے انتظام کی خوبیاں دکھاتے ہوئے ۲۹ جنوری ۱۷۷۵ء کو دنیا سے رخصت ہو گئے اور گلاب باڑی فیض آباد ہی میں دفن ہوئے۔

ان کے بعد نواب آصف الدولہ ان کے جانشین ہوئے، جو رات دن عیش پرستی میں مصروف رہتے تھے۔ مگر تھے بڑے فیاض، عوام ان کو ولی سمجھ کر کہتے "جسے نہ دے مولا اُسے دے آصف الدولہ" ہندوؤں کا تذکرہ کے منھ سے آنکھ کھلتے ہی نکلتا "یا آصف الدولہ ولی"۔ اور عمارتوں کے علاوہ آصف الدولہ کی سب سے بڑی یادگار ان کا امام باڑہ ہے۔ آصف الدولہ کے لکھنؤ میں قیام کی وجہ سے تمام فیض آباد لکھنؤ آ گیا تھا، یہاں تک کہ دہلی کے کاملوں نے دہلی چھوڑ کر لکھنؤ کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ستمبر ۱۷۹۷ء میں انھوں نے انتقال کیا، ان کی قبر ان کے امام باڑے ہی میں ہے۔

آصف الدولہ کے کوئی اولاد نہ تھی، انھوں نے ایک سید زادے وزیر علی کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا جو ان کے بعد ان کا جانشین بنایا گیا، لیکن نااہل ہونے کی وجہ سے چار مہینے کے بعد ہی معزول کر دیا گیا۔ اور نواب سعادت علی خاں آصف الدولہ کے بڑے بھائی وزیر قرار پائے۔ انھوں نے تخت پر بیٹھتے ہی نصف ملک انگریزوں کے حوالے کر دیا لیکن اپنے حسن انتظام سے اپنی نصف مملکت بہت بڑھا دکھایا۔ یہ نہایت کفایت شعار، بیدار مغز اور مدبر تھے۔ روپیہ جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔

اور فن جاننے والوں کی ہر وقت مدد کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے ۱۱۔جولائی ۱۸۱۴ء کو دُنیا سے کوچ کیا۔ ان کا اور اُن کی بیگم کا مقبرہ آج بھی قیصر باغ میں ان کی یاد دلا رہا ہے۔

اِن کے بعد ان کے بیٹے غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے، باپ کی جمع کی ہوئی دولت پانی کی طرح بہنے لگی۔ اودھ کے حکمرانوں میں سب سے پہلے غازی الدین حیدر نے یوروپین لیڈی سے شادی کی، اور انھیں نے سب سے پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے "بادشاہ" کا خطاب پایا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے جس نے جنگلی درندوں کو پالنے اور لڑانے کو رائج کیا وہ غازی الدین حیدر ہی تھے۔ انھیں نے نجف اشرف کی نقل موتی محل کے قریب بنوائی۔ ۱۹۔اکتوبر ۱۸۲۷ء کو انتقال کیا اور اپنے تعمیر کردہ نجف والے امام باڑے میں دفن کیے گئے۔

اِن کے بعد اِن کے بیٹے نصیر الدین حیدر کو تخت و تاج ملا، آخر یہ بھی چھ کروڑ روپیہ صرف کر کے عیش و عشرت کرتے ہوئے ۷۔جولائی ۱۸۳۷ء کو دنیا سے چل بسے۔ گومتی پار جو کربلا مکارم نگر میں انھوں نے بنوائی تھی اُسی میں ان کی قبر ہے۔

ان کے بعد نواب سعادت علی خاں کے بڑے بیٹے محمد علی شاہ بادشاہ ہوئے۔ یہ نہایت منتظم تجربہ کار اور زمانہ دیکھے ہوئے تھے ۶۔مئی ۱۸۴۳ء کو ان کا انتقال ہوا، اپنے بنوائے ہوئے حسین آباد کے امام باڑے میں دفن ہوئے، اس امام باڑے کے علاوہ وہیں پر ایک عالی شان مسجد ان کی یادگار ہے

ان کے بعد اِن کے بیٹے امجد علی شاہ سلطنت کے مالک ہوئے، صرف چار سال دس ماہ اور چار دن سلطنت کی۔ ۱۳۔فروری ۱۸۴۷ء کو انتقال کیا۔ ان کی قبر رسالدار مینڈھو خاں کی چھاؤنی میں ہے۔

امجد علی شاہ کے بعد اُن کے بیٹے سلطان عالم واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ یہ بچپن سے رنگین مزاج تھے، جس کا ذکر واقعات کے ساتھ خود انھوں نے اپنی مثنوی میں کیا ہے، اختر تخلص تھا عمارتوں کے بیحد شائق تھے۔ قیصر باغ جس میں اسی لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا انھیں کی یادگار ہے۔ ان کی رنگ رلیاں مشہور ہیں۔ اِن سب مصروفیتوں کے ساتھ علمی مشغلے بھی جاری تھے۔ انتظام سلطنت کی طرف کافی توجہ نہ کرنے کی وجہ سے ۴۔فروری ۱۸۵۶ء کو معزولی کا حکم سُننا پڑا۔

۳۔مارچ ۱۸۵۶ء کو انھوں نے لکھنؤ چھوڑا۔ ۱۳۔مئی ۱۸۵۶ء سے برابر کلکتے میں رہے۔ ۹۔جولائی ۱۸۵۹ء سے مٹیا بُرج کو زینت دی اور لکھنؤ کی طرح اس کو بھی کیا سے کیا بنا دیا۔ ۲۱۔ستمبر ۱۸۸۷ء کو یہ اودھ کا نامور آخری تاجدار دنیا سے چل بسا۔ انتقال کے تیسرے روز مٹیا برج کے امام باڑے سبطین آباد میں دفن کیے گئے۔ ان کے بیٹے برجیس قدر کو بھی مٹیا برج کی خاک مٹیا برج لے گئی، وہیں انھوں نے

بھی انتقال کیا، اور اس طرح اس خاندان کے ساتھ سلطنت اودھ جو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اب اس کے اصل نام و نشان کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

شاہانِ اودھ کے زمانے کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ یقیناً ایک حد تک ذہنی ترقی سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اس کا کھلا ہوا اثر جس چیز پر پڑا وہ یہاں کی معاشرت تھی۔ جب تک برہان الملک یہاں نہیں آئے تھے، یہ حصۂ زمین اگر تاریخی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جائے، بہت معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ علم و فضل یا تہذیب و شائستگی کی کوئی قابلِ ذکر خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی۔ لیکن ان کے آنے کے بعد اس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ اور اس نے تمام شمالی حصے کے لئے ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لی، جو رفتہ رفتہ زیادہ اہم، زیادہ دلچسپ اور زیادہ رنگین ہو گئی۔

کہا جاتا ہے اور غالباً غلط نہیں کہ لوگوں کا مشرب وہی ہو جاتا ہے جو فرمانرواؤں کا ہوا کرتا ہے اور چونکہ شاہانِ اودھ کی زندگی حقیقت میں دوسرا نام تھا دنیا کی فکریں بھلا دینے کا، اس لئے اس زمانے میں لکھنؤ عبارت تھا ایسی آبادی سے جس نے دن کو رات اور رات کو دن بنا لیا تھا۔

انسان فطرتاً عیش پسند واقع ہوا ہے یعنی وہ کم سے کم محنت کر کے زیادہ سے زیادہ آرام حاصل کرنے کی تمنا رکھتا ہے۔ اور چونکہ شاہانِ اودھ کی فیاضیوں نے لوگوں کی اس آرزو کے پورے ہونے میں بہت مدد دی، اس لئے قدرتاً یہاں وہی ذوق پیدا ہونا چاہیئے تھا، جو کام کی باتوں سے متعلق ہو یا نہ ہو، لیکن تفریحی پہلو ضرور رکھتا ہو۔ پھر دیکھئے اُس زمانے میں کیا ہوا اور کیا نہ ہوا لکھنؤ تو لکھنؤ اس کے آس پاس کے قصبوں نے جو علم و فضل کے کارنامے دکھائے وہ دوسری جگہ مشکل سے نظر آئیں گے۔ شاعری نے یہیں ترقی کی، اس میں جو پہلے بھی پیدا ہوئے، رنگینیوں کا اضافہ بھی ہوا اور رہنے سہنے کے وہ تمام خوبصورت اور نظر فریب پہلو جو اس وقت اندر باہر دونوں جگہ فضا کو رنگین بنائے ہوئے تھے، شاعری میں بھی ظاہر ہونے لگے۔ اسی کے ساتھ موسیقی نے بھی خاص ترقی کی، اور اچھے اچھے فن کے جاننے والے دُور دُور سے کھنچکر یہاں آنے لگے۔ ناچ رنگ کی محفلیں گرم ہونے لگیں، عیش و نشاط کے جلسوں کا ہنگامہ عام ہو گیا۔ وضع قطع میں بانکپن جھلکنے لگا۔ تکلف اور بناوٹ گھُٹی میں پڑ گیا۔ بول چال میں نیا نکھار پیدا ہو گیا۔ اُٹھنے بیٹھنے کے طریقوں میں لوچ آ گیا، نئے نئے کھانے ایجاد ہوئے، نئے آداب جاری کئے گئے۔ الغرض زندگی کا ہر پہلو بالکل بدل گیا۔ آخر کار لکھنؤ مع اپنی تمام آبادی کے اس دنیا کی چیز ہی نہیں رہا، بلکہ اُس دنیا سے متعلق ہو گیا جہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوتی۔

ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر کیفیت ایک جگہ پہونچکر ختم ہو جاتی ہے، اور پھر وہی ابتدائی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر کب تک زمانہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ سب کچھ دیکھتا رہتا، اُس کی نگاہ پھری، اُس کی نظر بدلی اور سلطنتِ اودھ کے ختم ہوتے ہی یہ محفل اپنی تمام رنگینیوں، نزاکتوں تکلف اور بنوٹ کو لئے ہوئے درہم برہم ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاہانِ اودھ کا زمانہ اپنی تہذیب و معاشرت کے لحاظ سے نہایت دلچسپ زمانہ تھا۔ لیکن تھا وہ حقیقتاً ایک خواب اور آخر کار خواب ہی کی طرح ختم ہوگیا۔

دردِ محبت کیا کہئے؟

(جنرل والاشان نواب معظم جاہ بہادر شجیع شہزادۂ دکن)

دل پہ ہوئی پھر چشمِ عنایت، وجہِ عنایت کیا کہئے
درد بھی ہے اپنی ہی ضرورت، ان کی ضرورت کیا کہئے

انکے تبسم پر ہیں نظریں، غم کا نہ سمجھا راز کوئی
اُن کا تبسم ہے کہ ہمارے غم کی حقیقت کیا کہئے

کس کی شکایت کس کا گلہ، اپنا ہی قصور اپنی ہی خطا
ہم نے بہت کچھ رنج اٹھایا، دل کی بدولت کیا کہئے

لب پہ ہزاروں شکوے تھے جب اُن سے نگاہیں چار ہوئیں
بھول گئے ہم سارا فسانہ، غم کی حکایت کیا کہئے

پوچھنے والے پوچھ رہے ہیں، غم کے بندے چپکے ہیں
راز ہے اُن کا دردِ محبت، دردِ محبت کیا کہئے

چہرہ زرد، نگاہیں غمگیں، رات کا قصہ چھپ نہ سکا
شامِ الم کے بعد ہی آئی صبحِ قیامت کیا کہئے

کل تک جن کی جنبش سے ظاہر تھے شجیع آثارِ ستم
آج اٹھاتی ہیں وہ نگاہیں بارِ ندامت کیا کہئے

دونوں کا ہمیشہ ساتھ رہے!

(از جناب بسمل الہ آبادی)

(۱)

ہندو بھی مسلماں بھی سوچیں، اس کشت و خوں سے کیا حاصل
یہ جوش بُرا ہے آپس کا، اس جوشِ جنوں سے کیا حاصل
مسجد توڑی مندر توڑا، اپنے اپنے سر کو پھوڑا
اللہ کے گھر کا یہ نقشہ، افعالِ زبوں سے کیا حاصل

کیوں ہاتھا پائی کرتے ہو، کیوں لڑتے ہو کیوں مرتے ہو
کیوں خون بہاتے جاتے ہو اس بارشِ خوں سے کیا حاصل
ہر لاگ بُری ہر آگ بُری، ہر رنگ بُرا ہر ڈھنگ بُرا
جو پھونک دے اپنے گھر کو بھی اس سوزِ دروں سے کیا حاصل

اے اہلِ وطن مانو کہنا، یوں ہرگز تیغ بدست نہ ہو
تم پستی میں پہلے ہی سے ہو اب اور بھی مٹ کر پست نہ ہو

(۲)

اک ایک سے یہ کہتا ہوں میں، ہاں ہند وطن ہے دونوں کا
تم دونوں اس کے مالی ہو، بے شک یہ چمن ہے دونوں کا
مندر میں سنکھ بجانے دو، مسجد میں اذانیں دینے دو
کیوں رنج کہن ہے دونوں میں کیا رنج کہن ہے دونوں کا

بس یادِ خدا میں مست رہو، کیوں جنگ کرو کیوں مفت لڑو
اغیار اسی پہ ہنستے ہیں، بدنام چلن ہے دونوں کا
یہ سوچ لو تم اپنے دل میں کیا نفع ہے لڑنے بھڑنے میں
نقصان کسی کا اور نہیں، نقصان ہمہ تن ہے دونوں کا
بسمل کی نصیحت دل سے سنو، لاج اپنی اپنے ہاتھ رہے
مل جاؤ گلے سنگم کی طرح دونوں کا ہمیشہ ساتھ رہے

مولانا محمد عبدالحلیم شرر لکھنوی

پیدائش سنہ ۱۸۶۰ء وفات سنہ ۱۹۲۶ء

یادش بخیر مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی

(از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم۔اے)

کئی سو برس پہلے محمد تغلق کے وقت میں مولانا شرر کے بزرگ عرب سے ہندوستان آئے اور یہیں بس گئے۔ ضلع جونپور اور اعظم گڈھ میں مولانا کے بزرگوں کی جاگیریں تھیں۔ مولانا کے پردادا مولوی نظام الدین قصبہ کرسی میں آ بسے۔ مگر چند ہی دن بعد مسٹر مارٹن جن کے نام کو لکھنؤ میں مارٹین کی کوٹھی آج بھی یاد دلا رہی ہے۔ مولوی نظام الدین کے شاگرد ہوگئے اور اُستاد کو ایسا نوازا کہ وہ بال بچوں سمیت لکھنؤ میں آکر رہنے لگے اور یہیں سنہ ۱۸۶۰ء میں مولانا عبدالحلیم شرر مارٹین کی کوٹھی میں پیدا ہوئے۔ مولانا کے والد بہت بڑے عالم اور حکیم تھے اور ان کو حکمران اودھ واجد علی شاہ کے پاس لکھنؤ سے کلکتہ جاکر مٹیا برج میں رہنا پڑا۔ لیکن مولانا عبدالحلیم شرر ابھی بہت چھوٹے تھے کل چار پانچ برس کی عمر تھی اس لئے وہ انھیں ننہال (لکھنؤ) چھوڑ گئے اور یہیں شرر کی تعلیم ہوئی۔ شرر نے الف بے شروع کی، لیکن تین سال میں ایک سبق سے آگے نہ پڑھ سکے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات مشہور مثل ہے لیکن زندگی کبھی کبھی اس مثل کو جھٹلا بھی دیتی ہے۔ شرر ہونہار بروا ضرور تھے لیکن اس بروا کے چکنے چکنے پات نہ تھے۔ باپ نے جب دیکھا کہ یہ حال ہے تو اپنے پاس کلکتہ بُلا لیا۔ یہاں شرر کے دل و دماغ کے جوہر چمکے، لیکن شہزادوں کی صحبت میں ذرا کیا اچھے خاصے بہک گئے۔ کچھ بدنام ہوئے مگر کچھ دنیا بھی دیکھ لی۔

رُسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم ۔۔۔ بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہوگئے

باپ نے پھر اچانک لکھنؤ واپس بھیجدیا۔ مولانا شرر نے کم و بیش چالیس ہزار صفحات اپنی عمر بھر میں لکھے ہونگے، ناولوں اور مضمونوں کے پہاڑ کے پہاڑ لگا دیے۔ اور لکھنؤ آکر یہ کام شروع کردیا، اور یہ بھی نہیں کہ کسی شاعر کی طرح ایک تکیہ میں بیٹھکر جگر کا خون ٹپکایا ہو، بلکہ مولانا کی زندگی کے واقعات، ان کی نوکریاں، ان کے مشغلے، اُن کی جائے سکونت سب ہی بدلتے رہے۔

؎ یہ مضمون لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈکاسٹ ہوچکا ہے

مولانا بنجارے کی طرح دلیس بدیس مارے پھرے، بچپن ہی میں لکھنؤ سے کلکتہ اور کلکتہ سے لکھنؤ کی راہ ناپ ڈالی۔ اس کے بعد ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، پھر دلی، حیدر آباد دکن، ایشیا کے اسلامی ملکوں اور انگلستان کی سیر رہی۔ ناول پر ناول، مضمون پر مضمون، کتاب پر کتاب، رسالہ پر رسالہ، اخبار پر اخبار۔ اس پریشان حالی میں مولانا کے قلم سے اس طرح برستے رہے، جیسے ساون کی جھڑی لگ جائے۔ مولانا کے پاؤں اور قلم اور تقدیر سبھی میں سنیچر بستا تھا۔ خود بھی آرام نہ لیا اور جس جس سے چل گئی اُسے بھی آرام نہ لینے دیا۔ اس سے بحث نہیں کہ جو علمی تاریخی مذہبی یا ادبی جھگڑے مولانا نے مول لئے ان میں کون ہارا اور کون جیتا۔ بہرحال مولانا نے غزل وزل تو یونہی سی کہکر نظم طباطبائی کو دکھا دی مگر وہ تخلص کے لحاظ سے اسم بامسمیٰ ضرور تھے۔ یہ چنگاری ہوا کے تیز جھونکوں سے نہ بجھی۔

تخلص کی وہ چنگاری تھی جس نے اک جہاں پھونکا
ادھر چمکی اُدھر سلگی، یہاں پھونکا، وہاں پھونکا

آج سے پچیس تیس برس پیشتر جب میں نے لڑکپن میں مولانا کا تخلص پہلے پہل سُنا تو دل ہی دل میں مجھے حیرت سی ہوئی تھی، کہ آخر سیکڑوں ہزاروں تخلص میں "شرر" کیوں چن لیا گیا۔ کیا عجب آپ کو بھی اس انتخاب پر کچھ نہ کچھ تعجب ہوا ہو، مجھے تو کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ منشی احمد علی کسمنڈوی نے جب مولانا کے لئے یہ تخلص تجویز کیا تو مولانا کی تخیل ذہانت اور ان کے رنگ طبیعت کو دیکھکر منشی احمد علی صاحب کے منھ سے اتفاقیہ "شرر" نکل گیا ہوگا۔

میں نے مولانا شرر کی ایک تصویر کسی رسالے میں دیکھی ہے۔ مولانا تصویر میں کھڑے ہیں اور غالباً ہاتھ میں ایک عصا ہے۔ سر پر وہ ٹوپی ہے جسے لوگ غلطی سے ابتک ترکی ٹوپی کہتے ہیں مولانا ایک سادہ اور ڈھیلی لیکن اچھی سِلی ہوئی (غالباً) حیدر آباد کی شیروانی پہنے ہوئے ہیں۔ پاجامہ مجھے خیال نہیں آتا کہ کس وضع کا ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد آتا ہے چوڑی دار پاجامہ نہیں تھا صورت اتنی بزرگانہ ہے کہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ڈریں یا عزت کریں، لیکن مولانا کی تصویر میں سب سے زیادہ قابل ذکر چیز مولانا کی داڑھی ہے جو نہایت چوڑی اور چھتنار اور گنجان ہے اور بالکل سفید ہے۔ مولانا شرر کی زندگی اور اُن کی لکھی ہوئی کتابوں کی فہرست مضامین معلوم ہوتی ہے، اس داڑھی کو دیکھتے ہوئے شرر کا تخلص ذرا خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

مولانا نے اپنی زندگی اور اپنی تحریروں کا ایک اچھا خاصہ معرکہ آرائیوں کے نذر کر دیا۔ کیا

معرکے سر کئے اور کئی معرکوں میں سر ہوئے۔ یہ معرکے مذہبی، ادبی، تاریخی اور افسانوی معرکے تھے
حیدرآباد میں حضرت امام حسین کی صاحبزادی حضرت سکینہ کی سوانحعمری لکھی جس سے ایک بڑی
جماعت میں ایسی برہمی پیدا ہوئی کہ مولانا کو حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ کچھ دنوں بعد یہ آگ بجھی تو پھر
حیدرآباد کا آنا جانا شروع ہوا، لیکن پھر ہوا بدلی اور ۱۹۰۹ء میں نظام کے حکم سے مولوی عزیز مرزا
مولوی ظفر علی خاں، مولوی صفی الدین اور مولانا شرر سلطنت دکن سے ہمیشہ کے لئے باہر کر دیئے
گئے۔ مولانا کے ایک ناول میں ایک ہندوستانی ریاست پر وہ شرر باریاں کی گئی ہیں کہ مومن
کا مصرعہ "جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کر چھوڑا" یاد آ جاتا ہے۔ اور اس آگ لگنے سے گویا جب
گھر والا بھاگتا ہے تو مولانا حسن کا ڈاکو' لکھکر معلوم ہوتا ہے کہ للکار رہے ہیں۔ مولانا نے سر والٹر
اسکاٹ کے ناول (The Talisman) میں صلیبی لڑائیوں کا بیان پڑھا جس میں مسلمانوں
کو نیچا دکھانے اور عیسائیوں کے نام اور کام کو اچھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا نے ملک العزیز
ورجنا لکھکر پانسا پلٹ دیا۔ تاریخ سندھ میں ان تمام الزامات کا جوش و خروش سے جواب دیا
جو سندھ کی تاریخ کے سلسلہ میں مسلمانوں پر لگائے گئے ہیں۔

رفیق ہند اخبار میں راجہ بلی کے نام سے پادری رجب علی اکثر مضامین لکھتے تھے۔ راجہ بلی
نے ایک بار لکھا کہ مولانا شرر کے رسالۂ محشر کا جو رنگ ہے، وہ عاشقی اور شاعری کی دنیا کے
ساتھ مخصوص ہے۔ اگر اڈیٹر محشر کو دعویٰ ہے تو ان دو چار سبجکٹوں پر زور طبع دکھائیں جو ہم بتاتے
ہیں۔ ایک سبجکٹ "روح" کا اُنھوں نے بتایا، ایک یہ کہ "ہندوستان کے لئے استمراری بندوبست
مناسب ہے یا میعادی"۔ اور اسی طرح کے اور بھی ٹھوس علمی عنوانات تھے۔ مولانا نے اسی رنگ
میں نہایت پرزور مضامین لکھکر محشر میں شائع کئے، جن کو دیکھکر لوگ عش عش کرنے لگے، اور
راجہ بلی صاحب نے خاموشی اختیار کی۔ "روح" کا مضمون تو سرسید احمد کو اتنا بھایا کہ انھوں نے قرآن
کی شرح میں اس کے حصے شامل کئے۔ لیکن مولانا کا سب سے زبردست ادبی معرکہ وہ تھا جو آج
بھی معرکۂ "شرر و چکبست" کے نام سے مشہور ہے۔ اور مثنوی گلزار نسیم سے متعلق ہے۔ دنیا جانتی
ہے کہ اس معرکہ میں مولانا شرر نے منہ کی کھائی لیکن سوا چکبست کے کسی اور کا کام بھی نہیں تھا
کہ قلم کے اس سورما سے لوہا لے سکے۔ آج شرر و چکبست دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دونوں
نے ایک ہی سال یعنی ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔ اور موت کے سناٹے میں ان معرکہ آرائیوں کو
بھول جاتے ہیں، اور ہماری آنکھوں کے دامن سے آنسوؤں کے پھول دونوں کی یاد میں

گزرتے ہیں ہم شرر کی قدر و منزلت کا اندازہ کس طرح لگائیں۔ یہ شخص جیتا جاگتا چلتا پھرتا ہوا انسائیکلوپیڈیا تھا۔ محض اس کی کتابوں اور مضامین کی بھرمار دیکھکر ہم پر رعب سا چھا جاتا ہے آپ اِن تمام کارناموں کو سنگ مرمر کی چٹان یا ہمالیہ یا قطب مینار نہ مانیں لیکن ہزارہا فٹ لمبا چوڑا مٹی کا ٹیلا دیکھکر بھی نگاہیں اُٹھ ہی جاتی ہیں، اور یہ ٹیلا اُوسر یا بنجر بھی نہیں ہے۔ کہیں گھنے سایہ دار درخت ہیں تو کہیں چشمے اور تالاب ہیں، جن کے کنارے سبزہ زار لہک رہے ہیں اور ریگستانی اور بیابانی حصوں میں بھی کہیں نخلستان ہیں تو کہیں لالہ زار لہلہا رہے ہیں۔ کہیں جھاڑیوں اور کھاڑیوں نے کانٹوں اور سنگ ریزوں کا دامن دُور دُور تک پھیلا رکھا ہے۔ کہیں واقعات اور ساخات کے دفینے ہیں، کہیں پریوں کا غول ہے اور کہیں پرانی تاریخ اپنی پرچھائیاں ڈال رہی ہے۔ لیکن شرر کو محض متفرق علوم اور موضوعات کا مصنف کہہ کر نہیں ٹال سکتے ہیں ناول نویسی میں لوگ اُن کو کبھی رچرڈسن، کبھی سر والٹر اسکاٹ سے تشبیہ دیتے ہیں مضمون نویسی میں اُن کا مرتبہ یہ ہے کہ اودھ اخبار کے پرانے فائلوں میں وہ صفحات جنھیں شرر کے مضامین نے پچاس برس پہلے سجایا تھا آج بھی سدابہار بنے ہوئے ہیں

بعض لوگوں نے انھیں انگریزی کے مشہور ادیب اڈیسن سے تشبیہ دی ہے، لیکن میری نظر میں سب سے مناسب تشبیہ شرر کی ڈی فو (De Foe) سے دی جا سکتی ہے جو بیک وقت جرنلسٹ، ناولسٹ، مضمون نگار اور مورخ تھا۔ اور جس نے عمر بھر نہ چلین لیا نہ چین دیا۔ شرر کے ناول آج ذرا پرانی چیزیں معلوم ہوتے ہیں اور اُن کی تحریر زیادہ تر کل کی بات معلوم ہوتی ہے ہم پریم چند کے ناولوں اور افسانوں اور شرر کے افسانوں سے زیادہ متاثر ہیں، لیکن ذرا یہ تو سوچیئے کہ سرشار کو چھوڑ کر شرر کے ہم عمر اور ہمعصر سیکڑوں ناول نگاروں میں آج کس کا نام زندہ ہے۔ کردار اور منظر نگاری اور تاریخی تخئیل کی کچھ اہم خامیوں کے باوجود بھی شرر کے کئی ناول کافی نظر فریب دلکش اور جاندار ہیں۔ اس کے علاوہ سرشار کے مقابلہ میں شرر کے ناولوں کا منظر بھی کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ایک سرشار پر کیا موقوف ہے۔ اُردو کے کسی دوسرے نثر نگار نے اتنے موضوعات اور اتنی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جن پر شرر نے ہزارہا صفحے لکھ کر قلم ہاتھ سے ڈال دیا۔

شرر کی شخصیت کیسی تھی، انھیں کس قسم کا کھانا پسند تھا کیسا گھر اور کیسا پڑوس پسند کرتے تھے، کیسے لوگوں کو پسند کرتے تھے، کیسے لوگوں کو ناپسند کرتے تھے، کن باتوں پر اُن

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم اے

ہنسی آتی تھی، کن باتوں پر غصّہ، یا یوں کہئیے کہ جب مولانا شررؔ ناول یا مضمون یا کسی اہم یا Serious کام میں لگے نہیں ہوتے تھے اُس وقت اُن کی شخصیت کا کون حصّہ نمایاں ہوتا تھا؟ میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے، اور شاید کسی کے لئے یہاں تک کہ اُن کے ساتھیوں اور بال بچوں کے لئے بھی یہ بتانا مشکل ہے۔ ایسے لوگ ہمہ تن عمل ہوتے ہیں، وہ کام کے ہوتے ہیں اور کام ان کا ہوتا ہے۔ یہاں پر مجھے مولوی اسمٰعیل کا پُرانا شعر یاد آیا:۔

"نہر پر چل رہی ہے پن چکّی — دُھن کی پُوری ہے کام کی پکّی"

لیکن یاد رہے کہ یہ آٹا پیسنے والی چکّی نہیں ہے، بلکہ دماغ کی وہ پن چکّی ہے جس نے زمین آسمان کے ماضی و حال کی ہسٹری اور کلچر کے علوم و فنون، بربریت اور جہالت کے قلابے ملا دیے تھے۔ آج ۱۹۳۵ء میں مولانا شررؔ زندہ ہوتے تو دو کم اسّی یعنی اٹھتّر سال کے ہوتے اور آرام اب بھی نہ لیتے، آج بھی کئی ناول سیکڑوں مضامین اور دلگداز و محشر اور ہزار داستان کی طرح کے نئے اخباروں اور رسالوں کے نکالنے کی فکر میں ہوتے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

شکوۂ معقول و فضول

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوشؔ ایم۔اے)

ہزار شکوہ ہمارا ہے گفتنی، معقول
مزاج دہر میں جب دخل ہی نہیں تو فضول

کسی کی بے کد و کاوش طلب پہ حصول
دُعا بھی کی نہیں آئی سدا قبول قبول

وہ خوش نصیب مرادیں بر آئیں خود کیا کیا
کوئی سوال نہ ہے کوئی بحث ردّ و قبول

کسی نے عین خزاں میں بہار بھی دیکھی
جدھر اُٹھائی نظر، آئی صورتِ مقبول

کوئی ہے وہ کہ تمنّا نے گر اُٹھائے قدم
صبا نے رول دیے راستہ میں پھول ہی پھول

مگر میں حرفِ مکرّر کیا گیا تسلیم
نگاہِ حسن میں اک نقشِ مہمل و مجہول

فرازِ حسن سے مدہوشؔ فرشِ دل پہ ہے
ہوا تو ہم [illegible]

کسی بیوفا سے

(از اشرف الحکما حکیم سید علی آشفتہ لکھنوی)

محبت کی آنچوں میں آنا پڑے گا
یہ شعلہ تمھیں کو بجھانا پڑے گا

نہ ہوگے تمھیں چارہ گر اور تمھیں کو
ہر اک زخم پر مسکرانا پڑے گا

اس اشکِ ندامت کے قربان لیکن
تمھیں پھر بھی یہ دل دکھانا پڑے گا

خبر یہ نہ تھی تم سے دہرا کے شکوے
ہمیں کو پھر الٹے مٹانا پڑے گا

یہ سب عہد سچے، یہ پیمان سچے
مگر پھر تمھیں آزمانا پڑے گا

سنو فطرتِ حسن بدلو گے کیونکر
نہ کھا دو قسم دل جلانا پڑے گا

جہاں دل پرستش تری کر رہا ہے
وہیں بے وفا تجھکو لانا پڑے گا

جسے رو دیئے آپ کل سنتے سنتے
وہ قصہ ابھی پھر سنانا پڑے گا

بتاتی ہیں آشفتہ اس دل کی ہوکیں
انھیں آج بالیں پہ آنا پڑے گا

خیالاتِ اعظم

(از حضرت اعظم لکھنوی)

حسنِ رخ جاناں کی اک یاد دہانی ہے
واعظ کی زباں پر جو حوروں کی کہانی ہے

کیا زندگیٔ نو کی تصویر ہے گلشن بھی
کلیوں میں لڑکپن ہے، پھولوں میں جوانی ہے

تنظیم سے اجزا کی، تحریک ہے وابستہ
موجیں جسے کہتے ہیں قطروں کی روانی ہے

دونوں ہی کو کھینچا ہے ساحل کی تمنا نے
چلتی ہوئی کشتی ہے، بہتا ہوا پانی ہے

ہمت کا تقاضا ہے پہونچیں گے لبِ ساحل
بازو تو تھکے لیکن دریا میں روانی ہے

جب دل میں کسک ہوگی لفظوں میں تڑپ ہوگی
اعظم کے لئے لازم آشفتہ بیانی ہے

قدرت کے کرشمے

(۱) مہرِ عالمتاب

(از مسٹر رام نراین نگم)

پنجۂ مہر کو خونِ شفقی میں ہر روز — غوطے کیا کیا ہے ترا دستِ حنائی دیتا (ذوق)

کیا شانِ کبریائی ہے کہ آفتاب جو ہماری دنیا سے لاکھوں گنا بڑا اور کروڑوں میل کے فاصلہ پر ہے صبحدم اُفق پر خونِ شفقی میں ڈوبا ہوا سفید روشنی والا دہکتا ہوا گولہ نظر آتا ہے۔ آسمان کے طبق لاجوردی میں صرف ہمارا ہی آفتاب نہیں لاکھوں اور بھی آفتاب ہیں جو نہ صرف فلک پیما دُوربینوں سے دیکھے جا چکے ہیں بلکہ اُن میں سے بعض کے فوٹو بھی لئے جا چکے ہیں۔ بعض بعض ایسے جید آفتاب اور ستارے موجود ہیں جو ہمارے آفتاب سے ہزاروں گنا بڑے اور لاکھوں گنا زیادہ روشنی اور گرمی والے ہیں جن کے مقابلہ میں ہماری دنیا (زمین) محض ایک ذرّہ اور ہمارا سارا نظامِ شمسی ایک کھلونا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ S Doradus جو سب سے زیادہ روشنی اور گرمی والا ستارہ ہے اگر ہمارے آفتاب کی جگہ پر ہوتا تو تمام جاندار اجسام کو ایک منٹ سے بہت کم عرصہ میں کباب بنا چکا ہوتا اور سمندروں پہاڑوں زمین وغیرہ کو صرف چند گھنٹوں میں بھاپ کی صورت میں تبدیل کر چکا ہوتا۔ ایسے ستاروں کی آفرینش کی مصلحت جو کچھ بھی ہو، ہزار ہزار شکر ہے کہ قسامِ ازل نے اپنے فضلِ بے پایاں سے ہم ساکنانِ خطۂ خاک کو ایسا آفتاب عطا فرمایا ہے جو ہماری دنیا کی پرورش کا کفیل ہے اور جلانے والے ہم سے دُور ہماری آنکھوں سے اوجھل خود ہی جل رہے ہیں۔ نظامِ شمسی بننے سے پہلے آسمان پر ایک ابر نما دھندلی روشنی والا ستاروں کا حلقہ سا نظر آتا ہے جس کو Nebula کہتے ہیں، پھر اسی سے آفتاب اور ستارے بنتے ہیں۔ ابتداءً ہمارا آفتاب بھی ایک Nebula کا مرکز تھا بعدہٗ مشیتِ ایزدی سے ایک ابر نما دہکتا ہوا سفید روشنی والا گیس کا تودہ بنا۔ اندازاً دو ارب سال کا عرصہ ہوا ہوگا کہ ایک اور ستارہ ہمارے آفتاب کے اس قدر نزدیک جا پہنچا کہ تصادم کی نوبت آ گئی تھی۔ تصادم سے بچ گیا مگر اس ستارہ کی (جو اب بہت ہی دُور چلا گیا ہے) نزدیکی کی بدولت ہمارے آفتاب میں ایک تلاطمِ عظیم

پیدا ہوا اور اُس میں سے مادّہ کے فوّارے جاری ہو گئے جو متعدد اطراف میں جا گرے اور رفتہ رفتہ اپنے اپنے مقام پر منجمد ہو گئے، اُنھیں سے نظام شمسی کے سیارے یعنی (۱) Jupiter (مشتری) (۲) Saturn (زحل) (۳) Neptune (۴) Uranus (۵) Venus (زہرہ) (۶) Mars (مریخ) (۷) Mercury (عطارد) (۸) Earth (زمین) بنے۔ گویا یہ سب آفتاب ہی کے جگر پارے ہیں۔

جب یہ سیارے اپنے اپنے محور پر استحکام کے ساتھ قائم نہ ہوئے تھے اور اُن کی حرکات وغیرہ میں مکمل باقاعدگی نہ تھی تو سیاروں سے چاند اُسی طرح پیدا ہوئے تھے جس طرح آفتاب سے خود سیارے۔ سب سیاروں میں ایک ہی چاند نہیں ہے جیسا کہ ہماری دنیا میں ہے۔ مریخ میں دو ۲ اور مشتری میں نو ۹، زحل میں دس چاند ہیں۔ ہر ایک چاند اپنے اپنے سیارے کے زیر اثر اور اُس کے ساتھ ساتھ گردش میں رہتا ہے۔ ہمارے چاند کا راستہ کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ کبھی تو وہ زمین سے دو لاکھ ترپن ہزار میل کے فاصلہ پر ہوتا ہے اور کبھی دو لاکھ بائیس ہزار میل کے فاصلہ پر آ جاتا ہے۔ تمام سیارے کشش ثقل (Gravity) کی رسّی سے بندھے ہوئے اپنے آفتاب کے گرد گھومتے اور اپنے اپنے محور پر گھوم گھوم کر دوہرا ناچ ناچتے رہتے ہیں۔ مریخ ہماری دنیا سے نزدیک ترین ہے مگر اسکی چال بھی پیچیدہ ہے اس لئے یکساں فاصلہ نہیں رہتا ہے۔ نزدیک ترین ہو پہنچنے پر بھی تقریباً چار کروڑ ستر لاکھ میل کا فاصلہ ہوتا ہے۔ عطارد زمین سے نزدیک ترین ہو کر بھی چار کروڑ اسی لاکھ بیس ہزار میل کے فاصلہ پر ہوتا ہے۔ مگر عطارد آفتاب سے نزدیک ترین ہے۔ اس کے بعد علی الترتیب زہرہ زمین۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل اور Uranus کا نمبر ہے۔ آفتاب سے بعید ترین سیارہ Neptune ہے جس کا فاصلہ تقریباً اٹھتر کروڑ چھتیس لاکھ ستاسی ہزار میل ہے۔ اس بڑے فاصلہ کی بدولت Neptune کو آفتاب کے گرد ایک مکمل گردش کرنے میں جس قدر مدت لگ جاتی ہے وہ ہماری دنیا کے ایک سو پینسٹھ سال کے برابر ہوتی ہے۔ حالانکہ ہماری دنیا صرف ایک سال میں ہی اپنی گردش مکمل کر کے بہار و خزاں، گرما و سرما سے ہم کو لطف اندوز کرتی رہتی ہے۔ آفتاب ہی وہ طاقت ہے جو ہماری دنیا (زمین) کو اٹھ سٹھ ہزار میل فی گھنٹہ کی حیرت انگیز رفتار سے اپنے گرد گھماتی رہتی ہے۔ آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ ۶۶ ہزار میل ہے اور اس طرح وہ زمین سے دس لاکھ گنا بڑا ہے اور باوجودیکہ آفتاب کا مادّہ ہر منٹ میں پچیس کروڑ ٹن کے حساب سے خرچ ہو رہا ہے تاہم اُس کا حجم گھٹتا زمین کے برابر ہوتے ہوتے بھی دس کروڑ برس لگ جائیں گے۔ زمین کا رقبہ ۱۹ کروڑ ۶۷ لاکھ ۹۱ ہزار

مربع میل ہے

اب درجۂ حرارت کا حال سنیئے، آفتاب کی سطحی حرارت ۶ ہزار درجہ، مرکزی حرارت ایک کروڑ ۰۰ ہزار درجہ اور اوسط دس ہزار ڈگری ہے۔ دن کے وقت پوری روشنی کی تاب ۰۰۰ ۰۰۰ ۰۰۰ درجہ ہے یعنی چودھویں کے چاند سے ۵۰۰۰۰۰ گنی زیادہ ہے۔ اگر سارے آسمان میں چاند ہی چاند بھر دیئے جائیں تب بھی دن کے وقت کی معمولی روشنی کا مقابلہ نہ ہو سکے۔ آفتاب کے ہر مربع انچہ سے پچاس گھوڑوں کی طاقت کے برابر طاقت خارج ہوتی رہتی ہے۔ گویا سطح آفتاب کا ایک پوسٹ کارڈ کے برابر لمبا چوڑا ٹکڑا ایک ٹرین چلانے کے لئے بہت کافی طاقت مہیا کر سکتا ہے۔ امریکہ کے ڈاکٹر سی۔ جی ایبٹ (C.G. Abbot) نے ایک ایسا انجن بھی بنا ڈالا ہے جو آفتاب کی شعاعوں کے زور سے چلتا ہے۔ آفتاب کی شعاعوں کو ایک مرکز پر یکجا کرنے سے قیامت کی تپش پیدا ہوتی ہے جس کی ایک چھوٹی سی مثال ذیل میں درج ہے:

واشنگٹن کی ایک لیباریٹری کی چھت میں ایک تین فٹ کا آتشی شیشہ (Magnifying Glass) لگا ہوا ہے جس میں آفتاب کی شعاعیں (Focus) ایک مرکز پر قائم ہوتی ہوئی اور شیشہ سے گذر کر زمین کے ایک چپّہ پر پڑتی ہیں۔ اس مقام پر ایسی قیامت کی گرمی ہوتی ہے کہ ہر چیز وہاں پہونچکر منٹوں میں پگھل جاتی ہے۔ کوئی سائنٹیفک آلہ وہاں کی گرمی کی پیمائش نہیں کر سکتا کیونکہ وہاں پہونچتے ہی سب آلات پگھل جاتے ہیں۔ ہماری دنیا کو آفتاب سے کس قدر اور کس طرح فیض پہونچتا ہے۔ ذیل کے سطور سے ظاہر ہوگا:۔

مادّی اشیاء کی زندگی پر درجۂ حرارت کا نہایت زبردست اثر ہے۔ سفید رنگ کے درجۂ حرارت میں جیسا کہ آفتاب میں ہے صرف عناصر قایم رہ سکتے ہیں۔ اس سے کم درجۂ حرارت میں سادہ مرکبّات جو ایک سے زیادہ اجزاء سے مرکّب ہوں اور اُس سے بھی کمتر درجہ حرارت میں وہ مرکّبات قایم رہ سکتے ہیں جو متعدد اجزاء سے بنے ہوں۔

ابتداءً زمین ایک کثیر التعداد اجزاء سے مرکب پگھلا ہوا تودہ تھی۔ آفتاب سے جدا تو ضرور ہوئی تھی مگر کشش مرکزی سے بندھی ہوئی متواتر آفتاب کے زیر اثر رہی۔ جب رفتہ رفتہ سرد ہو کر باقاعدگی پیدا ہوئی تو سُبک اجزاء نے اُوپر کو اُچک اُچک کر بری دنیا بنائی اور وزنی اجزاء سے سمندر کی تہہ بنی۔ پھر کیمیاوی تبدیلیوں سے زمین کے اندر سے Carbon dioxide اور پانی پیدا ہوئے اول الذکر گیس کی صورت میں ہونے کے باعث اوپر چڑھ گئی اور پانی کا کچھ حصہ بھاپ کی صورت میں

تبدیل ہوکر اوپر آ گیا اور بقیہ زمین پر رہا تاکہ ہر وقت اور ہر موسم میں ہوا میں بھاپ کی نمی اور زمین پر پانی کی تری میسر رہے۔ اُدھر مختلف عناصر کے خالص ذرات جو پہلے پگھلے ہوئے تھے رفتہ رفتہ سرد ہوکر اور ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک گاڑھے قوام کی صورت میں تبدیل ہوئے جن کو Colloids کہتے ہیں اور جن کی موجودگی بے جان مرکب اجسام میں پائی جاتی ہے اور جان پڑنے سے قبل کی حالت میں زندگی کی بنیاد وہی Colloids ہوتے ہیں۔ آکسیجن (oxygen) اور کلوروفل Chlorophyl بھی پیدا ہوئے۔ اول الذکر دوسری ضروریات کے علاوہ اغراض تنفس کے لئے لازمی ہے۔ اور آخر الذکر وہ مادہ ہے جس پر تمام جاندار دنیا۔ پودے۔ جانور۔ انسان وغیرہ کا دارومدار ہے اور جو پودوں میں سبز رنگ پیدا کرتا ہے۔ بے جان اجسام سے جاندار اجسام پیدا کرنے کا عمل جاری کرنے کی قوت براہ راست آفتاب سے حاصل ہوتی ہے۔ اور کلوروفل (Chlorophyl) میں آفتاب سے حاصل کی ہوئی قوت کو جذب کرنے کی صلاحیت ہے۔ چنانچہ جب مذکورہ بالا Colloids (گاڑھے قوام) روشنی سے متاثر ہوئے تو رفتہ رفتہ اُن میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ اُن سے اور پیچیدہ ترین مرکبات پیدا ہوسکیں جن کا براہ راست زندگی سے تعلق ہے۔ مثلاً ہیولیٰ Proto plasm (پروٹوپلازم)۔ یہ ایک حیرت انگیز مرکب ہے جس میں کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائیٹروجن۔ سلفر۔ فاسفورس کے علاوہ ایک اور حیرت انگیز جزو شامل ہے جس کو زندگی کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کو کماحقہٗ پہچاننے میں سائنس قاصر ہے الغرض جب سب ضروری سامان باقاعدہ فراہم ہوچکے تو زندگی کا وجود ہوا۔ انواع واقسام کے پودے زمین سے اُگے اور ہوا سے اپنی غذا حاصل کرنے لگے۔ خس وخاشاک سے جانوروں کے اجسام بنے۔ غلّوں سے چڑیوں کے رنگا رنگ پر بنے اور غذا ہی سے انسان بنا۔ اس طرح آفتاب ہماری دنیا کی تشکیل وتزئین کا موجب ہوا۔ نہ صرف دنیا کے ابتدائی زمانہ میں آفتاب نے یہ معجزہ دکھلایا تھا بلکہ آج بھی انھیں اصولوں پر یہ کام جاری ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ اوسر بنجر چٹیل پہاڑ آگ یا آتش فشاں پہاڑوں کے ویران کئے ہوئے خطے زمانہ کے ہاتھوں سبزہ کے مخملی فرش سے پھر مُزیّن ہو جاتے ہیں اور جانور وہاں اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ ماہرین سائنس کا خیال ہے کہ اگر کسی ارضی یا سماوی آفت سے زندگی کا وجود قطعاً کالعدم ہوجائے تو بھی اسی طریقہ سے ازسرنو دنیا آباد ہو جائے گی۔

آفتاب ہی وہ طاقت ہے جو تمام ذی روح ہستیوں اور پودوں کو برقرار رکھتی، پھولوں میں رنگت پیدا کرتی، سمندر اور دریاؤں سے بھاپ کی صورت میں پانی حاصل کرکے بادل بناتی، تندوتیز

ہوائیں چلا کر پانی میں تموّج پیدا کرتی اور اس طرح سمندروں کو ہوا بہم پہونچاتی ہے۔ کوئلہ کی کانوں کے ذریعہ انسان کے لئے گرمی کا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ زمین سے چالیس تا چار سو میل بلندی والے کرۂ ہوائی میں آفتاب کچھ ایسے مادّی تغیرات پیدا کرتا ہے جس سے زمین کی قوت مقناطیسی میں جلد جلد تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ آفتاب کی حدت سے ہوا گرم ہو کر جب اوپر کے ٹھنڈے طبقہ تک پہونچتی ہے جس کو سائنٹفک اصطلاح میں thermic bubble (حدت کا بلبلہ) کہتے ہیں تو بجلی کا طوفان پیدا ہوتا ہے جس سے زمین کے negative change کی کمی پوری ہوتی ہے۔ آفتاب ہی ہوا میں ایک برقی رو کی آمیزش کا موجب ہوتا ہے جس سے ہوا تازہ اور خوشگوار ہو کر انسان کی تفریح تقویت اور بشاشت کا ذریعہ ہوتی ہے۔ آفتاب ہی کی برقی رو انسان کے Ductless and thyroid glands کو جوش میں لاتی ہے۔ یہ وہ غدود glands ہیں جو انسان کے مزاج و شخصیت پر حکومت کرتے ہیں۔ مختلف رنگوں کی بوتلوں میں پانی بھر کر ایک مقررہ وقت تک تیز دھوپ میں رکھنے سے وہ پانی مختلف امراض کی دوا ہو جاتا ہے۔ باقاعدہ طور سے دھوپ میں تاپنے سے جسم کے ہر ایک حصہ کے امراض دور ہوتے ہیں۔ تمام مضرت رساں جراثیم جن کی ہماری ہی دنیا کے اندر ایک نرالی دنیا ہے اور جو خوردبین کی امداد کے بغیر دکھلائی بھی نہیں دیتے۔ آفتاب کی شعاعوں کے زیر اثر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ انسانی جسم و صحت پر آفتاب اور نظام شمسی کے دوسرے اجسام کا نہایت ہی گہرا اثر ہونا اب امر مسلمہ ہے۔

ہومیوپیتھی اس خیال کی پیرو ہے کہ ۲۰ گرہ (جن میں راشی وغیرہ بھی شامل ہیں) ایسے ہیں جو انسانی جسم کے حرکت نبضی پیدا کرنے والے مقدم مراکز عصبی کو بالخصوص متاثر کر کے تمام اعصاب اور شریانوں وغیرہ کو باقاعدہ چلاتے ہیں۔ جب کبھی اجتماع فضلات یا کسی دوسری وجہ سے کسی عصبی مرکز میں رکاوٹ حائل ہو جاتی ہے تو ماؤف عصبی مرکز اپنے متعلقہ فلکی اجرام سے فائدہ حاصل کرنے سے معذور ہو کر معطل ہو جاتے ہیں۔ جب رکاوٹ اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ اجرام فلکی سے جسم کا رشتہ ارتباط منقطع ہو جاتا ہے تو انسان اس دنیا سے اسی طرح بدر کر دیا جاتا ہے جس طرح بطن مادر میں غذا حاصل نہ کر سکنے پر جنین باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ ہومیوپیتھک دوائیں اجرام فلکی کے اثر کے لحاظ سے تجویز کی جاتی ہیں اس لئے حائل شدہ رکاوٹ کو سرعت کے ساتھ دفع کرنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

سورج گرہن (کسوف شمسی) نظام شمسی کے کل سیارے جن میں چاند بھی شامل ہے

تاریک ہیں، صرف آفتاب روشن ہے۔ آفتاب کے گرد زمین ایک سال کے عرصہ میں مکمل طور سے گھومتی ہے۔ ادھر چاند زمین کے گرد گھومتا ہے جس میں اس کو ۲۹½ دن کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ چاند کا راستہ کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ کبھی تو وہ زمین سے بہت نزدیک اور کبھی بہت دُور ہو جاتا ہے۔ سورج کے گرد گردش کرنے میں زمین اپنے ساتھ ساتھ چاند کو بھی کشاں کشاں لیجاتی ہے چنانچہ جب کبھی چاند زمین اور سورج کے ٹھیک درمیان پڑ جاتا ہے تو چاند کا تاریک سایہ سطح زمین پر پڑتا ہے، اسی ظہور نادرہ کو گرہن کہتے ہیں۔ اب زمین کے جو بھی حصّے اس تاریک سایہ کے اندر واقع ہونگے وہاں سے آفتاب کی طرف دیکھنے سے آفتاب دُھندلا اور مَیلا نظر آئیگا گرہن معینہ اوقات پر ہوا کرتے ہیں اور ان کا تسلسُل ایک عجیب وغریب ماجرا ہے۔ متعدد گرہن زمین پر قطب شمالی سے قطب جنوبی تک سایہ افگن ہوتے رہتے ہیں۔ عام طور سے تین قسم کے گرہن ہوتے ہیں، (۱) مکمل کسوف آفتاب جس کو ہندی میں سرب گرہن کہتے ہیں (۲) جزوی جس میں بیشتر آفتاب کا کچھ حصّہ روشن اور کچھ تاریک نظر آتا ہے (۳) چھلا نما گرہن جس میں آفتاب کے گرد ایک پتلا سا چھلا نما حلقہ روشن اور باقی تمام درمیانی حصّہ تاریک نظر آتا ہے۔ غرض یہ سب کیفیتیں چاند کے سایہ کی نوعیت اور وسعت پر منحصر ہیں۔ قریب پانچ سال کا عرصہ ہوا جب آخرالذکر قسم کا گرہن ہوا تھا۔ اس گرہن نے دنیا کے بڑے حصّہ پر چھاپہ مارا تھا جس میں ہندوستان کے علاوہ یورپ کے متعدد حصص، افریقہ، ایشیا، آسٹریلیا وغیرہ شامل تھے۔

گرہن کا دورہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک قطب سے گرہن کا سلسلہ شروع ہوکر دوسرے قطب کی طرف بتدریج بڑھتا ہے اور وہاں پہونچکر اُس سلسلہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ابتدا میں شمالی یا جنوبی latitude (عرض البلد) میں بہت بلندی پر ایک چھوٹا جزوی گرہن حادث ہوتا ہے اور قریب دس مرتبہ تک جزوی گرہن ہی ہوتا رہتا ہے بعدہٗ مکمل یا چھلا نما گرہن ہوتا ہے مگر وہ صرف قطب کے علاقہ ہی میں دکھلائی دیتا ہے۔ پھر مکمل یا چھلا نما گرہن کا سلسلہ جاری رہتا ہے مگر ہر دفعہ خط استوا (equator) کے نزدیک بڑھتا چلا آتا ہے اور جب قریب ۲۲ دورے ہو چکتے ہیں تو خط استوا کو پار کر جاتا ہے۔ اسی طرح پھر ۲۲ مزید دورے کرکے مقابل والے قطب تک پہونچتا ہے اور وہاں پہونچکر مکمل یا چھلا نما گرہن کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے لیکن قبل اس کے کہ گرہنوں کا یہ خاندان فنا ہو دس اور جزوی گرہن اُس قطب کے علاقہ میں حادث ہو لیتے ہیں۔ گرہن کے ایک خاندان کی عمر قریب بارہ سو سال ہوتی ہے اور اس عرصہ میں عموماً ۲۰ جزوی اور ۵۰ مکمل یا چھلا نما گرہن ہوا کرتے ہیں۔ ایک وقت میں گرہنوں کے بارہ خاندان برقرار رہتے ہیں جن میں سے ۲ خاندان

قطب شمالی سے قطب جنوبی کی طرف اور قطب جنوبی سے قطب شمالی کی طرف دورہ کرتے رہتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً انمیں سے کوئی نہ کوئی خاندان کسی نہ کسی قطب تک پہونچکر فنا ہوتا رہتا ہے لیکن متوفی خاندان کے بجائے دوسرا خاندان پیدا ہوجاتا ہے اور اس طرح ۱۲ خاندانوں کی تعداد برقرار رہا کرتی ہے۔ مکمل کسوف آفتاب (سرب گرہن) کی زیادہ سے زیادہ مدت ۸ منٹ ہوتی ہے بعدہٗ کچھ حصہ روشن ہونا شروع ہوجاتا ہے۔

جون ۱۹۳۷ء میں وسطی امریکہ کے ساحل سے کئی سومیل کی دوری پر ایک سرب گرہن مشاہدہ کیا گیا تھا جس کی لمبائی سات ہزار اور آٹھ ہزار میل کے درمیان مگر چوڑائی فقط ۱۶۰ میل تھی۔ اسکو عجیب ترین گرہن کہا جاتا ہے بارہ سو سال کے عرصہ میں جتنے گرہن پڑے ہیں اُن سب سے زیادہ دوران اس گرہن کا تھا یعنی ۷ منٹ ۴ سکنڈ۔ اس گرہن نے تھوڑی دیر کے لئے دن کو رات میں تبدیل کردیا تھا۔

آفتاب میں دھبے
SUN SPOTS.

آفتاب کے داغ یا دھبے بھی ایک نہایت حیرت انگیز کرشمہ ہیں۔ یوں توسلف سے ایسے دھبے آفتاب میں مشاہدہ ہوتے چلے آئے ہیں لیکن زمانۂ حال کی فلک رسا دُوربینوں نے اس عجیب منظر کے متعلق بہت کچھ معلومات فراہم کردی ہیں۔ دراصل یہ سطح آفتاب میں بڑے بڑے درارے یا گڑھے ہوجاتے ہیں جن میں سے اکثر اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ اُن میں زمین سے کئی گنا بڑے سیارے دفن ہوسکتے ہیں۔ ایسے ایک طوفان سے دوسرے طوفان تک عموماً ۱۱ سال کا وقفہ ہوتا ہے مگر کبھی کبھی اس وقفہ کا زمانہ کم وبیش بھی ہوجاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۳۶ء میں صرف نو سال کے وقفہ کے بعد ایسے دھبے مشاہدہ کئے گئے تھے۔ جن میں سے دو ایسے وسیع تھے کہ اُن کا اندازہ کروڑوں مربع میل کیا گیا تھا۔

۱۹۱۰ء سے ایسے دھبوں کی تاریخ اس خیال کی تصدیق کرتی چلی آتی ہے کہ موسمی حالت پر ان کا نہایت ہی گہرا اثر پڑتا ہے جس سے فصلیں متاثر ہوتی ہیں اور انسان کی غذا صحت و ذہنیت پر اثر پڑتا ہے۔ آخرکار اس ذہنیت کا دور جدال و قتال کی ہیبت ناک صورت میں نمایاں ہوکر رہتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سے تاریخی واقعات پیش کئے گئے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۱۴ء میں جو گذشتہ جنگ عظیم کے آغاز کا سال تھا ایسے دھبے نہ تھے۔ ۱۹۲۶ء میں سورج کے دہکتے ہوئے سینہ سے ایک لاکھ پچاس ہزار میل اونچے شعلے نکلتے ہوئے دکھلائی دیتے تھے۔ اُن کی نسبت یہ رائے قایم کی گئی ہے کہ وہ ایک مقناطیسی طوفان کا نتیجہ تھے۔ ۱۹۳۶ء کے دھبوں کو دیکھکر

پیشین گوئی کی تھی کہ ۱۹۳۹ء کے ابتدائی تین ماہ میں بارش کثرت سے ہوگی، خونریز لڑائیاں اور رنج و الم کے سامان ہونگے کیونکہ یہ طوفان سابقہ طوفانوں سے بڑھا ہوا ہے مگر ماہرین سائینس میں سے ایک طبقہ اس کا قایل نہیں ہے کہ جنگ و جدل شمسی دھبوں کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ البتہ Mount Wilson Ob servatory (America) نے اُس سال مندرجہ ذیل تین مناظر نادرہ کی جو رپورٹ دی تھی اُن کے لحاظ سے موجودہ طوفان کو کسی قدر اہمیت دیجا سکتی ہے۔

(۱) سیارہ مشتری میں ایک بہت بڑا نیا دھبہ دیکھا گیا ہے جو اُس دُنیا میں ایک طوفان عظیم کا پیش خیمہ ہے

(۲) مریخ کی صورت (Face) میں ایک نمایاں تبدیلی پائی گئی ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اُس کی تمام سطح پر گردسی چھا گئی ہے۔

(۳) ہمارے آفتاب میں دھبوں کا غیر معمولی طوفان ہے۔ اول الذکر دونوں حالتوں کا تعلق براہ راست ہماری دنیا سے نہیں البتہ ہمارے آفتاب کے دھبوں والے طوفان سے ہے جن سے ہماری دُنیا متاثر ہوتی ہے۔ شمسی دھبوں کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی جدوجہد جاری ہے جس کی تکمیل ہونے پر کوئی قطعی رائے قایم کی جا سکے گی۔

دنیائے سائینس میں تہلکہ سال گذشتہ کے ایک سرب گرہن کے وقت بالائی طبقات کے کرہ ہوائی (Stratosphere) میں پچیس ہزار اور تیس ہزار فٹ کے درمیان کی اونچائی پر پہونچکر آفتاب کے جو فوٹو لئے گئے ہیں اُن کو دیکھکر دنیائے سائینس میں ایک تہلکہ سا مچ گیا ہے، اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اینسٹین (Einstein) وغیرہ نے آفتاب کی ساخت اور اُس کے ملحقات وغیرہ کے متعلق جو جو نظریئے (Theories) قایم کیئے تھے اور زمانہ قدیم سے ابھی سال گذشتہ تک جن کو صحیح و درست تسلیم کرتے چلے آئے ہیں اُن میں زبردست ترمیمات کی ضرورت معلوم ہو رہی ہے۔ اب تک یہ خیال تھا کہ آفتاب میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو ہماری دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ آفتاب کے گرد ایک ہالہ ہے جس کی وسعت لاکھوں میل ہے۔ مکمل چاند کی روشنی سے اس ہالہ کی روشنی آدھی اور خود آفتاب کی روشنی کے مقابلہ میں اس ہالہ کی روشنی $\frac{1}{1000000}$ ہے۔ اس کے اندرونی حصہ کی رنگت ہلکی پیلی اور بیرونی حصے بالکل سفید روشنی والے ہیں۔ آفتاب سے جتنا جتنا زیادہ فاصلہ ہوتا جاتا ہے اُسی قدر اس ہالہ کی روشنی میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ مگر نظراً آفتاب سے قریب سد چند فاصلہ تک روشنی میں زیادہ کمی نہیں پائی جاتی ہے۔ مگر اب مذکورہ بالا عکسی تصاویر منکشف ہیں کہ چشمہ آفتاب جو خالی آنکھ سے

دیکھنے پر ایک سفید روشن حلقہ دکھلائی دیتا ہے۔ دوربین سے دیکھنے پر اُس کی سطح دانہ دار سی نظر آتی ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ دانے اُس گرمی کے بلبلے ہیں جو چشمۂ آفتاب کی اندرونی گہری تہوں سے برآمد ہوتی رہتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ گیس کا ایک نہایت ہی وسیع مدوّر غلاف جس کی گہرائی دس لاکھ میل اور وسعت دو کروڑ میل ہے چشمۂ آفتاب کو معہ اُس کے ہالہ کے ملفوف کئے ہوئے ہے۔ اس مدوّر غلاف کا علم (Einstien وغیرہ کو بالکل نہ تھا نہ کسی کو یہ خبر تھی کہ اس میں بھاپ (Vapour) بھی موجود ہے۔ ابھی ان جدید انکشافات کے متعلق معلومات بہت کم ہیں اس لئے تحقیق و تجسّس کا سلسلہ جاری ہے اور سر دست کوئی قطعی رائے نہیں قائم کی جا سکتی ہے البتہ ان جدید معلومات سے یہ ضرور ثابت ہو رہا ہے کہ اسرار قدرت کی عقدہ کشائی میں جس قدر زیادہ جد و جہد کی جا رہی ہے اُسی قدر زیادہ وہ گتھیاں اور بھی اُلجھتی چلی جا رہی ہیں۔

نظام شمسی کا انجام سائنس نے نظام شمسی کی عمر تین ارب سال قرار دی ہے جس میں سے تقریباً دو ارب سال گذر چکے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آفتاب دن بدن سکڑتا اور چھوٹا ہوتا چلا جاتا ہے اور اس انقباض کے ساتھ ساتھ نظام شمسی کے سیارے آفتاب کی طرف کھنچتے چلے جا رہے ہیں۔ آخر کار ایک ایسا وقت آئیگا کہ جو سیارے ابتدائے آفرینش میں آفتاب سے بنے تھے (جس میں ہماری دنیا بھی شامل ہے) وہ آفتاب ہی میں سما جائیں گے اور اس طرح ہمارے نظام شمسی کا خاتمہ ہو جائیگا۔

جذبات جلیل

(حضرت جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل)

ساقیا صحبت دیرینہ جو یاد آتی ہے
چشم تر صورت پیمانہ چھلک جاتی ہے

پوچھتا ہے جو کوئی حال دل بسمل کا
آنکھ سے خون کی اک بوند ٹپک جاتی ہے

قتل عشاق کو ہر چند زمانہ گذرا
دست قاتل سے ابھی خون کی بو آتی ہے

اور نشتر تو فقط ہیں رگ سودا کے لئے
نگہ یار رگ جاں میں اُتر جاتی ہے

یہ نہ سمجھو خلش دل سے تڑپتا ہے جلیل
ناوک ناز کی لذت اُسے تڑپاتی ہے

تصویرِ دوش

(از مسٹر شایق ہند دلکھنوی)

یہاں تھا وہ بتِ رشکِ قمر کل رات کو
جگمگا اُٹھا تھا میرا گھر کا گھر کل رات کو

چپہ چپہ تھا ستمرارِ اوجِ سینا در بغل
ذرہ ذرہ تھا دلِ لعل و گہر کل رات کو

حصر تھی پہنائے دو عالم حدودِ صحن میں
ہو گئی تھی کتنی دنیا مختصر کل رات کو

ایک مرکز پر جمع تھے ثابت و سیار سب
محو یا افلاک تھا زیر و زبر کل رات کو

تھی بساطِ میکشی آئینہ دارِ بزمِ جم
مے میں تھا آبِ سکندر کا اثر کل رات کو

چل رہے تھے بیدھڑک شیشے ادھر ساغر ادھر
ہل رہا تھا خود بخود مینا کا سر کل رات کو

تک رہے تھے دم بخود کل نوریانِ بزمِ مہ
تھا عجب کچھ شان سے وہ جلوہ گر کل رات کو

مجتمع تھے ایک جا کل حسن صورت کے صفات
بن گیا تھا کچھ سے کچھ وہ سیمبر کل رات کو

دیکھتا اس کو کوئی چشمِ زلیخا کی قسم
تھی حدیثِ حسنِ یوسف معتبر کل رات کو

درمیخانہ

ہے درِ پیرِ مغاں کفر ہے پندار یہاں
گرم ہر سُو ہے مساوات کا بازار یہاں

کام کرتا نہیں کچھ دبدبۂ حشمت و جاہ
ایک ہے منزلتِ مفلس و زردار یہاں

سنتِ ہوش ہے اس بزم میں ناداریٔ ہوش
ہے ہر اک فرد بشر نقش بدیوار یہاں

عام ہے سلسلۂ کاکلِ شب رنگ کا دام
محو ہے کشمکشِ سبحہ و زنار یہاں

کل شعائر کی علی الرغم عقائد کے خلاف
ہے نیا نہ رنگ و زہد کا معیار یہاں

بجتے رہتے ہیں دف و دائرہ چنگ و سرود
گونجتی رہتی ہے پازیب کی جھنکار یہاں

دم بدم اٹھتا ہے اک ولولۂ ذوقِ سجود
شعر پڑھ دیتے ہیں یوں ابروئے خمدار یہاں

والدلیل کہیں قرأت والشمس کہیں
عام ہے تذکرۂ کاکل و رخسار یہاں

انکی ہو حق میں بھی پوشیدہ ہیں عرفاں رموز
ہے ہر اک رندِ منش رومی و عطار یہاں

نازاں درمیخانہ میں ہندو ہی نہیں
آتے جاتے ہیں بہت اور بھی دیندار یہاں

رشی کیش کے مناظر

از ڈاکٹر پیارے لال صاحب سری واستو ہومیوپیتھ لکھنوی

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفتِ کردگار

اگرچہ قدرت کی صناعیاں ہر جگہ کثرت سے ہیں مگر قدرت الٰہی اور جدتِ انسانی نے رشی کیش ہردوار میں میری تنگ نظر پر جو اثر کیا اور کوتہ عقل کو جو سبق دیا۔ وہ نقش کالحجر ہوگیا ہے۔ اس کا آموختہ صرف زبان حال ہی ورد کر سکتی ہے قیل و قال یہاں قاصر ہے مگر اس کو ٹوٹی پھوٹی زبان میں قلمبند کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

گو چند روز کے لئے تمام لکھنوی تعلقات سے عارضی بے تعلقی سی ہوگئی تھی۔ مگر ایک خیال پے در پے ستاتا اور ایک مجبوری سی محسوس کراتا تھا۔ وہ یہ کہ کاش خاص خاص احباب بھی ساتھ ہوتے۔ اور یہاں کی نعمتوں سے فیضیاب ہوتے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھتا ہوں کہ رشتۂ دنیوی بہت کچھ گذشتہ سے پیوستہ ہے۔ اور اس سے عارضی علیحدگی بھی ہر شخص کا حصہ نہیں اس لئے یہ خیال کچھ زیادہ تکلیف دہ ثابت نہیں ہوا۔

یہاں کے منظر دو نوع کے ہیں۔ قدرتی اور مصنوعی۔ میں پہلے قدرتی مناظر کا ذکر کرونگا۔ ہردوار سے دو رویہ کوہستان کی دیواریں پیشِ نظر ہوتی ہیں۔ کل وادی ایک گلکار قالین سی نظر آتی ہے۔ راستہ میں جابجا آبشاریں ہیں۔ جو نہ صرف تشنہ لبوں کو سیراب کرتی ہیں۔ بلکہ گذرنے والوں کی سیر کو خوشگوار بناتی ہیں۔ طائرانِ بلند پرواز و خود سر۔ خوش آواز و رنگین پر اپنے اپنے دلکش ترانے سناتے ہیں اور دنیوی افسانے گاتے ہیں کہیں کہیں سرکاری تار پر لمبی لمبی قطاریں بے شمار مرغانِ خوش الحان خوش آمدید کا نغمہ سناتے اور دل کو لبھاتے ہیں۔ انواع و اقسام کے پھولوں کی مہک سبزہ زار کو معطر بناتی اور دماغی کلفت کو دور بھگاتی ہے۔ بادِ صبا ہر چند کہ ناز و نعم کی عادی ہے۔ مگر اس سے بھی پھولوں کی روش دیکھکر نہیں رہا جاتا۔ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آتی ہے۔ اور درختوں کو مست کر کے ان کے خاموش پتوں کو گویا بناتی ہے۔ وہ بیچارے بے زبان اپنی زبان میں عجیب دلکش (خوش آمدید) کا راگ گاتے اور مسافر کی تھکاوٹ کو مٹاتے ہیں۔

شہروں میں لوگ دو منزلہ کوٹھی بمنزلہ بہشت سمجھتے ہیں۔ یہاں پر پہاڑوں کی بلندی دیکھکر عمارتوں کی بلندیٔ خیالی کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ مگر واہ رے پہاڑیوں کا انبوہ۔ ایک سے ایک زیادہ بلند ہے لیکن کسی کو بھی بیجا عزت کا موقع نہیں۔ کیونکہ جس قدر بلندی ہے اسی قدر عمیق وادی کی پستی سے ہمکنار ہے۔ کیا خوب قانون قدرت ہے۔ بلندی ہر جگہ پستی سے ہم آغوش ہے۔ اس لئے پستی کی طرف نگاہ کرنے سے سرکشی کی ہمت ہی ممکن نہیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ باوجود اس کے کہ یہ پہاڑ خود مختار ہیں مستغنی ہیں۔ باحشمت و ذیشان ہیں۔ بلند مرتبت و عالیشان ہیں۔ مگر تنگ دل اور خود غرض نہیں۔ اور منت شکر و ہمدردی کے اوصاف سے بھی مزین ہیں ابر رحمت کے احسان سے اسقدر پانی پانی ہو گئے ہیں کہ دریائے گنگ کے استقبال کیلئے سرنگوں ہوکر دامن محبت پھیلا رہی ہیں۔ بلکہ وفور ہمدردی سے اپنے شفیق کو اپنی گود میں لیکر وادیوں کے چڑھاؤ اتار کے خطروں سے محفوظ رکھتے ہوئے نیچے میدان تک سلامتی سے لاکر پہونچا جاتے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ اپنے محسن پانی کو بھی اپنے جوف دل میں جگہ دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی خود غرضی کو بالائے طاق رکھکر دنیا دی فلاحوں کی ضروریات کا بھی خیال کرتے ہیں اور اپنے جگر کو چاک کر کے اسی عزیز از جان پانی کو تن سے جدا کر کے رواں کر دیتے ہیں قدرت بھی کیسی قدرشناس ہے کہ اس نے اس خدمت کے صلہ میں پہاڑوں کو از سرتاپا سبز خلعت عطا فرمائی ہے اور ہرے بھرے پھولنے پھلنے والے نور نظر عنایت کئے ہیں جنکو پہاڑ چھاتی سے لگائے ہوئے اپنے خون جگر سے پرورش کرتے ہیں اور مزید بلند حوصلگی ملاحظہ ہو کہ دوسروں کے لئے اپنے لخت ہائے جگر کو کس کشادہ پیشانی سے کٹنے دیتے ہیں کہ ماتھے پر ذرا بھی شکن نہیں پڑتی۔ پہاڑ ایسا سنگدل بھی پانی جیسی نرم و رقیق شے کی صحبت میں کس طرح ایثار نفسی کا سبق سیکھ لیتا ہے۔ کسی بزرگ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

دوستی با نرم طبعاں مایۂ روشن دلی ست رشتہ چوں با موم سازد نور محفل می شود

ایسے پہاڑ بھی دیکھے جو احسان فراموش۔ تن پرور اور خود غرض ہیں مگر وہ ہمیشہ اپنے محسن کی قربت سے محروم رہتے ہیں انکا ظاہر بھی خشک اور باطن بھی خشک نظر آتا ہے۔ یہ خود ہی شاد کام نہ اوروں کے لئے مفید۔ چنانچہ خود تن بدن کے ٹکڑے چٹانوں کی شکل میں ان سے جدا ہو کر علیحدہ ہوتے رہتے ہیں۔

دریا میں ایک عجیب لطف دیکھا۔ جہاں کہیں گہرائی ہے۔ دریا دلی ہے سنجیدگی ہے خاموشی ہے۔ تحمل و بردباری ہے خدمت گذاری ہے۔ کوئی چیز بھولے سے بھی دریا میں گر پڑے تو راز سربستہ کی طرح پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی چیز نذر کر سپرد کر دی جائے۔ تو دریا اُسے امانت کی طرح اپنی جان کے برابر سمجھ کر اور اپنے سینہ پر لاد کر حفاظت سے منزل مقصود تک پہونچا دیتا ہے۔ لیکن جہاں کہیں گہرائی نہیں ہے وہاں اوچھاپن ہے۔ غرہ کے مارے ذرا شور مچانا اور پتھروں سے سر ٹکرانا۔ خدمت گذاری اور نازبرداری کا تو ذکر کیا۔ اپنی ہی روانی کی فکر دامن گیر

رہتی ہے۔ آگے بڑھنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ اور ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ حتیٰ کہ عجز اور انکسار کا سبق سیکھنا اور فروتنی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ پانی سر کے بل پہلے سے بھی زیادہ گہرائی میں جا گرتا ہے۔ اور پھر اپنی اصلی صنعتوں سے آراستہ ہو جاتا ہے۔

پھولوں پر نظر پڑی تو گیا دیکھا کہ ہر طرف بے شمار پھول ہیں۔ خوش رنگ اور خوشبودار کلیاں ہیں۔ جا بجا کھلے پھولے اور کمہلائے ہوئے پھول بھی جن کا نہ کوئی یار نہ مددگار۔ نہ مہربان اور نہ قدر دان۔ اس دنیا میں آئے کھلے پھولے اور مرجھا گئے۔ نہ صلہ کی خواہش ہے نہ داد کی ہوس آئے اپنا فرض منصبی ادا کیا اور چلتے ہوئے پتھروں کو دیکھا کہ جو تن پرور نہیں ہیں۔ فرطِ محبت سے اپنے مہمانوں کے فرشِ راہ بن گئے ہیں۔ قدم رنجہ فرمانے والوں کے قدموں سے پامال ہو کر نہ صرف اوپر ہی سے چمکدار ہو گئے ہیں بلکہ ہزار سنگدل ہونے پر بھی صاف باطن ہو گئے ہیں۔ اور گو طاقت قیل و قال نہیں۔ مگر زبان دل سے یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ ؎

گر بر سر و چشم من نشینی　　　نازت بکشم کہ نازنینی

غرض کیا عرض کیا جائے۔ ہر شئے صنعت کردگار ہے۔ اور صانع حقیقی کی یادگار ہے۔ پہاڑ بلند حوصلگی۔ شکر گذاری۔ ہمدردی۔ اور ایثار نفسی سکھلاتے ہیں۔ دریا سنجیدگی۔ فروتنی بتلاتے ہیں۔ پھول فرض منصبی ادا کرنے کا سبق دیتے ہیں پتھر اطاعت و انکساری کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ خیال کرنے کی بات ہے۔ کہ جب معدنیات اور نباتات بھی ان صفتوں سے موصوف ہیں اور قانون قدرت کے نمونہ ہیں تو ہم لوگ انسان۔ ذی فہم۔ اور اشرف المخلوقات ہو کر خود غرضی کریں تو کہاں تک قوانین قدرت کے مطابق ہوگا۔ اور کس درجہ خوش اور شادکام رہ سکتے ہیں۔

آفریں اُن پر جو اوروں کے کام آتے ہیں۔ اور لُعنت ہو اُن پر جو تن پروری۔ خود غرضی اور دل آزاری کرتے ہیں !

"تہذیب کا دور جمہوریت سے شروع ہو کر جمہوریت ہی پر ختم ہوتا ہے۔ شاہی حکومت رؤسا کا اقتدار سرمایہ داروں کی بالادستی یہ درمیانی منازل ہیں۔ موجودہ دور نے درمیانی منزلیں طے کر لی ہیں اور اپنی آخری منزل تک پہونچا ہے مگر ہم ابھی تک اپنی ثروت اور اختیار کے نشہ میں اس قدر مخمور ہیں کہ ہمکو آثار و قرائن بالکل نہیں نظر آتے۔ اطراف عالم سے جمہور کی گھنگھور صدائیں ہمارے کانوں میں پہونچ رہی ہیں مگر ہم ابھی تک ایسے بے خبر ہیں گویا عالم خواب میں ہوں۔ موجودہ گرانی ضروریات پر سارے عالم میں واویلا مچا ہوا ہے اس سے ہماری تہذیب کے تاریک پہلو پر کیسی صاف روشنی پڑتی ہے۔ اب مہذب دنیا کو تجربہ ہو رہا ہے کہ تھیٹر کا وہ ایک ایکٹر جو پانچ ہزار روپیہ مہینہ پیدا کرتا ہے معاشرت کا ضروری جزو ہے یا وہ غریب کندۂ ناتراش کاشتکار جسے ہم حیوان مطلق سمجھنے کے عادی ہیں۔"

پریم چند

جلوۂ طور

جناب سکندر علی صاحب وجد بی۔ اے (عثمانیہ)

برسات کی رات تھی اندھیری ۔۔۔ دالان میں تھی مری مسہری
پانی جو برس کے کھل گیا تھا ۔۔۔ ہستی کا غبار دُھل گیا تھا
تاریک تھی رات پر سہانی ۔۔۔ جیسے بھٹکی ہوئی جوانی
اتنے میں بور رو چلی ہوا کی ۔۔۔ قسمت ہی چمک گئی فضا کی
ہونے لگی جگنوؤں کی بارش ۔۔۔ فطرت کے جمال کی تراوش
آتش افروز بام و در تھے ۔۔۔ لیکن یہ شرار بے ضرر تھے
پر جانب نور منتشر تھا ۔۔۔ گھر کیا تھا مطلع سحر تھا
آنگن میں تپاں تھے برق پارے ۔۔۔ رخشاں تھے، زمین پر ستارے
دروازے پہ، کھڑکیوں پہ جگنو ۔۔۔ دالان میں، سیڑھیوں پہ جگنو
تھا نور سے رشکِ طور گلشن ۔۔۔ ہر نخل تھا مثلِ نخل ایمن
پیپل تو چنار بن رہا تھا ۔۔۔ ہر شاخ سے نور چھن رہا تھا
میں اس منظر میں کھو رہا تھا ۔۔۔ ہر رونگٹا آنکھ ہو گیا تھا
روشن تھی کائناتِ پہلو ۔۔۔ دل میں بھی چمک رہے تھے جگنو

مدت اس حادثے کو گزری ۔۔۔ بھولی نہیں رات جگنوؤں کی
برسات کی رت میں اب بھی شب بھر ۔۔۔ آنکھیں یہی ڈھونڈتی ہیں منظر

جذبات فرحت

عجب کچھ صحبتیں ہیں چشم بد دور ۔۔۔ فغاں کی دل سے اور دل کی فغاں سے
نہیں جنت میں چلنے سے تو انکار ۔۔۔ وہاں لاؤنگا دردِ دل کہاں سے
نفس میں اتنے دلق ہم نے گذارے ۔۔۔ کہ خود واقف نہیں ہیں آشیاں سے

"اُردو ہندی ہندستانی"

(مباحثہ)

از منشی شیام موہن لال جگر بریلوی بی۔اے

زمانہ بابت ماہ جون ۱۹۳۶ء میں میرے مضمون "اُردو، ہندی، ہندوستانی" مطبوعہ زمانہ بابت ماہ اپریل کے جواب میں جو چند سطریں مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی کی شائع ہوئی ہیں۔ اگرچہ اُن سب کا جواب میرے مضمون محولہ بالا میں موجود ہے۔ تاہم چند باتیں مختصراً محتاج صراحت ہیں۔ مولانائے موصوف فرماتے ہیں کہ یہ کہنا بھی زیادتی ہے کہ اِدھر ہندوؤں کی تصانیف کو دائرہ ادب سے خارج کردیا گیا اُدھر تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں سے ہندو مصنفوں کو نظرانداز کردیا۔ میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے واقعات پر مبنی ہے۔ میرے مضمون سے تین اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) ہندو معاشرت و تمدن کا اُردو میں کتنا سرمایہ ہے؟

(۲) ہندو مصنفین کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا جارہا ہے؟

(۳) اگر پہلے سوال کا جواب نفی میں ہے اور دوسرے کا ایک ناخوشگوار حقیقت تو اُردو کیونکر ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کہی جاسکتی ہے؟

پہلے سوال کا جواب مولانائے موصوف نے پیش نہیں کیا ہے اِس لئے اس پر کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں دوسرے سوال کے متعلق میرے معروضات کو آپ زیادتی پر محمول کرتے ہیں۔ میں اُن کو زیادتی نہیں بلکہ کوتاہی سمجھتا ہوں۔ میں نے واقعات کے اعتبار سے اظہار رائے میں بہت اعتدال سے کام لیا ہے ورنہ اس معاملہ میں جتنی کھوج اور چھان بین کی جائے گی اُتنے ہی افسوسناک نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ تو میں نے خود اعتراف کیا ہے کہ متقدمین مثلاً میر حسن، میر تقی، شیفتہ وغیرہ کے تذکروں میں ہندوؤں کا ذکر ملتا ہے لیکن موجودہ عہد کی اُردو زبان کی تاریخوں میں اُن کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے پھر یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ یہ ذکر محض ذکر خیر ہے یا اس سے ان کی کوئی حیثیت بھی متعین ہوتی ہے۔ جہاں تک میرا مطالعہ و حافظہ شہادت دیتا ہے یہ تذکرہ ذکر خیر ہی تک محدود رہا ہے اور قریب قریب جملہ تذکروں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندو دائرہ تقلید سے آگے نہیں بڑھے اور ادبی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہے اور اسی لئے ادبیات سے ہم انھیں متروک پاتے ہیں۔ مولانائے موصوف اگر مندرجہ ذیل تصنیفات کا مطالعہ فرمائیں گے

تو دیکھیں گے کہ ہندو خدمت گذاران ادب کیساتھ کتنا حق ادا کیا گیا ہے اور کس لب ولہجہ میں:-

(۱) آب حیات - مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد۔

(۲) ہندو شعرا - مرتبہ عشرت لکھنوی

(۳) جدید اُردو شاعری - مرتبہ مولانا عبدالقادر سروری

(۴) اے ہسٹری آف اُردو لٹریچر - مرتبہ رائے بہادر رام بابو سکسینہ

(۵) انفلوئنس آف انگلش لٹریچر آن اُردو لٹریچر - مرتبہ ڈاکٹر عبداللطیف

(۶) شعر الہند - مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی

(۷) سیر المصنفین - مرتبہ محمد یحییٰ تنہا

(۸) جواہر سخن - مرتبہ مولوی محمد مبین کیفی چڑیاکوٹی

یوں تو بہت سی اُردو نظم و نثر کی تاریخیں لکھی گئی ہیں، جنمیں دو چار ہندوؤں کی بھی ہیں لیکن یہ سب محتاج مطالعہ نہیں۔ ترقی یافتہ ذوق کے مطابق تحقیق کرنے والوں کی نگاہیں ایسی ہی کتابوں پر جائینگی جن کے نام اوپر لکھے گئے اور جنمیں سے دو ایک کو چھوڑ کر باقی کل ادبی دُنیا میں تاریخ اُردو پر قابل استناد شہادت سمجھی جاتی ہیں۔ اور جن کا مطالعہ طالبان تحقیق کے لئے ناگزیر ہے۔ ایسی ہی کتابوں سے ڈاکٹر بیلی نے اپنی کتاب "اے ہسٹری آف اُردو لٹریچر مرتب کی اور انگریزی داں پبلک اور اہل مغرب کے سامنے بھی اُردو زبان میں ہندوؤں کی بے بضاعتی کا ڈھول پیٹ دیا۔

جی تو بہت چاہتا ہے کہ اپنے پیش کردہ دونوں نقط نظر سے مندرجہ بالا تصنیفات پر روشنی ڈالوں لیکن طوالت مضمون ایڈیٹر زمانہ کی جبین جبیں کی تاب نہ لاسکیگی۔ اس لئے صرف آب حیات کے متعلق چند جملے عرض کرتا ہوں۔ یہ اس لئے اور بھی کہ مولانائے موصوف نے صاحب آب حیات کو ہندوؤں کی حق تلفی کے الزام سے یہ کہکر بالکل بری کرنا چاہا ہے کہ "اُنھوں نے (آزاد نے) جو معیار (صحیح یا غلط یہ الگ سوال ہے) سامنے رکھا تھا اُس پر مسلمان شاعری کون بہت سے پورے اُترے ہیں۔ پس جو اُن کے معیار پر نہ اُترا وہ خارج کر دیا گیا۔ اس کو شاعر کے مذہب سے کوئی تعلق نہیں"۔

میرے معروضات اس کے متعلق یہ ہیں:-

آب حیات اُردو کی تاریخ میں ایک کارنامہ ہے۔ اوّلیت کا شرف تو اُس کو حاصل نہیں، لیکن رنگینیٔ تحریر اور پُر لطف تنقید کے باعث جو قبولیت و استناد اس تصنیف کو حاصل ہے وہ کسی دوسری کو نہیں۔ اس لئے بعد کے تذکرہ نویسوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی کو شمع ہدایت قرار دیا ہے۔ یہ تصنیف

پانسو اٹھائیس^۵۲۸ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ ابتدائی اسّی^۸۰ صفحات زبان اُردو اور نظم اُردو کی تاریخ وغیرہ سے متعلق ہیں۔ باقی چار سو اڑتالیس^۴۴۸ صفحے پانچ دَوروں میں منقسم ہیں۔ ہر دَور میں چند شعراء کے حالات زندگی اور انتخاباتِ کلام ہیں۔ آزاد نے یہ تو تسلیم کیا ہے کہ اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے لیکن کتاب کی بسم اللہ سے تمت بالخیر تک کہیں اُن خدمات کا ذکر نہیں جو ہندوؤں نے اُردو کی پرورش اور ترقی میں انجام دیں، بلکہ کہیں اُن کی شرکت کا شائبہ بھی نہیں آنے پایا ہے۔ آزاد کے معیار کی بلندی ہندو دماغ کی پروازِ فکر سے ہزار درجہ بالاتر سمجھی جاسکتی ہے لیکن تاریخی اعتبار سے اُن کے احسانات کو فراموش کردینے کو تعصب نہیں تو کیا کہا جاسکتا ہے۔ اگر بارگاہِ ادب میں آزاد نے ہندوؤں کو کسی خاص کرسی کا مستحق نہیں سمجھا تو ہم اس کیلئے اُس کے معیار کو ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں۔ لیکن اُردو کی تاریخ سے اُن کا نام مٹا دینا اہلِ انصاف بتائیں کیا معنی رکھتا ہے۔ پنڈت دیاشنکر نسیم کا نام جواب آبِ حیات میں نظر آتا ہے۔ اُس کے متعلق ابتدائی مضمون میں عرض کیا جاچکا ہے کہ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں بھی متروک تھا اور آزاد کے معیار یا مقصد کار کے بموجب یہ اخراج بالکل مناسب تھا۔ چنانچہ آبِ حیات میں نظم اُردو کی تاریخ میں ہم کو بہت سے معمولی شاعر ملتے ہیں مثلاً فطرت، اُمید، میر معز، قائم وغیرہ لیکن مخلص، رسوا، بہار، دیوانہ، پروانہ، راقم، صبا، دلگیر، فرحت کوئی نظر نہیں آتے اس لئے کہ یہ ہندو ہیں۔ جن سے صاحب آبِ حیات نے اسی طرح بچنے کی کوشش ہے، جیسے کوئی وبائی مرض سے بچتا ہے۔

محمد سلیم[1] صاحب نے رسوا کو ہندوستان کا خیام لکھا ہے۔ دیوانہ کے متعلق لکھا ہے کہ نہ صرف غیر مسلم بلکہ مسلم شعرا نے اُن سے مشورت سخن لی ہے اور شاگردی کا فخر رکھتے ہیں۔ اُن میں جعفر علی حسرت اُستاد جرأت اور میر حیدر علی حیران خاص طور سے مشہور ہیں۔ پروانہ کا دیوان کلام بلاغت نظام کا لاجواب انتخاب تھا۔ میر تقی میر نے راقم کے متعلق لکھا ہے کہ "خوب کہتا ہے" میر جیسا نازک مزاج شاعر اور باریک بین و سخت گیر سخن سنج جس کے متعلق یہ لکھے کہ خوب لکھتا ہے وہ کوئی معمولی شاعر نہیں ہوسکتا۔ صبا کے متعلق محمد سلیم صاحب نے لکھا ہے کہ ان کی غزلیں ادب اُردو میں ایک نادر اضافہ کرتی ہیں۔ دلگیر کے متعلق لکھا ہے کہ غازی الدین حیدر اور سعادت علی خاں کے عہد کے مرثیہ گویوں کے دلگیر سرتاج تھے۔ آزاد نے جعفر علی حسرت کا ذکر تو اپنی کتاب میں کیا ہے مگر اُن کے اُستاد کا نام نہیں بتایا اور صفحہ تین سو اٹھتر^۳۷۸ پہ چار مرثیہ گو گنائے ہیں

[1] ملاحظہ ہو اُردو ایسوسی ایشن میگزین ۲۹-۱۹۲۸ء، مرتبہ سید زوار عباس۔ جسمیں محمد سلیم صدیقی لکھنؤ یونیورسٹی کا وہ بیش بہا مضمون ہے جو آل انڈیا مقابلہ مضمون نویسی میں سب سے بہتر قرار دیا گیا تھا، اور جس کا موضوع تھا "مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں نے اُردو ادب کی کیا خدمات کیں"۔ جگر

ضمیر، خلیق، دلگیر، فصیح۔ دلگیر کے متعلق بس اتنا ہی لکھا ہے کہ اُن کی زبان میں لُکنت تھی۔ اور اُنھوں نے مرثیت کے دائرے سے قدم نہیں بڑھایا۔ مولانا شبلی نے بھی موازنہ انیس و دبیر میں "ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتدا" کے ضمن میں سکین، میر تقی، سودا، خلیق سب کے احسانات کا اعتراف کیا ہے۔ مگر دلگیر کا نام نہیں لیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "سب[1] سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر مرزا دبیر کے اُستاد ہیں"۔ اصلیت یہ ہے کہ مولانا شبلی کوئی نئی بات اِس معاملہ میں جب بتاتے کہ آزاد کے خلاف چلتے۔ آزاد کی متجسس نگاہوں نے ہدہد، ضاحک، مضمون، احسن وغیرہم کو تو ڈھونڈھ نکالا۔ لیکن خلق، رسوا، دلوانہ، پروانہ وغیرہم کی نمایاں اور گراں پایہ ہستیاں اُنھیں نظر نہ آئیں۔ اِس کو اہلِ انصاف کیا کہیں گے؟ اگر یہ کہا جائے کہ ضاحک وغیرہ سب اُس معیار پر پورے اُترے جو آزاد کے پیشِ نظر تھا تو اُنمیں سے صرف ایک یعنی احسن کے متعلق آزاد ہی نے جو کچھ اور جتنا بھی لکھا ہے نقل کرتا ہوں:۔

"احسن۔ تخلص محمد احسن نام۔ یہ بھی اُنھیں لوگوں کے ہمعصر و ہم زبان ہیں۔ چنانچہ ایک غزل اور دو شعر اُن کے ہات آئے وہی لکھے جاتے ہیں"۔ (یہ غزل و اشعار بخوف طوالت نقل نہیں کئے جاتے)

متذکرہ بالا دلائل اور شہادتوں سے آزاد کا معیار آب حیات کا مقصد تالیف سب کچھ روز روشن کی طرح ظاہر ہوگیا اب بھی اگر کسی صاحب کو شک وشبہ ہو تو وہ آب حیات کے صفحہ ۱۰۴ کے تحتی نوٹ کو ملاحظ فرمائیں۔ جسمیں مکند رام فدوی کا ذکر کرتے ہوئے آزاد تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کا دیوان نہایت[2] دلچسپ ہے لیکن افسوس باوصف اِس دلچسپی کے فدوی کو حاشیہ نشینوں میں جگہ دیجاتی ہے اور احسن اور بعض دیگر ایسے ہی حضرات کو مسند نشینی کا شرف عطا کیا جاتا ہے۔ یا للعجب۔

کتنے افسوس کا مقام ہے کہ جب ہندوں کی ادبی حیثیت کا ذکر آتا ہے تو معیار کا ایک ہوا کھڑا کرکے ان کو مرعوب و دم بخود کردینے کی کوشش کیجاتی ہے۔ جیسا کہ اس وقت دہلی اور لکھنؤ براڈکاسٹنگ اسٹیشنوں کی معرب و مفرس اُردو کی حمایت وجواز میں کیا جارہا ہے۔ میں یہ تو کہہ نہیں سکتا کہ مولانا عبدالماجد صاحب نے بھی آزاد کی حمایت میں معیار کا ذکر کچھ اسی منشا سے کیا ہے اور نہ اس وقت معیار ادب کی تعریف و توضیح میں پڑکر خواہ مخواہ اِس مضمون کو طول دینا چاہتا ہوں لیکن یہ دُہرا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اُردو کے جنم دن سے آجتک ہر دور میں ہندو بھی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ کے شاعر و انشا پرداز ہوئے ہیں۔ دَورِ حاضرہ کے باکمالوں سے گذشتہ دَور کا اندازہ کرلیا جائے۔ یہاں صرف ایک

---

[1] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۱۸۔ [2] خط میرا کھینچا ہوا ہے۔ جگر بریلوی

منشی پریم چند مرحوم ہی کی مثال پیش کر دینا کافی ہوگا۔ جن کے متعلق دُنیا کا مسلمہ سربرآوردہ شاعر و مفکر رشی ربندر ناتھ ٹیگور لکھتا ہے " پریم چند کی قابلیت اور ادبی خدمات بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ اُن کے چلے جانیسے ہم کو نقصان عظیم ہوا ہے" حقیقت یہ ہے کہ جو شہرت و ناموری منشی پریم چند کو حاصل ہوئی وہ اُردو میں آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ اب دیکھنا ہے اہل وطن اُن کیساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مقصود گذارش یہ ہے کہ جس پایہ کے ہندو مصنف دورحاضرہ میں موجود ہیں۔ اگر ان سے بڑھ کر نہیں تو کم سے کم معیاری تو ضرور گذشتہ ہر دور میں ہوئے ہیں۔ اس وقت اُنھوں نے بھی کافی بلند نامیاں حاصل کیں لیکن وہ سب اُن کے مرنے کے بعد ہی مٹ گئیں۔ اسی طرح اس زمانہ کے اہل کمال کے کارنامے اِسوقت تازہ ہیں اُن کی ہستیاں ہماری آنکھوں میں معزز و مفتخر ہیں، یہی وجہ ہے کہ مولانائے موصوف نے بھی چند نام لئے ہیں اور وہ خود فرماتے ہیں کہ " اُردو مصنفین اور شاعروں کا جب کبھی کوئی مسلمان مفصل تذکرہ لکھیگا تو اُن سب کے لئے بہرحال[1] مناسب جگہ نکالنی پڑیگی"۔
خوشی کی بات ہے کہ چند ہندو مصنفین کے کمالات کا خیال اہل انصاف حضرات کے دل میں ہے تو وہ اتنا ہی سہی کہ جب کبھی کوئی مفصل تذکرہ لکھا جائیگا۔ تو اُن کے لئے بہرحال مناسب جگہ نکالنی پڑے گی۔ لیکن جو کچھ اب تک ہوتا رہا ہے اُس سے تو قطعی اُمید نہیں کہ بہرحال مناسب جگہ نکالنے کا خیال کبھی عملی جامہ پہنے۔ واقعات سے قرائن نکلتے ہیں اور واقعات یہ ہیں کہ ہندوؤں کے کمالات کا سلسلہ بہ سلسلہ ادبیات یا تاریخ اُردو میں شامل کرنا تو درکنار کسی ادبی انجمن یا کسی واحد ادیب نے کسی ایک ہندو مصنف کے متعلق کبھی آج تک کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں کی ہے۔ سوائے ایک "یادگار نسیم" کے، جس کی ترغیب کس طرح ہوئی یہ حقیقت جلباب خفا میں ہی رہنا بہتر ہے۔ جس مفصل تذکرے کی بشارت مولانائے موصوف نے دی ہے سب سے پہلے اُس کی اُمید ہم کو اس صوبہ کے اُس بلند آہنگ و بلند نام سرکاری ادارے سے ہو سکتی ہے جس کا نام "ہندستانی اکیڈیمی" ہے

آیئے سرسری طور پر اپنے موضوع کے ضمن میں اس ادارے کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔ اکیڈیمی کی طرف سے ایک تذکرہ شعرا موسوم بہ جواہر سخن تین ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ جس کے مؤلف و مرتب مولوی محمد مبین کیفی چڑیا کوٹی ہیں۔ اس کی دوسری جلد جو آٹھ سو چالیس (۸۴۰) صفحوں کا گرانبار حجم رکھتی ہے اور جسمیں میر تقی سے لیکر انتالیس (۳۹) شعرا کا ذکر ہے میرے سامنے ہے۔ اُن انتالیس (۳۹) میں صرف تین ہندو ہیں

[1] خط میرا کھینچا ہوا ہے۔ مولانا کی اس عبارت میں دو لفظ "مفصل" اور "بہرحال" بہت معنی خیز ہیں۔ اور کافی غور و خوض کے محتاج۔ جگر بریلوی

اور اُن کی خدمات کی نذر صرف دو دو تین تین سطریں کی گئی ہیں۔ اور یہ بزرگ بھی ایسے ہیں جو خاص اہل کمال سے نہیں۔ اس تذکرے میں بھی مثل دیگر تذکروں کے بہت سے ایسے مسلم شعرا ہیں۔ جن سے بدرجہا بہتر ہندو شعرا شامل ہونیکے مستحق نکل سکتے تھے۔ اُن چند بزرگوں کا تو مرتبہ ہی اور ہے۔ جن کے نام آب حیات کے سلسلہ میں لئے گئے لیکن وہ اور یہ ہیں سب متروک۔ اب فرمایا جائے کہ جواہر سخن کے مطالعہ سے سوا اس کے اور کیا نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے کہ اُردو شاعری کلیۃً مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔

ہندستانی اکیڈمی سے ایسی غیر معتبر اور گمراہ کُن تصنیف کا شائع ہونا نہایت مایوس کُن ہی نہیں بلکہ ظُلم ہے۔ اِس ادبی مرکز کی تصنیفات سے اعتبار و استناد کی توقع کی جاتی ہے نہ کہ گمراہی و حق تلفی کی۔ جواہر سخن جیسی کتابوں کی بازار میں کیا کمی ہے جو پبلک کا ہزاروں روپیہ برباد کرکے دیانتداری کا خون کیا گیا۔ لیکن اُس کی کون پروا کرتا ہے۔ کسی نے چوں بھی نہ کی۔

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

حق و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اکیڈمی اِس کتاب کو اپنی مطبوعات کی فہرست سے خارج کردے اور اپنی الماریوں سے ایک ایک جلد نکال کر نذر آتش کردے ورنہ کسی طرح اِس ظلم کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

مولانائے موصوف فرماتے ہیں کہ شیفتہ کے گلشن بیخار سے متعلق بھی یہ بیان صحیح نہیں کہ اُس میں صرف پچیس تیس ہندو شاعروں کا ذکر ہے کم از کم بہتّر کا تو ضرور ہے۔ اس وقت گلشن بیخار میرے پاس موجود نہیں ممکن ہے بہتّر ہی ہندو شعرا کا ذکر ہو لیکن اس تعداد کی کمی بیشی سے میرے نفس مضمون اور اُس کی عملی حقیقتوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

مولانائے موصوف آخر میں فرماتے ہیں کہ مضمون نگار نے جو علاج تجویز کیا ہے وہ مرض کو دور کرنیوالا نہیں بلکہ اور پیچیدگیاں بڑھانے والا ہے۔ اُس کے متعلق میری گذارش یہ ہے کہ اس زمانہ میں قوموں کے حقوق کے تحفظ کا واحد علاج یہی ثابت ہے کہ اُن کو ترقی کے ہر شعبے میں کافی نمایندگی ہو۔ اس اصول کے ماتحت اپنی حقیر رائے سے میں نے یہ علاج تجویز کردیا۔ اگر مولانا موصوف کو اِس سے اختلاف ہے تو از راہ کرم وہی کوئی ایسی مبارک تجویز پیش کرکے ہندوں کو شکر گذاری کا موقع عطا کریں جس سے گذشتہ حق تلفیوں کی تلافی بھی ہو جائے اور آیندہ کی زبان مشترکہ طور پر صحیح معنی میں دونوں قوموں کی زبان ہو جائے۔ نہ یہ کہ کہنے کیلئے تو مشترکہ زبان ہو اور حقیقت میں ہو تمامتر یکطرفہ۔

دریا

(از مسٹر حسن یحییٰ عندلیب ایم۔اے۔ ایل ایل بی)

کوہ کے دامن سے نکلا رات کے پچھلے پہر
گھاٹیوں کی سیر کرتا زیرِ لب گاتا ہوا

ٹھوکریں کھاتا، اُلجھتا جھاڑیوں کے خار سے
سر کو پتھریلی چٹانوں سے وہ ٹکراتا ہوا

جھیلتا سختی کو لیکن خندہ پیشانی کے ساتھ
اِک جہاں کو اپنا استقلال دکھلاتا ہوا

سیکڑوں ٹیلوں، پہاڑوں پر نگاہیں ڈالتا
اور شبِ مہتاب میں ٹھنڈی ہوا کھاتا ہوا

لیلیٰ شب کی نگاہیں خیرہ کرتا نور سے
گھپ اندھیرے میں رخِ تاباں کو جھلکاتا ہوا

سنگ ریزوں کو جھٹکتا اپنے دامن سے مدام
چادرِ سیماب کا اِک فرش پھیلاتا ہوا

چلتے چلتے بھی دکھاتا رقصِ پیہم کی بہار
ناز سے ہر ہر قدم پر پیچ و خم کھاتا ہوا

منزلِ مقصود جیسے بھول جائے راہرو
وہ نگاہِ جستجو آمیز سے دوڑاتا ہوا

دیکھنے والوں کو دکھلاتا اِک آندھی کا سماں
کوہساروں سے نکل کر دشت میں آتا ہوا

ہر قدم پر لغزشِ پیہم سے دلوں کو روندتا
لیکن اپنی ہی ادا سے آپ شرماتا ہوا

کھیلتا چشموں سے، ہوتا ندیوں سے ہمکنار
آشتی و صلح کو دنیا میں پھیلاتا ہوا

دشت کو سیراب کرتا، بوستاں کو فیضیاب
کشت زاروں کو ڈبوتا اور نہلاتا ہوا

کودتا، گاتا، بجاتا، ڈگمگاتا، جھومتا
پرچم اپنا وسعتِ میداں میں لہراتا ہوا

وادی و کہسار میں اپنا دکھاتا رنگ و روپ
ایک طوفانِ بلا کی مثل منڈلاتا ہوا

کوششوں میں ملک گیری کی مثالِ تاجدار
سلطنت روئے زمیں پر اپنی پھیلاتا ہوا

یورشِ پیہم سے کرتا بحر و بر کو ایک جا
دشت و صحرا کو برابر آنکھ دکھلاتا ہوا

آسماں پر جب شفق ہو خوں فشاں ہنگامِ شام
مادرِ گیتی کو رازِ امن سمجھاتا ہوا

فتنہ زا موجوں کو پہلو میں سلاتا شوق سے
میٹھی میٹھی لوریوں سے اُن کو بہلاتا ہوا

انجمِ رخشندہ کو ناز و ادا سے دیکھتا
رعب سے لیکن دلوں کو اُن کے دھڑکاتا ہوا

ملکۂ شب تاکہ دیکھے حُسنِ گلشن کی بہار
ہاتھ میں اپنے لئے آئینہ دکھلاتا ہوا

ساحلِ شیدا سے کچھ اٹکھیلیاں کرتا ہوا
آتشِ اُلفت کو اُس کے دل میں بھڑکاتا ہوا

چھیڑتی مستی میں گر چلتی ہوئی بادِ صبا
عالمِ غیظ و غضب میں جھاگ برساتا ہوا

سرخوشی میں چھیڑتا لیکن سرودِ دلنشیں
مطربِ رنگیں نوا کی روح تڑپاتا ہوا

مرغزاروں میں گذر کر، شہر سے بیحد نفور
بستیوں میں دُور دُور اور اُن سے گھبراتا ہوا

ایک بحرِ بیکراں میں جا گرا دیوانہ وار
امتیازِ زندگی و مرگ بتلاتا ہوا

ناچاری

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ناشاد ایم اے)

چلنے کی سکت اب مجھ میں کہاں بیمار ہوں میں ناچار ہوں میں
اے میرے عصائے پیری تو پہنچا دے مجھے میخانے تک

محفل میں ساقی خود ہیں سے اُمید نہیں فیّاضی کی
کیا دیکھتے ہو اے تشنہ لبو خود جا پہنچو پیمانے تک

ہے وقتِ سحر خاموش بھی ہو تو اور جلا ئے گی کس کو
اے شمعِ فروزاں تیری پہنچ ہوتی ہے فقط پروانے تک

تھے اور بھی خرمن رستے میں کیا اُن کو جلانا مشکل تھا
کیوں چھوڑ کے سب کو آئی ہے اے برق مرے کاشانے تک

تو دیکھے سوکھے تنکوں کو میں ڈھونڈوں دل کے ٹکڑوں کو
اے بلبلِ بیکس ہم دونوں آ مل کے چلیں ویرانے تک

وہ زہد میں راز و نیاز کہاں جو عشق میں ہیں اعجاز نہاں
عاشق کی رسائی ہے بت تک زاہد کی پہنچ بتخانے تک

یہ فکر ہے کیسی کیسا غم اک روز نکل جائے گا دم
ناشاد کہاں کے رنج و الم ہیں ساتھ فقط مر جانے تک

پستالوزی

جدید طرزِ تعلیم کا بانی

از محمد اسحٰق صاحب ایم۔اے

یوہان ہانیریچ پستالوزی[۱] سوئزرلینڈ کے شہر زوریچ[۲] میں ۱۷۴۶ء میں ایک جراح کے گھر پیدا ہوا اور ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔

پانچ سال کی عمر میں اُس کے باپ کا انتقال ہوگیا تو پستالوزی کے دل پر اس سانحہ کا غیر معمولی اثر پڑا۔ اوّل اوّل اُس کی تعلیم زوریچ کے ایک مدرسے میں ہوئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنا آبائی پیشہ اختیار کرے لیکن کچھ دنوں بعد یہ خیال دل سے دُور ہوگیا۔ اور ژان ژاک روسو[۳] کی کتابوں کے مطالعہ نے پستالوزی کو ایک نئی شاہراہ پر ڈال دیا۔ خصوصاً روسو کی کتاب امیل[۴] کے پڑھنے کے بعد وہ تعلیم کی طرف مائل ہوگیا روسو کی دوسری کتاب "معاہدہ اجتماعی[۵]" کے پڑھنے کے بعد پستالوزی، روسو کے افکار اور خیالات کا عاشق اور اصلاحِ تعلیم و تربیت کے نشہ میں سرشار ہوگیا۔ روسو کے خیالات نے پستالوزی کے دل و دماغ پر اپنا پورا تسلط جما لیا۔

اُس وقت سوئزرلینڈ میں دلدادگانِ روسو کی ایک انجمن "سوسائٹی ہلواتین[۶]" کے نام سے قائم تھی۔ جس کا ممبر پستالوزی بھی بن گیا۔

ابھی بیس سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ اُس انجمن کے رسالہ میں مضامین لکھنے لگا۔ تھوڑے دنوں بعد اپنے ایک دوست کے کہنے سننے سے سیاسیات سے الگ ہوکر اُس نے سوداگری کا پیشہ اختیار کرلیا، اور ایک سوداگر کی بیٹی سے شادی کرکے ۱۷۶۹ء میں سوئزرلینڈ کے ایک گاؤں نیوہوف[۷] میں تھوڑی سی زمین مول لے کر زراعت کے کام میں مشغول ہوگیا۔ لیکن جب اس کام میں اُسے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو کاشتکاری ترک کرکے مویشی پالنے کا کام شروع کیا۔ اس میں بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ تو روئی کاتنے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ مول لیا۔ اور غریب بچّوں کو مزدور رکھ لیا۔

---

[۱] Johann Heinrich Pestalozzi. [۲] Zürich [۳] J.J. Rousseau. [۴] Emile on [۵] Contract Social [۵] la Nouvelle Education. [۶] Societe Helvetienne. [۷] Neuhof.

یہ پیشہ اُس کی طبیعت کے موافق تھا۔ اور اُسے اپنے میلانِ طبع کے موافق لڑکوں کے ساتھ میل جول کرنے کا اچھا موقع مل گیا۔ چنانچہ اُس کے دِل میں اُن کی محبت گھر کر گئی۔ اور وہ اُن کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ وہ اکیلا اِس بارِ گراں کے اُٹھانے کے قابل نہیں ہے تو اُس نے ایک رسالہ "دوست دارانِ انسانیت" کے نام سے شائع کیا۔ جسمیں اُس نے اعلان کیا کہ اگر لوگ چھ مہینے کے لئے اُس کے دفتر کا خرچ ادا کر دیں۔ تو وہ تمام غریب بچوں کی تعلیم و تربیت کا ذمہ لیلے۔ اور دش سال کی مدت میں وہ یہ رقم عوام کو واپس بھی کر دیگا۔ اِس رسالہ میں اُس نے یہ بھی لکھا کہ لڑکوں کو لکھنا پڑھنا، حساب کتاب، کھیتی باڑی اور لڑکیوں کو خانہ داری سینا پرونا اور بچوں کو پرورش کرنا اچھی طرح سکھلا سکتا ہے یعنی وہ ایک ایسے مدرسہ کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔ جہاں بچے علم بھی حاصل کریں، اور دستکاری سے بھی واقف ہو جائیں۔

لوگوں کے دلوں پر اِس اپیل کا بڑا اثر ہوا۔ چنانچہ تھوڑے ہی دِنوں میں کافی سرمایہ جمع ہو گیا۔ اور لڑکے بھی کافی تعداد میں مل گئے۔ اِس طرح کام شروع ہوا اور پستالوزی اپنے اس نئے کام میں پورے شوق کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ وہ بچوں کی تمام عادات و حالات کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔ اُس نے انھیں پڑھنے کا طریقہ اور رہنے سہنے کا سلیقہ سکھایا۔ اور بچوں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کو خود بازار لیجا کر فروخت کرتا تھا اس طرح پانچ سال تک اُس کا اسکول خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ لیکن وہ اُسکے مصارف برداشت نہ کر سکا۔ اور جب اس کی بدولت اپنی جائداد کو لٹا کر کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ تو مجبوراً اُس کو اسکول بند کرنا پڑا۔ لیکن اُس پر بھی وہ مایوس نہ ہوا اور اپنے قلم پر بھروسہ کرکے گذشتہ نقصان کی تلافی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اِسی دھن میں اُس نے بہت سے رسالے، قصے اور رومان لکھ ڈالے اور ایک رسالے کی بھی بنیاد ڈالی

اُس نے "لیونارڈ اور گارٹ رودڈ"[1] نامی ایک کتاب لکھی جو سوئزر لینڈ و جرمنی میں بہت مشہور ہوئی اور جس سے پستالوزی کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

اس کتاب کی اشاعت کے اٹھارہ سال بعد سوئزر لینڈ میں ایک انقلاب ہوا یعنی مُلک میں جمہوریت کا اعلان کیا گیا۔ پستالوزی کے کچھ احباب ریاست کے عہدہ دار ہو گئے۔ چنانچہ اُس کے ایک دوست نے جو وزارت کے عہدہ پر سرفراز ہوا تھا۔ پستالوزی کے لئے ایک اعلیٰ عہدہ انتخاب کیا۔ لیکن پستالوزی نے یہی جواب دیا کہ "میں معلم بننا چاہتا ہوں"۔

---

[1] Leonard and Gertrude.

اُس وقت چونکہ بعض باغی صوبوں میں حکومت کو جبر و تشدد سے بھی کام لینا پڑا تھا اور بغاوت کے فرو کرنے میں کشت و خون بھی روا رکھنا پڑا تھا۔ جسکی وجہ سے ہزاروں بچے یتیم ہو گئے تھے، اس لیے حکومت نے ایک یتیم خانہ قائم کیا اور اُسکی نگرانی پسٹالوزی کے سپرد کردی۔ اُس نے اِس یتیم خانہ میں اسقدر تندہی سے کام کیا کہ تھوڑے ہی دنوں میں اُس کو حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اور پسٹالوزی کو لوگ "یتیموں کے باپ" کے نام سے پکارنے لگے۔

کچھ دنوں بعد جب حکومت نے اُس شہر کو چھاؤنی بنا دیا۔ تو پسٹالوزی نے حکومت سے درخواست کی کہ اُس کو اپنے نئے اصول کا تجربہ کرنے کے لئے ایک مدرسہ میں موقعہ دیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں حکومت نے قصر برگ ڈورف[1] کو پسٹالوزی کے سپرد کر دیا تاکہ وہاں ایک نیا مدرسہ کھولا جائے اور بچوں کو نئے اصول پر تعلیم دی جائے۔ یہاں بچوں کی تعلیم و تربیت کے علاوہ پسٹالوزی نئے قسم کے اُستاد بھی تیار کرنے لگا۔ مگر یہاں بھی وہ تین سال سے زیادہ کام نہ کرسکا۔ کیونکہ سوئزرلینڈ چند جمہوریتوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور جب نئی حکومت نے اُس عمارت کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ تو پسٹالوزی حسرت اور افسوس کے ساتھ اُس جگہ کو چھوڑ کر اپنے ایک عزیز دوست کے گھر ایک پہاڑی علاقہ میں چلا گیا۔ لیکن دو یا تین مہینے سے زیادہ اُس کو بیکار نہ رہنا پڑا۔ حکومت نے اُسے قصر برگ ڈورف میں نئے اصول پر تعلیم اور تربیت دینے کی اجازت دیدی۔ لیکن مدرسہ کے منتظم سے اُس کی اَن بن ہو گئی اور پسٹالوزی کو مجبوراً کام بند کرنا پڑا۔ آخر ۱۸۰۴ء میں اُسے "مونخن بوخزہ" کی عمارت میں ایک مدرسہ قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ لیکن یہ بھی تھوڑے دنوں میں بند ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایورڈون[1] کے صوبہ نے پسٹالوزی کو بُلا کر ایک تربیت خانہ کھولنے کی درخواست کی۔ بہت سے اُستاد جو اُس کے ماتحت کام کرچکے تھے جمع ہو گئے اور اِس تربیت خانہ نے بڑی شہرت حاصل کی۔

۱۸۱۵ء میں پسٹالوزی کے ایک دوست نے اُس کی تمام کتابوں کی اشاعت کا "کوٹا" لائبریری کو ٹھیکہ دیا۔ اِس سے اُسے پانچ ہزار فرانسیسی لیرہ ملے۔ جس کو اُس نے اسی کام میں صرف کر دیا۔ اور ایک نئے تربیت خانہ کی بنیاد ڈالی۔ لیکن اسمیں بھی اُسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ مجبوراً ۱۸۲۵ء میں "ایورڈون" کے تربیت خانہ کو بند کرکے وہ "نیوہوف" کی کھیتی میں پھر آیا۔ اِس وقت اُس کی عمر اسّی سال کی ہو چکی تھی۔ یہاں اُس نے دو رسالے لکھے، ایک کا عنوان "نغمۂ قو" تھا اور دوسرے کا "مقدرت زندگی"۔ اِن رسالوں میں اُس نے اپنے مقاصد کی ناکامیابی کے اسباب دکھلائے۔ اپنی

[1] Yverdon. [1] Burgdorf.

خامیوں کا اقبال اور اپنی غلطیوں کا اقرار کیا جس سے اُس کو اپنے ہمچشموں میں اور زیادہ فروغ حاصل ہوا مگر اُس کے بعض دوستوں نے اُس پر چند بہتان بھی لگائے۔ جس سے اُس کو بڑا صدمہ پہونچا اور اُس کی رہی سہی ہمت ٹوٹ گئی مگر وہ اپنی صداقت اور نیک نیتی کے ثبوت میں ڈاکٹروں اور طبیبوں کی ممانعت کے باوجود مضامین لکھتا رہتا۔ آخر اسّی برس کی عمر میں دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔ اُس کی وفات "براگ" میں سترہ فروری ۱۸۲۷ء کو ہوئی۔

پستالوزی کے علمی کارنامے

۱۷۸۰ء میں پستالوزی کا پہلا رسالہ "ایک فقیر کی شام کی گھڑیاں"[1] جسمیں اُس کی تعلیم کا پروگرام درج تھا، شائع ہوا۔

پستالوزی نے ۱۷۹۲ء میں جرمنی کا سفر کر کے متعدد مشاہیر سے ملاقات کی۔

ایورڈون کے تربیت خانہ نے اسقدر شہرت حاصل کی کہ اسپین، روس اور اٹلی نے اُس کے اصولِ تعلیم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور پستالوزی کے نئے اصول پر کاربند ہوئے۔

۱۸۰۱ء میں پستالوزی برگڈوف میں ایک کتاب "گرٹروڈ کس طرح اپنے بچوں کو تعلیم دی"[2] کے عنوان سے لکھی۔ اس کتاب میں اُس نے اپنے ذاتی تجربات شائع کئے۔ اسی طرح اپنی دوسری کتاب "ماں کا وظیفہ اور بچے کی تعلیم و تربیت" نامی میں اُس نے بچوں کی پرداخت کی نسبت اپنے خیالات شائع کئے۔

پستالوزی کے تعلیمی اصول

"اصولِ تعلیم میں پستالوزی کا عقیدہ تھا کہ محسوسات اور بدیہیات کو بنیاد قرار دے کر تعلیم کی ابتدا کرنی چاہئے۔ بچوں کے روحانی جذبات سے فائدہ اُٹھا کر تعلیم کی بنیاد انکی سمجھ کے مطابق ہونا چاہئے۔"

"جو چیز بچوں کو یاد کرانا مقصود ہو انھیں کے ذریعہ اُس کی وضاحت کیجائے۔ یعنی اس طرح انھیں تعلیم دی جائے کہ جس چیز کو بچے یاد کرنا چاہیں اُس سے خود انھیں دلچسپی ہو جائے اور وہ اسکی نسبت اپنی سمجھ کے مطابق سوال کرنے لگیں۔ پستالوزی طرزِ تعلیم میں اس اصول کا بانی سمجھا جاتا ہے۔"

"پستالوزی نے یہ اصول سمجھ لیا تھا کہ مادی چیزوں کی تعلیم بذریعہ تصویروں، تختوں اور مختلف قسم کے کھلونوں سے آسانی سے دیجا سکتی ہے۔ اسی طرح اُس کی رائے میں ابجد کی تعلیم تختوں اور رنگ برنگ کے کاغذ کے ٹکڑوں سے بہت آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔"

"پستالوزی کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بچوں کو اپنے ساتھ ساتھ پڑھانے، ہجے کرنے اور تلفظ کرنے میں

---

[1] Evening Hours with a Hermit.

[2] How Gertrude teaches her children.

بڑا فائدہ ہوتا ہے؟

"اسی طرح اُس کو تجربہ سے معلوم ہوگیا کہ بچّوں کو ابتدائی تعلیم میں سبق کا دہرانا اور بلند آواز سے پڑھنا بڑا مفید ہوتا ہے"

پستالوزی کو اپنے ذاتی تجربہ میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ بچّوں کو کھیل کود کے سلسلہ میں لکھنا پڑھنا نہایت آسانی سے سکھایا جا سکتا ہے۔ مدرسہ ایک کھیل کود کی جگہ ہونی چاہیے نہ کہ قید خانہ اور لڑائی جھگڑا اور مار پیٹ کی جگہ۔

پستالوزی کو یقین ہوگیا کہ اگر ہاتھ کے کام اور دیگر جسمانی کام، دماغ اور نظروں کے کاموں کے ساتھ ساتھ کیے جائیں تو بچّے بہت جلد اپنی استعداد کے مطابق خود کچھ نہ کچھ سیکھ لیتے ہیں اور اپنے قدرتی ذوق کے موافق لیاقت بھی حاصل کر لیتے ہیں۔

اگرچہ ان میں کے بعض اصول پستالوزی کے جدید انکشاف سے پہلے بھی روسو، موسلیں اور کانت جرمنی کی بدولت معلوم ہو چکے تھے لیکن وہ انکشافات صرف نظریے ہی نظریے تھے کسی نے انکو تجربہ کی کسوٹی پر کسا نہ تھا۔ پستالوزی نے ان نظریوں پر عملدرآمد کرکے سوسائٹی کے سامنے پیش کیا۔ اس لئے اُس کو نئی طرز تعلیم کا موجد اور بانی کہا جاتا ہے۔

پستالوزی کی کامیابی کا اصلی سبب یہ تھا کہ وہ اپنے ارادے کا پکّا اور دُھن کا پورا تھا۔ باوجود انتہائی رکاوٹوں کے وہ اپنی کوشش سے کبھی باز نہ رہا۔ چالیس سال تک اُس کو ہر قسم کی رکاوٹیں پیش آتی رہیں، لیکن اِن رکاوٹوں کے باوجود وہ کبھی شکستہ خاطر نہ ہوا، اور نہ ہمت و استقلال کو ہاتھ سے دیا۔ اِس انتھک کوشش کی بدولت اُسے بالآخر کامیابی ہوئی۔ بات یہ ہے کہ وہ اپنے اصول تعلیم کا دلدادہ و شیدا تھا، چنانچہ اپنی ایک کتاب میں وہ لکھتا ہے کہ "حقیقی عشق اور پختہ ارادہ انسان میں ایک غیر معمولی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔"

پستالوزی تمام عمر اپنی آرزوؤں کا شکار ہوتا رہا اور اس کو فطرت نے ہمیشہ ناکام اور نامراد رکھا، لیکن اُس نے اپنے مسلک کو کبھی نہ چھوڑا۔ اُس کی دلی آرزو تھی کہ وہ غریبوں کے بچّوں کی ترقی اور تعلیم میں اپنا سر کھپا دے۔ اُس نے اپنے لئے کبھی فکر نہ کی اور نہ اپنے آرام و آسائش کی کوئی پرواہ کی۔ وہ غریبوں کی راحت اور خوشی کو ہمیشہ اپنی راحت اور خوشی پر ترجیح دیتا تھا۔ اپنے کو تباہ کرکے وہ انسانیت کو بچانا چاہتا تھا۔

اُس کو غریب اور یتیم بچّوں کے ساتھ دلی محبت تھی۔ حالانکہ وہ دوسرے امور میں جنکو اُسکے مسلک سے کوئی تعلق نہ تھا، بالکل ناقص اور کورا تھا مگر اُس کی زندگی انسانیت کے لئے رحمتِ ایزدی تھی۔

پستالوزی کی وفات کے بعد اُس کے نام کو شہرت ہوئی اور اُسکی قدر لوگوں کو معلوم ہوئی۔ بیشمار جگہوں میں اُس کا مجسمہ نصب کیا گیا۔ اُس کے نام پر مدرسے کھولے گئے اور رسالے جاری کئے گئے۔

۱۲ جنوری ۱۸۴۶ء کو پستالوزی کی پیدائش کے پورے سو سال بعد یورپ کے تقریباً تمام ممالک میں اُس کی یادگار میں جشن منایا گیا۔ اور یتیموں اور غریب بچوں کی حمایت اور تائید میں جابجا بہت سی انجمنیں اُس کے نام پر قائم کی گئیں۔ ۱۸۴۷ء میں برلن سے پستالوزی کے نام پر ایک رسالہ جاری کیا گیا۔ ۱۸۸۰ء میں پستالوزی کے نام پر برلن میں کئی یتیم خانے کھولے گئے اور ۱۸۹۶ء میں پستالوزی کی ڈیڑھ سو سال کی برسی کے موقع پر تقریباً تمام یورپ میں جشن منایا گیا۔

پستالوزی کے ہموطنوں نے اُس کی وفات کے بعد اُس کی قبر پر ایک پتھر اور اُس کا ایک مجسّمہ تیار کرکے لگا دیا جس کے نیچے یہ عبارت کندہ ہے:-

"ہائنریچ پستالوزی (۱۷۴۶-۱۸۲۷) نیوہوف کے فقیروں کا نجات دینے والا۔ اپنی کتاب "لیونارڈ اور گرترود" کے ذریعہ اپنی ملت کی رہنمائی کرنے والا۔ بورگڈوف اور یوفرڈن میں مدرسۂ عامہ کا بانی۔ شہر ایورڈون میں انسانیت کا مربی۔ شہر استانس کے یتیموں کا باپ، انسان عیسائی، اپنے وطن کو دوست رکھنے والا۔ دوسروں کے لئے سب کچھ، اپنے لئے کچھ بھی نہیں، خدا اُس کے نام کو پاک اور صاف رکھے۔"

تیس سال پہلے

تیس سال ہوئے زمانہ نومبر ۱۹۱۰ء میں "ہندی مذاق" کے عنوان سے مرحوم خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب قادیانی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جسمیں اردو ادب کی کمزوریاں بیان کرتے ہوئے قابل مضمون نگار نے لکھا تھا کہ:-

اگر فارسی ذخائر کی طرح ہندی ذخیروں سے بھی کام لیا جاتا تو اسوقت اردو شاعری کی کچھ اور ہی وقعت اور وسعت ہوتی۔ یہ غلطی قابل تسلیم ہے کہ جب ایک دفعہ اردو ادب نے کوشش نہیں کی ہندی کا حاصل کر لیں سمجھا گیا۔ ایران پر جو دور ہوا اپنے گھر یا پڑوس کی خبر تک نہ لی۔ یعنی دو آبہ پر نظر رہی۔ اُنکی تقلید کا شوق ہوا اسی طرح سعدی اور حافظ کے کلام پر مشق رہے۔ ہندی کی طرف توجہ نہیں۔ اسکا اس فن قافیہ کا ایعنی فن شعر سے شناسائی حاصل نہ کی۔ نہ فن نثر یعنی ناٹک طبع جانا اور نہ فروعات شعری مثل چھند، ساکھی، دوہا وغیرہ سے واقفیت پیدا کی۔

اس غلطی کا صرف یہی نتیجہ نہ نکلا کہ معلومات میں ترقی نہ ہوئی۔ بلکہ یہ بھی کہ اردو کے ادبیات اور نظم شاعری یا جن قیمتی خیالات کی ضرورت تھی۔ اُن سے اردو ابتک کسی حد تک خالی ہے اور دوسرے یہ کہ زبانوں کے خیالات جو بذریعہ محبت کے ایک دوسری قوم کو ایک دوسرے کے قریب لانے جاتے ہیں ان میں بہت کچھ فرق آ گیا۔"

تم یاد آتے ہو!

(از مسٹر بدری ناتھ شاطر الہ آبادی)

سحر کے وقت جب سورج کی کرنیں جگمگاتی ہیں اندھیرے کی بلائیں جب ضیا میں ڈوب جاتی ہیں
طرب انگیز جب دریا کی موجیں گنگناتی ہیں حیات افزا ہوائیں آکے جب شانہ ہلاتی ہیں
ہمیں تم یاد آتے ہو، ہمیں تم یاد آتے ہو

برہمن بتکدہ میں لیکے جب نا قوس آتا ہے مؤذن جب اذاں کا نعرہ مسجد میں لگاتا ہے
زمانے کا زمانہ جب یکایک چونک جاتا ہے جب اک کروٹ میں سو پہلو دلِ محزوں دکھاتا ہے
ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو

تپش گرمی کے موسم میں جب آکر قہر ڈھاتی ہے غریبوں کے مکانوں میں ہوا جب سنسناتی ہے
امیروں کی حویلی رنگ و بو میں جب نہاتی ہے ہمارے غم کی چنگاری ہمیں جب خود جلاتی ہے
ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو

جب اپنے کو جھلستی دھوپ میں مصور پاتے ہیں جب اپنی منزلِ مقصود کے چکر لگاتے ہیں
نرالے مرحلے جب رنج و غم کے پیش آتے ہیں اکیلے جب کسی جھاڑی میں تھک کر بیٹھ جاتے ہیں
ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو

بھری برسات میں ہوتی ہے جب دریا میں طغیانی نظر آتا ہے کالے کوسوں تک جب پانی ہی پانی
ہجومِ یاس سے بڑھتی ہے جب دل کی پریشانی گھٹاؤں میں چمک اٹھتی ہے جب اک برقِ نورانی
ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو

کبھی ہوتا ہے جب دیہات کی جانب گذر اپنا کسانوں کی ہری کھیتی کا جب کرتے ہیں اندازا
سماں بندھتا ہے جب پیشِ نظر طوفانِ باراں کا جب اک تالاب بن جاتا ہے بڑھکر غیرتِ دریا
ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو

جب اک رات [illegible] نئے منظر دکھاتی ہے پہاڑی [illegible] کے انوار سے جب جگمگاتی ہے

ہوائے سرد میدانوں میں جب دُم بار پاتی ہے　　　کلی کھل کھل کے جب صحنِ چمن میں مسکراتی ہے

ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو!

بسنتی ساڑیاں جب حُسنِ قدرت لیکے آتا ہے　　　ہری سرسوں میں پیلا قمقمہ جب رنگ پاتا ہے
نظامِ خلق سنّاٹے میں جب موتی لُٹاتا ہے　　　ستارے جب نظر آتے ہیں سورج ڈوب جاتا ہے

ہمیں تم یاد آتے ہو، ہمیں تم یاد آتے ہو

مصیبت کی گھٹا اُٹھ اُٹھ کے جب چکّر لگاتی ہے　　　بلائے ناگہاں جب سر پہ کوئی تازہ آتی ہے
نحوست بخت کی جب اشکِ خوں پیہم رُلاتی ہے　　　جب اپنی کشتیِ دل شورشوں میں ڈگمگاتی ہے

ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو

سہارا ایک تنکے کا بھی جب مطلق نہیں پاتے　　　ہوائے دہر کے جھونکے موافق جب نہیں آتے
طلسمِ بحرِ غم میں پھرتے ہیں جب ٹھوکریں کھاتے　　　اُبھرنے ڈوبنے کے جب نہیں احساس رہ جاتے

ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو

جب اپنی زندگی انفاس کی حد سے گذرتی ہے　　　جب اپنی آخری ہچکی قضا کا روپ بھرتی ہے
جب اپنی فردِ عصیاں پرسشِ محشر سے ڈرتی ہے　　　جب اپنی فکرِ شعر و شاعری پرواز کرتی ہے

ہمیں تم یاد آتے ہو۔ ہمیں تم یاد آتے ہو!

جذباتِ فیاض

وفورِ شوق سے اِک ربط ہے حسنِ گریزاں کو　　　گریباں میں مرے سی دیجئے یوسف کے داماں کو
ترستا ہے مرا دل کیف پرستہائے پنہاں کو　　　بنا دو جرعۂ صہبا نگاہِ زیرِ مژگاں کو
قیامت ہے حدودِ نوجوانی سے گذر جانا　　　اسی منزل پہ ٹھہرا لے کوئی عمرِ گریزاں کو
بہار آئی ہے سو جلوے لئے آغوش میں اپنی　　　میں اب دامن کا رکھوں ہوش یا دیکھوں گریباں کو
ابھی طوفِ حرم کی اہلیت پیدا تو ہو جائے　　　ابھی کچھ روز بُت خانے میں رہنے دو مسلماں کو
گُل ہنستے ہیں اب ان سے کلیاں مسکراتی ہیں　　　تم اپنے ساتھ لے آئے گلستاں کے گلستاں کو
مرے افسانے کا انجام عبرتناک تھا جتنا　　　اسی نسبت سے رنگیں تر بنایا اُس نے عنواں کو

بڑی اُمید سے کانٹوں نے پکڑا ہے ترا دامن
لُٹا دے آج تو فیاض ہر تارِ گریباں کو

فیاض [illegible]

حیوانات کا ماضی و مستقبل

از پروفیسر تاج محمد خیال ایم۔ اے لکچرار ایمرسن کالج

اکثر حیوانات ابتدا ہی سے انسان سے وابستہ رہتے ہیں۔ انسان خود ایک حیوان ہے مگر اُسے دیگر حیوانات کی نسبت عقل و شعور کا زیادہ حصہ ملا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ نیچر کی طاقتوں اور دوسرے حیوانات پر کئی طرح سے قابو پا لیتا ہے۔ انسان پر قدرت کے قوانین ایسے ہی عمل کرتے ہیں جیسے دیگر جاندار اور بیجان اشیاء پر، لیکن اس کی ہستی کچھ اسقدر اہم اور اعظم الشان ہے کہ اُسکے بدل جانے سے موجودات کی اکثر اشیاء کی قدر و قیمت خود بخود بدل جاتی ہے۔ انسان اور حیوانات کے تعلقات پر ذرا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تہذیب کی نشو و نما کے ساتھ یہ تعلقات بھی نمایاں طور پر بدلتے رہے ہیں۔

ارتقا کے اولین دور میں انسان خود حیوانی زندگی بسر کرتا تھا۔ بعض لوگ کہیں گے کہ آج بھی ہم سب حیوانی زندگی ہی بسر کر رہے ہیں۔ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور سوتے ہیں۔ یہ درست ہے مگر اب ہماری زندگی میں ان باتوں کے علاوہ بہت سی اور خصوصیات بھی موجود ہیں جو دیگر حیوانات میں نہیں ہیں۔ کبھی ایسا وقت تھا جب انسان اور حیوان میں شکل و صورت اور جسمانی بناوٹ کے علاوہ اور کسی بنا پر تمیز نہ کی جا سکتی تھی۔ اُس زمانہ میں حیوانات انسان کے مد مقابل تھے۔ مدتوں برابر کا مقابلہ رہا۔ سخت لڑائیاں ہوئیں۔ آجکل کی لڑائیوں کی طرح منظم جنگ نہیں بلکہ اِکّے دکّے حملے۔ دو دو چار چار کی ہاتھا پائی۔ انسانوں نے حیوانوں کو اور حیوانات نے انسانوں کو مار کھایا۔ جسمانی طور پر انسان حیوانات سے زیادہ طاقتور نہ تھا۔ مگر اس کا دماغ اُن سے کہیں بڑا تھا۔ اسمیں قدرت کو سمجھنے اور اسکی قوتوں سے کام لینے کی استطاعت پیدا ہو گئی۔ حیوانات محض اپنے جسمانی قویٰ سے لڑتے تھے۔ کسی قسم کے اوزار استعمال نہ کر سکتے تھے۔ انسانوں نے اپنے ہاتھ کی ضرب کو لاٹھی اور تلوار سے مضبوط کر لیا۔ پتھر مارنا سیکھا اور حریف پر دور سے وار کرنے لگا۔ زیادہ طاقتور حریفوں کے مقابلے میں گھر بنائے، اور اپنے آپ کو محفوظ کر لیا۔ غرض فہم و ادراک کی بدولت انسان نے حیوانات پر فتح حاصل کی۔ انسانی نسل بڑھتی گئی اور حیوانات کی تعداد دن بدن کم ہوتی گئی۔ سطح زمین کے بڑے بڑے حصے حیوانات سے صاف ہو گئے۔ انسان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مل جل کر رہنے میں طاقت کا راز پوشیدہ ہے۔ اس سے

سارے کام بہ آسانی طے ہوتے ہیں اور حریف کا مقابلہ بھی خوب ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جتھوں میں رہنے لگا۔ گاؤں اور شہر آباد کئے اور حیوانات اُس کے سامنے بالکل عاجز ہوگئے۔ انسان لڑنے کے عادی ہوچکے تھے وہ خو نہ گئی آپسمیں لڑنے لگے۔ جتھے بن گئے اور درندوں کی طرح آپسمیں گتھم گتھا ہونے لگی۔

اب ایک نیا دَور شروع ہوا۔ حیوانات انسان کے مدِ مقابل بن کر اُس کے لئے خطرناک ہونیکے بجائے اُس کے کاموں میں مدد کرنے لگے اور اُس کے آرام و آسائش کا باعث بنے۔ اس کے لئے بوجھ اُٹھاتے، ہل چلاتے اور خوراک کا سامان مہیا کرتے۔ اُس دَور میں انسان نے حیوانات کو کچھ آرام بھی پہونچایا، مگر ظلم بہت کئے۔ تہذیب کی ترقی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان اپنے جسم کی طاقت استعمال کرنیکے بجائے حیوانات یا نیچر کی بیجان طاقتوں کو استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ جسقدر یہ زیادہ کر سکتا ہے اُسیقدر اُسکی روزمرہ زندگی بہ آرام گذرتی ہے اور حریف کے مقابلہ میں وہ زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ چنانچہ ابتدا میں جس فوج کے پاس گھوڑے اور گدھے زیادہ ہوتے تھے وہی فتحیاب ہوجاتی تھی۔ اونٹوں اور ہاتھیوں سے بھی یہ کام لیا گیا۔ غرض اُس دَور میں انسان اور حیوان میں خوب تعاون رہا۔ انسان کی اقتصادی اور سیاسی زندگی کا دار و مدار زیادہ تر حیوانات پر ہوتا تھا۔ خوراک کا کام دینے کے علاوہ حیوانات زمین سے خوراک پیدا کرنے اور روپیہ کمانے میں بھی مدد دیتے تھے۔ اُن کی امداد کے بغیر بار برداری مشکل اور زراعت محال تھی۔ بیل نے کھیت میں ہل چلایا۔ گائے بھینس نے دُودھ دیا اور کتے نے گھر کی نگہبانی کی۔

انسانی عقل و تدبر نے اور ترقی کی تو انسان تمام دن محنت کرنے کے بجائے دن میں چند گھنٹے کام کر نیسے ضروریات زندگی بہم پہونچانے لگا۔ باقی وقت بسر کرنے کے لئے تفریحی مشاغل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ فرصت کی گھڑیاں گذارنے میں انسان نے حیوانات سے بہت مدد لی۔ کتا انسان کا مستقل ساتھی بنا۔ گھوڑے، گدھے اور اونٹ نے سواری کا کام دیا۔ بندر اور ریچھ نے تماشے دکھائے۔ طوطا اور مینا گھر میں دن بھر چہکتے رہتے۔ غرض حیوانات سے ایسے اکثر مشاغل پیدا ہوگئے جن سے فرصت کا وقت دلچسپی سے گذرنے لگا۔ یہ حیوانات کی زندگی کا تیسرا دَور تھا۔

دوسرے اور تیسرے دَور میں جن حیوانات کا انسان سے واسطہ پڑا اُنکی عادت میں خاص تبدیلی ہوگئی۔ مدت مدید تک محکوم رہنے کی وجہ سے اُنمیں فرمانبرداری کی عادت پیدا ہوگئی۔ خودمختاری اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کا مادہ آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ یہ انحطاط یہاں تک پہونچا کہ انسان کی مدد کے بغیر اُن کے لئے زندہ رہنا بھی مشکل ہوگیا۔ اگر پالتو بیل اور گدھے کو ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔ جہاں درندے رہتے ہوں تو چند دن بھی جینا محال ہے۔ یہ فرق صرف عادات ہی میں پیدا نہیں ہوا

بلکہ بعض جانوروں کی جسمانی ساخت بھی بڑی حد تک بدل گئی ہے۔

فارم کی گائے اور گھوڑ دوڑ کے بادپا گھوڑوں کی بناوٹ میں اِنسانی عقل کو کافی دخل ہے۔ اِنسانی مقاصد نے اِن حیوانات کی شکل و شباہت ہی بدل ڈالی ہے۔ اس سے حیوانات کی بہبودی اور بہتری مقصود نہ تھی۔ اِنسان کو اپنے مقاصد حاصل کرنے تھے۔ اُن کے لئے ان جانوروں کی نسل کشی خوراک اور تربیت میں تجربے کئے گئے اور اُنکی عادات اور جسمانی بناوٹ میں تبدیلی پیدا کر دی۔

موجودہ زمانے میں سائنس کی ترقی کی بدولت ایک نئے دَور کا آغاز ہوا ہے۔ اِنسان نے قدرت کی کئی طاقتوں پر قابو پا لیا ہے۔ موٹر کار۔ ریل گاڑی اور ہوائی جہاز کی ایجاد سے بار برداری کے لئے حیوانات کی ضرورت بہت کم ہو گئی ہے۔ سینما نے حیوانات کی تفریحی اہمیت کو بھی بہت حد تک ختم کر دیا ہے کبھی وہ وقت تھا کہ جس فوج کے پاس گھوڑے وغیرہ ہوتے تھے وہ بے سر و سامان مخالف پر جلد فتحیاب ہو جاتی تھی۔ آج یہ حال ہے کہ جو قوم محض گھوڑوں اور اونٹوں پر بھروسہ کرتی ہے اُس کی آزادی کے سال انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ جس قوم کی زراعت بیل اور بھینسے پر منحصر ہو، اُسے جان لینا چاہیئے کہ اُس کی زراعتی اشیاء کی تجارت آج نہیں تو کل ضرور مٹ جائے گی کیونکہ سائنس کے اوزار استعمال کرنے سے کم وقت اور کم روپیہ صرف کرنے سے زیادہ غلہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

صلح اور جنگ دونوں کی ضروریات میں حیوانات کو خوراک اور کسی حد تک لباس مہیا کرنے کے سوائے اور کوئی دخل نہیں رہا۔ اگر یہ تہذیب اِسی طرح قائم رہی اور آنے والی عالمگیر جنگ میں اس نے اپنے ہاتھوں اپنا گلا نہ کاٹ لیا۔ تو وہ دن دُور نہ ہو گا کہ لباس اور خوراک کی تمام ضروریات سائنس کی ایجادات سے پوری ہو جائیں اور اِنسان کو حیوانات کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے۔ مہذب ممالک میں تو بہت حد تک یہ ہو چکا ہے۔ لندن اور نیویارک میں رہنے والوں کو گوشت۔ دودھ۔ چمڑے اور اُون کے سوا حیوانات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ایسی چیزیں آج کل موجود ہیں جو دودھ کی جگہ استعمال ہو سکتی ہیں اور قرین قیاس ہے کہ آئندہ چند سال میں سائنس دان ایسی اشیاء ایجاد کریں جو گوشت، دودھ اور اُون کی جگہ استعمال ہو سکیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو مصنوعی چیزیں قدرتی اشیاء سے بہتر تصور ہونگی کیونکہ اُن کے اجزا میں حسب ضرورت کمی بیشی ہو سکے گی۔ قدرتی گوشت اور دودھ میں اس کی بہت کم گنجائش ہے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں اِنسان کو حیوانات کی بالکل ضرورت نہ رہے گی اور اُن کی بجائے قدرت کے پیدا کردہ سامانِ خورد و نوش کو بے فائدہ ضائع کرنے کا سامان بھی جاتا رہے گا۔ اس لئے بعید نہیں کہ تمام حیوانات صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے جائیں ؟

جانوروں اور چڑیا گھروں میں اُن کی نسل ضرور قائم رکھی جائیگی۔ اُس حالت میں بھی انسان اپنے آپ کو نہایت خود غرض آقا اور ناشکرگذار دوست ثابت کریگا۔

بہرحال تہذیب کے اولین دور میں حیوانات انسان کے حریف تھے، دوسرے میں اُس کے خادم، اور تیسرے میں اُس کے دوست رہے۔ آنیوالے دور میں حیوانات ایک غیر ضروری بوجھ سمجھ کر مٹادئے جائیں گے۔ سچ ہے دوستی یا دشمنی ہمیشہ برابر والوں میں قائم رہتی ہے۔ کمزور اور طاقتور بے شعور اور باشعور کے تعلقات ہمیشہ طاقتور اور باشعور کی اغراض پر منحصر ہوتے ہیں۔ طاقتور جو چاہے کرتا ہے۔ کمزور کی ہستی درکار ہو تو اُسے نہ صرف قائم رکھتا ہے بلکہ بہتر بناتا ہے۔ ضرورت نہ ہو تو تلف کردینے سے گریز نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے انسان نہایت خود غرض واقع ہوا ہے۔ بندوق بغل میں دبائے محض تفریح کے طور پر غافل بیٹھے ہوئے پرندوں کو مارتا پھرتا ہے۔ اُن کے کثیر تعداد میں مرجانے سے زراعت پر بُرا اثر پڑتا ہے تو پرندوں پر رحم کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور شکار حکماً بند ہو جاتا ہے۔ ان بیچاروں کا ہی یہ حال نہیں بلکہ طاقتور اور علم رکھنے والی قومیں کمزور قوموں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھتی ہیں۔ کمزور قوموں کی ہستی محض اس لئے قائم ہے کہ وہ طاقتور اور سائنسدان قوموں کے متعدد مقاصد پورا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جو قوم راہ میں حائل ہوتی ہے اُس کی ہستی حرفِ غلط کی طرح مٹادی جاتی ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے نظر آتا ہے کہ یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہیگا۔

ہستیِ مطلق

(از مسٹر جگن ناتھ آزاد بی اے)

بندگی زیبا فقط اُس ہستیِ مطلق کی ہے — جس کی دانائی سے قائم ہے جہاں کا انتظام
دیدۂ معنی کشا اور منکرِ ذاتِ خدا — اور ممکن ہو تو دیکھ اس لامکاں کا انتظام
گردشِ دورِ زمیں کتنی تعجب خیز ہے — کس قدر حیرت فزا ہے آسماں کا انتظام
چشمِ شاعر دیکھکر حیرت میں ہے ہر صبح و شام — کوہسار و سبزہ زار و گلستاں کا انتظام
بادلوں کو دیکھ حسنِ ماہ کا نظارہ کر — کتنا لاثانی ہے ذاتِ بے نشاں کا انتظام
عقلِ انسانی پہونچ سکتی نہیں اُس ذات تک — جس نے قائم کردیا بزمِ جہاں کا انتظام

ہستیِ مطلق ہے وہ شاعر کی تشبیہوں سے دور
مخزنِ الطافِ پیہم، معدنِ نور و سرور

نوجوان پُجاری

از چوہدری فدا محمد انجمن ترقی اُردو گوجرانوالہ

وہ ایک نوجوان پُجاری تھا۔ اور جب پوجا میں بیٹھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ گیان کی روشنی اُس کے چہرے پر نور برسا رہی ہے۔ پچیس ۲۵ برس کا سن ہوگا۔ آنکھوں میں ایک قدرتی کشش تھی جس سے دیکھنے والوں کے دل پر جادو کا اثر ہوتا، اور جب وہ آنکھیں بند کر کے دوزانو ہو کر پوجا میں بیٹھتا تو سب یہی کہتے کہ بڑھاپے میں تو سبھی کو پرماتما یاد آتا ہے۔ مگر عبادت وہی ہے جو جوانی میں ہو۔

اس کا مندر قصبہ کے ایک گنجان محلہ کے وسط میں تھا۔ اس لئے شام کے وقت بڑی رونق رہتی تھی۔ محلہ والے تو دیوی کے درشنوں کو آتے اور نوجوان پُجاری کے سامنے عقیدت کے پھول چڑھاتے ہی تھے۔ لیکن گھنٹے کی مترنم صدائیں سُنکر قصبہ کے اکثر لوگ اپنے اپنے کاروبار چھوڑ کر دو گھڑی کارساز دو عالم کے سامنے سر جھکانے کو وہاں آموجود ہوتے۔ مگر یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ پجاری کون ہے؟

آج سے دو برس پہلے مندر کا بوڑھا مہنت مرتے وقت اُس کو اپنی جگہ پر بٹھا گیا تھا۔ شروع شروع میں بوڑھوں نے اُس کے حالات دریافت کرنا چاہے۔ مگر اُس کا آچرن اور اسکی بھگتی دیکھکر پھر کسی نے کچھ نہ پوچھا، بلکہ سبھی لوگ اُس کے اخلاق کے گرویدہ ہو گئے

اُس کی زندگی بھی عام روش سے بہت بلند تھی۔ اس لئے کوئی اُسے رشی مانتا اور کوئی دیوتا سمجھنے لگا تھا۔ مگر حقیقت میں اُسے کسی نے نہ سمجھا۔

اُس کے پہلو میں ایک دردمند اور حساس دل تھا۔ اس کا کیریکٹر بہت مضبوط تھا اور دُنیا کے علائق کی لہریں اپنے حملے میں کامیاب نہ ہوتیں۔

مندر کے عین سامنے ایک کشمیری خاندان آباد تھا۔ جس کے سب لوگ مذہب کے بڑے پکے تھے۔ پنڈت کشن پرشاد نے محض مذہبی عقیدت کی بنا پر مندر کے قریب گھر خریدا تھا۔ تاکہ پوجا پاٹ میں آسانی رہے۔ وہ اکثر کہا کرتے۔ کہ ہمارے گھر میں گنگا بہہ رہی ہے۔

وہ قدیمی خیالات کے پابند تھے۔ چنانچہ جب اُنکی لڑکی رادھا بیس ۲۰ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تو وہ اُسے اپنے گھر لے آئے اور وہ یہ سمجھکر کہ اُسکے سُکھ کے دن ختم ہو گئے صبر کر بیٹھی۔ وہ بھی روزانہ درشن

اور پُوجا کے لئے مندر جایا کرتی تھی۔ چنانچہ جب سے نوجوان پجاری نے مندر کا کام سنبھالا۔ رفتہ رفتہ اسکی توجہ پجاری کی طرف منعطف ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وہ اُس کی تصویر کو اپنے من کے مندر میں بسا کر اُسکی پُوجا کرنے لگی۔ اس کو پورے ڈیڑھ برس کا عرصہ گذر گیا۔ رادھا نے اس عرصہ میں وہ وہ خواب دیکھے جو اُسے نہ دیکھنے چاہیئے تھے۔ اُس کا ایک بھائی ڈیڑھ برس کا تھا۔ جسے وہ بہت پیار کرتی تھی۔ یہ بھی اُس کیساتھ مندر آتا جاتا تھا۔ چنانچہ سادھو مہاراج کو اُس سے اُنس ہوگیا۔ اور سچ پوچھئے تو اسی وسیلے سے پجاری اور رادھا میں ایک طرح کی راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ بعض اوقات وہ بچہ خود بخود رادھا کی گود سے نکل کر پجاری کے پاس جانے کے لئے ہاتھ پھیلا دیتا۔ اور کبھی پجاری ایک تبسم کے ساتھ اُسے اُٹھا لیتا۔ غریب رادھا تبسم کا معلوم نہیں کیا مطلب سمجھتی۔

اسی طرح زندگی کے دن بیتتے چلے گئے۔ رادھا نے آشاؤں کے کئی طلسمی محل تیار کئے۔ لیکن اُنکی بُنیادیں خیالی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے جذبات کے بہاؤ میں اتنی دُور چلی جاتی کہ اپنے آپ کو ان خوبصورت محلوں کی رانی سمجھنے لگتی۔ اور اُن کی رونق بڑھانے کے لئے ان میں اُمیدوں کے باغ لگاتی اور آرزوؤں کے شگوفے کھلاتی۔ لیکن کبھی کبھی اُس کے خیالات میں ایک انقلاب آجاتا۔ اور اُسے محسوس ہوتا کہ ایک زلزلہ آیا۔ جس نے آن واحد میں اُس کی خیالی دُنیا کو مسمار کر دیا۔

معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اس سال سادھو کی پرکشا کے لئے ساون کو اپنی تمام لطافتوں سے معمور کر دیا تھا۔ آسمان پر اُودی اُودی گھٹائیں اٹھتیں اور رادھا اُن کی دلفریبیوں سے مست ہو کر سادھو کے سامنے حُسن کی نمایش کرتی ایک دن رات سے موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور دوسرے دن سہ پہر تک نہ تھمی۔ اگرچہ صبح کو ناقوس کی صدائیں آئیں، لیکن کوئی پُوجا کے لئے نہ گیا۔ رادھا کو خیال آیا کہ آج سادھو مہاراج کی سیوا کرنی چاہیئے۔ چنانچہ اُس دن اُس نے لذیذ بھوجن تیار کئے اور ایک تھال میں لگا کر بارش تھمنے کا انتظار کرنے لگی اور جب ذرا بارش تھمی۔ وہ تھال لے کر مندر کی طرف چلدی۔ سادھو مہاراج جو اسوقت بارش کا منظر دیکھ رہے تھے، رادھا کو دیکھکر خوش ہوئے اور جب رادھا نے تھال پیش کیا تو مُسکرا کر بولے "رادھا۔ پرماتما تجھے سکھی رکھے۔ تم نے ہمارے لئے اتنا کشٹ کیوں اٹھایا"

رادھا نے کہا۔ "نہیں مہاراج کشٹ کی کیا بات ہے۔ میں آپکی سیوا ہی میں سکھی ہوں"۔

"تو ہمیشہ سکھی رہے"۔

رادھا نے چاہا کہ سادھو مہاراج اُس کی طرف نظر بھر کر دیکھتے۔ مگر وہاں تو ان چیزوں کا کوئی اثر ہی نہ تھا۔ گھر آکر وہ سوچتی رہی کہ مندر کی مورتی اور سادھو مہاراج میں کیا فرق ہے؟ مگر

اُسے کوئی فرق نہ محسوس ہوا۔ سادھو بولتا پتھر تھا اور مورتی خاموش۔ مگر تھے دونوں پتھر ہی۔

(۲)

قصبہ میں دیوالی کا تہوار بڑے چاؤ سے منایا جاتا تھا۔ اور اُس کا مرکز یہی مندر ہوتا تھا۔ اس سال جو دیوالی آئی تو مندر میں پیشتر ہی سے اُسکی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ محلے کے نوجوانوں نے مندر سجانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ رنگ برنگ کی جھنڈیاں اور کاغذ کے فانوس مندر کی رونق کا باعث بن گئے اور رات کو دیپ مالا کے مناظر سے آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی تھی۔

نوجوان سادھو کی ریاضیت نے سبھی لوگوں کے مذہبی جوش کو اُبھار دیا اور وہ ان کاموں میں بہت زیادہ حصہ لینے لگے۔

رات کے وقت قصبہ کے رواج کے مطابق دیوی کے چرنوں میں پھولوں کے بے شمار ہار پہنائے گئے سادھو مہاراج مندر کے وسط میں بیٹھے تھے۔ اور اس نظارہ کو دیکھ دیکھ کر مسرور ہو رہے تھے۔ پھولوں کی کثرت سے تمام فضا خوشبودار ہو رہی تھی۔ دیوی کو اسقدر ہار پہنائے جا چکے تھے کہ اب اُس کے جسم پر کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ مجبوراً لوگوں نے قدموں پر ہاروں کے انبار لگانا شروع کئے۔ مگر رادھا نے اپنا ہار دیوی کو نہ چڑھایا۔ بلکہ سادھو مہاراج کے گلے میں ڈال دیا۔ یہ ابتدا ہوئی، پھر کیا تھا سب نے اُسکی تقلید میں سادھو مہاراج کے گلے میں ہار ڈالنا شروع کر دیئے یہانتک کہ وہ ہاروں میں دب گئے۔

سادھو مہاراج اس اظہارِ عقیدت سے بہت خوش ہوئے اور جب رات زیادہ ہوگئی تو لوگوں کو اُپدیش دیا۔ جسمیں اُنھوں نے اپنی قابلیت کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ سادھو معمولی پجاریوں کی طرح ایک خشک انسان ہیں۔ اُن کی باتیں دل پر اثر کرتی تھیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک زبردست نقاد بھی ہیں۔ جنھوں نے ہر نقطہ نظر سے مذہب کا مطالعہ کیا ہے۔ رادھا نے بھی بڑے شوق سے اُپدیش سُنے۔ مگر اکثر باتیں اُس کی سمجھ میں نہ آئیں۔ وہ یہ نہ جان سکی کہ کرشن مہاراج پریم کا اُپدیش دینے کے لئے کیوں اس دُنیا میں آئے اور کیا یہ اتنی اہم چیز ہے کہ جسکی تعلیم دینے کیلئے بھگوان کو خود آنا پڑا۔ اُس نے کئی بار چاہا کہ وہ سادھو مہاراج سے سوال کرے۔ مگر اُس کی جرات نہ ہوئی۔ اور وہ اپنے دل میں بے چینی کو دبائے بیٹھی رہی۔ یہانتک کہ اُپدیش ختم ہوا۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

اس رات رادھا کو نیند نہ آئی۔ دوسرے دن موقع پاتے ہی اُس نے سادھو پر اپنے سوالات کی بوچھار شروع کر دی۔ جس سے وہ سٹ پٹا گیا۔ اور حیرت سے رادھا کا منھ تکنے لگا۔

"جب بھگوان نے پریم کیا، تو ہم کیوں نہ کریں!"

"اُس نے جس سے چاہا پریم کیا۔ پھر کیا ہم بھی جس سے چاہیں پریم کر سکتے ہیں؟"
"بھگوان نے پریم کا جواب پریم سے دیا۔ پھر منش کیوں ایسا نہ کریں؟"
"سچا پریم کسے کہتے ہیں؟ اُسکا پریم سچا ہے یا جھوٹا؟ اور وہ جھوٹا کیونکر ہو سکتا ہے؟"

سادھو مہاراج نے رادھا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کہ تمہیں ایسے سوال نہ کرنے چاہئیں۔ بہرحال وہ ان سوالوں کا جواب دینے کو تیار نہ تھے۔ تاہم اتنا تاڑ گئے کہ ان سوالوں کے پردے میں کوئی راز دل پوشیدہ ہے۔ رادھا کو اس خیال سے باز رکھنے کے لئے سادھو نے طرح طرح کی تاویلیں کیں۔ مگر اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اُسوقت تو رادھا چلی گئی۔ مگر سادھو کو ایک نئے خیال میں مبتلا کر گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ سادھو نے مندر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ ہنوز مذہب کے معاملے میں طفلِ مکتب ہے۔ اُس نے دن رات عبادت کی۔ لیکن ابھی تک کسی منزل پر نہ پہونچ سکا۔ اس لئے اُس کو خیال ہوا کہ جب تک کسی مہاپرش کی سیوا میں رہ کر وہ تصوف کے نقطۂ خیال سے مذہب کی تکمیل نہ کرے گا۔ اُس وقت تک اُسے اصلی گیان حاصل نہ ہوگا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ اس مندر میں آنے سے اُس کی مذہبی تعلیم اُدھوری رہ گئی۔

جب محلہ والوں کو سادھو کے اس ارادہ کا حال معلوم ہوا، تو سبھوں نے اس کی مخالفت کی اور کسی طرح اُنھوں نے سادھو کو مندر چھوڑ کر جانے نہ دیا۔ سادھو کو ناچار اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔

رادھا نے جب یہ سُنا۔ تو دم بخود ہو کر رہ گئی۔ اور اُسی روز سے مندر میں آنا کم کر دیا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ واقعات بھی بدلتے چلے گئے سادھو کے دل میں جو کھٹک پیدا ہو گئی تھی، وہ رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ اُدھر رادھا نے مندر آنا چھوڑ دیا۔ اِدھر سادھو کو اُس کی غیر حاضری محسوس ہونے لگی۔

کیا اُس دل میں رادھا کی محبت پیدا ہو گئی ——؟ اس کا جواب نفی میں دیا جائے تو پھر سادھو پر شبہ ہوتا ہے کہ اس کا دل انسانی خصوصیات سے محروم ہے۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا۔ اُس کا قلب تو لطیف جذبات کی آماجگاہ تھا۔ جس پر خواہ کسی اور جذبے کا اثر نہ ہو۔ مگر محبت کے نازک احساسات اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ بہرحال یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ سادھو کو اُس سے محبت ہو گئی تھی کیونکہ اُس سے اُس کے مذہبی تقدس میں فرق آتا ہے۔

مگر یہ سب تخئیل کی طلسم کاریاں ہیں۔ حقیقت وہی تھی جسے سادھو کے دل نے محسوس کیا۔ وہ رادھا کے اتھاہ پریم کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ شروع شروع میں اس نے اس سے بچنے کی کوشش کی، مگر وہ جسقدر بچنا چاہتا تھا۔ اُسی قدر اس میں مبتلا ہو گیا۔ آخر کار اُس نے سب ہتھیار ڈال دیئے اور اپنے دل کے مندر

میں رادھا کی پرستش کرنے لگا۔

(۳)

اُسکی محبت کا معیار کیا تھا؟ سادھو کی بقیہ زندگی کے واقعات اس سوال کا جواب دینگے۔ اسمیں تو کوئی شک نہیں کہ وہ مندر کا مذہبی پیشوا تھا۔ اور اُسے زندگی میں محبت کے خارزار میں نہ اُلجھنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ اس سے نہ بچ سکا۔ یقیناً اس کی محبت نفسانی خواہشات سے بالاتر تھی۔ اور شاید اسی کو سچّی محبت کہتے ہیں! لیکن کبھی کبھی وہ عالمِ خیال میں رادھا کے حُسنِ جانسوز سے مسحور ہوکر اس سے ایسی باتیں کرنے لگتا تھا۔ جس پر شاید سچی محبت کے معیار کا اطلاق نہ ہوسکے۔ وہ اسکی خوبصورت آنکھوں کا تصور باندھتا جو ہر وقت ایک ابدی نشہ سے مست رہتی تھیں۔ وہ اُن بالوں کی درازی کا دھیان کرتا۔ جو اس کی کمر تک ہزار فتنوں کو اُٹھائے ہوئے لہرایا کرتے۔ پھر اُس کو رحم آتا کہ اس محبت کی دیوی کا کوئی پرستار نہ تھا۔ یہ بات اُسے ایسی معلوم ہوئی کہ گویا خود قدرت اپنے آپ پر ظلم کر رہی ہے۔

جوں جوں دن گذرتے گئے پجاری اپنی دُھن میں مست خاموش محبت کی پینگیں بڑھاتا رہا۔ یہاں تک کہ پھر دیوالی کے دن قریب آگئے۔ اور حلوائیوں نے مندر سجانے کی تیاریاں شروع کردیں۔ آخر وہ متبرک دن آگیا۔ دیپ مالا کی چہل پہل میں چراغوں کی کثرت نے مندر کی رونق کو دوبالا کردیا۔ اور پھولوں کی بہتات نے ایک عجب پُر کیف منظر پیدا کردیا۔ لیکن اگر کسی بات کی کمی رہ گئی تو یہ کہ رادھا نے اپنا ہار پجاری کے گلے میں نہ ڈالا۔ کسی اور کو تو اس کا خیال نہ آیا۔ لیکن خود پجاری نے یہ کمی محسوس کی۔ اور اُس کی آنکھوں میں گذشتہ سال کا دلفریب نقشہ پھر گیا۔

اِس سال پجاری نے جو اُپدیش دیا۔ اسمیں پچھلے سال کی طرح پریم کا کوئی لفظ زبان سے نہ نکلا۔ بلکہ اُسے بزرگوں کی کرامات بیان کرنے تک محدود رکھا۔ رادھا اُس کے اُپدیش کو سُنتی رہی مگر اُس نے کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ آخر تقریب ختم ہوگئی اور سب لوگ گھروں کو چلے گئے۔

مگر رادھا نہ گئی۔ شاید وہ آج کی رات دیوی کے چرنوں ہی میں گذارنا چاہتی تھی۔ اور اپنے سوالات کا جواب پجاری سے نہیں بلکہ دیوی سے پوچھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اور اپنے من میں مردہ آرزوؤں کی چتائیں تیار کرکے اُن پر آنسوؤں کے ہار چڑھاتی رہی۔ اِتنے میں سادھو نے دروازے پر قدم رکھا اور دیکھا کہ رادھا اپنے خیالات میں محو ہوکر دُنیا و مافیہا کو بھول چکی ہے۔ وہ کئی بار دروازہ تک آکر واپس لوٹ گیا۔ لیکن آخری مرتبہ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُسے کوئی چیز زبردستی کھینچے لئے جارہی ہے۔

(۴)

معلوم ہوتا تھا کہ سادھو مہاراج کا پائے استقلال لغزش کھا گیا۔ آخر بیچارہ انسان ہی تھا۔ ایک لمحہ کے لئے بھول گیا کہ وہ کون ہے۔ اور مندر کا پجاری ہونے کی حیثیت سے اُس کے کیا فرائض ہیں۔
رادھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ ایک خوبصورت تصویر ہے جو اُس کے دل میں اُتری چلی جا رہی ہے۔
سادھو کی نظریں اُٹھیں۔ سامنے رادھا تھی اور تنہا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں جن میں آتما اور نفس کشی نے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ اُس وقت رادھا کے دل کی گہرائیوں کا پتہ لگا رہی تھیں۔
رادھا نے سادھو کو دیکھا اور سادھو نے رادھا کو۔
جب رادھا نے یہ محسوس کیا کہ اُس کی کشتی پاپ کے منجدھار میں گر رہی ہے، تو وہ کانپ اُٹھی۔ اس بات کا کبھی اُسے خیال ہی نہ آیا تھا کہ محبت کی منازل طے کرنے کیلئے اُسے پاپ کے راستہ سے ہو کر گذرنا پڑیگا۔
سادھو نے اُس کا بازو پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رادھا کو اپنی گود میں اُٹھا لیگا۔ وہی سادھو جس نے اِس سے کٹھن موقعوں پر اپنے آپ کو نفس کی آگ سے بچایا تھا۔ اسوقت اس کے شعلوں میں بھسم ہو رہا تھا۔ اور وہی رادھا جس نے بارہا سادھو کے پاؤں میں گرنے کی تمنائیں کی تھیں، اس وقت تھر تھر کانپ رہی تھی۔
"یہ کیا ؟" سادھو مہاراج"۔ اُس نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پجاری کے دل میں یہ الفاظ تیر بن کر پیوست ہو گئے۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اور اُسے اتنا ہوش نہ رہا کہ وہ کس دُنیا میں پہنچ چکا ہے۔ لیکن اب اُسے اپنی اخلاقی پستی کا صحیح طور پر اندازہ ہوا۔ اور یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ قعر ذلت میں گر چکا ہے۔
اُس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔ اُس کے دونوں ہونٹ سل گئے۔ آنکھیں پتھرا گئیں، اور وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل کر بے تحاشا بھاگا۔ اُسے یاد آیا کہ قصبہ کے چار پانچ میل پر ایک بڑی نہر ہے اور اسکی مچلتی ہوئی لہریں ہی اب اُس کی روح کو اطمینان دے سکتی ہیں۔ اسی دُھن میں وہ بھاگا جا رہا تھا۔ رات کا اندھیرا تھا اور آسمان پر ستاروں کی درخشاں دُنیا مسلط تھی۔ اُسکے دل کی تڑپ اُسے لئے جا رہی تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ ٹھوکریں کھائیں۔ کئی جگہ اُس کے پاؤں پتھروں سے ٹکرائے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ آج اُس کے جسم کا گوشت اور ہڈیاں لوہا بن گئی تھیں۔ جن پر کوئی چیز اثر نہیں کر سکتی۔
کبھی کبھی کسی جذبۂ بے اختیار کے ماتحت اُس کی رفتار تیز ہو جاتی تھی مگر پھر جب اسے رادھا کے وہ الفاظ یاد آتے کہ "یہ کیا سادھو مہاراج ؟" تو اُس کی آواز مدھم پڑ جاتی۔ اُس کا دماغ زیادہ پریشان

ہونے لگتا۔ اب اُسے رات کی سائیں سائیں میں ایک مہیب آواز آنے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ راستہ کے درخت اور کھیتوں کے پودے اپنی زبانیں پھاڑ پھاڑ کر اُس سے پوچھ رہے ہیں۔

"یہ کیا سادھو مہاراج؟" "یہ کیا سادھو مہاراج؟"

اُس نے جلد بہت چار پانچ میل طے کر لئے۔ آخرکار اُسے درختوں کے جھنڈ نظر آئے جو نہر کا پتہ دیتے تھے۔ درختوں کو دیکھ کر اُس کے جنون میں ایک مستقل جوش پیدا ہو گیا۔ اور اُس نے اپنا سر راستہ کے پتھروں سے پٹکنا شروع کر دیا۔ وہ ندامت سے بچنے کیلئے بہت جلد موت کی آغوش میں سو جانا چاہتا تھا۔ صرف موت ہی اُسے اس روحانی عذاب سے نجات دلا سکتی تھی۔ ابھی وہ نہر پر تھا۔ تھوڑی دیر میں پل پر جا کھڑا ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکی آنکھوں کے سامنے نہر کی بیتاب لہریں اُس کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر اُسے اپنی آغوش محبت میں آنیکی دعوت دے رہی تھیں۔ اُس نے چھلانگ ماری۔ مگر ـــــ وہاں کچھ نہ تھا۔ اُسے اس بات کا خیال ہی نہ تھا کہ نہر سوکھی پڑی ہے۔ بجائے اِس کے کہ وہ لہروں کے دامن پر ابدی نیند سو جاتا۔ وہ ریت کے ایک ٹیلے پر جا پڑا۔ معاً اُس کے دل میں خیال آیا کہ وہ بہت پست ہو چکا ہے اور نہر کی لہریں بھی اس ننگ وجود کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے تیار نہیں۔ مگر اب اُسکا جوش و خروش مدھم ہو چکا تھا۔ اُس کے حواس کچھ کچھ بجا ہوئے۔ تو اُسے رات کی تنہائی سے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اُس نے اپنا ہاتھ ماتھے پر رکھا تو وہ خون سے بھر گیا۔ اُس نے اپنے کپڑے کو ٹٹولا تو وہ پارہ پارہ ہو چکے تھے۔ اپنے پاؤں کو دیکھا تو وہ چھلنی ہو گئے تھے، اسی حالت میں اُٹھا۔ تو معلوم ہوا کہ داہنی ٹانگ پر سخت چوٹ آگئی ہے۔ لنگڑاتا ہوا نہر سے باہر نکل آیا اور پھر مندر کی راہ لی۔

اب کے سفر بہت دیر سے کٹا۔ جب وہ مندر پہونچا تو صبح کاذب نمودار ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ مندر کا دروازہ کھول اندر داخل ہو گیا۔ اب وہ تھکاوٹ سے چکنا چور ہو چکا تھا۔ اندر پہونچ کر اُس نے دیا جلایا۔ اور سب دروازے بند کر دیئے۔ اُس نے دیکھا کہ دیوی کی مورتی اُس کی حالت زار دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے اب اُسمیں کھڑا ہونے کی بھی سکت نہ تھی۔ وہ مجبوراً گر پڑا۔

لیکن قدرت کے نظام اوقات میں خلل نہیں آسکتا۔ کاش رات کی گھڑیاں ذرا دراز ہو جاتیں تو وہ کچھ سوچ سکتا۔ اُسے خیال آیا کہ صبح ہونے والی ہے۔ اِس خیال کے ساتھ ہی صبح کی چہل پہل اُسکی آنکھوں میں پھرنے لگی۔ ابھی ناقوس کی صدائیں بلند ہونگی۔ پہلے سوئی ہوئی دیوی جاگے گی۔ اور پھر سب لوگ اُس کی پوجا کریں گے۔ اور پھر رادھا آئے گی ـــــ رادھا کے خیال سے پھر اس کے دماغ میں تشنج پیدا ہونا شروع ہوا۔ اسے اب یہ خیال ستا رہا تھا کہ رات کے واقعہ کے بعد اب وہ رادھا سے کس طرح

آنکھیں چار کر سکتا ہے؟

یہ بہت بڑا سوال تھا۔ وہ اس خیال سے لرز اٹھا وہ سادھو تھا مندر کی دیوی سے زیادہ لوگ اُس کی پوجا کرتے تھے محلہ بھر کی بہو بیٹیاں اُس کے پاس بلا روک ٹوک آتی جاتی تھیں۔ اُس کی قوتِ واہمہ نے پھر طلسم کاری شروع کر دی اُسے دکھائی دینے لگا کہ پچھلے سال کی دیوالی کی طرح نوجوان لڑکیاں پھر اُس کے لئے پھولوں کے ہار لا رہی ہیں۔ اور وہ ہر ایک کو ایسے پیار اور محبت کی نظروں سے دیکھ رہا ہے جو اس جیسے سادھو کی شان کے شایاں تھی۔

یکلخت اُس کے دماغ نے پلٹا کھایا۔ اور اُسے رات کا واقعہ یاد آگیا۔ پھر اسے اپنی ذلت کا احساس ہونے [illegible] کی شدت نے اُس کے دماغ کا توازن کھو دیا۔ اُس نے خیال کیا کہ رادھا نے رات کا واقعہ جا کر اپنی ماں سے کہہ دیا ہوگا۔ اور لوگ اکٹھے ہو کر اُسے مارنے کے لئے مندر کے دروازہ پر جمع ہو رہے ہوں گے۔ اسی ڈر سے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کواڑوں کی درازوں سے جھانکنے لگا۔ پھر اُس نے خود دروازہ کو زور سے ڈھکیلنا شروع کیا تاکہ لوگ اندر نہ آسکیں۔ پھر یکایک اس دروازہ کو چھوڑ کر وہ کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اور اُس کے کواڑوں میں سے جھانکا۔ پھر ٹوٹی ہوئی ٹانگ میں شدید درد محسوس ہونے لگا جس سے وہ گر پڑا۔

باہر پنڈت نے ناقوس بجانا شروع کر دیا اور اس سے پے بہ پے ایسی آواز آنے لگی۔ جس نے پجاری کو اور بھی پریشان کر دیا۔ دیئے کی روشنی اب مدہم پڑ چکی تھی۔ تاہم اُسکی ٹمٹماتی ہوئی لو میں دیوی کی مورت صاف نظر آرہی تھی۔ اُسکی نگاہ مورت پر جم گئی۔ وہ پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا دیوی کے پاس پہونچا اور لیٹے لیٹے اپنا سر اُس کے قدموں پر رکھ دیا۔ جوں جوں ناقوس کی صدائیں تیز ہوئیں، جوشِ جنون کا غلبہ ہونے لگا۔ آواز کی ہم آہنگی نے اُس پر ایک نیا اثر دکھانا شروع کر دیا اور اُس نے زور زور سے اپنا سر ٹیکنا شروع کر دیا۔

اب اُس کے سر سے خون کی ندی پھوٹ نکلی جس نے کمرے کو لالہ زار بنا دیا۔ دیوی اس منظر کو دیکھ کر مسکرائی۔ پجاری نے کہا "دیوی مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے معاف کر دو" اور پھر آخری بار اپنا سر اُس کے قدموں میں رکھ دیا۔ دیوی نے اُس کی دعا قبول کر لی۔ اور اُسے بخش دیا۔ اُدھر کمرے کا دیا گل ہوا اور اُدھر سادھو کی روح عالمِ بالا کو پرواز کر گئی

تنقید کتب

نور مشرق[1]

مہرلال صاحب سونی ضیاؔ فتح آبادی ایم۔ اے دورِ جدید کی شاعری کے دلدادہ ایک نوجوان اور ہونہار شاعر، حسنِ فطرت کے سچے پرستار اور مادرِ ہند کے جان نثار فرزند ہیں۔ اگرچہ ابھی آپ کی شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے لیکن لفظوں کی ترتیب، ترکیبوں کی چستی، بیان کی روانی جو اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے اُس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر مشقِ سخن جاری رہی تو آپ بہت جلد مشہور شعراء میں شمار ہونے لگیں گے۔ ضیاؔ صاحب کے لفظ لفظ سے جوش اور مصرع مصرع سے جوانی کی اُمنگ مترشح ہوتی ہے الفاظ کا ترنم اور بیساختہ پن بہت پُرلطف ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اُنکی تخئیل کسی قدر سطحی ہے اور وہ گہرے نہیں جاتے، لیکن جس محنت سے الفاظ کی تلاش کرکے اور جس خوبصورتی سے انھیں مصرعوں میں بٹھاتے ہیں۔ اُس سے آیندہ کیلئے ہم کو آپ کی ذات سے بڑی اُمیدیں معلوم ہوتی ہیں، مثلاً

نشاط تقسیم ہو رہی ہے، چمن چمن جنتیں بنی گی ٹپک رہی ہے جو بوند رس کی فلک سے غنچے کھلا رہی ہے
دلوں میں وحشت سروں میں سودا نگاہ مضطر حواس گم ہیں گرج گرج کر سیاہ بدلی ہزار فتنے جگا رہی ہے

ہوا بھی رنگیں، فضا بھی رنگیں، زمیں بھی رنگیں فلک بھی رنگیں
غروب خورشید بھی ہے رنگیں، طلوع شب کی جھلک بھی رنگیں

اگر اسی طرح مشقِ سخن جاری رہی اور تخئیل میں گہرائی پیدا ہوگئی، تو وہ دن دور نہیں کہ فتح آباد کا یہ نوجوان شاعر اُردو کا ایک مکمل شاعر بن کر چمکیگا۔

اِس مجموعہ میں چھوٹی بڑی ساٹھ نظمیں ہیں اور ضیاؔ صاحب کی عکسی تصویر بھی ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ سب عمدہ، اور جلد خوبصورت ہے۔ حجم ۱۳۶ صفحات۔

علم خانہ داری[2]

پچھلے زمانہ میں لڑکیاں گھر کے کام کاج میں اپنی ماؤں کا ہاتھ بٹاتی رہتی تھیں، جس سے انھیں تمام امورِ خانہ داری کا تجربہ حاصل ہو جاتا تھا اور کھانا پکانا، سینا پرونا، گھر کی صفائی اور رکھ رکھاؤ سب کچھ سیکھ جاتی تھیں۔ مگر اب زمانہ بدل گیا ہے۔ نئی کتابی تعلیم کی بدولت لڑکیوں کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ

[1] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ گجندر لال سونی، کٹرہ کرارا، بیپالک حبش خاں دہلی۔ [2] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور

گھر کے دھندوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتیں۔ ہاتھ سے کام کاج کرنا تو بڑی بات ہے۔ اس کے بعد شادی بیاہ ہوتی ہے تو یاد پڑا ہوا علم بھولا جاتا ہے اور گھر بھی ایسے ہو جاتے ہیں جب خانہ کو گھر کی معمولی دیکھ بھال کا بھی سلیقہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب تک وہ خود ہوشیار نہ ہوں تو نوکروں اور ملازموں کی نگرانی ممکن نہیں ہے اسلئے لڑکیوں کیلئے جسقدر ضرورت علم خانہ داری کے سیکھنے کی ہے اتنی کسی اور بات کی نہیں ہے۔

انگریزی میں تو امور خانہ داری پر بہت اچھی کتابیں موجود ہیں لیکن اردو میں اب تک اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ بیگم شاہنواز صاحب کی دختر نیک اختر ممتاز شاہنواز صاحبہ نے البتہ حال میں یہ کتاب لکھ کر ایک بڑی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ یہ کتاب سولہ باب میں تقسیم ہے جن میں (۱) گھر (۲) ہوا (۳) پانی (۴) لوگوں کی صفائی (۵) گھر کی صفائی (۶) کمروں کو گرم یا سرد رکھنے کے طریقے (۷) جراثیم و حشرات (۸) جسم کی ساخت (۹) صحت کے اصول (۱۰) خوراک (۱۱) کھانا پکانا (۱۲) تیمارداری (۱۳) فوری امداد (۱۴) بچوں کی پرورش (۱۵) لباس (۱۶) کپڑوں کی دھلائی اور صفائی وغیرہ سب باتوں پر تفصیل کے ساتھ دلنشین پیرایہ میں سلیس زبان سے بحث کی گئی ہے جو لڑکیوں اور عورتوں کے لیے بہت مفید ثابت ہو گی۔ ہماری رائے ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ہر پڑھی لکھی لڑکی کیلئے ضروری ہے۔ کھانا پکانے کی ترکیبوں میں اگر ہندوستانی رسوئی کا بھی خیال رکھا جاتا تو یہ کتاب زیادہ وسیع حلقے کیلئے مفید ثابت ہوتی۔ حجم [illegible] صفحات ہے۔

فرہنگ ناصرہ[1]

اس نام سے محمد عبداللہ خاں صاحب خویشگی خورجوی نے عام فارسی و اردو لغات کا ایک کارآمد فرہنگ تیار کیا ہے جس میں کئی ہزار الفاظ و اصطلاحات کے معنی درج ہیں اور ہر لفظ کے سامنے بریکٹ میں اس کا تلفظ بھی دیدیا گیا ہے جس سے لفظ کا صحیح تلفظ معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً

خونچکانی (خُوں۔ چکا۔ نی) ۔ لہو ٹپکنا　　　　خوہلہ (خُو۔ لہ) ۔ ٹیڑھا ۔ کج

اکثر مشکل اور غیر معروف الفاظ کی جمع بھی دیدی گئی ہے اور فارسی مصدروں کے مضارع اور مشتقات بھی درج کیے گئے ہیں۔ غرض اس فرہنگ میں بہت سی خوبیاں ہیں البتہ دو باتوں کی کمی بھی ہے یعنی ایک تو یہ نہیں بتایا گیا کہ فلاں لفظ فارسی ہے عربی ہے یا ترکی ہے۔ دوسرے یہ فرہنگ قدیم فارسی سے تعلق رکھتا ہے، موجودہ فارسی اسقدر بدل گئی ہے کہ پرانی فارسی کو اس سے بہت کم لگاؤ رہ گیا ہے۔ تاہم یہ فرہنگ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کیلئے مفید ہے۔ اس کا سائز چھوٹا اور حجم ۳۰۵ صفحات۔

---

[1] قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ محمد عبداللہ خاں خویشگی، فیروز منزل، متصل جامع مسجد، خورجہ

محروم ہوگیا ہے اور موریودین سائیلیشیا[ط] اور چیکوسلاویکیا کے درمیان ریلوے پر بھی اب اُسکا کوئی اختیار باقی نہیں رہا۔ تاہم چیک قوم ایک جاں باز، اولوالعزم، منظم اور خود دار قوم ہونے کی حیثیت سے کبھی معدوم نہیں ہوسکتی، ہر چند اُس کے مہربان انگلستان و فرانس اُسے چرکہ پر چرکہ دے رہے ہیں۔ فرانس نے صاف انکار ہی کردیا ہے کہ وہ اپنی ضروریات سے مجبور ہے، اس لئے چیکوسلاویکیا کو کوئی قرضہ بھی نہیں دے سکتا، برطانیہ نے البتہ ایک کروڑ پونڈ کی رقم قرض دینے کا وعدہ کیا ہے مگر اس سے زیادہ رقم قرض دینے پر وہ بھی رضامند نہیں ہے، چنانچہ اس بارے میں برطانیہ نے بھی علانیہ طور پر چیکوسلاویکیا پر اپنی معذوری ظاہر کردی ہے۔

اس وقت ہر ہٹلر، برطانیہ کی طرف سے جرمن نوآبادیات کی واپسی کے مسئلہ کے تصفیہ کے متعلق تجاویز پیش کئے جانیکا منتظر ہے۔ اُس نے یہ بھی ظاہر کردیا ہے کہ اس معاملے میں برطانیہ کو جرمنی سے کوئی مطالبہ پیش ہونے کا انتظار نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ جب ہٹلر اور چیمبرلین نے ایک باضابطہ معاہدہ صلح پر میونخ میں دستخط کرکے برطانیہ اور جرمنی کے درمیان کل معاملات باہمی مشورہ سے طے کرنیکا فیصلہ کیا تو ہٹلر نے اُسی وقت نوآبادیات کی واپسی کے متعلق اشارہ کردیا تھا۔ چنانچہ سابق جرمن نوآبادیات Tanga Nyika. اور South West Africa. کی واپسی کا مسئلہ عنقریب ہی برطانیہ کے لئے مشکلات پیدا کردیگا۔ کیونکہ جب یہ نوآبادیات جرمنی کو واپس مل جائیں گی تو ہٹلر اُن علاقوں میں بحری اور ہوائی مستقر قائم کرنیکا ارادہ رکھتا ہے جس سے برطانیہ کیلئے ہندوستان اور مشرق بعید کا راستہ بہت خطرناک ہوجائے گا۔

حال ہی میں Tanga Nyika میں ایک نئی لیگ قائم کی گئی ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ اس نوآبادی کو جرمن حقوق قائم ہونے سے محفوظ رکھا جائے۔ لیگ مذکور ہندوستانی آبادی کی اعانت بھی حاصل کرنا چاہتی ہے چنانچہ اس معاملہ میں برطانیہ کو کانگریس کا دست نگر ہونا پڑے گا۔ اور اُس کی لازمی طور پر یہی خواہش ہوگی کہ کانگریس اس بارے میں اپنی پوزیشن کا صاف اعلان کردے۔ لیکن کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے پچھلے اجلاس دہلی میں جو ریزولیوشن اُس وقت پاس کئے تھے۔ جب وسط یورپ میں جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے، برطانیہ کے لئے تذبذب و مایوسی کا باعث ثابت ہوئے ہیں۔ گو اُن سے کانگریس کی معاملہ فہمی اور تدبر کا ثبوت ضرور بہم پہونچا ہوگا۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جرمنی اور برطانیہ کے مابین ہوائی طاقت محدود کئے جانے کی بابت گفتگو ہورہی ہے اور گو ابھی تک کوئی ٹھوس اسکیم مرتب نہیں ہوئی ہے تاہم اس خیال سے کہ روس کی ہوائی طاقت اب

[ط] Base at Moravian Silesia.

باعتبار خطرۂ جنگ ایسی پریشان کن نہیں رہی۔ یہ بات ممکن العمل ہوگئی ہے کہ برطانیہ، فرانس اور جرمنی اس بارے میں مفاہمت کریں۔ جس طرح ہٹلر اور چیمبرلین میں معاہدہ ہوگیا ہے اسی طرح فرانس اور جرمنی میں بھی باہمی صفائی ہوکر مصالحت ہوجانے کا امکان روز بروز قوی تر ہورہا ہے۔

ملک فرانس کے اندرونی اختلافات مٹانے کی بھی کوشش ہورہی ہے۔ موسیو دلادے[4] اور موسیو بلم[3] میں اس معاملہ پر بات چیت ہورہی ہے کہ وسیع تر بنیاد پر ایک متحدہ فرانسیسی وزارت قائم کی جائے۔ فرانس کو بھی اندرونی کمزوریوں کا احساس ہورہا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ چیکوسلاویکیا کے معاملہ میں اس نے خاموش رہنا، بلکہ برطانیہ کے ساتھ ملکر ہٹلر کی دلجوئی کرنا ہی اپنے لئے مناسب سمجھا۔ کیونکہ اسی دوران میں فرانس میں مزدوروں کی ہڑتال ہورہی تھی اور وہ خود اپنی پریشانیوں میں الجھا ہوا تھا۔

بہرحال اب صورت حالات یہ ہے۔ جمہوری ملکوں کو ہر بین الاقوامی معاملہ میں سرنگوں ہونا پڑ رہا ہے جو سلطنتیں ان سے امداد و سرپرستی کی امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھیں انکی بھی آنکھیں کھل رہی ہیں اور وہ بھی اب اسی میں اپنی بھلائی سمجھتی ہیں کہ یوروپ کے آمران ہٹلر اور مسولینی سے سمجھوتہ کریں۔ چنانچہ چیکوسلاویکیا نے کمیونسٹ پارٹی کا خاتمہ کردینے کا فیصلہ کرلیا ہے تاکہ آیندہ کے لئے جرمنی سے تعاون کی پالسی قائم رکھنے میں کوئی مزاحمت نہ ہو۔ سلاوک کی نئی آزاد حکومت نے اپنی کیبنٹ میں سوڈٹین پارٹی کے ممبر ہر کرمسن کو شامل کرلیا ہے اور جرمن اخباروں کو داخلے کی اجازت دیدی ہے۔

اسپین کے معاملہ میں بھی جمہوریتوں کو نیچا دیکھنا پڑا ہے اور اب خود اسپین کی جان بلب حکومت اس بات کا احساس کررہی ہے کہ وہ اپنے رفیق فرانس اور روس کی اعانت سے، اب زیادہ عرصہ تک باغیوں کے حملوں کی تاب نہ لاسکیگی۔ ایبرو[2] علاقہ اور ایسٹریمڈورا[1] کے محاذ پر باغی فوجیں برابر بڑھتی جارہی ہیں۔ حکومت اسپین نے غیر ہسپانوی رضاکاروں کی واپسی کا بھی حکم دیدیا اور اب یہی چاہتی ہے کہ اس خانہ جنگی کا خاتمہ ہو۔ کیونکہ اب نہ جنگ کی تاب و طاقت ہے اور نہ اس کی کوئی امید باقی رہ گئی ہے کہ اسپین کی موجودہ جنگ بین الاقوامی جنگ ہوجائے۔ اس وقت اسے مایوسی اور تاریکی کے سوائے اور کوئی صورت بہتری کی نظر نہیں آتی۔

فلسطین کی حالت ناگفتہ بہ ہورہی ہے۔ ابھی تک لوٹ مار کے حادثات کبھی کبھار اور چھپ چھپا کر ظہور پذیر ہوتے تھے لیکن اب تو ایک غدر کی سی حالت پیدا ہوگئی ہے جسمیں سول حکومت مفلوج ہوگئی ہے اور عرب منظم اور باقاعدہ طور پر مسلح ہوکر برطانوی حکومت کو علانیہ چیلنج دے رہے ہیں۔ چنانچہ بغاوت

---

[1] Estremadura. [2] Ebro. [3] M. Blum. [4] Daladar.

افشا ہو چکا ہے کہ لارڈ لنلتھگو کا یہ سفر اور لندن میں اتنے دنوں تک ان کا قیام انھیں سیاسی معاملات کی بنا پر تھا
اور وقت یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اس معاملے کو طے کرنے کیلئے دہلی میں ایک جمہوری گول میز کانفرنس
منعقد کی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو غالباً کانگریس اس دفعہ اس میں غیر مشروط طور پر شریک نہ ہو بلکہ عجب نہیں کہ
پہلے یہ شرائط منظور کرا لے کہ کانفرنس میں ایسے مسائل کو جن کا حل ہندوستانیوں سے متعلق ہے اور جن میں
تیسری پارٹی کی مداخلت کی ضرورت نہیں، مثلاً فرقہ وارانہ سمجھوتہ وغیرہ داخل نہ کئے جائیں بلکہ یہ مسائل نمائندہ اصلی
کی مرضی پر چھوڑ دئے جائیں۔ بہر حال ہم ایک یہ اُمید کرنا بیجا نہ ہوگا کہ جو نکہ لارڈ لنلتھگو جب کانگریس کے تالیف قلب
کی پالیسی برتنا چاہتے ہیں اور یہ بھی سنا جاتا تھا کہ گاندھی جی سے ملاقات کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو موجودہ غیر ذمہ دار
مرکزی اسمبلی کی زندگی ختم ہونے کے بعد ... صوبوں کے اختیارات حاصل ہونے کے باعث عوام کے
قائم مقاموں کو کوئی موثر کارروائی کرنے کا موقع ہی نصیب نہیں ہے مزید توسیع کا حکم جاری نہ فرمائیں گے۔

کانگریس کی یہ سخت بد نصیبی ہے کہ جب سے وہ ملک کے مختلف صوبوں میں برسر اقتدار ہوئی ہے اُسے
مرکزی اسمبلی میں جو بحالت موجودہ ایک غیر ذمہ دار مجلس ہے مجبوراً غیر ذمہ دارانہ مخالفت کرنے کے سوائے اور کوئی
چارہ کار ہی نہیں رہا ہے۔ فیڈریشن کے جلد نفاذ کی اُمید پر اب تک گورنمنٹ ہند موجودہ اسمبلی کی زندگی میں
خواہ مخواہ توسیع کرتی رہی ہے۔ لیکن اب ضرورت ہے کہ نئے انتخابات کا حکم دیا جائے۔

کراچی میں اللہ بخش پارٹی کے مسلمانوں پر مسٹر جناح اور مسلم لیگیوں نے کس طرح ڈورے ڈالے اور کس
طرح انھیں محض فرقہ وارانہ وزارت قائم کرنے پر آمادہ کیا اور کس طرح وہ عین وقت پر اس جال سے نکل
بھاگے۔ یہ ایک دلچسپ حکایت ہے۔ مسٹر جناح بہ خیال خود صوبہ متوسط اور اڑیسہ کا جواب دینا چاہتے تھے
اسی لئے انھوں نے سندھ میں ہر طرح سے خالص مسلم وزارت قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن خان بہادر اللہ بخش
موجودہ وزیر اعظم سندھ اس پر کسی عنوان سے رضامند نہ ہوئے۔ حال ہی میں مسٹر جناح نے بیان کیا ہے کہ وہ
خالص مسلم وزارت کے خواہاں نہیں تھے لیکن جو تقریریں انھوں نے اور مسٹر فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے
سندھ مسلم کانفرنس میں کیں ان کے لب و لہجہ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ کم سے کم اس وقت ان کا یہی خیال
اور یہی خواہش تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ رہنا اور ہندوستان میں ہی مرنا جینا ہے۔ اور
سندھ میں تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ اور بھی رواداری برتنا چاہیئے تاکہ تمام ملک کیلئے رواداری کا
ایک قابل تقلید نمونہ قائم ہو جائے۔

بہر حال اب صورت حال یہ ہے کہ ممبران مسلم لیگ خان بہادر اللہ بخش کے خلاف بے اعتمادی کا ووٹ
کریں گے جس کا پاس ہونا یا نہ ہونا کانگریسی ممبروں کے موافق یا مخالف رویہ پر منحصر ہے۔ شکر ہے کہ کانگریس

ہائی کمانڈ نے سندھ اسمبلی کے دس کانگریسی ممبروں کو ووٹ کی آزادی دیدی ہے۔ اسلئے توقع ہے کہ خان بہادر اللہ بخش کے متعلق مسٹر جناح کی کوششیں بیکار ثابت ہوں گی اور وہ ہاتھ ملتے ہی رہ جائیں گے۔

نئی کانفرنس

کانگریسی وزرا ر صنعت کی جو کانفرنس حال میں نئی دہلی میں شری سبھاش چندر بوس کی زیر صدارت منعقد ہوئی اُسمیں یہ قرار پایا ہے کہ ملک کی تمام صنعتوں کو جو اس وقت کسی پیمانہ پر بھی جاری ہیں نیز گھریلو صنعتوں[1] کو فروغ دینے کے لئے ملک کی ضروریات، کچے مال کی پیداوار و دیگر لوازمات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر صوبہ کی صنعتی ترقی کے لئے ماہرین تمام ضروری تفصیلات طے کر کے ایک عملی دستور العمل بنالیں۔ اسکا خاکہ کانفرنس نے تیار بھی کرلیا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق کئی اہم تجویزیں پاس ہوئی ہیں مثلاً مختلف اوزاروں اور طرح طرح کی مشینوں کا بنانا۔ ہندوستانی طالب علموں کو وظیفہ دے کر ممالک غیر میں صنعتی تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیجنا۔ بہرحال شروعات ہوگئی ہے۔ آیندہ چل کر اس کا کچھ نہ کچھ مفید نتیجہ ضرور نکلے گا۔ مسٹر بوس نے اسکے متعلق ایک بااثر تحقیقاتی کمیٹی نامزد کردی ہے جسمیں ملک کے تمام ماہرین سائنس شامل کرلئے گئے ہیں۔ موجودہ افلاس و بیکاری کے زمانہ میں مسٹر بوس کی یہ پیشقدمی اُن کے زمانہ صدارت کا ایک شاندار کارنامہ ہے اور یہ امر بہت تسلی بخش ہے کہ کانگریس نے ملک کی اس ضروری خدمت کی طرف بھی قدم بڑھایا ہے۔

[illegible]

یو۔پی کی کانگریسی حکومت نے زراعتی بل پر غور کرنے کے لئے جو سب کمیٹی مقرر کی تھی اُس کی رپورٹ شائع ہوگئی ہے۔ مسلم لیگ ممبران کمیٹی نے اور بعض دوسرے طبقہ والے نمایندگان نے اختلافی نوٹ لکھے ہیں۔ کمیٹی کی اکثریت کی رائے ہے کہ بڑے زمینداروں کو سیر میں اضافہ کرنے کا حق نہ دیا جائے۔ آگرہ قانون قبضہ داری ۱۹۲۶ء اور اودھ قانون لگان ۱۹۲۱ء کا منشا ر دراصل یہ تھا کہ چھوٹے زمیندار سیر میں اضافہ کے اختیار سے مستفید ہوں نہ کہ یہ بڑے بڑے زمیندار اپنی سیر کی زمین بڑھاتے چلے جائیں اور کاشتکاروں کے لئے ایسی زمین جسمیں انھیں موروثی حقوق حاصل ہوسکیں بہت کم رہ جائے۔ چھوٹے زمینداروں کا گذارہ محض قلیل منافع سے نہیں چلتا۔ انھیں کاشت بھی کرنا پڑتی ہے جس کیلئے اُن کے پاس جسقدر سیر کی زمین ہوگی، اتنی ہی انھیں فارغ البالی حاصل ہوگی۔ چنانچہ کمیٹی کی اکثریت کی رائے ہے کہ جو قانون بنایا جائے اُسمیں یہ مدنظر رہے کہ چھوٹے زمینداروں کو جو حقوق سیر کے متعلق حاصل ہیں اُن میں کوئی کانٹ چھانٹ نہ کیجائے کمیٹی نے اس تجویز کی رائے دی ہے کہ شکمی کاشتکار کو بھی اس لگان کی ادائیگی کی ذمہ داری میں جو کاشتکار اور زمیندار میں طے ہوا ہے۔ کاشتکار کا شریک ٹھہرایا جائے۔ کیونکہ شکمی کاشتکار ممکن ہے اس خوف سے کہ گو اُس کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا ہے وہ پورے کھیت کے لگان کی ذمہ داری میں کاشتکار کا شریک ہے اور جب

[1] Cottage Industries.

زمیندار قرقی لائیگا تو وہ اُس سے (شکمی کاشتکار سے) وصول کرلیگا۔ اپنے لگان کی ادائگی ہی ملتوی رکھے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقدمہ بازی بڑھ جائے گی۔

کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ لگان میں چھوٹ اور التوا اور مالگذاری کی چھوٹ اور التوا میں مناسبت رکھنے کا التزام رکھا جائے اور لگان کے علاوہ تمام دیگر مطالبات جن کو زمیندار صاحبان رواجاً وصول کرتے ہیں اور جن سے بیچارے کاشتکار زیر بار رہتے ہیں خلاف قانون ٹھہرائے جائیں اور اگر زمیندار کوئی ایسی رقم وصول کریں تو وہ نہ صرف سزا کے مستوجب ہوں بلکہ اُن سے کاشتکار کو ہرجانہ بھی دلایا جائے۔

کمیٹی نے چھپے ہوئے فارم پر لگان کی باقاعدہ رسیدیں دینے کی بھی سفارش کی ہے۔ زمیندار ممبران کمیٹی نے اختلافی نوٹ لکھے ہیں اور زمینداروں و تعلقہ داروں کے حلقوں میں مجوزہ اصلاحات کے متعلق بڑی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے جلسے ہو رہے ہیں اور دھواں دھار تقریریں کی جاری ہے۔ گورنمنٹ کے خلاف ستیہ گرہ وغیرہ کی دھمکیاں بھی دی گئی ہیں۔ لیکن یہ کام دھمکی اور جوش بیجا کا نہیں ہے بلکہ ٹھنڈے دل سے اِس بات کے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ زمینداروں کو کاشتکاروں کے ساتھ کیا رعایتیں کرنا چاہئے جن سے اُن کی زندگی جینے کے قابل ہو جائے۔ بعض ممتاز لیڈروں نے دہلی میں کانگریسی رہنمایان سے سمجھوتہ کیلئے سلسلہ جنبانی کی ہے۔ الہ آباد کی زمیندار کانفرنس نے بھی جسمیں صوبہ آگرہ کے بہت سے زمیندار شریک تھے کل معاملہ کو کانگریس ہائی کمانڈ کی پنچایت پر چھوڑنے کا فیصلہ کیا لیکن تعلقہ داران اودھ نے اس تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے سمجھوتہ کی خواہش ظاہر کی ہے مگر وہ پنچایت میں معاملے میں فضول بحث و مباحثہ کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے درمیان میں پڑنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس پر تعلقہ دار صاحبان میں کچھ ہلچل ہے اور بعض لوگ غیر مشروط ثالثی کے لئے تیار ہیں۔ بہرحال دیکھئے اس معاملے میں آخری رائے کیا طے پاتی ہے۔ اسمبلی کا سیشن ۔۔ نومبر سے شروع ہونے والا ہے۔ اگر اس اثنا میں کوئی سمجھوتہ نہ ہوا تو اسمبلی اپنی رائے سے اس معاملہ کو طے کردیگی۔

تصحیح:۔ ہمیں افسوس ہے کہ زمانہ بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں کاتب کے سہو سے چند ایسی غلطیاں ہوگئی ہیں جن سے عبارت ہی مبہم ہوگئی ہے مثلاً مضمون "اردو۔ہندی۔ہندوستانی" میں صفحہ ۲۲۱ سطر ۱۶ میں لفظ "نہ" رہ جانے سے عبارت ہی غلط ہوگئی ہے۔ فقرہ "نہ ہند شعرا اور مصنفوں ۔۔۔ داد دی" اس طرح ہونا چاہئے:۔

"نہ ہند شعرا اور مصنفوں کی کوئی حوصلہ افزائی کی اور نہ اُن کی کارگذاریوں کی داد دی"

اسی طرح صفحہ ۲۳۶ سطر ۹ میں کئی لفظ لکھنے سے رہ گئے۔ یہ جملہ "اس طرح ہندی میں کھڑی بولی کی تخلیق ہوئی جس کیلئے ہند و مسلم (Genius) مرہون منت ہے بالکل بے معنی ہے۔ صحیح و مکمل عبارت درج ذیل ہے:۔

"اس طرح ہندی میں کھڑی بولی کی تخلیق ہوئی۔ دُنیائے ہندی اس جدت و یکسانیت کیلئے مسلم Genius کی مرہون منت ہے۔"

علمی خبریں و نوٹ

پنجاب میں ہر سال سررشتۂ تعلیم کی طرف سے صوبہ کی بہترین ادبی تصانیف کے لئے بیش قرار انعامات دئے جاتے ہیں چنانچہ امسال مشہور افسانہ نگار مسٹر ایم۔ اسلم کی کتاب "تفسیر حیات" کی قدردانی ہوئی ہے اور اس تصنیف کے صلہ میں لائق مصنف کو ساڑھے سات سو روپیہ کا پہلا انعام دیا گیا ہے۔ ہم اس قدرشناسی پر اسلم صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ناظرین زمانہ کے لئے اُن کا نام نیا نہیں ہے۔ کیونکہ زمانہ کی پچھلی جلدوں میں اُنکے متعدد مضامین و افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ حال میں اُن کے مختصر افسانوں کے کئی دلکش مجموعے شائع ہوکر مقبول عام ہو چکے ہیں۔

اسی پرچے میں مولانا عبدالحلیم شرر پر ہمارے دوست مسٹر رگھوپتی سہائے فراق کا ایک قابل قدر مضمون ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے مولانا شرر کی اُردو تصانیف کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے کم نہ ہوگی اور اگر اُن کے مختلف مضامین بھی شامل کرلئے جائیں تو اُن کی تعداد کئی سو کی ہو جائے گی۔ شرر کے ناول زیادہ تر تجارتی مطبعوں نے نہایت معمولی صورت میں چھاپے ہیں۔ مضامین کا ایک قابل قدر سلسلہ سید مبارک علی شاہ گیلانی بُک سیلر لاہور نے کسی قدر اہتمام سے شائع کیا ہے۔ مگر ابھی بہت سی تصانیف غیر مطبوعہ ہیں۔ جن کے مسودے شرر صاحب کے صاحبزادہ محمد صدیق حسن صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ اب اُن کی اشاعت کے لئے حیدرآباد دکن میں شرر پبلشنگ سوسائٹی قائم ہوئی ہے۔ جو صاحب یکمشت بیس روپیہ عطا کریں گے وہ اس سوسائٹی کے رُکن ہوں گے اور اُن کو تصانیف شرر نصف قیمت پر دیجائینگی جو صاحب پانچ روپیہ یکمشت اور ایک روپیہ ماہوار دیتے رہیں گے اُن کو سوسائٹی کی مطبوعات چوتھائی قیمت پر ملیں گی اور دو سو روپیہ یکمشت عطا کرنیوالے اصحاب سوسائٹی کے رُکن دوامی شمار ہوں گے اور انھیں کل تصانیف بلاقیمت نذر کی جائیں گی۔ مزید معلومات کیلئے شائقین منیجر صاحب دلگداز پریس کالی کمان حیدرآباد دکن سے خط وکتابت کریں۔

---

۲۸ ستمبر ۳۸ء کو خان بہادر نواب سر مزمل اللہ خاں رئیس ضلع علیگڈھ کی وفات حسرت آیات سے صوبہ متحدہ کا ایک مخیر رئیس اور ادب اُردو کا ایک بہت بڑا سرپرست اُٹھ گیا۔ اُردو۔ فارسی۔ عربی کے عالم فاضل ہونیکے علاوہ آپ تمام علوم وفنون کے قدردان اور ہر مفید عام تحریک کے حامی تھے۔ شاعری سے آپ کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ فارسی میں مرزا سنجر طہرانی اور اُردو میں حضرت اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ آپ نے اپنی ذات سے اپنی ریاست کو غیرمعمولی ترقی دی تھی۔ اور اپنے تعلقہ کے ہر کس وناکس کے سچے ہمدرد تھے۔ وقت اور ضرورت پر غربا کی امداد سے کبھی دریغ نہ

کرتے تھے۔ زمانہ کے بھی بڑے قدردان تھے۔ آخر تک اُس کے پرچوں کو شوق سے مطالعہ فرماتے رہے۔ افسوس آپ کے انتقال پُرملال سے حسن اخلاق اور اگلی وضعداری کی ایک بہترین یادگار معدوم ہوگئی۔

شروع ستمبر میں ایک اور حادثہ جانگداز یہ ہوا کہ زمانہ کے دیرینہ قدردان مسٹر جگدیش پرشاد پانڈے ڈپٹی کلکٹر کسیا ضلع گورکھپور چند دنوں کی علالت کے بعد رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ پانڈے صاحب زمانہ کے پُرانے مضمون نگار تھے۔ ملازمت کی مصروفیات کی وجہ سے اُن کے قلمی احسانات کا سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔ لیکن رسالہ کیساتھ اُنکی خاصی دلچسپی آخر تک قائم رہی۔ وہ اپنے احباب سے بھی اسکی قدردانی کی سفارش کرتے رہتے تھے۔ جولائی گذشتہ میں اُنھوں نے اپنی جلدیں مکمل کرنے کیلئے دفتر سے کئی پچھلے پرچے اور بعض نوطبع کتابیں منگائی تھیں۔ افسوس اسقدر جلد وہ ہم سے جدا ہوگئے۔ اس سانحۂ عظیم سے مسز پانڈے اور اُن کے ننھے ننھے بچوں پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے۔ اس کا خیال آتے ہی دل بیٹھ جاتا ہے۔ ایشور سب پر رحم کرے۔

نواب صاحب بھوپال نے مولوی عبدالرزاق صاحب مصنف البرامکہ کو ازراہ قدردانی اپنی ریاست کے محکمۂ تاریخ کا مہتمم مقرر فرمایا ہے۔ چنانچہ موصوف نے اپریل گذشتہ سے اس محکمہ کا چارج لے لیا ہے۔ حال ہی میں آپ نے اپنی پُرانی تصنیف البرامکہ کی نظر ثانی کرکے چند ابواب کا اضافہ کیا ہے۔ جن کا حجم دو سو صفحات کے قریب ہے۔ پوری کتاب انتظامی پریس کانپور میں زیر طبع ہے اور عنقریب شائع ہوگی۔

اِس سال دوسری سہ ماہی (اپریل لغایت جون ۱۹۳۳ء) میں صوبۂ آگرہ و اودھ میں کل ۱۲۷ کتابیں شائع ہوئیں۔ جنمیں ۲۷ انگریزی، ۴۱۴ ہندی، ۳۲۰ اُردو، ۱۶۹، سنسکرت فارسی اور دوسری زبانوں کی کتابیں تھیں۔ اُردو ہندی کتابوں کی مضمون وار تفصیل یہ ہے۔

مضمون	انگریزی	ہندی	اُردو	مضمون	انگریزی	ہندی	اُردو	مضمون	انگریزی	ہندی	اُردو
آرٹ	۲	۲	۰	زبان	۱۷	۱۳	۳	فلسفہ	۴	۹	۰
سوانحعمری	۰	۱۶	۳	قانون	۵	۸	۱	مذہب	۲	۲۰	۱
ڈراما	۰	۱۲	۳	طب	۰	۶	۱	سائنس و ریاضی وغیرہ	۷	۱۵	۲
ناول	۰	۶۳	۳	شعر و سخن	۰	۱۸۹	۴	سفرنامے	۰	۱	
تاریخ و جغرافیہ	۳	۳	۱	سیاست	۳	۳	۴	تعلیمی کتابیں	۱۳	۵۲	۵

آنریبل شری سمپورنانند صاحب وزیر تعلیم صوبہ ہندی زبان کے نامور انشا پرداز اور صوبہ کے مشہور سوشلسٹ لیڈر ہیں۔ آپ نے سال ہی میں سوشلزم کے مسئلہ پر ہندی زبان میں ایک مستند کتاب لکھی ہے، جسے آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن نے امسال کی بہترین تصنیف قرار دے کر فاضل مصنف کو پانچ سو روپیہ کا منگلا پرشاد انعام دیا ہے۔ پانچ سو روپیہ کا ایک دوسرا انعام لالہ سیتارام سکسریا کی طرف سے دیا جاتا ہے جو اس سال شری متی دیکشت کو دیا گیا ہے۔ اور بابو منگلا پرشاد رئیس بنارس کی یادگار میں بارہ سو روپیہ کا جو سالانہ انعام دیا جاتا ہے وہ امسال کاشی کے مشہور ہندی ادیب بابو جے شنکر پرساد کو ملا ہے۔ بابو صاحب کا سنہ ۱۹۳۷ء کے وسط میں انتقال ہو چکا ہے، اس لئے یہ انعام اُن کے بچوں کو ملیگا۔

پچھلے دنوں شری سمپورنانند صاحب کی خدمت میں بنارس کے سنسکرت پاٹھ شالاؤں کے پنڈتوں اور ودیارتھیوں نے سنسکرت زبان میں ایڈریس پیش کیا تھا۔ ممدوح نے اس کا جواب سنسکرت میں تو نہیں مگر ہندی بھاشا میں دیا۔ اس جواب کی زبان جلسہ کے موقعہ و محل کے لحاظ سے قدرتاً معمولی سے کسی قدر ادق تھی۔ اور گورنمنٹ صوبہ کے دفتر اطلاعات نے اُس کی اُردو و ہندی رپورٹ جو اخبارات میں بھیجی تو ہندی رپورٹ میں آنریبل وزیر تعلیم کے اصل الفاظ درج کر دئے۔ اس پر ہمارے بعض معاصرین بہت چراغ پا ہوئے ہیں کیونکہ انھیں دھوکا ہوا ہے کہ وزیر موصوف نے ہندستانی زبان میں تقریر کی ہے جس کی سفارش کانگریس ہائی کمانڈ نے کی ہے۔ ہم کو افسوس ہے کہ ہمارے سنجیدہ معاصرین بھی اس قسم کی غلطی یا غلط فہمی کے مرتکب ہوئے۔ ہم نے آنریبل وزیر تعلیم کو ہندو مسلمانوں کے ایک مشترکہ مجمع میں سلیس ہندستانی زبان میں اسی بے تکلفی کے ساتھ تقریر کرتے ہوئے سُنا ہے جس آسانی سے وہ سنسکرت علمار کی مجلس میں عالمانہ ہندی میں گفتگو کر سکتے ہیں۔

ناظرین زمانہ حضرت فراق گورکھپوری کے شاعرانہ کمالات سے بخوبی واقف ہیں۔ نثر بھی آپ خوب لکھتے ہیں اور فن تنقید پر آپ کو جو دسترس حاصل ہے اُسکی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے۔ اسی پرچے میں حضرت شرر پر آپ کا ایک دلچسپ مضمون ہدیۂ ناظرین ہوا ہے۔ زمانہ کو آپ نے اور بھی کئی قابل قدر مضامین عنایت فرمائے ہیں جو اگلے نمبروں میں شکریہ کیساتھ شائع کئے جائیں گے۔ آپ کے اشعار کیا باعتبار لطف زبان اور کیا بہ لحاظ مضامین ہمیشہ غور سے پڑھنے کے لائق ہوتے ہیں۔ آپ کا تخیل بلند، نظر وسیع اور دماغ ہمہ گیر واقع ہوا ہے۔ اسی سے آپ کا کلام ایسا دلکش و دلنشیں ہوتا ہے۔ ناظرین یہ سُنکر خوش ہوں گے کہ آجکل آپ اپنا مجموعہ کلام مرتب کر رہے ہیں اور یہ عنقریب شائع ہو کر مقبول عام ہوگا۔ اس نمبر میں آپ کی تصویر بھی ہدیۂ ناظرین ہے۔

بزمِ زمانہ

بیادگار

وفات حسرت آیات رائے بہادر لالہ سیتا رام آنجہانی

ہمارے صوبہ آگرہ و اودھ کے نامور محقق و ادیب رائے بہادر لالہ سیتا رام صاحب آنجہانی کے سوانحی حالات و قطعہ تاریخ وفات زمانہ جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب ایک شاعر دوست نے انکی یاد میں ایک نوحہ لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔ واقعی جن لوگوں کو صاحب مرحوم سے ملنے کا فخر حاصل ہوا ہے اُنکے دلوں سے آپ کے حُسنِ اخلاق کی یاد کبھی محو نہیں ہو سکتی ہے۔

زمانہ میں یہ اللہ اللہ جوشِ غم کی طغیانی
بجا ہے گر ہے ذرہ ذرہ وقفِ مرثیہ خوانی

دلِ درد آشنا ہے ساتھ اور کچھ اشک رنگیں ہیں
ادا کرنے چلا ہوں آج اپنا فرضِ انسانی

سرشکِ غم میں ہیں صد پارۂ قلب و جگر پنہاں
ذرا دیکھے تو کوئی چشمِ تر کی لعل افشانی

مرا ہر حرف خونیں ترجمانِ قصۂ غم ہے
نہیں مقصود حاشا اس سے اظہارِ سخندانی

نہیں یہ قطرہ ہائے اشک نذرِ دیدۂ تر ہے
تعالی اللہ گہر ہائے عقیدت کی فراوانی

یہ کس کے آستانِ تعزیت پر ہے جبیں فرسا
جھکی ہے کس کے غم میں خامۂ رنگیں کی پیشانی

فضائے ہند کل تک تھی منوّر جس کے پرتو سے
کہاں ہے اب وہ سیتا رام کا فیضِ ہمہ دانی

نہ بھولے گا زمانہ تا ابد اس نامِ نامی کو
تصدق جسکے ہر ہر حرف پر ہے ذوقِ وجدانی

بنائے گا جہاں علم و دانش حرزِ جاں اس کو
کرے گا ذوقِ عرفاں اس سے حاصل کیفِ پنہانی

چمک جاتی ہے بزمِ علم و دانش جسکے پرتو سے
کہاں ہے آہ اب محفل میں وہ تابندہ پیشانی

اُسے باغِ ادب کا بلبلِ رنگیں نوا کہیے
کہ اُس نے مدتوں کی اس چمن میں زمزمہ خوانی

زمانہ سے مٹے نام و نشاں گو جسمِ فانی کے
مگر زندہ رہیں گے کارنامے آنجہانی کے

ابھی تک رو رہی ہے بزمِ اربابِ سخن تم کو
بجا ہے گر کہوں میں اب شہیدِ علم و فن تم کو

تمھارے نغمۂ رنگین سے بیخود ہے فضا اب تک
بھلائے گا بھلا کس طرح گلزارِ وطن تم کو

نہ جانے آج تم کس بوستاں میں ہو نوا پیرا
چمن میں ڈھونڈتے ہیں ہمصفیرانِ چمن تم کو

لگا رہتا تھا جمگھٹ جسمیں سرمستانِ دانش کا — بھلا یاد آئے گی کیا آج وہ بزمِ کہن تم کو
ازل سے جسکی کیفیت سے تم سرشار رہتے تھے — ملا تھا فیضِ فطرت سے وہ ذوقِ علم و فن تم کو
رہا کرتے تھے سرخوش نشہ ہائے حُبِ قومی سے — سدا رکھتی تھی بیخود خدمتِ ملک و وطن تم کو
یہ ذوق و شوق اللہ اللہ نظم و نثرِ اُردو سے — کہ خود اہلِ ہنر کہتے تھے یکتائے زمن تم کو
نمونہ تھی سلف کا ذاتِ والا عہدِ حاضر میں — سمجھتے تھے متاعِ بے بہا اربابِ فن تم کو
عجب کیا ہے اگر نذرِ عقیدت پیش کرتے ہیں — بلا تفریقِ ملت آج شیخ و برہمن تم کو
یہ مانا سرزمینِ ہند سے پھر تم نہ اوٹھو گے — ق — کرے گی اب نہ پیدا حشر تک خاکِ وطن تم کو
زبان موج ہو گی اور تمھاری داستاں ہو گی — ابد تک زندہ رکھیں گے مگر گنگ و جمن تم کو

رہیں گے تا قیامت اس طرح نام و نشاں باقی
تمھاری زندگی کی داستانیں جاوداں باقی

رائے بہادر لالہ سیتا رام صاحب سنہ ۱۸۶۱ء میں بمقام اجودھیا رائے زادگان "کٹرا مانک پوری" کے خاندان میں پیدا ہوئے اور سلسلۂ نسب راجہ دشرتھ کے مشہور وزیر سمنت جی سے ملتا ہے۔ آپ کے ایک بزرگ راجہ رگھوناتھ سہائے شہنشاہ فرخ سیر کے زمانہ میں دہلی میں آباد ہوئے اور دوسرے بزرگ راجہ امرت لال غازی الدین شاہ اودھ کے راجگان میں تھے۔

آپ نے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے کل امتحانات ہمیشہ درجہ اول میں پاس کئے اور درجہ اول کے طلبا میں بھی اکثر آپ کا نمبر اول ہی رہتا تھا۔

تعلیم ختم کرنے پر آپ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکول سیتاپور مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں ڈپٹی کلکٹری پر فائز ہوئے۔ آپ اُردو ہندی کے نامور شاعر و مصنف، اودھ پنچ اور اودھ اخبار کے خاص نامہ نگاروں میں تھے۔ اُردو میں آپ نے سیکسپیر کے کئی ڈراموں کا ترجمہ کیا۔ جب ہندی کی طرف راغب ہوئے تو میگھدوت اور رگھوبنس وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کی فرمائش پر "منتخب ہندی لٹریچر" نامی ایک سلسلہ کتب مرتب کیا۔ اجودھیا اور ریاست سروہی کی تاریخ لکھی۔ اس طرح آپ نے ۴۶ کتابیں تصنیف کیں۔

آپ کے خلف اکبر بابو گرجا کشور صاحب بی اے اسسٹنٹ اکسائز کمشنر صوبہ ایک لائق و نیک کام افسر تھے۔ افسوس اُن کا سنہ ۱۹۳۴ء میں انتقال ہو گیا۔ باقیماندہ صاحبزادوں میں رائے صاحب کوشل کشور صاحب اس وقت محکمہ تعلیم کے ڈیپارٹمنٹل امتحانات کے رجسٹرار ہیں۔ بابو رگھو راج کشور وکیل حضور گورنر صوبہ متحدہ کے میر منشی ہیں۔ اور کپتان برج راج کشور انڈین میڈیکل سروس رزرو فورس میں ڈاکٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

پبلک سروس کمیشن صوبجات متحدہ

ضرورت ہے

۳۸ - ۲۴۳/۶۰۴۷

حکومت صوبجات متحدہ کی ترقی دیہات کی اسکیم کے سلسلے میں ۱۴۶ ایورویدک اور ۴۶ یونانی دواخانے جاری کئے جانیوالے ہیں۔ اُن کے لئے اتنے ہی ویدوں اور اطبّا کی ضرورت ہے۔ ایسے ویدوں اور اطبّا کا تقرر فی الحال ۶ ماہ کے لئے ہوگا۔ ممکن ہے کہ آئندہ اور توسیع ہو۔ اُمیدواروں کو صوبجات متحدہ یا ریاستہائے رامپور و بنارس و ٹہری (گڈھوال) کا مستقل باشندہ ہونا ضروری ہے۔ تنخواہ ۳۵ - ۵ - ۶۵ روپیہ ماہوار۔ اسکے علاوہ دس روپیہ ماہوار متعین شدہ الاؤنس دورہ کے اخراجات کے لئے۔ یہ مشاہرہ عارضی ہے اور اس میں مزید تخفیف ممکن ہے۔ اُمیدوار کو بورڈ آف انڈین میڈیسنز صوبجات متحدہ (Board of Indian Medicines, U.P.) کے درجہ الف (A class) کا رجسٹرڈ وید یا طبیب ہونا ضروری ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایورویدک کالج اور مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے طبیہ کالج کے سندیافتہ اُمیدواران کو ترجیح دی جائیگی۔ اُمیدواروں کی عمر یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو عموماً ۲۵ اور ۴۵ سال کے درمیان ہونی چاہیئے۔ درخواستیں ۵ دسمبر ۱۹۳۸ء تک داخل ہوجانی چاہئیں۔ درخواست کا مجوزہ فارم اور مزید اطلاعات سکریٹری صاحب پبلک سروس کمیشن صوبجات متحدہ الہ آباد، سے درخواست کرنے پر دستیاب ہوسکتے ہیں۔

الہ آباد۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ زبان اور اصل انگریزی کی طرح زور بیان۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تاریخ پر ایک بے نظیر کتاب ہے۔ نوجوانوں کے قائد اعظم نے ہماری تحریکوں اور ہمارے رہنماؤں کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت تقریباً گیارہ سو صفحات ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ، بہت سی تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ قیمت مجلد صہ/ غیر مجلد للعہ/

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

میدانِ عمل

منشی پریم چند مرحوم کا یہ بے نظیر ناول حال ہی میں مکتبہ جامعہ ملیہ نے خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اسمیں ملک کی موجودہ بیدار روح کی جیتی جاگتی تصویریں، فطری عشق و محبت کے سادہ دلکش اور بناوٹ سے پاک نقشے ملیں گے۔ بیحد دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول ہے۔ صفحات پانسو، کتابت اعلےٰ کاغذ نفیس، روشن طباعت، خوبصورت اور مضبوط جلد دیدہ زیب مصور ڈسٹ کور۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

شعلہ و شبنم

شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی پر جوش اور پر کیف نظموں کا بہترین مجموعہ ہے جو آپ کو بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلبانگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونیکا موقع دے گا۔

شاعر اعظم کا لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے۔ کتاب مجلد، نہایت خوشنما گردپوش سے آراستہ ہے

قیمت صرف تین روپیہ (سہ/)

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

یادگارِ حالی

مشہور رسالہ زمانہ کا دسمبر ۱۹۳۵ء نمبر شمس العلما مولانا حالی کی صد سالہ سالگرہ کی یادگار میں خاص حالی نمبر کی حیثیت سے شائع کیا گیا ہے جسمیں مولانا مرحوم کے سوانحی حالات کے علاوہ اُن کی نثر اور نظم پر متعدد تنقیدی مضامین درج ہیں۔ موجودہ زمانہ کے کئی نامور شاعروں اور مشہور انشا پردازوں نے اس نمبر کیلئے خاص مضامین لکھے ہیں۔ جشن پانی پت کا بھی مفصل تذکرہ ہے۔ کئی عکسی تصاویر بھی زیب رسالہ ہیں۔ غرض ہر حیثیت سے یہ پرچہ قابل قدر یادگار حالی کہلانیکا مستحق ہے۔ قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

کراس ڈیجٹ کمپی ٹیشن ۲۱

ڈھیروں روپیہ اور بوریوں دولت

اسپیشل دیوالی پیشکش

بتیس ۳۲ ہزار روپیہ کے انعامات

ہر کامیاب اور دونوں مربعوں کا صحیح حل بھیجنے والے کو نقد اور بونس کی صورت میں ایکہزار روپیہ، ایک مربع صحیح حل بھیجنے والے ہر شخص کو چار سو روپیہ کے انعام کی گارنٹی۔

آخری تاریخ ۱۵ نومبر ۱۹۳۹ء نتیجہ کی تاریخ ۲۲ نومبر ۱۹۳۹ء

اس مقابلہ صحیح حل بمبئی بلین ایکسچینج سیف ڈیپازٹ لیمٹیڈ کی تجوری میں امانتاً رکھدیا گیا ہے۔

دونوں مربعوں کے لئے فیس فی داخلہ ڈو روپیہ ایک مربع کے لئے فی داخلہ ڈیڑھ روپیہ

مربع نمبر ۲ (۲ سے ۷ اتک) مربع نمبر ۱ (۵ سے ۲۰ تک)

مربع ۱ میں ۵ سے ۲۰ تک اور مربع ۲ میں ۲ سے ۷ اتک عددوں کو اس طرح درج کرو کہ جب انھیں اوپر نیچے اور آڑے ترچھے جوڑا جائے تو مجموعہ علی الترتیب ۵۰ اور ۳۸ نکلے۔ جو حضرات دس یا دس سے زیادہ داخلے بھیجیں گے انھیں جدید وضع کا فوٹو کیمرہ دیا جائے گا۔

آخری تاریخ ۱۵ نومبر ۱۹۳۹ء ہے۔ دونوں مربعے حل کر کے مع فیس داخلہ اس طرح بھیجئے کہ ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۹ء تک پہونچ جائے اول ایک ہزار حضرات کو بونس کی صورت میں انعام دیا جائیگا۔

اس مقابلہ کا جو صحیح سر بمہر حل ہے اُس کا اعلان ۲۲ نومبر ۱۹۳۹ء کو بذریعہ ڈاک تمام مقابلہ کرنیوالوں کے پاس کر روانہ کر دیا جائیگا۔ لیکن صرف انھیں حضرات کو جو اپنے داخلوں کیساتھ ٹکٹ دار لفافہ مع پتہ ہمارے پاس بھیجدیں گے۔ ورنہ حل کا اعلان مختلف اخباروں میں کر دیا جائے گا۔ اندراج نام میں سہولت کے لئے حل کیساتھ منی آرڈر کی رسید بھی ضرور بھیجئے۔

انعام میں کوئی کمی نہ ہوگی اور نہ تناسب کیا تھ روپیہ تقسیم کیا جائیگا۔ ہر مقابلہ کرنیوالے کیلئے ایک ہزار اور چار سو روپیہ کی رقم گارنٹی شدہ ہے۔ بشرطیکہ ان کا بھیجا ہوا حل ہمارے اس حل کے بالکل عدد بعدد مطابق ہو جو بمبئی بلین ایکسچینج سیف ڈیپازٹ لیمٹیڈ میں رکھا ہوا ہے۔ بغیر فیس داخلہ کوئی حل قبول نہ ہوگا۔

روپیہ مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کیا جائے :-

مینجر صاحب نیشنل ٹریڈنگ کمپنی، سی ڈیپارٹمنٹ، راوجی بلڈنگ چڈاور کر روڈ، کنگس سرکل بمبئی ۹

ہمارے سابق مقابلہ کا سر بمہر حل (۱ الغایت ۱۶، مجموعہ ۳۴)

پہلی لائن	۴	۱۴	۱۵	۱
دوسری لائن	۹	۷	۶	۱۲
تیسری لائن	۵	۱۱	۱۰	۸
چوتھی لائن	۱۶	۲	۳	۱۳

ناول اور افسانے

بنی اسرائیل کا چاند - مصنفہ رائڈر ہیگرڈ - مترجمہ عبدالمجید صاحب حیرت بی - اے علیگ - فرعون کا دور حکومت، شہزادہ سیتی ولیعہد سلطنت کی عدل و انصاف کیلئے معزولی؛ عبرانیوں پر مظالم - ایک عبرانی لڑکی میرآپی کے حیرت انگیز کارنامے - مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے در پے مختلف قسم کی وبائیں - بنی اسرائیل کی آزادی؛ فرعون کی مع لشکر غرقابی؛ سیتی و میرآپی کے تعلقات کی دلگداز داستان - قیمت مجلد عا ر

میدان عمل - ملک کے مشہور و معروف ادیب منشی پریم چند کا بے نظیر ناول "میدان عمل" میں ملک کی موجودہ بیچین بیدار روح کی ایک جھلک ہے - اس ناول کے افراد ملک کے وہ زندہ انسان ہیں جو محبت کرنے اور محبت کی آگ میں اپنا سب کچھ جلا کر خاکستر کر دینے کے اہل ہیں، انکے ہاتھوں میں ہندوستان کا مستقبل ہے اور اُن کے کارناموں پر کروڑوں انسانوں کی فلاکت کا بار قیمت مجلد عگر

بیوہ - منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں - ایک بیوہ کی ترغیبات اسکی الجھنوں اور اُن سے حاصل کرنیکی کوششوں کو بہترین پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیئے - قیمت مجلد عہ ر

واردات - منشی پریم چند کے جادو نگار قلم کے ۱۳ تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ - یہ افسانے ہماری معاشرت اور سماج کی تصویریں ہیں جو افسانوں کی شکل میں منشی صاحب آنجہانی نے پیش کی ہیں - کاغذ طباعت اعلےٰ - تقریباً ۲۰۰ صفحات - قیمت مجلد عہ ر

کیمیاگر - پروفیسر محمد مجیب صاحب بی - اے آکسن کے مختلف افسانوں کا مجموعہ - طباعت وغیرہ خوبصورت - یہ افسانے اعلیٰ اور ستھرے مذاق کے طبقہ میں عموماً پسند کئے گئے ہیں - قیمت عہ ر

دامن باغبان - مشہور ادیب و صحافت نگار جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کے منتخب اصلاحی افسانوں کا نہایت قابل قدر مجموعہ، ہر افسانہ ایک مستقل پیام ہے اور ہر لحاظ سے کامیاب، طباعت وغیرہ عمدہ اور نفیس قیمت عہ ر

مکتبہ جامعہ، دہلی - نئی دہلی - لکھنؤ - لاہور

پرنٹر پنڈت سری شبھ میر دال پریس کانپور		ایڈیٹر و پبلشر منشی دیا نرائن نگم بی - اے

ZAMANA. December 1938.

دسمبر ۱۹۳۸ء | مرتبہ دیا نرائن نگم بی اے | جلد ۷۱
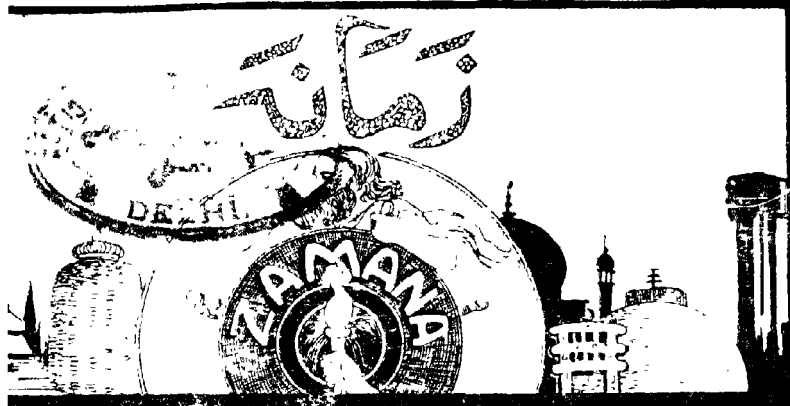
فہرست

تصاویر: کمال پاشا - حضرت عرش گیاوی

۱- رحیم کے دوہے
از سید مقبول حسین احمد پوری بی اے ایل ایل بی ... ۳۳۵

۲- خطا بروز زاہد (نظم)
از حضرت نجم آفندی ۳۴۴

۳- قیصر باغ کی تاراجی
از شیخ تصدق حسین بی اے ایل ایل بی ... ۳۴۵

۴- رموز و نکات (نظم)
از حضرت راز چاندپوری ۳۵۳

۵- تلاش ناکام (نظم)
از مسٹر جگن ناتھ آزاد بی اے ۳۵۴

۶- حضرت عرش گیاوی
از سید رضا قاسم مختار بلاموں ۳۵۵

۷- کلام فراق
از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق ایم اے ... ۳۶۰

۸- حکمت کی شاعری
از مسٹر گوبند پرشاد بھنوی ایم اے ... ...

۹- ہمارا ہندوستان
از مسٹر پرشوتم لال چودھری ایم اے ... ...

۱۰- کنجن لتا (نظم)
از حضرت جگر بریلوی بی اے ... ...

۱۱- غریب کا دل (قصہ)
از مسٹر دھیرج پرکاش بھٹناگر کنشت ... ...

۱۲- مصطفےٰ کمال پاشا
از مولانا محمد یعقوب خاں کلام بی اے ...

۱۳- تنقید کتب
صبح مشرق۔ جوئبار۔ باغی۔ سوز سنگار۔ وغیرہ

۱۴- رفتار زمانہ ... ...

۱۵- علمی خبریں اور نوٹ ... ...

قیمت سالانہ پانچ روپیہ | دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوا | فی پرچہ سات

ہفتہ وار اخبار آزاد کانپور

(جس میں)

ہفتہ بھر کے اہم اور ضروری واقعات پر آزادانہ رائے زنی ہوتی ہے

لیڈروں کی ضروری تقریروں کا خلاصہ درج ہوتا ہے

ہندوستان کی ملکی و قومی تحریکوں اور جلسوں کے حالات

اور

سرکاری رپورٹوں کے دلچسپ اقتباسات شائع ہوتے ہیں،

ایڈیٹر زمانہ کی ایڈیٹری میں ہر سنیچر کو دفتر زمانہ کانپور سے شائع ہوتا ہے،

قیمت سالانہ تین روپیہ　　فی پرچہ ار　　نمونہ مفت

ضرورت ہے

دفتر اخبار آزاد و رسالہ زمانہ میں ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے جو انگریزی سے بخوبی ترجمہ کر سکے، کاپی و پروف دیکھ سکے۔ اور کچھ اخباری تجربہ بھی رکھتا ہو۔ تنخواہ حسب لیاقت دی جائے گی۔

(۲) دفتر آزاد و زمانہ کو ایک خوشخط اور انگریزی اُردو کلرک کی ضرورت ہے جو حساب کے کام سے بھی واقف ہو اور ٹائپ کر سکتا ہو۔ کارکردہ آدمی کو ترجیح دی جائیگی۔ تنخواہ ۲۰ سے ۳۰ تک ماہوار حسب لیاقت دیجائیگی۔

منیجر زمانہ کانپور

ملک کے مشہور اخبارات کی رائیں

گذشتہ پچیس سال کے اندر ملک کے بہت سے مشہور و معروف اخبارات نے آزاد کے متعلق جو رائے لکھی ہے انہیں سے بعض کے اقتباسات یہ ہیں:۔

زمیندار (لاہور)

"منشی دیا نراین نگم کا آزاد بالکل نرالا ہے اسکی طرز روش تعصب و ناواجب جنبہ داری کی آمیزش سے پاک ہے۔ وہ ہندو مسلم معاملات میں آزادی سے بحث کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بہاری (بانکی پور)

"آزاد ایک بلند پایہ اُردو اخبار ہے اور بالکل زمانہ کی روش پر نکالا گیا ہے"۔

ویدک میگزین (گورکل)

"آزاد نہایت لیاقت سے مرتب کیا جاتا ہے اس کے مضامین اور ایڈیٹوریل نوٹ افراط تفریط کے نقص سے پاک ہوتے ہیں، جذبات کی سنجیدگی اور خیالات کی بلندی اسکی دوسری خصوصیات ہیں"۔

ونکیٹشور سماچار (بمبئی)

"آزاد اپنے ڈھنگ کا ایک ہی پرچہ ہے آزادی سے اپنے سنجیدہ خیالات ظاہر کرنے والا طرفداری سے بالکل پاک اخبار ہے،

قیمت صرف تین روپیہ سالانہ

ملیریا کل اور آج

زمانہ قدیم ہی سے ملیریا انسان کیلئے ایک عذاب عظیم تھا۔ قدیم فلسطین کے یہودیوں کو اس کا حال بخوبی معلوم تھا۔ کیونکہ انکی کتابوں میں لکھا ہے۔ یہوداہ نے لوگوں کو بخار سے سزا دی۔ گمان غالب ہے کہ جس بخار کا ذکر کیا گیا ہے وہ "دلدلی بخار" یا ملیریا تھا۔

قدیم یونان کے لوگ ملیریا سے بہت گھبراتے تھے۔ کیونکہ بڑے بڑے جنرل بھی اتنا اتلاف جان نہیں کرتے تھے جتنا کہ ملیریا کر ڈالتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ٹرائے کے محاصرہ کے زمانہ میں جس مرض نے یونانیوں میں تہلکہ ڈال دیا تھا وہ غالباً ملیریا ہی تھا جو میدانِ جنگ کے نواحی دلدلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔

رومیوں نے بھی ملیریا سے سخت تکلیف اٹھائی کیونکہ اُن کا دارالحکومت روم براہ راست پونٹائن کے مشہور دلدل سے ملا ہوا تھا۔ جہاں ملیریا پھیلانے والے مچھر بہت آسانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ رومیوں کو پورے طور پر یقین تھا کہ یہ دلدل خطرہ کا گھر ہے۔ اسی لئے انھوں نے اس کے خشک کرنے کیلئے وسیع پیمانہ پر نالے بنوائے تھے۔ گندہ پانی کی نکاسی کیلئے اُنھوں نے جو زیر زمین نالیاں بنائی تھیں، اُن میں بہت سے نالے ایسے تھے جن کی ڈاٹ کا قطر چھ فٹ تھا اور جو سیکڑوں میل تک چلے گئے تھے۔ اُن کے آثار اب بھی ملتے ہیں۔

اپنی کتاب موسومہ "ملیریا" میں جس سے یونان و روم کی تاریخ میں غفلت کی گئی تھی۔ مسٹر جونس نے بیان کیا ہے کہ ملیریا نے یونانیوں کی طاقت چوس لی تھی اور رومیوں کو جو زیادہ طاقتور تھے، خونخوار درندے بنا دیا تھا۔

آج بھی اس امر پر زور دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ ملیریا ہنوز ایک تباہ کن وبا ہے اور یونانیوں اور رومیوں کے زمانہ کی طرح اب بھی ملیریا جنگ میں ایک اہم حصہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں جبکہ جنگ عظیم کا سلسلہ جاری تھا، ملیریا نے اتحادیوں کی اُن فوجوں کا تقریباً صفایا کر دیا تھا جو بلقان میں تعینات تھیں۔ ایک لاکھ پندرہ ہزار فوج میں سے ساٹھ ہزار سپاہی ملیریا میں مبتلا ہوئے جسمیں سے تین سو اُناسی (۳۷۹) مر گئے۔

مگر شکر کا مقام ہے کہ لڑائی کا فیصلہ ملیریا پر منحصر نہیں رہا، کیونکہ اب انسان کو کونین جیسی طاقتور دوا معلوم ہو گئی ہے، جسکی بدولت یہ مرض رک سکتا اور اچھا ہو سکتا ہے۔ اِس بات کا ثبوت ۱۹۱۸ء میں بلقان کے محاذ پر حاصل ہوا جہاں صرف ایک ہزار آدمی ملیریا میں مبتلا ہوئے اور صرف اٹھتر آدمی مرے، کیونکہ کونین کے ذریعہ سے اس مرض کے انسداد کی بہت بڑی کوشش کی گئی اور چونکہ اس محاذ کی فوج ۱۹۱۸ء میں ۱۹۱۶ء کی فوج سے دگنی تھی، اسلئے اعداد و شمار سے ہمارا دعویٰ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔

لیگ اقوام کے ملیریا کمیشن کی ہدایت کے مطابق انسداد ملیریا کیلئے فصل بھر ہر شخص کو روزمرہ چھ گرین کونین کھانا چاہیئے، اور جو لوگ ملیریا میں مبتلا ہوں اُن کو پانچ سات روز تک روزمرہ پندرہ سولہ گرین کھانی چاہیئے۔ اسکے بعد کوئی ضرورت نہیں، لیکن اگر بیماری پھر پلٹ آئے تو پھر پہلے کی طرح علاج کیا جائے۔

سدھا سندھو
فہرست
مفت
کف کھانسی - ہیضہ -
دمہ پیچش پیاس قے وغیرہ امراض
کی بے ضرر اور خوش ذائقہ دوا ہے
سکھ سنچارک کمپنی متھرا

پبلک سروس کمیشن یو۔پی

ترمیم

کمیشن کے پچھلے اشتہار مورخہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں (جس میں ویدوں اور اطبا کی جگہوں کے لئے درخواستیں طلب کی گئی ہیں) حسب ذیل ترمیم کیجاتی ہے:۔

(۱) امیدوار کے لئے لازم ہے کہ وہ (الف) یا تو آیورویدک کالج بنارس ہندو یونیورسٹی یا طبیہ کالج علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کا سند یافتہ ہو۔ (ب) یا بورڈ آف انڈین میڈسین صوبہ جات متحدہ کا رجسٹرڈ وید یا طبیب ہو۔

اُن امیدواروں کو جوکہ آیورویدک کالج یا طبیہ کالج مذکورہ بالا کے سند یافتہ ہونگے۔ ترجیح دی جائے گی۔

(۲) اُمیدوار کی عمر یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو بیس۲۰ سال سے کم اور پینتالیس۴۵ سال سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔

(۳) درخواستیں بجائے ۵ دسمبر ۱۹۳۸ء کے ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء تک سکرٹری صاحب پبلک سروس کمیشن یو۔پی۔ الہ آباد کے پاس پہونچنا چاہئیں۔

مصدرہ الہ آباد

مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۸ء

گھر میں رکھنے والی چھ چیزیں جن کا ثانی دوسرا نہیں
"امرت دھارا" رجسٹرڈ
لاہور کے مشہور و معروف حکیم ہوی ولود ویدک ویشن پنڈت ٹھاکر دت شرما وئید کی ایجاد ہے۔ جس نے دُنیا کو حیرت میں ڈالدیا ہے۔ باقی پانچوں ادویات اس عجیب الاثر دوائی کی ملاوٹ سے تیار کی جاتی ہیں۔ لاکھوں استعمال کرنے والوں میں سے ۳۶ ہزار سے اوپر لکھ کر بھیج چکے ہیں کہ
امرت دھارا ہر گھر اور ہر جیب میں موجود رہنی چاہیئے
یہ ایک ہی دوائی کھانے سے اور لگانے سے تقریباً کل امراض یا حادثات کا قطعی علاج ہے۔ ہر قسم کی اندرونی و بیرونی درد، نزلہ، کھانسی، زکام، دمہ، بخار، ہیضہ، انفلوئنزا، پلیگ، نمونیا، پیچش، بچھو، سانپ، بھڑ وغیرہ کا کاٹنا تک کوئی بیماری نہیں جو یہ دُور نہ کرے۔
قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ۔ نصف ۱۲/۱۔ نمونہ ۸/
"امرت دھارا" مرہم رجسٹرڈ
بعض جلدی امراض کے دُور کرنے والی ادویات کو اپنی مشہور و معروف دوائی "امرت دھارا" کے ساتھ ملانے سے تیار کی گئی ہے۔ امرت دھارا مرہم میں
کوئی حیوانی چربی شامل نہیں ہے
"امرت دھارا" مرہم تقریباً تمام جلدی امراض کے واسطے بینظیر ہے۔ تمام قسم کے زخم، چوٹ، رگڑ، پھوڑے، پھنسیاں، خارش، داد، چنبل، ایگزیما، چھالے، ہاتھ پاؤں کا پھٹنا، سوزش جلد، جلدی دانے، زخم ہائے آتشک، مسّا ہائے بواسیر، مچھر، بھڑ وغیرہ کے ڈنک، آگ یا گرم پانی یا تیزاب وغیرہ سے جلنا سب اِس سے دُور ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے گہرے زخم اتنی جلدی بھرنے شروع ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے ڈاکٹر حیران رہ جاتے ہیں۔ عجیب مرہم ہے۔ قیمت فی بکس ایک روپیہ (عہ/)
"امرت دھارا" صابن
اس صابن میں جو خوبی ہے وہ کسی میں نہیں۔ یہ صابن جلدی امراض جیسے داد، چنبل، پھوڑے، پھنسی، پتی، خارش، گرمی دانے، کیل، چھائیاں وغیرہ کو دُور کرتا ہے۔ مگر کاربالک سوپ وغیرہ کی طرح بدبودار نہیں ہے۔ بلکہ روزانہ استعمال کے لئے یہ لاثانی چیز ہے۔ میل کو فوراً دُور کرتا ہے۔ چمڑے کو نرم اور خوبصورت بناتا ہے۔ ڈس انفکٹنٹ (جرم کش) اوّل درجہ کا ہے۔
اسواسطے وبائی دِنوں میں ہر ایک کو اس سے ہاتھ دھونے چاہئیں
جب سے ہم نے یہ صابن مشتہر کیا ہے۔ پبلک نے اس کو بہت پسند کیا ہے۔ قیمت تین ٹکیہ کا بکس صرف چودہ آنہ (۱۴/) فی ٹکیہ ۵/
امرت دھارا لوزنجز یعنے امرت دھارا کی میٹھی ٹکیہ رجسٹرڈ
ولایت سے پیپرمنٹ کی ٹکیہ وغیرہ برائے فروخت ہندوستان میں آتی ہیں۔ ہم نے امرت دھارا کی ٹکیہ تیار کی ہیں۔ جنکے ذریعے بچے اور نازک مزاج تک امرت دھارا کو نہایت خوشی سے کھا سکتے ہیں۔ آپ جیب میں ہر وقت امرت دھارا ٹکیہ کو رکھ سکتے ہیں۔ اور ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کے چوسنے سے حسب ضرورت امرت دھارا کا فائدہ ہونے کے ساتھ ساتھ دانتوں اور مسوڑھوں کے امراض۔ بلغم۔ خراش گلو۔ گلے پڑنا۔ کھانسی وغیرہ کو فائدہ ہوتا ہے۔ بچوں کو کھوکھ، بسکٹ، ٹکیہ و گولیاں وغیرہ کھانے کے بجائے ان کو پاس رکھا کریں۔
قیمت فی ڈبیہ ایک سو ٹکیہ ۲/
"امرت دھارا" بام | یہ بام خاص طور پر تمام قسم کے دردوں کے واسطے اکسیر ہے۔
جہاں درد۔ سوجن۔ اینٹھن۔ چیرنا۔ توڑنا۔ کریدنا وغیرہ ہو۔ اُس جگہ کے لئے اس سے بڑھ کر آپ کو آرام دینے والی بام نہ ملے گی۔ گٹھیا۔ گوٹ۔ درد چھاتی وغیرہ سب میں استعمال ہو سکتی ہے۔
قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ/)
امرت دھارا لوشن | اس کے غرارے کرنے سے منہ، دانت و گلا کی عفونت دُور ہوتی ہے اور منہ کی بیماریاں نہیں ہوتیں۔ اگر ہوں تو ہٹ جاتی ہیں۔ دانت مضبوط رہتے ہیں۔ حجامت کے بعد مل لینے سے استرا لگنے کا اثر نہیں ہوتا۔ بالوں پر ملنے سے بال مضبوط رہتے ہیں۔ گلے کی خرابیاں۔ دانتوں کی عفونت۔ گندہ دہنی۔ مچھر وغیرہ کاٹنے پر لگا سکتے ہیں۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ/)
خط و کتابت و تار کا پتہ :-
امرت دھارا ۲۵۴ لاہور
المشتہر
منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون،
امرت دھارا سڑک امرت دھارا ڈاکخانہ، لاہور

مصطفیٰ کمال اتاترک

سنہ ۱۸۸۱ع　　　سنہ ۱۹۳۸ع

زمانہ

نمبر ۶ — دسمبر ۱۹۳۸ء — جلد ۱۷

رحیم کے دوہے

(از سید مقبول حسین احمد پوری، بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)

آجکل جبکہ اُردو ہندی مسئلہ ایک شورش کی صورت اختیار کرچکا ہے یہ کہہ دینا کہ مسلمانوں نے بھی ہندی کی خدمت اُردو سے کہیں زیادہ کی، دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

امیر خسرو کے زمانہ میں اُردو کا نام تک کوئی نہ جانتا تھا، خود شاہزادے اور بیگمات جب کبھی دیسی زبان [بو]لتیں تو وہ ہندی ہی ہوتی تھی جس کا ثبوت تاریخ فرشتہ اور منہاج السراج وغیرہ میں موجود ہے یہی وجہ ہے [کہ] خسرو نے ہندی میں اشعار لکھے۔

شیر شاہ کے زمانے میں بھی خود بادشاہ نے ہندی زبان سیکھی اور اس کو باقاعدہ اپنے دربار میں بار یاب کیا [اک]بر بادشاہ نے تو اس کی اچھی خاصی خدمت کی، ان کے عہد میں شاہی حرم میں ہندی بخوبی رائج تھی۔ [او]ر دربار میں بھی ہندی زبان کا چرچا پہلے سے بہت زیادہ تھا۔ بڑے بڑے ہندی شاعروں کو دربار میں [سرف]رازی حاصل تھی۔ انعام، خلعت، جاگیر غرض کونسی مراعات ہندی شعرا کو حاصل نہ تھیں۔ اس زمانے میں "زبان ہندوی" کے سوائے اُردو کا کوئی نام تک نہ جانتا تھا۔ چنانچہ اس عہد کا مشہور ہندی شاعر [اک]بر اکبری کا ایک مقتدر امیر عبدالرحیم خان خاناں تھا جو فارسی کا بھی ایک پرگو اور مستند شاعر مانا گیا ہے

پھر اُردو کیسے آئی؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ زبان ہندوستان کے اصلی باشندوں یعنی ہندوؤں نے ایجاد کی۔ ہندو لوگ فارسی پڑھ کے اپنی بول چال میں کثرت سے فارسی اور عربی الفاظ استعمال کرنے لگے۔

اور اُس کو اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ سوسائٹی کی نشانی سمجھکر ان الفاظ کا رواج عام کرتے رہے یہاں تک کہ عام ہندی ہندی معلی اور پھر ریختہ، اور ریختہ سے اُردو اور اُردو سے اُردوئے معلیٰ ہوگئی ۔ اب اس میں انگریزی اتنی زیادہ ملتی جارہی ہے کہ آئندہ ہندی، اُردو، ہندوستانی مل ملاکر "لنگوا فرینکا" ہی ہوجائیگی نہ اُردو رہیگی نہ ہندی بلکہ "لنگوا فرینکا" رہیگی لیکن شہری اور دیہاتی زبانوں کا امتیاز جیسا ہمیشہ رہا ہے اب بھی ہے اور ہمیشہ رہیگا ۔ دیہاتی لوگ کبھی "بقراط" یا والمیک نہ ہوسکیں گے ۔

غرض بادی النظر میں یہ کہدیا جائے کہ ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں نے ہندی کی زیادہ خدمت کی ہے تو شاید کچھ لوگ اس پر قہقہہ مار کے ہنسیں اور کچھ لوگ اپنا منہ ٹیڑھا کریں لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، اُردو کو ہندوؤں ہی نے جنم دیا تھا ۔ اب اگر وہ اسے نشٹ بھرشٹ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں اُنھیں کا نقصان ہے، یہ گھر آئی ہوئی لچھمی کو نکالنا ایک پاپ کے بمنزلہ ہے

بہرحال سلطنت مغلیہ نے ہندستان کو ہندی زبان کا ایک ایسا مسلمان شاعر دیا ہے جس کی شاعری کا چرچا آج بھی ہندو گھرانوں میں ہے ۔ ہمارا مطلب عبدالرحیم خانخاناں سے ہے جن کے "دوہے" آج بھی اپنی قدیمی آن بان کے ساتھ زبان زد خاص وعام ہیں ۔

یوں تو بابا تلسی داس اور سور داس جی کے مقابلے میں عام فہم ہندی دوہے لکھنے والوں کی تمثیل غالبًا ناممکن ہے ۔ کبیر صاحب کو جذبات کا بادشاہ کہا جاسکتا ہے مگر علم عروض یعنی ہندی پنگل سے وہ بالکل ناآشنا رہے اور اس معاملے میں وہ ضرورت سے زیادہ آزاد اور آئین شکن واقع ہوئے تھے، البتہ زبان و بیان کی تاثیر جو اُن کے دوہوں اور بھجنوں میں پائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے کبیر صاحب آج بھی ہندی کے بڑے شاعروں میں پیش پیش نظر آتے ہیں ۔ چنانچہ ان گنتی کے ناموں میں جو اپنی شہرت کا دعویٰ اپنے نام ہی سے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، حسب ذیل زیادہ نمایاں ہیں :-

(۱) تلسی داس　　(۳) کبیر صاحب　　(۵) رحیم یا رحمٰن

(۲) سور داس　　(۴) میرا بائی

مندرجہ بالا ناموں کے بعد بہاری، بھوشن، پدماکر، تسی جی، دیش بندھو، اور نارائن سوامی وغیرہ کا نمبر آتا ہے ۔ لیکن یہ نام اتنے زیادہ عام نہیں ہیں ۔ حالانکہ کبیر صاحب کی "اُلٹو اسیون" کی طرح نارائن سوامی کی "چیتاؤنی"[1] اور بہاری کے دوہے وغیرہ بہت مشہور ہیں ۔ لیکن زیادہ تر ہندو اہل قلم اور عام طور

---

[1] نارائن سوامی ہند راہنما کے "چیتاؤنی" دوہوں کے چند نمونے ذیل میں دئیے جاتے ہیں :-

۱۔ تلقین معرفت | نارائن ہری بھجن میں تو جن دیر لگائے ۔ کو جانے جا دیر میں سانس رہے کہ جائے ۔

ترجمہ :- کس لئے یاد خدا میں دیر کی اے جان من + کیا خبر اس دیر میں یہ سانس آئے یا نہ آئے ۔

پر لوگ تلسی داس، سورداس، کبیر صاحب، میرا بائی اور رحیم ہی کے نام کی سمرن کرتے ہوئے نظر آتے ہیں

ذیل میں ہم رحیم کے ہندی دوہوں میں سے چند مشہور عام دوہے صرف اس لئے لکھتے ہیں کہ ایک ایسے شخص جس کی مادری زبان فارسی ہو اُس کے ہندی کلام کا ذخیرہ ہمارے لئے سند کا کام دے سکے، اور یہ کہنے کو نہ ہو کہ ہندی کی پرورش کا سہرہ صرف ہندوؤں کے سر ہے۔

جیساکہ مولوی شبلی مرحوم نے شعرالعجم میں لکھا ہے عبدالرحیم خانخاناں کا فارسی کلام جا بجا عرفی اور نظیری کے کلام سے بھی سبقت لے گیا ہے۔ اس سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ رحیم کا دماغ ایک حقیقی شاعر کا دماغ تھا۔ اس لئے اس نے ہندی یا فارسی میں جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ شعرالعجم میں جو رحیم کی ایک فارسی غزل بطور نمونہ پیش کی گئی ہے اُس کا ہندی ترجمہ ناظرین کو کسی دوسری جگہ ملے گا۔ اس سے شاعر کی قادرالکلامی اور شستگی زبان کا اندازہ بخوبی ہو جائیگا۔

یہاں رحیم کے دوہوں کا مختصر سا انتخاب دیا جاتا ہے، جس کے ساتھ جا بجا ڈھنگ، ترجمہ اور تشریح وغیرہ بھی کی جاتی ہے تاکہ اردو داں اصحاب کو ان کا حسن نمایاں اور معنی سمجھ میں آ سکیں۔

(۱) حقیقتِ دوست — سب کوُ سب سے کرے، رام جوہار سلام
ہت اَن ہت تب جانیئے، جا دِن اَٹکے کام!

सब कोऊ सब से करे, राम जुहार सलाम ।
हित अन हित तब जानिये जा दिन अटके काम ॥

(رام جوہار۔ معنی آداب۔ سلام علیک وغیرہ۔ ہت معنی محبت یا محبت والا آدمی، اَن ہت معنی بے مروت)

ترجمہ:۔ ہر شخص ہر دوسرے شخص کو بظاہر سلام و پیام سے مخاطب کیا کرتا ہے لیکن مروت اور بے مروتی کا اندازہ تو اُسی وقت ہوتا ہے جب ایک کی دوسرے سے غرض اٹکے اور دوستانہ قائم رہے۔

شعر ع یارے کہ بکار تو بیاید یار است

۲- توکل الی اللہ — اَمر بیل بِن مؤل کی پرتِ پالت ہے تاہ
رحمنؔ ایسے پربھو تجِ، کھوجت پھریئے کاہ؟

۲- بے ثباتی زعم باطل — نارائن جِن ہاتھ پہ جوتر دھرت سومیر۔ سُو وِیرجا بھوم پہ بھئے راکھ کا ڈھیر!

ترجمہ:۔ وہ بہادر جو اُٹھا لیتے تھے ہاتھوں پہ پہاڑ۔ وہ بھی آخر اس زمیں پہ ہو گئے مٹی کا ڈھیر!

۳- شکوۂ خاص — گڑھ گڑھ کے باتیں کریں مَن میں تنک نہ پریت۔ نارائن کیسے ملیں صاحب سانچے میت!

ترجمہ:۔ بنا بنا کے کریں بات دل میں اُنس نہیں۔ ملیں تو کیسے ملیں خالص اور سچے دوست!

अमर बेल बिन मूल की, प्रति पालत है ताहि ।
रहिमन एसे प्रभू तजि, खोजत फिरये काहि

(امربیل (نہ مرنے والی بیل) یعنی آکاش بیل جسکے "مول" یعنی جڑ نہیں ہوتی۔ سوتوں کی طرح درختوں پر پھیلی پڑی رہتی ہے۔
"تاہ" معنی اسکو ۔ "کاہ" معنی کیا۔)

ترجمہ۔ آکاش بیل بغیر جڑ کے نشو و نما پاتی ہے، خدا اُس کی بھی پرورش کرتا ہے (یعنی جس کا کوئی روزی رساں نہیں اُس کو بھی خدا رزق دیتا ہے) ایسے مہربان خدا کو چھوڑ کر رحمن تم کیا ڈھونڈھتے پھرتے ہو

(۳) حقیقت عشق

یہ نہ رحیم سراہیے، دین لین کی پریت
پرانن بازی راکھیے، ہار ہووے کہ جیت

(پرانن معنی جان)

यह न रहीम सराहिये, देन लेन की प्रीत ।
प्रानन बाज़ी राखिये, हार होय की जीत ॥

ترجمہ۔ کہو نہ تم کہ ہے الفت بھی لین دین رحیم لگاؤ جان کی بازی، یہ جی رہے نہ رہے

(۴) نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد

رحمن کھوجت کیوں پھرے، رام نکٹ ہے جان
یہ دس اندری بند کر، تب ہی تو پہچان

रहिमन खोजत क्यों फिरै, राम निकट है जान ।
यह दस इन्द्री बंद कर, तब हि तू पहिचान ॥

(نکٹ معنی نزدیک ۔ دس اندری یعنی دس قسم کی لذت نفسانی)

ترجمہ۔ اے رحمن تم خدا کی تلاش میں کیوں سرگردان ہو۔ وہ تو رگِ گلو سے بھی قریب ہے، ہاں اپنی اِن دسوں خواہشاتِ نفسانی کو روکو تو اس کو پہچان سکوگے۔

(۵) تخم تاثیر۔ صحبت اثر

رحمن سنگت سنت سے، مکت پدارتھ پائے
ویشیا ڈھگ نا بیٹھیے، دھرم نشٹ ہو جائے

रहिमन संगति सन्त से, मुक्त पदारथ पाय ।
वैश्या ढिग ना बैठिये, धर्म नष्ट हो जाये ॥

(سنت معنی پاکباز لوگ۔ گت پدارتھ پائے یعنی مکتی یا نجات حاصل ہو۔ ویشیا معنی زنِ بازاری
ڈِھگ معنی نزدیک، قریب۔)

ترجمہ:۔ نجات ملتی ہے صحبت سے نیک لوگوں کی ہوا بُروں کی بُجھاتی ہے شمعِ ایماں کو

(۶) شیریں کلامی کی خوبیاں

مَدُھر بچن پیارو لگے، سُنِ کٹھور دُکھ ہوئے
میل کُٹمبھ سے راکھیو، اَتِ رحیم سُکھ ہوئے!

मधुर बचन प्यारो लगे, सुनि कठोर दुख होय।
मेल कुटम्ब से राखियो, अति रहीम सुख होय॥

(۱ مدھر بچن معنی میٹھے بول، شیریں گفتار۔ ۲ کٹھور معنی سخت کڑوے (تلخ الفاظ) ۳ کٹمبھ معنی خاندان)

ترجمہ:۔ پیارے ہیں بول میٹھے، کڑوی ہیں سخت باتیں،
اپنوں سے میل رکھو، سکھ چین پاؤ گے تم!

(۷) ضبطِ غم کی تلقین

رحمن نج مَن کی بتھا، مَن ہی راکھو گوئے
سُن اَٹھلاویں لوگ سَب، بانٹ نہ لیوے کوئے

रहिमन निज मन की बिथा, मन ही राखो गोय।
सुनि अठलावें लोग सब, बांट न लेवै कोय॥

(۱ نج معنی اپنی نجی۔ ۲ گوئے۔ گائے یعنی کہنا ۔ ۳ بتھا معنی دُکھڑا۔ درد دُکھ

ترجمہ:۔ اپنے دل کا درد دل ہی میں رکھو اپنے رحیم
دُکھ بٹائے گا نہ کوئی بلکہ سب اُٹھلائیں گے!

(۸) حبِ وطن

جال پڑے جَل جات بہہ، تج مینَن کو موہ
رحمن مچھری نیر کو، تئو نہ چھوڑت چھوہ!

जाल पड़े जल जात बहि, तजि मीनन को मोह।
रहिमन मछरी नीर को, तऊ न छोड़त छोह॥

۱ جل = پانی ۲ تج = چھوڑکر ۳ مین = مچھلی۔ مینن = مچھلیاں ۴ موہ = محبت ۵ نیر = پانی
۶ تئو = تب بھی۔ ۷ چھوہ = ساتھ۔

ترجمہ:- پانی میں (ماہی گیر کا) جال پڑتا ہے تو پانی مچھلیوں سے کنارہ کش ہو کر اور انھیں چھوڑ کر بہہ جاتا ہے (اس بے مروتی پر بھی) اے رحمن مچھلی پانی کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی

(۹) خدمتِ والدین

لاکھ بات کی بات ہے، رحمن کہت سنائے
مات پتا کو سیو کی، جگ میں سکھ ات پائے

लाख बात की बात है, रहमन कहत सुनाय।
मात पिता को सेव की, जग में सुख अति पाय॥

لہ سیو - سیوا - خدمت - سلہ ات - بہت -

ترجمہ:- رحمن لاکھ بات کی ایک بات یہ کہتے ہیں کہ ماں باپ کی خدمت کرنے سے دنیا میں بڑی خوشی اور آرام نصیب ہوتا ہے -

(۱۰) ضبط کی تلقین

جیسی پڑے سو سہہ رہے، کہہ رحیم یہ دیہہ
دھرتی ہی پر پڑت سب، شیت، گھام اور مینھ

जैसी पड़े सो सहि रहै, कहि रहीम यह देह।
धरती ही पर पड़त सब शीत घाम और मेंह॥

ترجمہ:- رحیم یہ کہو کہ جیسی بھی پڑے یہ جسم سہہ لیا کرے کیونکہ دھرتی لینی زمین ہی پر جاڑا - گرمی اور برسات ہوا کرتی ہیں - (گویا جسم ایک طرح سے بمنزلہ زمین ہے -

(۱۱) تلقینِ صبر

رحمن چپ ہو بیٹھیے، دیکھ دنن کے پھیر
نیکے دن جب آئے ہیں بنت نہ لاگی دیر

रहमन चुप हो बैठिये, देख दिनन के फेर
नीके दिन जब आइ हैं, बनत न लागी देर॥

ترجمہ:- گردشِ ایام کی حالت دیکھ کر رحمن خاموش بیٹھ رہو کیونکہ بھلے دن جب آئیں گے تو بگڑی جلدی بن جائے گی -

(۱۲) جوانمردوں کی تعریف

جو نر بپتا بانٹ ہیں وے ہیں سنگھ سمان
رحمن اپنی بات پر تج دیں آپن پران

जो नर बिपता बांट है वे हैं सिंघ समान ।
रहमन अपनी बात पर, तजि दें आपन प्रान ॥

(نر-آدمی۔ بپتا بانٹ۔ دکھ بٹانے والے۔ ہمدرد۔ سنگھ۔ شیر۔ سمان۔ مانند۔ پران۔ جان)

ترجمہ:- اے رحمن جو لوگ ہمدرد ہیں وہ شیر مرد کہلانے کے مستحق ہیں، اپنی بات پر وہ اپنی جان تک دینے کو تیار رہتے ہیں۔

(۱۳) بد باطن لوگوں سے احتراز کی تلقین

کپٹ گانٹھ من میں رکھے، بیر ورُودھ کی کھان
رحمن ایسے دشٹ سوں، تجے جان پہچان

कपट गांठ मन में रखै बैर विरुध्द की खान ॥
रहमन ऐसे दुष्ट सों, तजै जान पहिचान ॥

(کپٹ: فریب۔ بیر ورُودھ: دشمنی۔ دشٹ: دشمن۔ تجے: چھوڑ دے)

ترجمہ:- جو شخص دل میں بغض رکھے وہ دشمنی کی کھان ہے۔ اے رحمن ایسے دشمن سے تعلقات منقطع ہی کرلینا چاہیے۔

(۱۴) بڑائی اصل میں غریبوں کی پاسداری میں ہے

جو گریب پر ہِت کریں، وے رحیم بڑ لوگ
کہا سُداما باپُرو، کرشن متائی جوگ

जो गरीब पर हित करैं, वे रहीम बड़ लोग ।
कहा सुदामा बापुरो, कृष्णा मिताई जोग ॥

(۱۵) پابندیٔ وضع

رحمن رہیو جب ہی لوں، جو لوں شیل سموچ
شیل ڈھیل جب دیکھیے، تُرت کیجیے کوچ

سُداما، بھگوان کرشن کے ہم سبق تھے جو ذات کے برہمن اور نہایت غریب تھے۔ کرشن جی کے یہاں جانے پر بھگوان نے اپنے ہاتھ سے ان کے پیر دھو کر ان کو اپنے سنگھاسن پر بٹھایا تھا اور دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔

रहिमन रहिबो तबहिं लौं, जौ लौं शील समूच।
शील ढील जब देखिये, तुरत कीजिये कूच॥

ترجمہ:- رحمن جب تک عزت وحرمت قایم رہے، جبھی تک قیام کرنا مناسب ہے، جب عزت وحرمت میں کمی دیکھو فوراً کوچ کردو۔

(۱۹) جزاءُ سیئۃٍ سیئۃٌ مثلہا

کھیرا کا منہ کاٹ کے، ملئے لون لگائے
رحمن کڑوے مکھن کو چیئے یہی سجائے

खीरा का मुंह काटिके मलिये लोन लगाय।
रहिमन करुये मुखन को, चहिये यही सजाय॥

ترجمہ:- کھیرے کا منھ کاٹ اسمیں نمک پاشی کی جاتی ہے۔ اے رحمن تلخ رو لوگوں کے لئے یہی سزا مناسب ہے۔

جیوں رحیم گت دیپ کی، کل کپوت گت سوئے
بارے اُجیارو لگے، بڑھے اندھیرو ہوئے

ज्यों रहीम गति दीप की, कुल कपूत गति सोय
बारे उजियारो लगै, बढ़े अंधेरो होय॥

ترجمہ:- اے رحمن جو قطع کہ چراغ کی ہے وہی صورت نالایق لڑکے کی بھی ہے۔ اس کے جلانے سے روشنی ہوگی اور بڑھے پر یعنی اگر وہ بڑا ہوا تو تباہی اور بے عزتی کا باعث ہوگا۔

آخر میں خانخاناں کی ایک فارسی غزل مع ہندی ترجمہ ہدیۂ ناظرینِ زمانہ کی جاتی ہے۔

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است

ہے آن گنت یہ پریت کی کلپنا، پریت کا دکھ ہے اتھاہ اپار
بس یہی جانوں میں، پریت کے دکھ سے، دل ہوا گھائل اور بیمار

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار است
نگاہِ اہلِ محبت تمام سوگند است

پریت کو قول قرار نہ چھاجے، نقد نہ مول میں اس کے اُدھار
جان بھی دان میں پریت دلاوے، نین سے نین کرے بیوہار

نہ دام دانم و نے دانہ ایں قدر دانم
کہ پائے تا بہ سرت کس ہرچہ ہست دربند است

کونسا پھند ہے اس نے لگایا، کیسے کیا تن من کو شکار
سانس میں ماس پیر سے سر تک، پریت نے باندھ رکھے ہیں تار

مرا فروخت محبت ولے ندانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است؟

مجھ کو بھرے بازار میں بیچا، پریت کرے چوکھا بیوہار
پر یہ نہ جانوں کہ کس نے خریدا، دام دیئے کہ لیا ہے اُدھار

ادائے حق محبت عنایتے است زدوست
وگرنہ خاطرِ عاشق بہ ہیچ خرسند است

پریت کی لاج رکھے جو وہ پریتم، اُس کی دیا ہے، وہی مختار
یوں تو کچھ، سکھ سے ہے پریمی، یہ جیون پریتم پہ نثار

ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم
کہ اندکے بہ ادا ہائے عشق پیوند است

پریت کے بول رحیم تمہارے، چھیڑتے ہیں جیون کا تار
پریت بچن میں ہے پریت کی چھایا، سُکھ دایک، کومل، سُکمار

"زمانہ" تیس سال پہلے

زمانہ دسمبر سنہ ۱۹۰۸ء میں شمس العلما خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب کا ایک مضمون "سُدیشی تحریک کا قصّہ" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس کی آخری سطریں یہ تھیں "سُدیشی اپنے پیاروں سے کہتی ہے کہ تم مجھ سے خالی خولی باتیں مت بناؤ۔ اپنے وطن سے دلی سچی محبت رکھو مجھے اپنا معشوق دل آرام بناؤ میں ہردم تمھاری بغل میں ہوں کہ تمھارے سب رنج افلاس کو دُور کرونگی۔ اپنے حسن روح افزا کی وہ بہار دکھاؤنگی کہ تم اچھا اس فریفتگی کو بھول جاؤگے جو ہزاروں کوس دُور کی چیزوں کے ساتھ رکھتے ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم اپنے وطن سے سچی محبت رکھو میری بنیاد غلطی سے پولیٹیکل نہ رکھو۔ میری گردن میں بائے کاٹ کے چکی کا پاٹ نہ ڈالو۔ قومی محبت پر میری بنیاد قائم کرو تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ نہیں۔ سُدیشی کی تحریک کا اصلی راز قومی ترقی ہے نہ تجارتی ہے نہ پولیٹیکل۔

طائر و زاہد

(نتیجۂ فکر حضرت نجم آفندی)

فصلِ گل تھی اور صحرا بیخود و خاموش تھا
ایک چشمہ تھا جسے بہنے کا اپنے ہوش تھا
خاک کے بستر پہ سبزہ نیند میں کھویا ہوا
سبز چادر میں حسیں جیسے کوئی سویا ہوا
پھول تھے اپنی جوانی کے غرورِ ہوش میں
زندگی خاموش تھی اُس عالمِ خاموش میں
تھا بلندی پر تکبّر سرو قدِ اشجار کو
چُپ لگی تھی فکرِ کاوش میں زبانِ خار کو
اُس کا سناٹا نہ تھا فطرت کے لب پر آہ تھی
اِس فضا میں ایک زاہد کی عبادت گاہ تھی
اِس قدر تھی آرزوئے دیدِ ربانی جسے
وجہِ تخریبِ نظر تھی شکلِ انسانی جسے

سر بسجدہ فکرِ انجام جبیں سائی میں تھا
اُس کا گم گشتہ خدا جنگل کی تنہائی میں تھا

خامشی پر چھیوں کے تیر برساتا ہوا
ایک طائر آنکلتا تھا کبھی گاتا ہوا
جس کا نغمہ شغلِ زاہد میں خلل انداز تھا
اُس کی اگلی زندگی کی بازگشت آواز تھا
یاد آتی تھی بہارِ آشیاں بھولی ہوئی
ذہن کر دیتا تھا حاضر داستاں بھولی ہوئی
نغمۂ طائر سے برہم تھا نظامِ عبدیت
منتشر تھا صفحۂ دل پر پیامِ عبدیت
چھین لی اِک بے خبر نے بے خبر کی زندگی
وہم پر قربان کر دی مشت پر کی زندگی
چُپ ہوا طائر فضائے دشت تھرّانے لگی
گوشِ نامحرم میں اِک آوازِ غیب آنے لگی
دُور ہے تجھ سے بہت اُمید گاہِ عاشقی
کس اندھیرے میں ہے اے گم کردہ راہِ عاشقی
اِک نفس اُس کا مقدس تھا ریاضت سے تری
اُس کی اِک چہکار بہتر تھی عبادت سے تری

تیرا سجدہ عرش کا پایہ ہلا سکتا نہیں،
تو مجھے او بے نیازِ درد پا سکتا نہیں،

قیصر باغ کی تاراجی

از شیخ تصدق حسین بی۔ اے ایل ایل۔ بی،

قیصر باغ دو مرتبہ لٹا۔ پہلی مرتبہ چنہٹ کی لڑائی سے پہلے اور دوسری مرتبہ غدر کے بعد جب لکھنؤ پر دوبارہ انگریزوں کا تسلط ہوا اور مرزا برجیس[1] قدر اپنی والدہ حضرت محل کے ساتھ قیصر باغ کی سکونت ترک کر کے نیپال کی طرف روانہ ہو گئے۔

اول بار مسٹر گبنس رکن مالیات اودھ (H. R. Gubbins Financial Commissioner of Oudh.) کو مرزا رضا علی[2] کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ سلطان عالم واجد علی شاہ کے تعمیر کردہ قیصر باغ میں دیگر قیمتی سامان کے علاوہ نایاب و گرانبہا جواہرات بھی بافراط موجود ہیں اس لئے اگر سرکش اور باغی فوج قیصر باغ پر قابض و متصرف ہو گئی تو کل جواہرات اُس کے ہاتھ لگ جائیں گے یہ بات سر ہنری لارنس (Sir Henry Lawrance.) چیف کمشنر اودھ کے گوشگذار کی گئی تو انہوں نے میجر بنکس (Major Banks.) اور کپتان کارنیگی (Capt. Carnegie) کے سپرد یہ کام کیا کہ قیصر باغ کے جواہرات و دیگر قیمتی سامان اپنی تحت میں کر کے رزیڈنسی لے آئیں۔ مگر اس کام کا انجام دینا سر سے کنواں کھودنے کے برابر تھا کیونکہ قوی احتمال تھا کہ قیصر باغ کے محافظین حبشی خواجہ سرا، اور پہرہ دار اپنی جان پر کھیل جائیں گے اور اپنے جیتے جی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانے دیں گے، اسی دغدغا اور اندیشہ سے میجر بنکس دو توپیں۔ کچھ سکھ کچھ مسلمان اور کچھ گورہ فوج اور والنٹیر لے کر ۲۸ جون ؁۱۸۵۷ء کی دوپہر کو قیصر باغ پہونچے جب پر حبشی سپاہیوں نے جو حسام الدولہ کی ماتحتی میں در دولت کی حفاظت کے لئے تعینات تھے اُن سے کہا کہ عنقریب فیض آباد سے فوج آنے والی ہے اس کو خبر کر کے جلد بلوا لیجئے جب تک ہم انگریزی فوج کا مقابلہ کر کے اُن کو روکے رہیں گے مگر حسام الدولہ نے انہیں بر سر پیکار ہونے سے منع کر دیا چنانچہ جائزہ لینے پر نہایت قیمتی جواہرات اور بہت سی نایاب چیزیں برآمد ہوئیں جن میں ایک نہایت گرانقدر مرصع تخت شاہی بھی تھا۔ تین تاج تھے جن میں نہایت

---

[1] پسر سلطان عالم واجد علی شاہ جنکو باغیوں نے اودھ کا بادشاہ قرار دیا تھا۔

[2] یہ شاہی زمانہ میں کوتوال شہر تھے اور انگریزی عملداری ہونیکے بعد ایک بیش قرار مشاہرہ پر سرکار انگریزی کے ملازم ہو گئے تھے۔

آبدار و خوشرنگ جواہرات جڑے تھے۔ بہت سے توڑے اسپین اور وینس کی اشرفیوں کے تھے اور مختلف قسم کے ہار۔ گلوبند۔ بازوبند۔ انگشتریاں۔ انواع و اقسام کے زیورات اور بائیس صندوقچے نہایت اعلیٰ و نفیس جواہرات کے تھے جن کی لکڑی پورانی ہونے کی وجہ سے کرم خوردہ اور بوسیدہ ہو گئی تھی اور جب کوئی صندوقچہ اٹھایا جاتا تھا تو نیچے کے تختے گر پڑتے تھے اور زمین پر موتی اور جواہرات بکھر جاتے تھے۔ بڑی دقت اور پریشانی سے یہ سب سامان جس میں ہر قسم کے جواہر۔ اور قیمتی خوشنما تلواریں اور شاہی پوشاکیں وغیرہ تھیں کئی بڑے صندوقوں میں بے ترتیب تلے اوپر بھر دیا گیا اور قفل دستیاب نہ ہونے کے باعث چاروں طرف ڈوریوں سے جکڑ کے ہر گرہ پر مہر لگا دی گئی۔ اس مال میں صرف جواہرات کی قیمت کا تخمینہ اسّی لاکھ روپیہ کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد حسام الدولہ وغیرہ سے شاہی اسلحہ کا پتہ دریافت کیا گیا مگر اُن لوگوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کر کے بتانے سے انکار کر دیا۔ اِس پر حسام الدولہ۔ مفتاح الدولہ اور حشمت الدولہ کو زیر حراست کر کے گوروں کے پہرے میں علیحدہ علیحدہ بٹھایا گیا جس سے آپس میں گفتگو تک نہ کر سکتے تھے اور پہرے سے سخت پریشان تھے۔ آخر کار اسلحہ خانہ کا پتہ چل گیا اور نیزے اور بندوقیں وغیرہ سات چھکڑوں پر لاد کر ریذیڈنسی بھیجدی گئیں جب منکیس صاحب کل مال و اسباب اپنے قبضہ میں کر چکے تو تینوں اسیروں کو گوروں کے حلقہ میں چھ بجے شام کو ریذیڈنسی لے چلے۔ بیگمات شور و غل کرنے لگیں کہ ہے ہے بادشاہ کا گھر لوٹے لئے جاتے ہیں۔ منکیس صاحب نے جواب دیا ہم یہ سامان باغی فوج کی دستبرد سے بچانے کو اپنی حفاظت میں لئے جاتے ہیں۔ یہاں رکھنے میں بربادی اور غارتگری کا اندیشہ ہے۔

مفتاح الدولہ کو قید سے رہائی پانے کی کوئی توقع نہ تھی مگر جب رات ہوئی تو خلاف اُمید رہا کر دئے گئے اور صحیح سلامت گھر آ گئے۔ کل مال و متاع جو قیصر باغ سے آیا تھا ریذیڈنسی کے ایک کمرے میں رکھ دیا گیا تھا مگر محاصرہ کے زمانہ میں کئی مرتبہ چوریاں ہوئیں جنمیں زیادہ تر جواہرات اُٹھ گئے۔ عام طور سے لوگوں کو شک و شبہ بتیس نمبر کی رجمنٹ کے سپاہیوں پر تھا کیونکہ انہوں نے بہت سے مسروقہ جواہرات ہندوستانی قیدیوں کے ہاتھ بہت آزادی اور دیدہ دلیری سے فروخت کئے تھے ڈوپریٹ نامی (Dupret.) ایک فرانسیسی سوداگر نے جو ریذیڈنسی کے اندر پناہ گزیں تھا اور شراب بھی فروخت کرتا تھا ایک درجن برانڈی کی بوتلوں کے عوض قیمتی قیمتی جواہرات پائے تھے۔

دوران محاصرہ میں ایک حوض کو صاف کرانے کے لئے خالی کیا گیا تو اُس کے ایک گوشہ میں مٹھی بھر از قسم مروارید و زمرد وغیرہ بحفاظت تمام رکھے ہوئے ملے جو خزانہ شاہی میں داخل کر دئے گئے کیونکہ اس [illegible] گذاشتہ [illegible] سے پوشیدہ طور پر اڑالا یا تھا۔

۱۸ ستمبر ۵۵ء کو کل باقی ماندہ جواہرات ریذیڈنسی سے لیجا کر بیگم والی کوٹھی یعنی مسکن مس والڈیز ولایتی محل شاہ نصیر الدین حیدر مخاطب بہ خطاب نواب مخدرّہ علیا میں رکھ دئے گئے اور نومبر ۵۷ء میں جب انگریز ریذیڈنسی خالی کر کے چلے گئے تو شاہی جواہرات بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ کل بچے کھچے جواہرات جان عالم واجد علی شاہ کے حوالے کر دئے گئے جنکو فروخت کر کے انہوں نے مٹیا برج میں متعدد کوٹھیاں تعمیر کرائیں۔

قیصر باغ کی دوسری تاراجی کا سبب یہ ہوا کہ جب ۵۷ء ختم ہوگیا اور اودھ میں بغاوت کے بادل کسی طرح نہ چھٹے تو سر کالن کیمپ بیل (Sir Colin Campbell.) سرکشوں کو زیر کرنے کی نیت سے انگلستان سے کلکتہ پہونچے اور فروری ۵۸ء کے آغاز میں لکھنؤ کی طرف کوچ کیا۔ راستہ میں کچھ باغی سپاہی سدراہ ہوئے مگر ہر مرتبہ ان کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ لشکر انگریزی چندروز سلطان پور میں خیمہ زن رہا بعدہٗ دو حصّوں میں منقسم ہوکر ایک حصّہ براہ نواب گنج اور دوسرا گوسائیں گنج ہوکر لکھنؤ کے قریب پہونچا باغیوں نے ایک ہفتہ تک خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر آخر میں اُن کے قدم اُکھڑ گئے چنانچہ فوج انگریزی سمت مشرق محاذی قیصر باغ اور سمت شمال گومتی پار پہونچی اور لکھنؤ کا دو طرف سے محاصرہ کر کے باغیوں سے نبرد آزما ہوئی۔ شہر کی ہر گلی کوچے میں "گورے آئے گورے آئے" کا غلغلہ بلند ہوا۔ رعایا حیران و پریشان سر بصحرا نکل کھڑی ہوئی۔ سرکش حواس باختہ ہوئے۔ دو تین روز میں شورش پسندوں کے کل کارخانے درہم برہم ہوگئے۔ انگریزی فوج نے بادشاہ باغ پر قبضہ کر کے وہاں سے مکانات مسکونہ مرزا برجیس قدر پر گولے برسانا شروع کئے۔ جب اُس پر بھی باغیوں نے ہار نہ مانی اور مقابلہ پر ڈٹے رہے تب افسران فوج گوروں کی دو کمپنیاں لے کر دلکشا[۱] سے پہلے کوٹھی حیات بخش (موجودہ گورنمنٹ ہوس) میں آئے پھر امام باڑہ سبطین آباد مقبرہ جنت مقام حضرت امجد علی شاہ واقع حضرت گنج میں آئے۔ کچھ باغی وہاں موجود تھے اُن کو لڑ کر زیر کیا پھر وہاں سے بشیر الدولہ کے امام باڑہ ہوتے ہوئے بتاریخ ۱۶ مارچ ۵۸ء قیصر باغ کے شمال پھاٹک پر جا پہونچے اور کلہاڑوں سے پھاٹک کو توڑ کر باغ میں داخل ہوگئے اور نقرئی بارہ دری میں فتح کا پرچم گاڑ دیا۔ افسرانِ فوج بارہ دری میں کرسیوں پر بیٹھے۔ گورے باغ کی ہر روش پر ٹڈی دل کی طرح پھیل گئے۔ سکھ فوج روضہ اور مقبرہ جنت آرمگاہ نواب سعادت علی خاں سے داخل ہوئی۔ ہر طرف شور و غوغا اور لوٹ مار کا بازار گرم ہوا۔ بہت سے ملازمین شاہی نے جب یہ رنگ دیکھا تو اُن کے منھ میں بھی پانی بھر آیا اور چاہا کہ

---

[۱] ایک کوٹھی کا نام ہے جو قریب لامارٹینر کالج واقع ہے۔

بہتے دریا میں ہاتھ دھولیں۔ وہ بھی اس لوٹ میں شریک ہوگئے۔ محلات شاہی میں کہرام مچ گیا۔ اگر سپاہ اس وقت لوٹ میں منہمک نہ ہوجاتی اور کوٹھی چولکھی کے قریب فرحت افزا نامی مکان پر حملہ کردیتی تو جناب عالیہ و برجیس قدر اور دیگر لوگوں کو اسی وقت گرفتار کرلیتی۔ اتفاقاً اسی وقت خان علی خاں کئی ہزار سپاہ سے باغ میں داخل ہوگئے گوروں سے نہایت خونریز جنگ ہوئی چمن کی ہر روش خون سے لالہ زار ہوگئی ہر طرف کشتوں کے پشتے لگ گئے اور ہر قطعہ آراضی پر مقتولین کے لہو سے گلکاریاں کیں۔ گورے نیپالی سمت کرشنگی بارہ دری میں ہورہے تھے پیچھے سے مہاراجہ جنگ بہادر والی نیپال کی فوج نے آکر باڑہ ماری سیکڑوں باغی نذر اجل ہوگئے۔ آخرکار شورش پسند یہ خیال کرکے کہ جب انگریزی فوج باغ پر قابض ہوجائے گی تو چاروں طرف سے اس کا محاصرہ کرلیں گے مقابلہ سے منھ موڑ گئے مگر یہ خواب پریشان کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ خان موصوف بھی زخموں سے چور ہوگئے۔ جب میدان صاف ہوگیا تو انگریزی فوج نے دل کھول کر لوٹ مچائی اور قیصر باغ کو تہس نہس کردیا۔

اسی روز شام کے وقت بحالت بیم و یاس جناب عالیہ و برجیس قدر و دیگر صاحبات محل نے سکونت قیصر باغ ترک کردی۔ مسٹر ملیسن (Malleson.)[1] ایک انگریز افسر اس روز قیصر باغ میں موجود تھے۔ انہوں نے جو واقعات بچشم خود دیکھے تھے ان کو سپرد قلم کردیا ہے چنانچہ مندرجہ ذیل عبارت کا مواد انہیں کی انگریزی تحریر سے لیا گیا ہے۔ موصوف کا بیان ہے کہ :۔

قیصر باغ ایوانوں اور کوشکوں کا مجموعہ ہے جس کی تمام عمارتیں خوش قطع ایشیائی طرز کی بنی ہوئی ہیں ان سب عمارتوں کے ہر کمرہ میں سنہرے جگمگاتے ہوئے چوکھٹوں میں لگے ہوئے قدآدم آئینے بافراط آویزاں تھے۔ ہر کمرہ کی چھت سے بلور کے جھاڑ بھی ہر رنگ اور ہر طرز کے لٹک رہے تھے۔ سامان آرائش اور فرنیچر کے بارے میں صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ اکثر مکانوں کی حالت دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ یوروپ کے کل قدیم محلوں کا ساز و سامان یہاں لاکر جمع کردیا گیا ہے جس میں گراں بہا قالین خوش وضع و بیش قیمت کوچین بھی تھیں جن کے تکیوں کے غلافوں پر سنہرا زردوزی کام بنا ہوا تھا اور کشمیری شال کے خوشنما اور قیمتی پردے پڑے تھے۔ میز پوشوں پر بھاری کارچوبی کام بنا تھا جن کے حاشیوں پر موتیوں کی جھالر ٹنکی تھی۔ بعض کمروں میں چند تصویریں بھی لگی تھیں جن کے چوکھٹے خوشنما اور چمکدار تھے مگر غارت گروں کی دست برد سے ایک چیز بھی نہ بچی۔ جو چیزیں بندوقوں کے کندوں سنگینوں۔ اور برچھوں کی زد سے باہر تھیں ان کو گولیوں کا نشانہ بنادیا گیا یا میزوں کے پائے نکال کر وقتی طور پر ان سے کام لیا گیا۔ چھتوں سے جھاڑوں کے گرنے کی چھنا چھن کی آوازیں مسلسل

آرہی تھیں اور جب پُر جوش اور فتح و ظفر کے متوالے سپاہی دروازوں، کھڑکیوں، آئینوں
ہانڈیوں اور جھابوں کو توڑ پھوڑ کر گراتے تھے تو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے چھناکوں کی آوازیں
آتی رہتی تھیں۔

سکھ اور دیگر سپاہی لوٹ کھسوٹ میں مگن اور مدہوش تھے اور مالِ غنیمت حاصل کرنے
اور اُس کی توڑ پھوڑ میں مجنونانہ حرکات کے مرتکب ہو رہے تھے۔ جو لوگ یکبارگی اندر تک داخل
ہو سکتے تھے وہ مال کی ٹوہ میں برآمدوں میں گھومتے پھرتے تھے اور باغ کی مورتوں کی ناک۔ ٹانگ
یا بازو توڑ ڈالتے تھے یا کوٹھریوں میں گھس جاتے تھے جہاں اُن کو یا تو خلافِ اُمید کچھ گرانقدر سامان
ملجاتا تھا یا وہاں چھپے ہوئے جوشیلے اور پُر غضب سپاہیوں کے ہاتھوں خود اپنی متاعِ حیات بھی کھو
بیٹھتے تھے۔"

چونکہ یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ قیصر باغ مع زر و جواہر اور مال و اسباب آج ہی کے دن ہمارے ہاتھ
لگ جائے گا اس لئے اس اندھا دھند لوٹ مار کے تدارک کا موقع نہ مل سکا تھا ۔ بعض سپاہی
خواجہ سراؤں کی چمکدار اور فوق البھڑک پوشاکیں پاکر جو اُن کو بعض کمروں میں دستیاب ہوئی تھیں خوشی کے
رے جامہ میں نہ سماتے تھے بمشکل تمام وہ اِس بات پر رضامند ہوئے کہ لیس دار تاج اور مُورچھا کے
ماور ڈابیں اُتار ڈالیں جن سے اُنھوں نے اپنے سروں اور کاندھوں کو مزّین کیا تھا۔

تمام عمارتوں میں بہ تعداد کثیر کنکوے بھی دستیاب ہوئے جن کا اُس زمانہ میں لوگوں کو بہت
شوق تھا۔ ایک عمارت میں سارس۔ بالو بندر۔ لنگور۔ اور انواع و اقسام کے طوطے ملے جو
تعداد کثیر پنجروں میں بند تھے۔ ان سب جانوروں کو فوجی سپاہی اپنے تحت و تصرف میں لائے۔
یک بالو گینڈا بھی تھا اُس کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔

لیکن عین اس وقت جبکہ چند افسران ایک شخص کی طرف نظر جمائے دیکھ رہے تھے جو ایک خواجہ سرا کی
عجیب و غریب قسم کی پوشاک پاکر زیب جسم کئے تھا۔ محل کے ایک کمرے سے چھوٹی ہوئی بندوق کی گولی
اُن کے درمیان سے ہو کر سَن سے نکل گئی جس سے معلوم ہوا کہ یہ مقام ہنسی مذاق اور چہل بازی
کا نہیں ہے اور سب لوگ بعجلت تمام اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔

ایک دوسری عمارت میں جو چاروں طرف چار دیواری ہونے کے باعث گولیوں وغیرہ
سے محفوظ تھی بعض آدمیوں کے ہاتھ بہت سا مال لگا۔ یہ لوگ شاہی استعمال کے بعض درجوں میں
داخل ہو گئے تھے اور شالیں اور پشمینہ اور گنگا جمنی زر دوزی کام کی اشیاء اور مرواریدں

وغیرہ جو اُن کے ہاتھ لگے اُن کے حصہ بانٹ میں منہمک ہوگئے۔ اسی عمارت کے سامنے ایک گوشے میں جہاں قدرے سایہ تھا ہم لوگ دم لینے کو چلے گئے۔ اس عمارت کے اگلے حصہ میں آتش زنی ہو چکی تھی اور ہر لحظہ سرنگوں کے پھٹنے کا سخت احتمال تھا مگر اس پر بھی نوّے نمبر کی پلٹن کے دو آدمی ہمارے سامنے اس میں داخل ہو گئے اور بعدہٗ اڑتیسویں نمبر کے رسالہ کے بعض سپاہی اُن کی مدد کو پہونچ گئے۔ میں نے بچشم خود دیکھا کہ اس قدر کثیر رقم اُن کے ہاتھ لگی کہ وہ زندگی بھر کے لئے فکر معاش سے بے نیاز ہو گئے۔

اس گوشہ کے مقابل والے کمرے میں یا تو بادشاہ سلامت یا خاندان شاہی کا کوئی مالدار رکن اپنا مال اسباب رکھتا تھا کیونکہ جب سپاہی اندر داخل ہوتے تھے تو کوئی نہ کوئی بیش بہا اور بے نظیر شے لیکر ضرور نکلتے تھے۔ ایک صندوقچہ میں اُنہیں الماسی کڑوں کی جوڑی اور متفرق جواہرات مثل زمرد۔ یاقوت۔ موتی وغیرہ ملے جو بڑے قد کے ہونے کے علاوہ بہت آبدار بھی تھے مگر اتنی بدسلیقگی سے جڑے گئے تھے کہ ہم لوگوں کی نظروں میں محض شیشے کے نگینے معلوم ہوتے تھے۔
ایک دوسرے بکس میں ولایتی طرز کے طلائی مرصع کار پستول کی جوڑی ملی جس کے "پرچہ قیمت" سے جو ساتھ ہی لپٹا ہوا تھا واضح ہوا کہ شاہ اودھ کو ابھی دو سو اسّی پونڈ یعنی (چار ہزار دو سو روپے) مالک کارخانہ کو اسکی قیمت کی بابت ادا کرنا باقی ہیں۔ اس کے بعد وہ لوگ تلواروں کا ایک گٹھر لیکر نکلے جن کے دستے طلائی مرصع کار تھے جن کو زمین پر پٹخ پٹخ کر اُنھوں نے سونا اور جواہرات نکال لئے اور باقی حصہ چھوڑ دیا۔ اُس کے بعد ایک بڑی "قرعہ انبیق" نکال کر لائے جو دواسازی اور عطر سازی کے کام میں آتی ہے۔ اُس کے بعد ایک سنہرے کام کا زین پوش جس میں موتی ٹنکے تھے۔ پھر طلائی شاموں والے ہنٹر اور سنگ سلیمانی اور سنگ اسود کے مرصع کار پیالے نکال کر لائے۔ اِن گرانقدر اشیاء کے پانے والے خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے اور اتنی جلد جلد سوال کرتے تھے کہ اُن کا جواب دینا مشکل تھا۔ "دیکھئے یہ سونا ہے نا؟ آپکی رائے میں کیا یہ ہیرا نہیں ہے؟ کیا آپ کو پورا یقین ہے کہ یہ طلائے خالص ہے؟ کیا یہ سفید دانوں کی تسبیح کوئی قیمتی چیز ہے؟"
ایسے موقع پر اپنے ضمیر کی ہدایت پر عمل کرنا ایک احمقانہ فعل تھا خصوصاً ایسی حالت میں کہ انسان کی جیبیں بالکل خالی ہوں کیونکہ اس ملک میں لوٹ کی طمع میں کوئی شخص ایک جھنجھی بھی لیکر نہیں چلتا۔ ایک پختہ کار اور گرم و سرد چشیدہ افسر عجیب قسم کا طرز عمل اختیار کئے تھا

اگر کوئی دیسی سپاہی اندر جاتا اور کوئی چیز کسی تاریک گوشہ سے لیکر باہر آتا تو یہ شخص طپنچہ ہاتھ میں لیکر اس پر جھپٹ پڑتا اور تحکمانہ انداز سے کہتا۔ دیکھو خبردار اسے ہاتھ نہ لگانا۔ میں نے تو خود اس کو وہاں رکھدیا تھا۔ یہ الفاظ کچھ ایسے تیکھے تیوروں سے ادا کئے جاتے تھے کہ دوسرا شخص مرعوب ہوکر وہ چیز فوراً وہیں رکھ دیتا تھا۔ اگر وہ شے قیمتی ثابت ہوتی تو رکھ لی جاتی تھی ورنہ کسیکو بطور تحفہ دیدیجاتی تھی

ہمارے قریب ہی جاپانی ساخت کے بڑے بڑے صندوق تھے جن میں بلا مبالغہ ہزاروں پیالے اور بلور اور دیگر ظروف بھرے ہوئے تھے جنہیں سپاہی لاپروائی اور بیدردی سے ادہر اُدہر پھینک کر چکنا چور کر دیتے تھے اگر اس موقع پر باغی فوج ہم پر دفعتاً حملہ کر دیتی تو ہم اپنے سپاہیوں کی نصف تعداد کو بھی مقابلہ کے لئے یکجا نہ کر سکتے یہی حالت قیصر باغ کے ہر مکان اور ہر کوٹھی کی تھی۔

ان کارروائیوں کے دوران میں جنرل مینس فیلڈ (General Mans Field.) سالار فوج کو خبر ملی کہ کچھ مستورات قیصر باغ کے ایک نہایت مستحکم مقام میں پوشیدہ ہیں جسپر کپتان ہوپ جانسٹن (Capt. Hope Johnston.) چند افسران اور اڑتیسویں رجمنٹ کے دو دستے فوراً متعین کر دئے گئے کہ ان کو کسی محفوظ مقام میں پہونچا دیں مگر چند سپاہی مال و اسباب کی تلاش میں اُن درجوں میں قبل ہی سے دروازہ توڑ کر داخل ہو چکے تھے۔ اور قبل اس کے کہ اُن کو وہاں مستورات کی پناہ گزینی کا علم ہوا انہوں نے فوراً بندوقیں داغ دیں جس سے کسی بیگم کا تخمیناً بیس سال کا کڑیل جوان لڑکا جو گونگا اور بہرہ بھی تھا مع دو تین عورتوں کے ہلاک ہوگیا[1]

جس وقت افسران مع اپنے ہمراہی سپاہیوں کے اندر داخل ہوئے تو بیگمات اور اُن کی خادمائیں خوف و دہشت سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ سپاہی اُن کو فرشتۂ اجل معلوم ہوتے تھے وہ سب ایک دوسرے سے زور سے چمٹی ہوئی تھیں۔ افسروں کے تسلی بخش الفاظ انکو اطمینان دلشفی دلانے سے بالکل قاصر رہے۔ حالانکہ اُنھوں نے فوراً انتظام کرکے اُن کو ایک بے خطر مقام میں پہونچا دیا۔ جب یہ عورتیں نقل مکان کر رہی تھیں تو ایک عورت نے کپتان ہوپ جانسٹن سے ایک صندوقچہ کی طرف اشارہ کرکے کہا جس کو کپتان مذکور نے اُسی وقت فرش سے اُٹھاکر میز پر رکھا تھا کہ اسمیں دس لاکھ روپیہ کی مالیت کے جواہرات ہیں۔ چنانچہ اس اشارہ کے پاتے ہی انہوں نے فوراً دروازوں پر چوکیدار مقرر کرکے حکم دیدیا کہ کوئی اندر نہ جانے پائے جب سب افسروں کی ہمراہ وہ بیگمات کو مقام محفوظ دامون میں پہونچا کر واپس آئے تو آگ کے شعلے اُس درجے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھیر چلے تھے۔ چوکیداروں نے بمشکل تمام اپنی جان بچائی مگر جواہرات غائب ہو چکے تھے۔ اگر کپتان (JOHNSTON) اُن کو اپنے

[1] ملاحظہ ہو نوٹ صفحہ ۳۵۲

قبضہ میں کر لیتے تو وہ انہیں کی ملک ہو جاتے۔ کیونکہ اُس روز قیصر باغ میں خوب لوٹ کھسوٹ ہوئی اور جو چیز جس کے ہاتھ لگی وہ اُسکی ہو گئی۔
قیصر باغ کی شاہی عمارتیں جن میں قبل ازیں بجز کمشنر صاحب اودھ کے کسی دوسرے یورپین افسر نے سوائے بکار سرکار یا بسلسلہ تقریب کبھی قدم نہ رکھا ہوگا اب معمولی معمولی سپاہیوں اور فوج کے ادنےٰ ملازموں سے بھری ہوئی تھیں لوٹ اور غارت گری سے عمارتوں کی زینت بالکل جاتی رہی تھی۔ مگر گرد و پیش تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر بہت ہی دلخراش اور روح فرسا تھے چیزیں ٹوٹنے کی آوازیں سکھوں اور دیگر سپاہیوں کا شور و غوغا بہت اذیت کا باعث ہو رہا تھا۔ ہم لوگ بوقت شب اپنی قیام گاہ کو بہت دیر سے واپس ہوئے۔ سڑک پر تخمیناً بیس ہزار فوجی سپاہیوں کا جم غفیر تھا جو مال سے لدے پھندے۔ اور سر کے بوجھوں سے لڑکھڑاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ یہ نظارہ بہت ہی عجیب غریب اور بیان سے باہر تھا گویا انسانوں کا ایک بحر ذخار تھا جو اپنے سروں اور کاندھوں پر پوشاکیں آئینے۔ تصویریں۔ ظروف برنجی۔ تلواریں۔ توڑے دار بندوقیں۔ قیمتی شالیں۔ دوپٹے۔ زردوزی پوشاکیں اور دیگر ہر قسم کا مال محلات سے لوٹے ہوئے چلا جاتا تھا۔ اور سڑکوں پر اُن کا شور غل گرد و غبار۔ چیخ پکار اور جوش و خروش ناقابل برداشت تھا۔ کمانڈر انچیف سر کالن کیمپ بیل (SIR COLIN CAMP BELL) اور ان کے عملہ کے سردار اپنی اپنی قیام گاہوں میں تھے۔ اوّل الذکر کے بشرے سے اس دن کی کارروائی اور کامیابی پر بہت ہی آثار مسرت پائے جاتے تھے۔"

نوٹ صفحہ ۴۵۱ لہ اگرچہ میکس صاحب نے اس نوجوان شہزادہ کا نام نہیں تحریر کیا ہے مگر ظن غالب یہ ہے کہ یہ خسرو مرتبت دارا شوکت نوشیرواں قدر مرزا محمد حیدر علی پسر اکبر تاجدار اودھ حضرت واجد علیشاہ از بطن نواب خاص محل عالم آرا بیگم تھے اُن کی عمر تخمیناً بیس سال کی تھی مگر بد قسمتی سے مجنون اور مصروع بھی تھے جسکی وجہ سے معمولاً زیر حراست رکھے جاتے تھے اور اسی معذوری کی وجہ سے بادشاہ نے باوجود اُن کے اولاد اکبر ہونے کے اپنے پسر دوم شہزادہ مرزا محمد حامد علی کو ولیعہد قرار دیا تھا۔ باغیوں نے ۱۸۵۷ء میں بغاوت کے شعلے بلند ہونے کے بعد انکو بادشاہ بنانا چاہا تھا مگر اُن کی نانی نے جواب دیا کہ وہ عقل و خرد سے بالکل بیگانہ ہیں۔ بادشاہ بننے کی مطلقاً اہلیت اور قابلیت نہیں رکھتے۔ اس جواب کے مفہوم کو واجد علی شاہ کے ایک مصاحب خاص حضرت منیر نے نہایت خوبصورتی سے حسب ذیل نظم کیا ہے۔

چراغ رہ عقل خاموش ہے ‖ وہ اپنے سراپا سے بے ہوش ہے ‖ مگر شاہزادہ وہ مجنون ہے ‖ دل اُس کی عنایت سے ممنون ہے
ولی عہد کرتے اُسے بادشاہ ‖ جو ذی ہوش ہوتا وہ نور نگاہ ‖ کرے ہوش سے داد پاؤ گے کیا ‖ سر تخت اُس کو بٹھاؤ گے کیا

شہزادہ موصوف کی شادی بتاریخ ۲۰ فروری ۱۸۵۱ء بفرمائش حضور عالم نواب علی نقی خان وزیر اعظم بحض خوشنودی والدین کے لئے نواب خاص محل کے سگے چچا نواب اکرام الدولہ مکرم الملک حسین مرزا خان کرامت جنگ کی دختر سے بڑی دھوم دھام اور تکلفات شاہانہ سے ہوئی تھی۔ دولہن نہایت بُردبار۔ حیادار اور قبول صورت تھی مگر جب آرسی مصحف کے لئے نوشاہ اور دولہن کے اوپر زردوزی دوشالہ ڈالا گیا تو دولہن نے چیخ چلاہٹ سے آسمان سر پر اُٹھا لیا جس پر سب مہمان ہکا بکا ہو گئے اور دولہن درد و خوف سے بیہوش ہو گئی۔ وجہ یہ ہوئی کہ جب دونوں دوشالہ کے اندر نظروں سے اوجھل تھے تو فاتر العقل نوشاہ نے دولہن کی نتھ بیدردی سے نوچ کر اسکو سخت مجروح کر دیا اور زد و کوب بھی کیا اس واقعہ کے بعد دولہن رخصت نہیں کی گئی اور نہ شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کی گئی بلکہ تمام عمر دوشیزہ رہی اور اسی طرح کورے بنڈے کے ساتھ خدا کے گھر سدھاری۔

جملہ مورخین متفق البیان ہیں کہ شہزادہ موصوف نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ عظیم میں جام شہادت نوش کیا۔ مگر کسی نے طریقہ ہلاکت پر روشنی نہیں ڈالی تھی۔ میکس صاحب کے بیان سے یہ بھی معلوم ہو گیا۔ موصوف نے شہزادہ کا گونگا اور بہرہ ہونا بیان کیا ہے۔ شاید اُن کو اطلاع غلط دی گئی دراصل وہ مخبوط الحواس اور مصروع تھے۔"

حضرت عرش مرحوم

ولادت ۱۸۶۸ء وفات ۱۹۳۶ء

از سید رضا قاسم مختار پلاموں

عرش کیا ہو اعتبارِ عالم مردہ پسند میر کو بھی ناموافق تھا زمانہ میر کا

میر بہار سید ضمیر الدین احمد[1] المتخلص بہ عرش، صوبہ بہار کے اُس قدیم و معزز خاندان کے رکن تھے جو اپنے اعزاز و علمی قابلیت کی بدولت متوسلین حکومت بہار میں شمار کیا جاتا تھا۔ اور جو اطراف بغداد سے اول اول بزمانۂ شہاب الدین سہروردیؒ دہلی آیا۔ اور پھر تغیر زمانہ نے اُس کو حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدینؒ بہاری کے عہد میں صوبہ بہار میں پہونچا دیا اور آپ کے بزرگوں نے مضافات بہار شریف کے موضع شکرانواں ضلع پٹنہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

آپ کا جدی شجرۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؑ سے ملتا ہے اور ماں کی جانب سے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت سید الساجدین امام زین العابدین علی بن الحسینؑ سے وابستہ تھا۔ آپ کے نانا میر ولایت حسین مرحوم ساکن موضع فیروزی ضلع گیا سادات نجیب الطرفین تھے۔

آپ کے والد منشی میر بندہ علی[2] نے، جن کا شمار امرائے صوبہ بہار میں تھا، وکالت کی سند حاصل کر لی، تو ضلع پٹنہ کی سکونت ترک کر کے گیا چلے آئے اور یہیں مستقل طور پر محلہ پرانا گدام میں سکونت اختیار کر لی۔ جہاں سید ضمیر الدین احمد عرش ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے والدین کے سب سے چھوٹے فرزند تھے اور باوجودیکہ آپ کے دو بڑے بھائی سید امیر الدین[3] احمد اور سید نصیر الدین احمد[4] بھی موجود تھے مگر آپ کے والد آپ کو اپنی تمام

---

[1] آپ کا قد متوسط تھا۔ جسم قدرے گداز۔ کتابی چہرہ۔ رنگ گندمی۔ آنکھیں بڑی۔ مونچھیں اوسط اور داڑھی ہمیشہ منڈی رہتی تھی۔ آپ زیادہ تر عمامہ باندھا کرتے تھے۔ [2] آپ نے طویل علالت کے بعد اٹھارویں رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ کو انتقال فرمایا اور شہر گیا کے متصل بمقام دلہا اپنی کوٹھی کے احاطہ میں باغ کے شمالی گوشے میں مدفون ہوئے علاوہ پیشۂ وکالت کے آپ ریاست ٹکاری ضلع گیا میں بحیثیت مدار المہام بھی مامور رہے تھے۔ [3] آپ حضرت عرش کے بڑے بھائی تھے۔ گیا کی عدالت دیوانی میں بعہدۂ پیشکار مامور تھے شاعری کا اچھا مذاق تھا۔ امیر تخلص کرتے تھے اور لیاقت علی خاں عیش داؤد نگری یادگار مصحفی کے ارشد تلامذہ میں تھے، ۲ اپریل ۱۹۱۲ء کو انتقال کیا۔ [4] آپ حضرت عرش کے منجھلے بھائی تھے، علوم مروجہ میں اچھی مہارت رکھنے کے علاوہ ایک اچھے مقرر تھے۔ محکمۂ ریلوے میں منصرم دفتر تھے۔ بعد کو ملازمت ترک کر کے قومی کاموں میں منہمک ہو گئے تھے۔ سولہویں اپریل ۱۹۳۵ء کو انتقال کیا۔ اور شہر گیا کے محلہ کریم گنج میں مدفون ہوئے۔

اولاد میں زیادہ محبت و اُلفت کی نظر سے دیکھتے تھے اور شفقت کی بنا پر مولوی صاحب کے لقب سے یاد فرماتے تھے۔ نیز علالت کے زمانہ میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری نذر و نیاز اور کارِ خیر کی خدمتوں کو میرا یہی روشن ضمیر فرزند جس کا نام میں نے ضمیر رکھا ہے انجام دے گا۔

باپ کی تمنا تھی کہ اِس چھوٹے فرزند کی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کی جائے۔ اِس لئے مولوی عبدالکریم مرحوم تھالپوشی گیاوی جو ایک زبردست عالم تھے مستقل طور پر آپ کی تعلیم و تربیت کے لئے ملازم رکھے گئے۔ جن سے آپ نے فارسی و عربی کی بعض درسی کتابیں پڑھیں نیز مولانا محمد اسحاق[1] صاحب مغفور بدو سری گیاوی سے خطِ نسخ و نستعلیق کی اصلاح لی اور انگریزی تعلیم کے لئے گیا کے گورنمنٹ اسکول میں داخل کئے گئے۔ مگر حوصلہ مند باپ کا آپ کی صغیر سنی ہی میں انتقال ہو گیا۔ چنانچہ اس بے وقت حادثہ نے آپکو فارغ التحصیل ہونے کا موقع نہ دیا۔ باپ کے مرتے ہی خاندانی نفاق نے جائداد کا خاتمہ کر دیا اور ادبار کی تیز ہوا نے اقبال کے چراغ کو گل کر دیا۔ چنانچہ اُس وقت جب آپ کی عمر تیرہ[۱۳] یا چودہ[۱۴] سال کی تھی اپنے والد مرحوم کے وظیفہ کی کتاب اور تسبیح بطور یادگار ساتھ لے کر بحال تباہ گھر سے نکلے اور اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی توحید مرحوم کے پاس بنارس پہونچے۔ وکیل صاحب موصوف آپ سے بہ شفقت پیش آئے۔ آپ وہیں رہنے لگے اور اسی مقام پر آپ کی تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ چنانچہ بنارس کے دوران قیام میں آپ نے عربی و فارسی میں نہایت فاضلانہ قابلیت پیدا کر لی اور انگریزی کی استعداد بھی ضرورت کے مطابق حاصل کر لی۔ بنارس میں آپ کا قیام سات سال تک رہا۔ مولوی توحید مرحوم کی سعی و کوشش سے بنارس کے محکمہ رجسٹری میں آپ کو ملازمت مل گئی۔

آپ کی موزونیت طبع جو ابتدا سے اپنی جھلک دکھلایا کرتی تھی یہاں آ کر رنگ لائی چنانچہ اسی اثنا میں حُسنِ اتفاق سے ایک شخص غازی پور کے رہنے والے مقدمات کے سلسلہ میں بنارس آئے اور مولوی توحید مرحوم وکیل کے یہاں مقیم ہوئے۔ جن سے دورانِ گفتگو میں مولانا عبدالاحد صاحب شمشاد فرنگی محلی (لکھنوی) کا ذکر آ گیا۔ آپ نے انھیں کی معرفت پہلے پہل اپنی دو غزلیں حضرت شمشاد[2] کی خدمت میں اصلاح کے لئے بھیجیں جنکے

[1] آپ منگلور کالج میں عربی کے پروفیسر تھے اور شباب کے عالم ہی میں عازم حج ہو کر مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور وہیں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپکی یادگار صرف ایک لاولد دختر بحالت بیوگی موجود ہیں جنکی شادی گیا کے مشہور طبیب محمد طبیب صاحب بھائی محمد شریف صاحب مرحوم سے ہوئی تھی۔ مولانا مغفور نے اپنی جیب خاص سے شہر گیا کے محلہ معروف گنج میں ایک مسجد بنوائی تھی جو ہنوز آپکی یاد تازہ کر رہی ہے۔

[2] مولانا موصوف اس وقت مدرسہ چشمۂ رحمت کے مہتمم کی حیثیت سے غازی پور میں مقیم تھے۔

مطلعے ملاحظہ ہوں ؎

ناتواں ہوں اِس قدر رنجِ فراقِ یار میں ۔۔۔ دب کے رہ جاتا ہوں اکثر سایۂ دیوار میں

جگر میں داغ پڑ لیتا ہے تب آنسو نکلتے ہیں ۔۔۔ شجر کا قاعدہ ہے پھولنے کے بعد پھلتے ہیں

یہ وہ زمانہ تھا جب منشی امیر احمد مینائی لکھنوی، نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی، حکیم سید ضامن علی جلالؔ لکھنوی اور منشی امیر اللہ تسلیمؔ لکھنوی کا ڈنکا بج رہا تھا اور علم و تحقیق میں مولانا عبدالاحد شمشادؔ لکھنوی یادگار ناسخؔ کا کوئی جواب نہ تھا۔ رفتہ رفتہ حضرت عرشؔ کی طبیعت طرزِ ناسخؔ کی دلدادہ ہوگئی اور حضرت شمشادؔ کے فیضانِ علم نے کچھ ہی دنوں میں آپ کو کامل الفن بنا دیا۔ مگر جب آپ کا تبادلہ تحصیل کھنڈہ ضلع مرزاپور میں ہوگیا تو یہاں چند ایسے دیرینہ سال شعراء کا ساتھ ہوا جو قدیم دِلّی والوں کی یادگار تھے اور لکھنؤ والوں کے طرزِ سخن پر مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ اِن حالات نے حضرت عرشؔ کو صد درجہ ذہنی کشاکش میں مبتلا کر دیا اور آپ کو ایسے اُستاد کی جستجو ہوئی جو دہلوی رنگ سے بھی آشنا ہو، چنانچہ آپ میر مہدی مجروحؔ شاگردِ غالبؔ سے رجوعِ سخن کرنے لگے۔ مگر حضرت مجروحؔ اُس وقت مُسن و نابینا ہو چکے تھے اِس لئے خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح لینے میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر منشی امیر اللہ تسلیمؔ لکھنوی (تلمیذ نواب اصغر علی خاں نسیمؔ دہلوی یادگار مومنؔ) کی طرف رُخ کیا اور علاوہ حضرت شمشادؔ کے حضرت تسلیمؔ کے پاس بھی اصلاح کے لئے غزلیں بھیجتے رہے چنانچہ اپنی پہلی غزل جو آپ نے حضرت تسلیمؔ کے پاس اصلاح کے لئے بھیجی تھی اُس کا مطلع یہ ہے ؎

صبا بھی تھک گئی سو بار محوِ جستجو ہو کر ۔۔۔ چمن میں رنگ ہو کر ہے نہ تو گُل میں ہے بُو ہو کر

جب حضرت تسلیمؔ نے آپ کی طبیعت کے زور کو دیکھا تو ہدایت کی کہ زمانہ بدل گیا ہے زبان و بیان کو بھی بدلو، آخر کچھ دنوں بعد آپ کی طبیعت کا رنگ بدلا، اور جب آپ کی شادی فراشخانہ دہلی میں ہوگئی۔ آپکی آمد و رفت ہونے لگی تو آپ خاندان دردؔ و مومنؔ کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے اور آپ نے حضرت شمشادؔ سے اصلاح لینی ترک کر دی اور یکسو ہو کر حضرت تسلیمؔ کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔

[illegible] میں آپ کو اساتذۂ فن میر مہدی مجروحؔ اور حضرت ظہیرؔ کی صحبتوں میں بیٹھنے کا بکثرت موقع [illegible] کی انداز شاعری پر کافی جلا ہوتی رہی نیز اپنے اُستاد منشی امیر اللہ تسلیمؔ لکھنوی کے [illegible] آپ کو رامپور بھی آنا جانا پڑا جہاں حضرت امیر مینائی، داغؔ اور جلالؔ جیسے اہلِ کمال [illegible] کبھی کبھی آپ کی لکھنؤ کی آمد و رفت بھی میر خورشید علی نفیسؔ اور مرزا محمد جعفر اوجؔ [illegible] سے جاری رہی۔

[illegible] میں والئی ریاست رامپور کا دربار باکمال اہلِ فن اساتذہ کی قدردانیوں کے لئے کھلا ہوا تھا۔

غرض اُس وقت تک جب تک کہ آپ کے اُستاد حضرت تسلیم لکھنوی کی بصارت و سماعت باقی رہی، آپ اُن سے اصلاح لیتے رہے اور یہاں تک آپکی مشق سخن جاری رہی کہ آپ کا شمار صوبہ بہار کے مشہور و کہنہ مشق شعراء میں ہونے لگا۔ اور آپ ہمارے صوبہ کے اُن قادر الکلام سخنوروں میں گنے جانے لگے جنھوں نے شاعری کے ہر صنف میں اپنے جوہر کمال سے ادبی دُنیا میں اپنی شاعرانہ قابلیت کا سکہ بٹھا رکھا ہے اور آپ کی بدولت گیا کے لوگوں میں شعر و سخن کا خاصا مذاق پیدا ہوگیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

یہ تحریک کا عرشؔ تیری سبب تھا گیا میں جو اِس فن کا چرچا ہوا

نیز ہندوستان کے مختلف مقامات میں بھی آپ کے شاگردوں کی کافی تعداد موجود ہے اور جبمیں اکثر شعر و شاعری میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

شاگردوں کے کلام میں وجوہ اصلاح کا لکھنا علامہ شمشاد لکھنوی کے بعد غالباً آپ ہی کا حصہ تھا۔ ایک ایک غزل کا حاشیہ ایک چھوٹے سے رسالے سے ہرگز کم نہ ہوتا تھا اور دو ہی چار غزلوں کی اصلاح کے بعد آپکے تلامذہ باخبر ہو جاتے تھے۔

یوں تو آپ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر آپ کا رنگ تغزل خصوصاً امتیازی شان رکھتا ہے جبمیں حکیم مومن خاں دہلوی کے طرز کلام کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ہر چند آپ کا کلام کسی نئے پیام کا حامل نہ تھا۔ تاہم آپ اکثر غزلیں نیچرل رنگ میں خوب لکھتے تھے۔ دُنیا جانتی ہے کہ حکیم مومن خاں دہلوی کا مرتبہ غزل میں ثریا سے بھی بلند ہے۔ چنانچہ اسی اعتبار سے حضرت عرشؔ کی رفعت بھی مسلم ہے۔ آپ کے کلام میں بلندی تخئیل۔ تشبیہات جدید، استعارات لطیف، چُست بندش، حشو و زوائد کا نام نہیں اور درد و اثر جو شعر کی جان ہے، کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں۔ غرض جملہ محاسن شاعری علی الخصوص وہ سب چیزیں جو غزل گوئی کی جان ہیں آپ کے کلام میں پوری طرح موجود ہیں۔

غزل گوئی کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی آپ کو خاص مہارت تھی۔ منقوط و غیر منقوط تاریخ گوئی پر زبردست قابو رکھتے تھے نیز سادی تاریخیں بھی اچھی کہتے تھے۔ مرثیے کے بعض بندنے تو اساتذہ کے اشعار کو اپنا کر لیا ہے اور رباعیات میں ہو بہو میر انیس کا رنگ پایا جاتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

دانہ ترے حکم سے شجر بنتا ہے ہر ماہ میں ماہ نو قمر بنتا ہے

کیا ٹھاٹھ علیگی بحر قدرت کی عرشؔ اک قطرۂ آب جب گہر بنتا ہے

مختصر انداز بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کی شاعری کو تین دور قدیم، متوسط اور حال میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ قدیم سے مراد وہ انداز ہے جو امام الشعراء ناسخ لکھنوی، سید اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی، میر علی اوسط رشک

میر بہار سید ضمیر الدین احمد صاحب عرش
ولادت ۱۸۸۰ء وفات ۱۹۳۶ء

فیض آبادی۔ مرزا محمد رفیع سودا دہلوی وغیرہ کا تھا چنانچہ مثال کے طور پر ذیل کی سطروں میں آپ کا اس قسم کا کلام مختصراً ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ؎

کاہیدگی سے اب نہیں عالم وہ زور کا — مجھ پر گمان ہے نظر چشم مور کا
تھا خیالِ زلف مجکو صبح وصل — نور کا تڑکا شب دیجور تھا
وہ سمندر ہے ہمارے دیدۂ پرآب کا — حلقۂ گرداں ہے ہر حلقہ جہاں گرداب کا
حلقۂ زلف میں ہم نے رُخِ جاناں دیکھا — خطِ طغرا میں یہ لکھا ہوا قرآن دیکھا
عرش ہوتے عہد ناسخ میں تو ملتی داد فکر — شعر جو لکھے ہیں یہ اصرار تھا احباب کا
خدا کی یاد سے کوئے بتاں میں تم نہ باز آئے — بنارس میں بھی رہ کر عرش پابند شریعت ہو

دور متوسط میں تیر ونشتر کا زیادہ ترنگ ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

جگر کی آگ دبی کچھ تو دل کا داغ جلا — جو اک چراغ بجھا دوسرا چراغ جلا
سب کہتے ہیں دُنیا میں جسے صبح قیامت — شامِ شب ہجراں کی ہماری وہ سحر ہے
قبر پر اپنی جو دو پھول کھلے لالے کے — عشق ہے بعد فنا بھی ترے رخساروں کا
ہے خطِ سبز سے رُخسارِ فروزاں کا یہ حسن — سبز ہونا نظر آیا مجھے انگاروں کا
صرف بلبل ہی محبت میں نہیں گرم فغاں — لوٹتے دیکھتے ہیں گل کو بھی ہم خاروں پر
باغباں اُلفتِ گیسو مجھے لے آئی ہے — عشق پیچاں ہے ترے باغ کی دیواروں پر

آپ کے زمانہ حال کے کلام میں پختہ کلامی کے ساتھ سادگی زبان وتصوف کا اضافہ ہے اور خدائے سخن میر تقی میرؔ سید خواجہ میر دردؔ دہلوی اور حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی کا رنگ غالب ہے۔ چنانچہ بطور نمونہ ایک غزل کے چار شعر ذیل کی سطروں میں پیش کئے جاتے ہیں[1]

ہنسی میں اشک آجانا مسرت کی نشانی ہے — خوشی کے مارے مرجانا کمالِ شادمانی ہے
وہ سنگِ راہ مجکو جان کر ٹھکرائے جاتے ہیں — یہاں جنبش بھی مشکل ہوگئی یہ ناتوانی ہے
تیر چھالے بھرے تلووں کو یارب تو سلامت رکھ — انھیں دو چھلنیوں سے خاک اک عالم کی چھانی ہے
قریبِ صبح پیری بجھ گیا اے عرش دل ایسا — برنگ شمع کشتہ اب ہماری زندگانی ہے

اس میں شک نہیں کہ حضرت عرش تقریباً کل اساتذہ فن کی قابلیت کے معترف اور قدردان تھے

[1] ان اشعار کے علاوہ حضرت عرش کے چند اشعار جو اس مضمون کے آیندہ صفحات پر کلکتہ کے مشاعرے کے تحت درج کئے گئے ہیں، وہ بھی آپ کی حال کی شاعری کے نمونے ہیں۔

جس کا ثبوت آپکی متفرق غزلوں کے مندرجہ ذیل مقطعوں سے ملتا ہے سہ

پیرو برائے نام ہوئے عرش سیکڑوں — لیکن نہ شعر کہہ سکے وہ میر کی طرح

یہ فیض حضرت تسلیم ہے عرش — کہ شہرہ آج ہے مجھ بے ہنر کا

غالب و مومن میں جانیں کیا سخندانی تھی عرش — جس میں پائی کچھ سخن فہمی سخنداں کردیا

شعر مضموں زا نہ کیوں لکھوں میں عرش — ناسخ مغفور کا دستور تھا

حضرت درد کی یہ روح کا ہی فیض کہ عرش — تو بھی اس دور میں مست مئے عرفاں نکلا

اس زمیں میں اور بھی کچھ گل کھلاتا عرش میں — دم بخود ہوں روئے شمشاد سخنداں دیکھ کر

زمانے سے گئے تسلیم و مجروح — زبس باقی یہی دو نکتہ داں تھے

لیکن آپ میر تقی میر کے بجید مداح تھے اور خدائے سخن کا انداز سخن اسقدر پسند تھا کہ آپ نے اسی عقیدت کی بناپر بطور یادگار میر تقی میر کے خلف الرشید حضرت عرش کے تخلص کو اپنے لئے پسند فرمایا تھا خصوصیت کیساتھ تقلید میر میں آپ نے زبردست کوشش کی اور اُن کے کلام کا ایسا چربا اُتارا کہ ۱۹۱۵ء میں اوّل اوّل فاضل مدیر مخزن لاہور نے اور بعدہٗ ملک کے دیگر مبصر رسائل نے آپ کو میر بہار تسلیم کرلیا۔ چنانچہ ذیل کی سطروں میں آپکا ایک قطعہ اور چند اشعار جن سے میر کا انداز ٹپکتا ہے پیش کئے جاتے ہیں سہ قطعہ

گذرگاہ میں میر کی اے صبا — گذر ہو، تو کہنا ہمارا سلام

یہ کہنا دعا میری خاطر کریں — میں ہوں مقتدی اور وہ ہیں امام

اگر التجا ہے تو یہ التجا — ہو مقبول عالم میں میرا کلام

وہ بحر غم کی طغیانی وہ کالی رات فرقت کی — وہ پیہم ڈوبنا اپنا وہ اکثر پار اُتر جانا

آنکھوں میں اشک اور گریباں دریدہ تھا — دیکھا تھا ہم نے عرش کو آفت رسیدہ تھا

جوانی میں اے عرش کیوں جان دی — سر شام موقع نہ تھا خواب کا

ترے فراق میں یوں دل کا داغ جلتا ہے — کہ جیسے طاق میں شب کو چراغ جلتا ہے

جگر کی آگ سے دل اور دماغ جلتا ہے — چراغ ہی سے ہمیشہ چراغ جلتا ہے

ترے غم میں عمر ساری میری جاں تمام کردی — ہوئی صبح جس جگہ پر وہیں رو کے شام کردی

جب تک آپ کے پھوپھی زاد بھائی مولوی توحید وکیل زندہ رہے آپ تحصیل کنڈہ ضلع پرتاپگڈھ کی ملازمت کو وابستہ رہے اور جب وکیل صاحب مذکور کا انتقال ہوگیا تو آپ اپنی والدہ کے اصرار سے مجبور ہوکر وہاں کی ملازمت ترک کرکے گیا چلے آئے اور یہاں آکر ایسٹ انڈین ریلوے کمپنی میں ملازمت کرلی، مگر اس ملازمت کی مصروفیت

کے باوجود آپ کی عالمانہ و فاضلانہ قابلیت آپ کو ادبی و قومی خدمت پر مجبور کئے رہتی تھی۔ چنانچہ آپ کے افکار عالیہ اکثر و بیشتر ملک کے مقتدر اردو رسائل مثلاً مخزن لاہور۔ ادیب الہ آباد، زمانہ کانپور، مکتبہ حیدرآباد، ندیم گیا اور علیگڑھ میگزین وغیرہ میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کرتے رہتے تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ کے لئے "بہار سخن" کی ادارت بھی ایک ذمہ وار ایڈیٹر کی حیثیت سے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کی تھی اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ صاحب تصنیف و تالیف بھی تھے۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کر کے زبان اور قوم کی جو خدمت کی ہے وہ یقیناً ہندوستان کی ادبی تاریخ میں آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور آپ کا یہ کارنامہ ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے، چنانچہ آپ کی تصانیف کا مفصل ذکر سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس سے آپکی شاعرانہ قابلیت کے ساتھ ساتھ قارئین کرام کو آپ کی فاضلانہ نثر نگاری کا بھی کافی طور پر اندازہ ہو جائے گا۔

تصنیفات و تالیفات حضرت عرش:۔

(۱) فکرِ عرش۔ آپ نے یہ اپنا پہلا دیوان داغ کے رنگ میں لکھا تھا مگر یہ زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔

(۲) کلیاتِ عرش موسوم بہ نظم نو نگار۔ جمیع اصناف سخن کے ساتھ حضرت تسلیم کے رنگ میں، جب آپ نے اپنا یہ کلیات ترتیب دیا تو لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ نے نہایت قیمتی رائیں لکھیں، جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے مستند اہل فن حضرات نے آپ کو اہلِ زبان تسلیم کر لیا تھا[1]۔

(۳) کیسۂ جواہر۔ اس مختصر مجموعے میں آپ کی اکثر نظمیں مدحت الٰہی میں ہیں اور کچھ عاشقانہ غزلیں بھی ہیں اور کچھ مختلف اشعار میر تقی میر کے انداز کے ہیں۔

(۴) ثمر نافرمانی۔ یہ ایک اخلاقی ناول ہے جو ایک دوست کی فرمائش پر صرف دو راتوں میں لکھا گیا اور لکھنؤ کے نامی تاجر محمد عبد اللہ کے اہتمام سے چھپا۔

(۵) حیاتِ تسلیم[2]۔ یہ کتاب آپ کے اُستاد منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کی سوانح حیات ہے جو اول اول لاہور میں محمد الدین فوق ایڈیٹر کشمیری میگزین کے اہتمام سے چھپی تھی۔

(۶) حیاتِ جاودانی۔ جب بیگم باشی منشی نوبت رائے نظر لکھنوی فاضل مدیر رسالہ ادیب الہ آباد نے اپنے مجلہ ادیبہ

---

[1] کلیات عرش صفحہ ۲۲۳ پر میر خورشید علی نفیس مرحوم خلف میر ببر علی انیس مرحوم لکھتے ہیں کہ "یہ تصنیف اس مرتبہ کی ہے جس کو دیکھ کر مصنف کو کوئی باشندہ پورب نہ کہیگا بلکہ شبہ بھی نہ کریگا" صفحہ ۲۲۴ پر میر ناصر علی نذیر فراق مرحوم دہلوی لکھتے ہیں کہ "میر بہادر مولانا عرش تسلیم! آپکی زبان دہلی کے فصحا کی زبان ہے" اور پھر اسی صفحے پر مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی یوں ارقام فرماتے ہیں کہ آپ کے خط اور دیوان کی جو زبان ہے اگر یہی زبان صوبۂ بہار اور بنگال میں بولی جاتی ہے تو دہلی اور لکھنؤ والوں کو ذرا سوچ سمجھ کر زبان دانی کا دعویٰ کرنا چاہیئے۔

[2] حضرت عرش نے جب یہ کتاب لکھ کر منشی سجاد حسین مرحوم مدیر اودھ پنچ جیسے زبان داں کے پاس بھیجی تو منشی صاحب مرحوم نے اس پر یہ لکھا کہ "آپ کی یہ کتاب زبان کے لحاظ سے آزاد کی آب حیات کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے"۔

میں منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی کا تذکرہ شائع کرنا چاہا تو اس کام کے لئے حضرت عرش ہی کا انتخاب کیا چنانچہ کچھ دنوں بعد آپ نے تذکرہ سابق یعنی "حیات تسلیم" میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کے ساتھ "حیات جاودانی" کے نام سے اُس کو دوبارہ مرتب کیا جس کو آپ کے اُستاد بھائی مولانا حسرت موہانی نے اپنے اہتمام سے علیگڈھ میں چھپایا۔

(۷) بارگاہِ سلطانی۔ حضرت عرش کی یہ تصنیف "آثار الصنادید" مصنفہ سر سید احمد خاں مرحوم کے انداز کی تاریخ ہے جسمیں دہلی و آگرہ کے آثار قدیمہ و جدیدہ کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اس کے کچھ حصے رسالہ مخزن اور ادیب الہ آباد میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۸) رسالہ عروض و قوافی۔ آپ کی یہ تصنیف "بارۂ عروض" مولفہ مرزا حاتم علی مہر شاگرد ناسخ کے انداز کی ایک عام فہم کتاب ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ پڑی ہے۔

(۹) عرش اللغات۔ یہ اُردو محاوروں کا لغت ہے جسمیں مستند اساتذہ کے اشعار اور اُن کی تاریخی حالت مندرج ہے۔ شمس العلماء خاں بہادر مولانا محمد یوسف صاحب جعفری المتخلص بہ رنجور عظیم آبادی چیف مولوی، بورڈ آف ایگزامنرس کلکتہ نے حضرت عرش کی اِس تصنیف کو طبع کرانا چاہا تھا مگر افسوس اُن کی زندگی نے وفا نہ کی اور کئی ہزار محاورات کا یہ ادبی سرمایہ ناقدردانیوں کے باعث غیر مطبوعہ رہ گیا۔

(۱۰) حیات مومن۔ حضرت عرش کی یہ تصنیف بہت بلند پایہ ہے۔ اِس کتاب میں آپ نے واقعات خاندانی کو جمع کرکے مومن کی ڈوبی ہوئی کشتی کو دریائے گمنامی سے نکالا ہے۔ پچیس۲۵ سال کی مسلسل تحقیق اور کاوشوں کے بعد آپ نے یہ کتاب لکھی تو معزز اجمل خانی خاندان نے آپ کی اِس تصنیف کو درجۂ قبولیت بخشا نیز ملک کے دیگر اہلِ نظر حضرات نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

صحت زبان کا آپ کو بیحد خیال تھا اور باوجود اس کے کہ آپ ایک تو پورب کے رہنے والے تھے اُس پر مزید طرہ یہ کہ ایسے محکمہ سے وابستۂ ملازمت رہے جہاں مختلف دیار و امصار اور مختلف لوگوں کو بات چیت کرنے کا سابقہ پڑتا تھا جہاں بڑے بڑے اہلِ زبان ایسے ماحول میں رہنے کی وجہ سے یہاں کی فضا سے متاثر ہو کر ایک خاص قسم کی بگڑی ہوئی بنگالی و انگریزی نما ولایتی زبان جس کو "ریل کی اردو" کہا جا سکتا ہے بغیر سمجھے بوجھے بہ شوق بولنے لگتے ہیں مگر وے اسٹاف اور آنے جانیوالے مسافروں کا ماحول حضرت عرش کی زبان پر کوئی اثر ڈال نہ سکا بلکہ آپ اپنی زبان کو اساتذہ لکھنؤ اور دہلی کا سا بنانے میں کوشاں رہے اور بڑی حد تک اسمیں کامیابی بھی حاصل کی، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ہر چند لکھنوی ہوں نہ میں دہلوی ہوں عرش — گرویدہ پھر بھی خلق ہے میری زبان پر

اے عرش روحِ حضرتِ مومن کا فیض دیکھ — پورب میں رہ کے پائی زباں تخت گاہ کی

ہیں گرچہ اِس بہار میں اُستادِ فن بہت　　راسخ سے ملتی جلتی ہے زباں میری

آپ کے کلام وخصوصاً طرزِ ادا کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ آپ کو دور و دراز مقامات سے معرکتہ الآرا مشاعروں میں شرکت کے لئے دعوت نامے وصول ہوا کرتے تھے، جن کے مفصل حالات بخوف طوالت نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ البتہ صرف دو صحبتوں کا حال نہایت مختصر الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے، جس سے آپکی شاعرانہ قادر الکلامی کا راز بہر طور عیاں ہو جائے گا۔

(۱) یوں تو آپ اکثر اپنے اُستاد حضرت تسلیم لکھنوی کی ملاقات کو رامپور جایا کرتے تھے لیکن خُلد آشیان نواب سر حامد علی خاں بہادر والئی ریاست رامپور کے عہد میں ایک دفعہ ایسے وقت میں آپ رامپور پہونچے جبکہ چند ہی روز پہلے حضرت تسلیم کا وصال ہوچکا تھا۔ اور مرحوم کے صاحبزادے منشی تجمل حسین رامپور ہی میں مقیم تھے رامپور پہونچکر حضرت عرش اپنے مغفور اُستاد کے شاگرد رسید حاجی محمد اسمٰعیل خاں صبر رامپوری (معروف بہ بلبلِ تسلیم) کے مہمان ہوئے اور عرصہ تک وہیں ٹھہرے۔ رفتہ رفتہ آپ کے افکار عالیہ کا رامپور میں بڑا غلغلہ ہوا اور معتمدینِ ریاست نے آپ کی قدر افزائی کی، آخر میں چند پُر آشوب حضرات نے تسلیم مرحوم کی جانشینی کے مسئلے کو حل کرنا چاہا اور میجر جنرل ریاست رامپور کے دولتکدہ پر ایک زبردست مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں بہتیرے نامور شعرا، علما، فضلا، معزز اراکین ریاست اور مُدیرانِ اخبار و رسائل سبھی موجود تھے۔ چنانچہ بمقابلہ دیگر شاگردانِ تسلیم حضرت عرش ہی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر جب دستارِ جانشینی آپ کے سامنے لائی گئی تو آپنے نہایت مؤدب و مہذب طریقے پر یہ کہکر انکار کر دیا کہ "ان باتوں سے نفس میں رعونت اور بھائیوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ میں جانشینی کا قائل نہیں ہوں، حصولِ کمال چاہیئے جس کا فیصلہ وقت اور ملک خود کر لیگا۔"
چنانچہ اسی امتحانی مشاعرے کے متعلق آپ فرماتے ہیں ؎

خدا نے بزمِ دشمن میں ہماری آبرو رکھ لی　　وہاں کا معرکہ بھی عرش جا کر آج مار آئے

(۲) بورڈ آف اگزامنرس کلکتہ کے چیف مولوی شمس العلما مولانا محمد یوسف صاحب جعفری المتخلص بہ رنجور عظیم آبادی مرحوم کسی ضرورت سے گیا آئے تھے تو مولانا موصوف نے آپ کو کلکتہ میں شرکتِ مشاعرہ کی دعوت دی جسمیں یہ طرح قرار دی گئی تھی ؎

جنابِ عرش گیا سے یہاں ہیں آئے ہوئے

غرض آپ کلکتہ تشریف لے گئے اور مولانا رنجور عظیم آبادی کے مہمان ہوئے اور کلکتہ کے ہے مشہور شہر میں مشاعرہ منعقد ہوا جسمیں مختلف مقامات کے کثیر التعداد شعرا کے علاوہ مقامی اساتذہ میں حضرت رغب، وحشت ڈاکٹر ایت اللہ بسمل اور پیر صد سالہ نواب مجھلے حضور المتخلص بہ مہر والئی مرشد آباد بھی شریک تھے۔ چنانچہ حضرت مہر

کا مندرجہ ذیل شعر کلکتہ کی ادبی تاریخ میں آبِ زر سے لکھا ہوا اب تک اِس مشاعرہ کی یاد تازہ کر رہا ہے ؎

جناب عرشؔ گیا سے یہاں ہیں آئے ہوئے ۔۔۔ نہ آج عرش پر کیوں ہو دماغ کلکتہ

کجا بود مرکب کجا تاختم، کلکتہ کے اِس مشاعرے کے متعلق حضرت عرشؔ کا ذکر کرتے کرتے جناب مہرؔ وائی مرشدآبادی کی شاعری کا نمونہ بھی پیش کر دینا پڑا، بہرحال کلکتہ کے اِس مشہور مشاعرے میں حضرت عرشؔ نے جو غزلیں پڑھیں تھیں اُن میں سے بعض غزلوں کے مطلعے اور مقطعے ملاحظہ ہوں[1]۔

حجاب کس کا ہے آخر دُلہن بنائے ہوئے ۔۔۔ ہے بوجو غنچوں کی گھونگھٹ میں مُنہ چھپائے ہوئے

کرو نہ جوہرِ ذاتی کو عرشؔ ظاہر تم ۔۔۔ زمین اپنے خزانوں کو ہے چھپائے ہوئے

وہ لوگ منزلِ پیری میں ہیں جو آئے ہوئے ۔۔۔ خیال قبر میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

جناب عرشؔ کو کس مستِ ناز کا ہے خیال ۔۔۔ کہ آج جھوم رہے ہیں وہ سر جھکائے ہوئے

فراق میں ہیں ہم اندازِ دل کا پائے ہوئے ۔۔۔ یہ وہ چراغ ہے جلتا ہے بے جلائے ہوئے

اگر ہو سوز تو اے عرشؔ دل کو روشن کر ۔۔۔ چراغ جل نہیں سکتا ہے بے جلائے ہوئے

لحد میں جو ترے بیکس ہیں مر کے آئے ہوئے ۔۔۔ کفن ہے سینہ سے اپنے انھیں لگائے ہوئے

جناب عرشؔ زمانہ کے بعد کلکتے ۔۔۔ گیا سے آئے ہیں رنجورؔ کے بلائے ہوئے

قبل اِس کے کہ حضرت عرشؔ کی شاعری کے بیان کو ختم کر کے آپ کے دوسرے حالات حوالہ قلم کئے جائیں اتنا عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ حضرت عرشؔ کا اشعار پڑھنا اور وقتی تصویر کھینچنا خاندانِ میر انیسؔ سے بہت کچھ مشابہ تھا اور باوجود ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے آپ اپنی شعرگوئی پر کبھی فخر نہ کرتے تھے جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

اے عرشؔ مرا کلام کیا ہے ۔۔۔ لوگوں کی ہے صرف قدردانی

علاوہ علمی و ادبی ذوق کے آپ کو ستار نوازی کا بھی عشق تھا۔ اگرچہ اسکی مشق آپ ہمیشہ تخلیہ ہی میں کرتے تھے تاہم اِس فن میں بھی آپ کو قابل لحاظ دستگاہ حاصل ہو گئی تھی۔ آپ نے اس کو لکھنؤ کے مشہور ستار نواز اور سرود کے مشہور اُستاد باسط خاں اور حیدر خاں کے کہنہ مشق شاگردوں سے حاصل کیا تھا۔

آپ کی طبیعت نہایت غیور، دیر آشنا اور فقیر منش واقع ہوئی تھی، جھوٹی خوشامد اور جاہ پرستی سے آپکو خلقی نفرت تھی، امیروں اور رئیسوں کی قصیدہ گوئی کو آپ بدترین گناہ سمجھتے تھے۔ فاقوں پر بھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز کرنا آپ کے خیال میں کفر تھا اور میر تقی میرؔ کی طرح بے محل ٹوک ٹاک کو ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

---

[1] یہ کل اشعار جو کلکتہ کے مشہور مشاعرے میں پڑھے گئے تھے حضرت عرشؔ کے دورِ حالیہ کی شاعری کے نمونہ ہیں۔

ہر چند آپ کا مزاج ظریف واقع ہوا تھا۔ جس کا کافی ثبوت منشی سجاد حسین مرحوم اور سورگ باشی پنڈت رتن ناتھ سرشار کے زمانہ کے اودھ پنچ میں ملتا ہے مگر حوادثِ زمانہ کا اثر پڑتے پڑتے آخر عمر میں آپ میں وہ زندہ دلی باقی نہ رہی تھی۔ نفاست وارشاد میں آپ ثانی مرزا شمش الدین مظہر جانجاناں تھے، اپنے کمرے بلکہ سارے گھر میں کوئی چیز بھی بے قرینہ رکھی ہوئی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے اور دورانِ درود وظائف تک میں ایک تنکے کو بھی سامنے پڑا ہوا دیکھنا گوارا نہیں تھا۔ جانماز سے اُٹھ اُٹھ کر اس کو پھینکتے اور دوبارہ سہ بارہ اور اور تعقیبات شروع کرتے۔ طہارت اور کپڑوں کی صفائی کے بھی نہایت دلدادہ تھے۔ آپ مذہباً حنفی تھے، اور آپ کا مسلک درویشانہ و فقیرانہ تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جامہ ملا جو فقیر کا اے عرش فخر کر — سارے لباس سے تر اترھکر لباس ہے

مزاراتِ صوفیائے کرام سے ازلی دلچسپی تھی۔ ہمیشہ اجمیر شریف جایا کرتے اور پیرانِ کلیر شریف کے مزار پر تنہا راتیں گذارا کرتے۔ چنانچہ آپ کی ریلوے کی ملازمت سے وابستگی کا یہی راز تھا کہ ہر سال بے شمار راہ داری آپ کو ملا کرتا تھا اور اِس ذریعہ سے آپ اولیائے عظام وصوفیائے کرام کے مزارات پر برابر پہنچا کرتے تھے۔

آپ کی کئی شادیاں ہوئی تھیں مگر ہر دفعہ آپ کی شریکِ زندگی کی اختصارِ حیات نے آپ کے گھر کو ویران کر دیا۔ جس سے آپکی زندگی کا آخری حصہ نہایت تلخ ہوگیا تھا جیسا کہ آپ کے مندرجہ ذیل شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

ہمارے خانۂ دل میں ہے جیسا کچھ کہ سناٹا — زیادہ اس سے کیا ویرانِ مجنوں کا مکاں ہوگیا

آپ کی پہلی شادی مولوی سید وزیر علی مرحوم گیاوی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے آپکا ایک لڑکا مسمیٰ سید جلال الدین احمد تھا جو کہ نہایت صغیر سنی کے عالم میں معصوم ہی دُنیا سے گذر گیا۔ بعدہٗ آپکی زوجہ موصوفہ نے بعارضہ طاعون ۱۳۲۲ھ انتقال فرمایا۔ آپ کی دوسری شادی ڈاکٹر مرزا اسمٰعیل بیگ دہلوی ابن مرزا عبداللہ بیگ دہلوی کی دختر سے ہوئی، جو دق کے سے مہلک مرض میں مبتلا ہو کر ضلع پلاموں میں بہ عالمِ جوانی ۱۹۱۲ء میں اِس جہانِ فانی سے رحلت کر گئیں۔ ان معظمہ کی یادگار آپ کے ایک فرزند مسمیٰ سید صلاح الدین احمد صاحب عروج[1] ہیں جو بہر طور اپنے پدر بزرگوار کے نقشِ قدم پر گامزن رہ کر اِسوقت

---

[1] آپ کے کمالاتِ سخن کے نمونے ملک کے اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں نیز ایک مجموعۂ کلام "بہارستانِ عروج" کے نام سے مدینہ پریس بجنور میں طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ یہاں پر بطور نمونہ آپ کے صرف دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

بظاہر شیشۂ دل گو نہاں معلوم ہوتا ہے — مگر اس جامِ جم میں اک جہاں معلوم ہوتا ہے
روش پر باغ کے تنکے کہاں سے اِسقدر آئے — ارے یہ تو ہمارا آشیاں معلوم ہوتا ہے

گیا کے محکمۂ آبکاری میں برسر ملازمت ہیں۔

حضرت عرشؔ کی ایک اور شریک زندگی آبرالنسا بیگم نامی تھیں جن کے ساتھ آپ کو سچا عشق تھا اور جنکی تمنا میں آپ نے بہترے مصائب اٹھائے تھے۔ چنانچہ آپ کے مجازی جذبات جو آپ کے دیوان میں نظر آتے تھے۔ اُن میں بڑا حصّہ آپ کی اسی محبت و عشق کا ہے جو آپ کو اپنی اس زوجہ سے تھا۔ جس کا ثبوت خود آپ کے اِس شعر سے ملتا ہے ؎

اے عرشؔ مجھکو عشق نے بخشا یہ مرتبہ　　دیکھو ہے نظمِ غیر میں ایسا اثر کہاں

حضرت عشق نے شادی کی تھی اور محبت کے قاضی نے عقد پڑھا تھا۔ لیکن شومئ قسمت کو کیا کیجئے کہ جب موصوفہ آپ کے عقد میں آئیں تو صرف ایک سال رشتۂ حیات باقی تھا، مناکحت کے بعد مشکل سے چھ مہینے تندرست رہیں اُس کے بعد دق کے عارضہ میں مبتلا ہو کر پندرہویں اکتوبر ۱۹۲۲ء کو ناشاد و نامراد اِس دُنیائے رنگ و بو سے عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گئیں۔

آپ کی ایک زوجہ حکیم امیر الدین ساکن شہر گیا محلہ مرار پور کی صاحبزادی تھیں۔

آپ کی ایک اہلیہ سید امیر حسین خاں مرحوم رئیس موضع جموآں ضلع پٹنہ کی لڑکی تھیں جنکی یادگار آپکے چھوٹے صاحبزادے سید شہاب الدین احمد ہیں جو ننہال میں رہتے ہیں۔

حضرت عرشؔ کو اول اول سلسلۂ قادریہ سے تعلق تھا لیکن بعد کو شوقِ سماع نے خاندانِ چشت سے توسل حاصل کرنے کا خیال پیدا کر دیا۔ اور تب آپ نے حضرت حفیظ شاہ رحمانی وارثی مرحوم سے ارشاد حاصل کر لیا اور اب خاندانِ چشت میں داخل ہونے کے سبب مجالس سماع کا ذوق بحد بڑھا۔ مستقل طور پر قوال نوکر رکھے گئے اور فرصت کے اوقات کے علاوہ بیشتر راتیں اسی جوش و سرود میں بسر ہونے لگیں مگر کچھ دنوں کے بعد شاہ صاحب موصوف کی روحانی تعلیم نے آپ پر وہ اثر ڈالا کہ آپ ریلوے کی ملازمت سے علیحدہ ہو کر اپنی زندگی کا بقیہ حصہ زیادہ تر یادِ الٰہی درود و وظائف اور مشائخ کی صحبتوں میں گذارا کرتے، یہاں تک کہ کثرت ریاضت کے باعث دورۂ قلب و ضعف دماغ کی شکایت پیدا ہو گئی۔ مگر اس پر بھی مشاغل میں فرق نہ آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ دورانِ سر کئی کئی روز تکئے سے سر اٹھانے نہیں دیتا تھا تاہم ایسی حالت میں بھی آپ کی ہمہ دم یہی خواہش تھی کہ جس طرح ہو غالب کی طرح مومنؔ کے مزار کی تعمیر ہو جائے اور جس کیلئے موت سے چند ماہ پیشتر تک آپ نے دہلی کا سفر اختیار کر کے اس کے متعلق بے انتہا کوشش کی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے متعلق بہت کچھ مالی قربانی بھی کی تھی۔

دوسری آرزو آپ کی یہ تھی کہ علامہ شمشاد لکھنوی مرحوم کے مکمل سوانح حیات کتابی صورت میں قلم بند فرما کر

تشنگانِ علم وادب کو علامہ ممدوح کے علم وفضل اور شاعرانہ کمالات سے روشناس کرایا جائے اور جس کے لئے آپ بہت کچھ مسالہ فراہم کر چکے تھے لیکن افسوس کہ آپ کی یہ دلی تمنائیں پوری نہ ہوسکیں اور بمصداق ؎

ابھی جام عمر بھرا نہ تھا کفِ دستِ ساقی چھلک پڑا
رہی دل کی دل ہی میں حسرتیں کہ نشاں قضا نے مٹا دیا

چنانچہ تیرھویں جولائی ۱۹۳۶ء بروز دوشنبہ نو بجے دن کو جبکہ آپ گیا ہی میں تھے دفعتاً حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث آپ کا مُرغ روح قفسِ عنصری کو چھوڑ کر عالمِ بالا کو پرواز کر گیا۔ اور دُنیائے ادب کو سوگوار چھوڑ گیا۔ یہاں پر آپ کا ایک شعر ملاحظہ ہو جو شاید اسی موقع کے لئے کہا گیا تھا ؎

ہمارے جامۂ ہستی کو اک دن چاک ہونا تھا
ہوئے تھے خاک سے پیدا ہمیں پھر خاک ہونا تھا

کاش آپ کچھ دنوں اور زندہ رہے ہوتے تو مزار مومن یقینی طور پر تعمیر پذیر ہو کر اس وقت زیارت گاہ خاص وعام بنا رہتا اور علامہ شمشاد کے مفصل حالات وکمالات بھی منظر عام پر آگئے ہوتے۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

جذباتِ ضیا

(از حضرت ضیا فتح آبادی)

فکرِ مآلِ رنگ و بو دامنِ لالہ زار میں
ذکرِ خزاں فضول ہے موسمِ نوبہار میں

تیرا جمال محوِ رقص وادی و کوہسار میں
میرا جلال موجزن نغمۂ آبشار میں

میں نے اُسی کے سامنے عشق کا راز کہہ دیا
مجھ سے یہ بھول ہو گئی عالمِ اضطرار میں

چھایا ہوا ہے اِک سکوت محشر کائنات پر
عشق ہے انتظار میں حُسن ہے انتظار میں

جس نے سمجھ لیا کہ زیست نام ہے اضطراب کا
اُس کو سکون مل گیا گردشِ روزگار میں

آخر کار یاس نے عقل کو یہ دیا فریب
زیست پر اپنا بس نہیں موت ہے اختیار میں

منزلِ زیست ہے ضیا دُور اگر، ہوا کرے
دوست کا نقشِ پا لئے بیٹھا ہوں رہگذار میں

کلامِ فراق

(از حضرت فراق گورکھپوری ایم اے)

یاد ہیں بزمِ ازل کے دورِ جامِ بیخودی
کیا ہوئی اے آسماں ساقی کی وہ دریا دلی

یاد ہے چشمِ کرم کا دل سے پھرنا یاد ہے
حسن کو کچھ رنج بھی تھا عشق کو حیرت نہ تھی

تیرہ بختی عشق کی مٹ کر ہوئی شامِ ابد
وہ بقائے زندگانی بھی فنا شایستہ تھی

انقلاب آیا تو یوں آیا نگاہِ یار میں
کچھ مروت میں اضافہ کچھ محبت میں کمی

اب تو کچھ مجبوریوں کا بھی لگا رہنے خیال
یاد آیا مے کہ کر گزرے جو دل میں ٹھان لی

آج زندانِ دو عالم کا پتہ ہوتا نہیں،
کیا کریں پابندِ الفت، بندگی بیچارگی

تو نگاہِ یار و دورِ چرخ کے دھوکے میں ہے
تو نے جانی ہی نہیں ہے عشق کی بدقسمتی

آپ اپنی ضد ہے گویا اختلاطِ حسن و عشق
دوستی کی دوستی ہے دشمنی کی دشمنی

تو ہی اے دل ایک عالم کو پیامِ کفر دے
تو نے دیکھا بھی ہے اِن آنکھوں کا سحرِ سامری

دیکھئے کب شامِ نظمِ زندگی کی صبح ہو
آسمانوں کو بھی جیسے آ رہی ہو نیند سی

پھر جمودِ روزگار انگڑائیاں لینے لگا
موت نے شاید نوائے زندگی پھر چھیڑ دی

ہے ابد بھی عشق کی جاتی ہوئی دنیا کا نام
ٹوٹتا جاتا ہے پے در پے خمارِ زندگی

وجد میں شعلے جہنم کے بھی ہیں اب تو فراق
یہ فرشتوں کے بھی نغموں میں کہاں تاثیر تھی

کہیں مٹانے سے مٹ سکی ہیں نشانیاں کشتگانِ غم کی،
طلسم اندر طلسم ہوگا ۔ مزار اندر مزار ہوگا

نہ جانیں کس کے گدازِ دل کی بہارِ گلشن بھی منتظر تھی
کسے خبر تھی کہ اشکِ شبنم گلوں کا آئینہ دار ہوگا۔

فراق

چکبست کی شاعری میں وفا کا تخیل

از مسٹر گوبند پرشاد مسوی ایم۔اے فائنل

قبل اس کے کہ چکبست کی شاعری کا جائزہ لیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کیجائے کہ اُن کے خیال میں "وفا" کا مفہوم کیا ہے اور اس کا اخلاقی خوبیوں کے ذیل میں کیا درجہ ہے۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ ذیل کا مضمون دو وجوہات سے لکھا گیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ عموماً اُردو شاعروں کا کوئی خاص مسلک نہیں ہوتا اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی شاعر متضاد خیالات کا اظہار کرتا ہے اور پتہ نہیں چلتا کہ اس کا اعتقاد کس اصول پر ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک عموماً غزلیں لکھی گئی ہیں اور غزل کا ہر ایک شعر مختلف معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک غزل کے دو شعر متضاد معانی کے حاصل ہو سکتے ہیں۔ غزل کا شعر عموماً قدیم اساتذہ کی پیروی کرتا ہے۔ اُردو کے بڑے شاعر فارسی کے نامور شعراء کی نقل کرتے ہیں۔ اور اوسط درجے کے شعراء اُن دونوں کی۔ بڑے شعراء کے متضاد و مختلف خیالات کو عقیدت کے ساتھ اپنے اشعار میں منتقل کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ زیادہ تر شعراء شاعری کو صرف ذریعہ تفریح سمجھتے ہیں یہاں تک کہ صریح جھوٹ بھی جائز قرار دے لیتے ہیں۔

اُردو میں شاعری کو "جزو پیغمبری" سمجھنا تھوڑے ہی دنوں سے شروع ہوا ہے۔ چنانچہ جس طرح انگریزی شاعر شلی محبت کا پیغام دیتا ہے اور کیٹس حُسن کا یا ورڈس ورتھ نیچر کے ذریعہ روحانیت کا سبق دینا چاہتا ہے اُسی طرح اُردو میں ڈاکٹر اقبال اسلامی اخوت کا پیغام دیتے اور عمل اور محبت کو نجات کا ذریعہ بتلاتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی مشرقی تہذیب کے شیدائی ہیں۔ اور ظرافت کے پیرائے میں مشرقی تمدن کی عظمت بیان کر جاتے ہیں۔ چکبست ہندوستانی قومیت کے پرستار ہیں۔ اور ہندو مسلمان دونوں کو اُسی کا سبق دیتے ہیں۔ وفا اُن کے نزدیک وہ اخلاقی خوبی ہے جو ہمیں نجات دلا سکتی ہے۔ وہ اُسکی بار بار تعریف کرتے ہیں۔

اخلاقی خوبیاں بہت سی ہیں، لیکن چند خاص اوصاف ایسے ہیں کہ باقی تمام خوبیاں انھیں کے تحت میں آجاتی ہیں۔ یہ بڑی بڑی خوبیاں چار ہیں۔ پرہیزگاری، دلاوری، دانشمندی اور انصاف۔ یہ افلاطون کا خیال ہے۔ مسیحی مذہب نے محبت کو سب سے بڑی خوبی مانا ہے۔ مہاتما گاندھی کے نزدیک

اہنسا اور سچائی" سب سے بڑی خوبیاں ہیں اور نطشے کے نزدیک طاقت وغیرہ وغیرہ،

چکبست وفا کو سب سے بڑی خوبی تصور کرتے ہیں۔ اُن کے خیال میں وفا ہی تمام خوبیوں کی سرتاج ہے۔ یہی انسانیت کا جزو اعظم ہے اور یہی مذہب کی جان ہے۔ وفا کے معنی کسی بات پر قائم رہنے کے ہیں جس بات کو دل نے اچھا سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ اُس پر ہمیشہ کے لئے کاربند رہنے کا نام وفا ہے۔ غرض وفا اخلاق کی عملی صورت کا نام ہے۔ نیکی درحقیقت اخلاقی خوبیوں میں اعتقاد رکھنے یا اُن کو اچھا کہنے کا نام نہیں بلکہ اُن کے بموجب عمل کرنا نیکی ہے اور اس کے بموجب مسلسل عمل کرنے کی عادت ہی علی کیرکٹر ہے۔ لہذا وفا اعلیٰ کیرکٹر کی بنیاد ہے۔ اتنا سمجھ لینے کے بعد اب چکبست کے اشعار سنیئے :۔

اُن کی ایک نظم "مذہب شاعرانہ" ہے۔ جسمیں وہ کہتے ہیں ؎

جس گوشۂ دُنیا میں پرستش ہو وفا کی کعبہ ہے وہی اور وہی بتخانہ ہے میرا

"اگر بقول شاعر" وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے تو اسمیں تعجب ہی کیا ہے کہ اسکو شاعر نے اپنا دین و ایمان بنالیا ہے۔ کیونکہ مذہب درحقیقت پاکیزگی نفس کا ذریعہ ہے۔

وفا اخلاق کی عملی صورت ہے۔ لہذا حق و انصاف کی حمایت پر کمربستہ رہنا چاہئے۔ ذیل کا شعر اسی بات پر زور دیتا ہے ؎

دلوں میں آگ لگے یہ وفا کا جوہر ہے یہ جمع خرچ زبانی رہے رہے نہ رہے

چکبست بتلاتے ہیں کہ اصلی وفاداری یہ ہے کہ دل میں نیکی یا فرض کے لئے بیحد محبت پیدا ہو، اور اُس محبت میں اسقدر جوش ہو کہ ہم قربانی کے لئے تیار رہیں۔ صرف زبان سے کسی بات کی تعریف کرتے رہنا وفا نہیں ہے۔

یہ تو وفا کی تعریف ہوئی۔ اب دیکھنا چاہئے کہ چکبست کے نزدیک اس کا کیا رتبہ ہے۔ دراصل وہ وفا کو انسانیت کا جزو سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال سے انسانیت کے لئے صرف تین باتوں کی ضرورت ہے۔ اول دردِ دل یعنی محبت اور ہمدردی۔ رحم اور اہنسا وغیرہ سب اسی کے تحت میں ہیں۔ دوسرے وفا کا لحاظ یعنی جس بات کی سچائی پر یقین ہو اور اس اعتقاد کے تحت جو کچھ زبان سے کہہ دیا ہو اُس پر برابر عمل کرتے رہنا اور تیسرے ایمان۔ یا خدا کی ہستی میں اعتقاد۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

دردِ دل، پاسِ وفا، جذبۂ ایماں ہونا آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

پھر اتنا ہی نہیں وفا آبرو کے لئے بھی ضروری ہے۔ یہاں آبرو سے مراد ہے خودداری۔ جو کسی شخص کو اپنے سے حقیر اور نہ کسی پیشہ میں اپنے کسرِ شان سمجھتے ہیں بلکہ خودداری نام ہے خدا اور نیکی کی عزت کرنے

جس کی وجہ سے گناہ درکنار معمولی لغزش بھی شایانِ شان نہیں معلوم ہوتی۔ خودداری درحقیقت زندگی اس طرح بسر کرنے کا نام ہے کہ اپنی ذات سے برابر نیک کام ہوتے رہیں اور کسی کو تکلیف نہ پہونچے۔ چنانچہ بقول چکبستؔ ع آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا

وفا کو چکبستؔ اپنے ہیرو کی پہلی صفت قرار دیتے ہیں۔ وہ قومی پیشواؤں کو "وفا کے دیوانے" اور "وفا کا آفتاب" کہہ کر پکارتے ہیں۔ ایک جگہ بال گنگا دھر تلک کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

زندگی تیری بہارِ چمنستانِ وفا — آبرو تیرے لئے قوم سے پیمانِ وفا

عاشقِ نامِ وطن، کشتۂ ارمانِ جفا — مردِ میدانِ وفا جسمِ وفا جانِ وفا

وفا کی تعریف بھی ہو چکی۔ وفا کا دوسری خوبیوں کے درمیان مرتبہ بھی بیان ہو چکا۔ اب وفا کے دوسرے پہلو دیکھنا چاہیئے۔

چکبستؔ جب قوم کی حالتِ زار کا ماتم کرتے ہیں تو انھیں سب سے پہلی جو بات نظر آتی ہے، وہ "وفا کی بربادی" ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہے آج کس کی ہوا میں وفا کی بربادی — سُنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی

چکبستؔ کے نزدیک وفا ایسی خوبی ہے کہ اُس سے تمام اعلیٰ صفات حاصل ہو جاتی ہیں، اور بیوفائی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ لہٰذا وہ دوسری خوبیوں کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔ غالباً وفا اُن کے نزدیک تمام خوبیوں کا مجموعی نام ہے۔ اور بیوفائی یا جفا اسکی ضد ہے۔ جیسا کہ اِس شعر سے مترشح ہوتا ہے

بُروں سے بھی یہاں برتاؤ رکھتے ہیں بھلائی کے — بنایا باوفا اِس دل کو صدقے بے وفائی کے

وفا نے اُن کے دل کو ایسا پاکیزہ بنا دیا ہے کہ وہ انتقام کے طور پر بھی بُرائی سے احتراز کرتے ہیں ؎

دوستی میں اپنا اپنا حق ادا کرتے رہے — وہ جفا کرتے رہے اور ہم وفا کرتے رہے

وفا سے چکبستؔ کو ایسی محبت ہے کہ اِس مضمون پر اُنھوں نے بہت سے عمدہ اشعار لکھے ہیں ؎

مٹنے والوں کی وفا کا یہ سبق یاد رہے — بیڑیاں پاؤں میں ہوں اور دل آزاد رہے

آپ سے ہم سے ہوا تھا کبھی پیمانِ وفا — کیجئے ظلم مگر وہ بھی گھڑی یاد رہے

دم سے گاندھی کے رہے شورِ وفا بستی میں — قیسؔ جنگل میں رہے کوہ پہ فرہادؔ رہے

کشش وفا کی انھیں کھینچ لائی آخرکار — یہ تھا رقیب کو دعویٰ وہ آ نہیں سکتے

ہزاروں جان دیتے ہیں بُتوں کی بیوفائی پر — اگر اُن میں سے کوئی باوفا ہوتا تو کیا ہوتا

شرکتِ غم کا عزیزوں میں جو دستور نہیں — امتحاں اُن کی وفا کا مجھے منظور نہیں

ہمارا ہندوستان

ہندوستان کی قومی تحریک پر ایک سرسری نظر

از مسٹر پرشوتم لال چودھری ایم۔ اے

ہندوستان ہمارا ہے۔ یہ بات کوئی نئی نہیں۔ مگر اس امر کی واقفیت یقیناً باعث دلچسپی ہوگی کہ آخر کب تک ہم اپنے ہی مُلک کو مہمان خانہ تصور کرتے رہے، اور کب سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان دراصل ہمارا ہی ہے۔ اب سے تقریباً دوسو برس کا عرصہ ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے آخیر میں جب سلطنت مُغلیہ کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ اور انگریزوں کی تجارت ترقی پر تھی۔ اسوقت ہندوستان کو رفتہ رفتہ محسوس ہونے لگا کہ کوئی بیرونی طاقت اُن پر قابض ہوتی جارہی ہے۔ گورے اور کالے کا امتیاز صاف محسوس ہونے لگا۔ یہی احساس دراصل قومی جذبہ کا منبع ہے۔ اُس زمانہ میں کوئی اس کو سمجھ نہ سکا۔ یہ دوسری بات ہے۔ مگر یہ خیال دلوں میں پیدا ہوچکا تھا اور رفتارِ زمانہ آہستہ آہستہ اس کو دعوتِ عمل دے رہی تھی۔

خیر جو کچھ بھی ہو۔ انگریز یہاں آئے، اتفاقاً نہیں بلکہ ضرورتاً۔ اُن کے ساتھ ہی اُنکی تعلیم و تہذیب بھی آئی۔ انگریز تاجروں کو ہندوستانیوں سے تجارت کرنے میں زبان کی دقت محسوس ہوئی۔ ہندوستانی انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ انگریز ہندستانی سے بے بہرہ۔ اس لئے انگریزی تعلیم جاری کی گئی اور کچھ عرصہ بعد ہندوستانیوں کا وہ طبقہ تیار ہوگیا جو انگریزی تعلیم یافتہ کہلاتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ہی انگریز پادریوں نے عیسائی مذہب کا وعظ بھی شروع کیا۔ لاکھوں کی تعداد میں بھولے بھالے ہندوستانی عیسائیت کے جال میں پھنسنے لگے۔ ہندوستانی اپنا سب کچھ قربان کرسکتے ہیں لیکن مذہب نہیں۔ چنانچہ جب تک انگریزی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ ہندوستانی خاموش رہے لیکن جیسے ہی اُن کا دھرم خطرے میں پڑنے لگا اُن کے کان کھڑے ہوگئے۔ چنانچہ انگریزوں ہی کی تیار کردہ تعلیم یافتہ جماعت میں سے بڑے بڑے ریفارمر پیدا ہوگئے راجہ رام موہن رائے نے ستی کی رسم بند کرنے کی کوشش کی اور تعلیم نسواں کو فروغ دیا۔ مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور و بابو کیشب چندر سین نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ سوامی دیانند نے آریہ سماج قایم کیا۔ رام کرشن پرم ہنس اور سوامی وویکانند نے رام کرشن مشن اور سیوا آشرم کھولے۔ غرض انیسویں [19] صدی میں جو بیداری ہندستان میں نمودار ہوئی وہ خاص کر ہندوؤں میں اور صرف مذہبی میدان ہی میں پیدا ہوئی۔ مسلمان بھی بیدار ہوئے

لیکن انیسویں صدی کے آخیر میں اور ہندوؤں کے بہت بعد۔

اب تک ہندوستانی انگریزوں کو اپنا سرپرست سمجھتے تھے اور سب کا یہی خیال تھا کہ ہندوستان کی ترقی برطانیہ کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔ لیکن واقعات نے جلد ہی اِس خیال کی تردید کی انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے علاوہ برطانوی طرز عمل نے بھی بہت سے مخالف پیدا کر لئے۔ زمیندار، کسان، مزدور اور مِل مالکان یہ سب ہندوستانی تھے ضرور مگر انگریزوں کے تعلقات ہی سے امیر و خوشحال تھے لیکن وہ جلد ہی اِس بات کو بھول گئے کہ برطانیہ ہی نے اُن کو یہ مرتبہ عطا کیا ہے۔ دولت بھی ایک نشہ ہے اسمیں مست ہو کر انھوں نے انگریزوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔ دوسری جانب ہندوستانی کاشتکاروں اور مزدوروں کا بُرا حال تھا۔ یہ غربت اور ظلم کی چکی میں پسے جا رہے تھے۔ ایک طرف ہندوستانی زمینداروں اور سرمایہ داروں کی زیادتیاں اور دوسری طرف انگریزوں کی سنگدلی۔ ۱۸۷۲ء میں مشہور بنگالی مصنف شری بنکم چندر چٹرجی کے قلم سے نیل درپن اور آنند مٹھ جیسے شاہکار عوام کے سامنے آئے۔ اپنی غربت اور پستی کا دِل سوز بیان پڑھکر ہر ہندوستانی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ قومیت کا دریا اب دِل و دماغ کی وادیوں سے نکل کر میدانِ عمل میں آ رہا تھا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی۔ مگر یہ آجکل کی طرح غریبوں کی کانگریس نہ تھی، یہ اُن لوگوں کی جماعت تھی جو مشہور زمیندار و سرمایہ دار تھے۔ اور انگریزوں سے تجارت کے میدان میں مقابلہ کے خواہشمند تھے لیکن کھُلم کھلا اُن کی مخالفت کرنے کی جراءت نہیں کر سکتے تھے۔ پہلی کانگریس بمبئی میں مسٹر ڈبلیو سی بنرجی کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اسمیں مؤدبانہ طریقہ پر حکام وقت سے درخواست کی گئی کہ ہندوستان میں فوجی صرفہ کم کر دیا جائے۔ ہندوستانیوں کو حکومت میں ملازمتیں زیادہ تعداد میں دی جائیں۔ اور ہندوستان سے سونے کی درآمد بند کر دی جائے۔ چند سال بعد ہی کانگریس کے آسمان پر دادا بھائی نوروجی کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکنے لگا۔ یہ پہلے ہندوستانی بزرگ تھے، جنھوں نے سوراج کا لفظ استعمال کیا۔ ۱۹۰۴ء میں جاپان جیسی چھوٹی حکومت نے روس جیسی عظیم الشان سلطنت پر فتح پائی۔ اس سے ہندوستان میں خود اعتمادی کا جذبہ مضبوط ہو گیا۔ انھیں دنوں برطانیہ سے صوبہ بنگال کو منقسم کرنے کی غلطی سرزد ہوئی۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ، سودیشی کا پرچار اور تحریک دہشت انگیزی کا آغاز اسی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ اِس طرح قومیت کی تحریک بڑے زوروں پر پہونچ گئی۔ اور اغلب تھا کہ سلطنت برطانیہ سے اُس کا تصادم ہو جائے کہ اتنے میں کانگریس کے دو بڑے لیڈران مہاتما تلک اور مسٹر گوکھلے میں اختلافات ہو گئے۔ گوکھلے آئینی جدوجہد کے حامی تھے۔ تلک براہ راست

جنگ کے خواہاں۔ گوکھلے کو تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقے کی حمایت حاصل تھی۔ تلک کو عوام کی ہمدردی۔
باہمی نفاق کمزوری کی علامت ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں کانگریس کی طاقت میں نمایاں کمی محسوس ہونے لگی، سرکار نے تلک اور لالہ جپت رائے کو لمبی سزائیں دیں۔ عوام کے جذبات کچھ عرصہ کے لئے کچل دئے گئے، اعتدال پسند جماعت کو خوش کرنے کے لئے سرکار نے سنہ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات جاری کیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کو رد کیا۔ عوام پر سرکار کا عتاب نازل ہو رہا تھا۔ اسوقت قومی خدمت کا چراغ صرف مسز اینی بسنٹ کی ہوم رول لیگ کی شکل میں ٹمٹما رہا تھا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں دونوں جماعتوں کا پھر ملاپ ہوا۔ لکھنؤ کانگریس میں دونو طبقے اس بات پر متفق ہو گئے کہ برطانیہ سے قطع تعلق کئے بغیر ہندوستان کے لئے خود مختار حکومت کا مطالبہ کیا جائے۔ اب تک سر سید احمد خاں کے مشورے سے مسلمانوں نے کانگریس میں شرکت نہیں کی تھی لیکن کانگریس کے اسی اجلاس میں لیگ کانگریس اسکیم مرتب ہوئی اور مسلمانوں نے بھی قومی مورچے میں حصہ لینا منظور کیا۔ ۱۹۱۹ء میں خلافت کی تحریک میں ہندوؤں کی شرکت کے نظارہ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ ہمیشہ اُسے یاد رکھیں گے۔ ہندو مسلم ملاپ کو دیکھکر اُسوقت تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ سوراج کی منزل اب کچھ دُور نہیں۔
لیکن برطانوی سیاست وان کچھ کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہیں ہیں۔ جتنا ہندوستان کو وہ سمجھتے ہیں، اُتنا شاید ہندوستان خود اپنے کو نہیں سمجھتا۔ خود مختار حکومت کے مطالبہ کے ساتھ ہی اُس کا وعدہ بھی کر دیا گیا۔ اس وعدہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کیلئے کمیٹیاں بھی مقرر کی گئیں، اور سب غور وخوض کا نتیجہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی شکل میں سنہ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ ایسا کھلونا تھا جسے لبرلوں نے تو پسند کیا لیکن عوام اُس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اس لئے ایک بار پھر لبرل ممبران نے کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کی۔

اصلاحات کی مخالفت کو کچلنے کے لئے سرکار مکمل طور پر تیار تھی۔ بنا بنایا بہانہ یہ تھا کہ پنجاب میں تحریک دہشت انگیزی کو روکنا ہے۔ اُس کے لئے رولٹ ایکٹ بنایا گیا جو عوام کی زبان میں کالا قانون کہلاتا ہے۔ اِس قانون کی منسوخی کے لئے وائسرائے صاحب سے درخواست کی گئی۔ ستیہ اگرہ سبھائیں قائم کی گئیں۔ ۶ راپریل کو عام ماتم کا دِن قرار دیا گیا اور اُس روز ہڑتال رہی۔ ایکٹ کی مخالفت میں مختلف مقامات پر بڑی دھوم دھام سے پبلک جلسے ہوئے۔ ۱۳ راپریل سنہ ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ میں ایک ایسے ہی جلسہ پر حکومت کی جانب سے گولیاں برسائی گئیں۔ جس سے تقریباً ایک ہزار بیگناہ اشخاص مارے گئے۔ جب ہی سے ۶ راپریل سے ۱۳ راپریل تک کا ہفتہ "قومی ہفتہ" شمار ہونے لگا۔

۱۹۱۹ء کی کانگریس امرتسر ہی میں منعقد ہوئی۔ ہر ایک ہندوستانی کا دل دھڑک رہا تھا۔ سب لوگ حکومت برطانیہ کے شاکی تھے۔ بغض کی آگ بھڑک رہی تھی۔ پوشیدہ طور پر بم اور کارتوس کی تیاری کی جا رہی تھی۔ یہ خیال ملک میں عام ہو رہا تھا کہ ہندوستان ہمارا ہے اور ہمارا ہی ہونا چاہیے۔ سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے اور ہم اُس کو ضرور حاصل کریں گے، مگر کس طرح؟

کس طرح؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بڑے بڑے لیڈر۔ اعلیٰ سے اعلیٰ دماغ اس سوال کا جواب دینے سے قاصر تھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ بالکل اندھیرا۔ ہندوستانی غم و غصہ کی آگ میں جل رہے تھے۔ اُن کے دل و دماغ ٹھکانے نہیں تھے۔ اُنھیں راستہ کی تلاش تھی۔ اِس تاریکی کے عالم میں دریائے سابرمتی کے کنارے ایک خاموش کٹیا سے اُمید کی ہلکی سی شعاع نمودار ہوئی۔ کسی کی دھیمی مگر مضبوط آواز نے کہا "بھولے بھائی! ظالم کا نہیں ظلم کا مقابلہ کرو۔ ظلم پر ظلم سے نہیں محبت سے فتح پائی جاتی ہے۔ جو تمہیں مارے تم اُسے پیار کرو۔ جو تمہیں گالی دے تم اُس کے مشکور ہو۔ بحری، بری اور ہوائی تینوں طاقتیں غیروں کے ہاتھ میں ہیں، تمہارے پاس نہ زر ہے نہ زمین۔ نہ طاقت ہے، نہ ہمت۔ نہ عقل ہے نہ تجربہ۔ پھر بھلا تم کس طرح حکومت برطانیہ جیسی مستحکم طاقت کا مقابلہ کروگے؟ مگر مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تم نے تیمور اور نادر جیسے حملہ آوروں کی خون کی پیاس بجھائی ہے کنس اور ہرناکشیپ جیسے ظالموں کی سختیاں برداشت کی ہیں۔ پھر اب یہ بے بسی کیوں؟ بھکاری نہ بنو۔ دل نہ توڑو۔ کمر ہمت مضبوط باندھو، استقلال کی ڈھال اور عدم تشدد کی تلوار ہاتھ میں لو، مرد میدان بنکر حالات حاضرہ سے باخبر ہو۔ ظلم کا مقابلہ آسان نہیں۔ کھوئی ہوئی آزادی کبھی خیرات میں واپس نہیں ملتی۔ اگر تم واقعی آزادی کے خواہاں ہو تو مظالم برداشت کرو۔ قربانیوں کے لئے تیار رہو اور اپنی جان کی بازی لگادو۔ تب کہیں آزادی کی سُنہری منزل دکھائی دے گی"۔ یہ اُس پالیسی کا لب لباب ہے جو ۱۹۱۹ء میں مہاتما گاندھی نے مُلک کے سامنے رکھی۔ اُنھیں کی سرکردگی میں اُس پر عمل کرنا قرار پایا۔ دو سال بعد بدقسمتی سے پرنس آف ویلز ہندوستان تشریف لائے۔ مگر اُس وقت تحریک کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ سودیشی کھدر، بدیشی مال کا بائیکاٹ۔ عدم ادائیگی ٹیکس کی لہر شروع ہو چکی تھی۔ تقریباً تیس ہزار آدمی جنمیں مسٹر سی۔ آر۔ داس جیسے نامور لیڈر شامل تھے جیلوں میں بھر دئے گئے۔ ۱۹۲۲ء میں خود مہاتما گاندھی چھ سال کے لئے مانڈلے جیل میں بند کر دئے گئے۔ پانچ چھ سال تک سرکار نے متواتر اس تحریک کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر قومی تحریک کی شمع نے ہر ایک ہندوستانی کے دل کے چراغ کو روشن کر دیا تھا۔ آخر کار ۱۹۲۷ء میں ہندوستان کو مزید اصلاحات دینے کیلئے

سائمن کمیشن کا تقرر ہوا۔ ادھر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگریس نے ایک سال کے اندر اندر ڈومینین اسٹیٹس کا مطالبہ کیا اور یہ مدت گذر جانے پر ۱۹۲۹ء میں ۳۱ دسمبر کی رات کو بارہ بجے لاہور میں دریائے راوی کے کنارے برطانیہ کے روبرو مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کل کی باتیں ہیں۔ لارڈ اِروِن کو مہاتما جی کے دوستانہ خطوط، نمک کی قانون شکنی کے لئے ڈانڈی کا تاریخی سفر، ہندوستان میں نمک کی فروخت، مہاتما جی کی گرفتاری، تقریباً ایک لاکھ ہندوستانیوں کی جیل یاترا۔ گاندھی اِروِن پیکٹ، گول میز کانفرنس میں مہاتما جی کی شرکت اور مکمل آزادی کا مطالبہ، واپسی پر دوبارہ گرفتاری تشدد اور عدم تشدد کی خوفناک جنگ، فرقہ وارانہ تصفیہ، اچھوتوں کے لئے جیل ہی میں مہاتما جی کی خوفناک فاقہ کشی۔ رہائی اور اُس کے بعد سے قومی خدمت کی شاندار کوششیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ۔ سات صوبوں میں کانگریسی حکومت کی قائمی۔ یہ سب قومی تاریخ کے سُنہری باب ہیں۔ مہاتما جی کی سب باتوں سے کبھی کسی کو اتفاق نہیں ہو سکتا۔ ہم اُن سے اختلاف رکھتے ہیں، مگر دوست و دشمن سب اِس بات پر ضرور متفق ہیں کہ یہ ہستی دورِ جدید کا سب سے بڑا سرمایہ اور مادرِ وطن کے تاج میں سب سے بیش قیمت ہیرا ہے۔ مہاتما جی کے بعد کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر کبھی کبھی رونگٹے کھڑے ہونے لگتے ہیں۔ مگر زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا۔ یہاں کبھی دھوپ ہے تو کبھی چھاؤں۔

کشمکش

از حضرت منور لکھنوی

ممکن نہیں وجودِ بشر کشمکش بغیر ۔۔۔ ہو عازمِ فرار نہ قصدِ گریز کر
مرنا نہیں مقدرِ اربابِ جاں سپار ۔۔۔ جینا جو ہے تو حوصلۂ رستخیز کر
گرمی اُبھار بزم کے ساماں سے رزم کی ۔۔۔ ہاں نوش جاں پیالۂ صہبائے تیز کر
ہر بوند اس لہو کی بنے برقِ شعلہ پاش ۔۔۔ افزوں وقارِ دیدۂ خونابہ بیز کر
آمادۂ مصاف ہو شورِ بزن کے ساتھ ۔۔۔ سر دیکے احترامِ صدائے بریز کر
اب کچھ تجھے تلافیٔ غفلت بھی چاہئے ۔۔۔ باقی ہے جتنی عمر نثارِ ستیز کر

تیرے لئے حیات کا دامن نہ تنگ ہو
دعویٰ زندگی ہے تو مصروفِ جنگ ہو

کچن لتا

از حضرت جگر بریلوی بی۔ اے

لڑکی ہے کہ چلتی پھرتی گڑیا
لڑکی ہے کہ تو کوئی کھلونا
ٹوٹا ہے یہ آسماں سے تارا
ہے چاند کی کور یا کنارا
مسکیں صورت ہے بھولی بھالی
لیکن جو ادائیں ہیں نرالی
ننھے ننھے سبک یہ اعضا
شاداب گلاب سا یہ چہرا
ریشم کے یہ لچھے ہیں کہ ہیں بال
ہنستے ہوئے پھول ہیں کہ ہیں گال
چلتی پھرتی ہے جیسے پتلی
یا جس طرح ناچتی ہو تتلی
نازک ہے تو چھوئی موئی ہے
پتلی یا موم کی کوئی ہے
ننھی سی ہے دھان پان ہے تو
خالق کی عجیب شان ہے تو

یہ عمر یہ مختصر سی ہستی
اور سر پہ اٹھائے ہے گرہستی
چکی چولھا توا کڑھائی
ہر شے اپنی الگ منگائی
جوڑے بیٹھی ہے سارا سامان
بنتے ہیں طرح طرح کے پکوان

مہکائے ہے گھر کو اس طرح تو
جس طرح چمن کو پھول کی بو
معصوم اداؤں سے لبھا کر
چھا جاتی ہے تو دماغ و دل پر
جب تیوری چڑھا کے کرتی ہے بات
کھا جاتا ہے مجھ سا منطقی مات
کس جوش سے کہتی ہے کہانی
جھرنے سے رواں ہو جیسے پانی

آتا ہوں سفر سے جب میں چلکر
تو آتی ہے گود میں اچھل کر

غل کرتی ہے کیسا کھلکھلا کر ۔۔۔ "پاپا پاپا" کی رٹ لگا کر
مٹ جاتی ہے ساری کوفت و غم ۔۔۔ ہو جاتا ہوں باغ باغ اکدم
رونق یہ تیرے ظہور کی ہے ۔۔۔ چھائی ہوئی گھر پہ موہنی ہے
پیشپل[1] نے دیا تھا داغ جب سے ۔۔۔ سونا تھا جگر کا باغ تب سے
پھر روح سی اسمیں تو نے پھونکی ۔۔۔ حالت وہ نہیں غم فزوں کی
ہنستی پھرتی ہے جب تو گھر میں ۔۔۔ گلزار سا ہوتا ہے نظر میں
گویا تو نسیم ہے چمن کی ۔۔۔ یا شمع ہے میری انجمن کی

ہر وقت یہی دعا ہے میری
ہو عمر بہت دراز تیری

نوائے راز

ابوالفاضل راز چاندپوری

وہ خود ہی معترف ہے اپنی ہر اک خطا کا ۔۔۔ اب کیا مزاج پوچھوں خود کام رہنما کا
تشریح مدعا کا طالب ہے کیوں وہ ظالم ۔۔۔ روشن ہے نقطہ نقطہ تصویر مدعا کا
یاد خدا ہے دل میں نام خدا ہے لب پر ۔۔۔ احسان ہے یہ مجھ پر ارباب خود نما کا
دنیا ذرا اسے بھی پیغام نیک نامی ۔۔۔ لیتا ہے نام کا فر اب بر ملا خدا کا
گلچین خود غرض کی باتوں میں تو نہ آنا ۔۔۔ اے باغباں یہ ظالم قائل نہیں وفا کا
حسن سخن طرازی یکسر فریب یکسر ۔۔۔ عہد وفا نوازی دیباچہ ہے جفا کا
گلچیں ہو یا صبا ہو شبنم ہو یا ہوا ہو ۔۔۔ بدخواہ لالہ و گل ہے مستحق سزا کا
اہل وطن مبارک یہ دور شادمانی ۔۔۔ لیکن خیال رکھنا ہر رند و پارسا کا

سچ ہے یہ قول واعظ کافر ہے راز کافر
اک رکن خاص ہے وہ میخانۂ صفا کا

---

[1] جگر صاحب کی بالغ ... سال کی ... کا انتقال ... [illegible]

غریب کا دِل

فرانسیسی افسانہ نگار وکٹر ہیوگو کا ایک شاہکار قصّہ

ترجمہ۔ مسٹر دھیرج پرکاش بھٹناگر

غریب کی جھونپڑی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ اندھیری رات کی سیاہ پیشانی پر ایک دمکتے ہوئے ہیرے کی طرح چمک رہا تھا۔ جھونپڑی چھوٹی اور معمولی ہونے پر بھی خوب گرم تھی۔ اِس لئے کافی آرام دہ تھی۔ دُھندلے سے اُجالے میں وہاں کی قریب قریب تمام چیزیں نظر آتی تھیں۔ چولہے میں راکھ کے ڈھیر میں جلتے ہوئے انگارے چمک رہے تھے۔ دھوئیں سے گھر کے تمام بانس بلّیاں سیاہ پڑ گئے تھے۔ دیواروں پر مچھلیاں پکڑنے کے جال لٹک رہے تھے۔ ایک جانب ایک بوسیدہ اور پُرانا سا پلنگ جس کی مسہری ٹوٹ کر زمین پر گر پڑی تھی، پڑا ہوا تھا۔ اُس کے قریب ہی دو دو پُرانی چوکیاں بھی پڑی تھیں۔ جن پر پھٹے پُرانے گدّے بچھے تھے۔ اُن گدّوں پر ننھے ننھے پانچ حسین بچّے بے خبر سو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پریوں کے خوبصورت بچے آشیانہ میں محوِ خواب ہیں۔ قریب ہی اُن کی ماں زمین پر دو زانو بیٹھی تھی۔ اُس وقت وہ اکیلی ہی تھی۔ اُس کا شوہر مچھیرا تھا اور تلاشِ معاش میں سمندر پر گیا ہوا تھا۔ بچپن ہی سے اُس نے یہ خطرناک پیشہ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ اُسے ہر روز بحرِ بیکراں کی تند و تیز لہروں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن خُدا کے فضل و کرم سے، موت کے مُنہ میں پڑ کر بھی وہ صحیح سلامت گھر واپس آجاتا تھا۔ کشمکش حیات و جدوجہد زیست کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آندھی ہو یا پانی۔ طوفان ہو یا کچھ اور۔ اُسکو اپنا اور اپنے بیوی بچّوں کا پیٹ پالنے کے لئے ہر روز مچھلیوں کا شکار کرنے کے لئے اپنی ڈونگی لے کر سمندر کی خوفناک اور مہلک موجوں میں کُودنا پڑتا تھا۔ یہی اُس غریب کا ذریعۂ معاش تھا۔

شوہر کی عدم موجودگی میں غریب جُوآنیا جھونپڑی میں بیٹھکر پُرانے پالوں میں پیوند لگاتی۔ جال کی مرمت کرتی۔ گھر گرہستی کے کام انجام دیتی۔ اور جیسے ہی اُس کے پانچوں بچّے سو جاتے وہ زانو کے بل سربسجود ہو کر اپنے پیارے شوہر کی بخیریت واپسی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتی۔ اِسی طرح ان بیچاروں کی زندگی کے دن بسر ہوتے چلے جاتے تھے۔

سمندر میں ایک مقام پر ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا جس کے قرب وجوار میں مچھلیاں ملنے کا امکان تھا۔ لیکن کچھ تو اندھیرے کی وجہ سے اور کچھ مہیب لہروں کی اونچائی کے باعث وہ مقام آسانی سے نظر نہ آتا تھا۔ مگر جولیا کا شوہر کسی نہ کسی صورت سے شدت کی سردی اور کہرے کی خوفناک تاریکی میں بھی اُس ٹیلے کا سُراغ لگا ہی لیتا تھا۔ اسی طرح وہ روز زندگی اور موت کا کھیل کھیلتا اور جس وقت سمندر کی بے پناہ اور ہیبت ناک موجیں خونخوار اژدھے کی طرح مُنھ پھیلا کر اُس کو کشتی سمیت نگل جانے کے لئے سنسنا کر حملہ آور ہوتیں۔ وہ بھی پتوار اور ڈنڈوں کی مدد سے پر استقلال حوصلے کیساتھ اُن کا مردانہ وار مقابلہ کرتا۔ ایسے برفیلے سمندر کی سرد آغوش میں پڑ کر اُس کا دُبلا پتلا جسم بھی سرد ہونے لگتا۔ مگر جولیا کی محبت اور اُس کی یاد اس کے دل کو گرما کر اُس کی سرد رگوں میں گرم خون کا دریا رواں کر دیتی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر محبت سرچشمۂ حیات ہے۔

اُدھر بیچاری جولیا بھی اپنے شوہر کی اِس بے بسی پر غم کے آنسو بہاتی اور پرماتما سے رحم کی التجا کیا کرتی' سمندر کی ہیبتناک لہریں جب چٹان سے ٹکرا کر زخمی شیر کی طرح گرجتیں تو نازک بدن جولیا کا ملائم دل خوف سے لرز جاتا۔ ادھر مفلسی اُس کے خوبصورت جسم کو گھلائے دیتی تھی۔ اپنے پیارے بچوں کو سردی میں ننگے پاؤں دیکھ کر اُس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ غریبوں کو جب کھانے تک کا بھی ٹھکانہ نہیں تو جُوتے اور دوسری آرام کی چیزیں کہاں سے آئیں ؟

وہ انھیں پریشان کُن خیالات میں مستغرق تھی کہ یکایک بڑی تیز ہوا چلنے لگی اور سمندر کے تٹ پر لہریں لوہار کے گھن کی طرح بجنے لگیں۔ جولیا کا دھیان اُس طرف مبذول ہوا تو بے چاری کانپ اٹھی۔ سوچنے لگی۔ انسان کتنا بے بس ہے۔ کاش! میں بدنصیب کسی صورت سے اس مفلسی کے عذاب کو دُور کر سکتی۔ کیا یہ افلاس وفلاکت ہمیں زندگی بھر اُبھرنے نہ دیگی؟ کیا ہم یونہی قیامت تک افلاس کی گود ہی میں پرورش پاتے رہیں گے؟ یا پروردگار!! کیا اس سے ہمارا کبھی چھٹکارا نہ ہوگا؟ اچانک اُسے پھر خیال آیا کہ اُس کا پیارا شوہر ایسے طوفان بلاخیز میں بے یار و مددگار تن تنہا مچھلیوں کے شکار میں مصروف ہوگا۔ کاش! اُس کے یہ ننھے ننھے بچے اس وقت بالغ اور جوان ہوتے اور اپنے غریب باپ کی اِس ضرورت کے وقت مدد کر سکتے۔ مگر ....'

وہ پھر سوچنے لگی۔ مگر پھر اِن کو بھی تو اسی طرح اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھکر روزی کمانے کے لئے مارا مارا پھرنا پڑتا۔ نہیں۔ نہیں۔ خداوند عالم۔ میں یہ نہیں چاہتی۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ ہم سب اور یہ ہمیشہ ہی ننھے بچے بنے رہتے۔ اس کے دونوں مرمریں ہاتھ خود بخود آسمان کی طرف دُعا کیلئے اُٹھ گئے

اور آنسوؤں کے چند قطرے ڈھلک کر زمین پر گر پڑے۔

اسی طرح چند گھنٹے گذر گئے۔ مجولیا نے سوچا۔ اُن کے آنیکا وقت تو ہوگیا۔ باہر نکل کر دیکھوں، شاید وہ آتے ہوں۔ ممکن ہے طوفان کچھ ہلکا ہوا ہو، اُن کی کشتی پر جو لالٹین روشنی کے لئے لگی رہتی ہے وہ دکھائی دیتی ہے یا نہیں؟ اسی قسم کی باتیں سوچکر وہ لالٹین اور لبادہ لے کر گھر سے نکل پڑی۔ مگر مایوسی کے سوائے وہاں اور کسی کی صورت نظر نہ آئی۔

ابھی تک بارش ہورہی تھی مگر صبح صادق کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ بوندوں کی جھلملی چادر سے شفق کا سُنہری چہرہ جھلک رہا تھا۔ سونے والے ابھی تک جاگے نہ تھے۔ مجولیا نے چاروں طرف نظر دوڑائی، تو اُسے ایک خستہ حال جھونپڑی دکھائی دی۔ مگر یہاں بھی روشنی یا آگ کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ ہوا کے تیز جھونکوں سے اُس کا دروازہ کبھی کھل جاتا اور کبھی بند ہوجاتا تھا۔

"ارے یہ تو بیچاری بیوہ کی جھونپڑی ہے جس کو میرے شوہر اُس روز دیکھ آئے تھے۔ آہ! میں تو اُسے بھول ہی گئی تھی۔ چلوں۔ ایک بار بیچاری کو دیکھ تو آؤں۔ نہ معلوم غریب دُکھیا کس حال میں ہے۔" اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا اور جواب کے انتظار میں کچھ دیر کھڑی رہی۔ لیکن جب کوئی جواب نہ ملا۔ اور سرد ہوا سے اُسے کپکپی سی معلوم ہونے لگی تو اُس نے جلدی سے دروازہ کھٹکھٹایا اور زور سے پکارا "ارے کوئی اندر ہے؟" اُس پر بھی جواب ندارد۔ جھونپڑی گونگے کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ مجولیا نے سوچا شاید بیچاری کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اُس غریب کے دونوں چھوٹے بچے بھی نہ جانے، کس مپرسی کی حالت میں ہوں۔

تھوڑی ہی دیر میں ہوا کے تیز جھونکوں سے دروازہ کھل گیا۔ مجولیا نے اندر جاکر اپنے لالٹین کی روشنی میں دیکھا کہ جھونپڑی میں فقیر کی پھٹی پرانی گدڑی کی طرح جگہ بجگہ سوراخ ہورہے۔ جن سے بارش کا پانی ٹپک رہا ہے۔ ایک کونے میں کوئی بے سدھ و بے خبر سا پڑا ہے۔ پھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نیم برہنہ عورت بے حس و بے جان ہاتھ پیر پھیلائے پڑی ہے۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ اور انھیں دو کھڑکیوں سے طائر روح نے نہ معلوم کب قفس عنصری کو چھوڑ کر پرواز کر گیا ہے۔

وہ بھی ایک وقت تھا جب اُس کے بدن میں جان تھی۔ طاقت تھی، وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اور اپنے دونوں چھوٹے بچوں کی بسر اوقات کرتی تھی۔ مگر گردشِ روزگار کے ظالم ہاتھوں نے جہاں اُس کے پیارے شوہر کو اس سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ وہاں اس مصیبت زدہ کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ اچھی طرح اپنے بچوں کی پرورش کر سکے۔ سچ ہے غریبوں کا پرساں حال ہی کون ہوتا ہے؟ بچوں کا پیٹ بھرنے

اور اُن کو بھوک کی تڑپ سے بچانے کے لئے عرصہ تک کڑی مشقت کرتی رہی جس کی وجہ سے اس غریب کے نحیف جسم نے ہمیشہ کے لئے جواب دیدیا۔ اب اس بیکس و مظلوم کے لئے آغوشِ مرگ سے بہتر اور کون سا کنجِ عافیت ہوسکتا ہے۔

ماں کی چارپائی کے قریب ہی دو ننھے ننھے بچے نیند کی گود میں لیٹے ہوئے خواب کی دنیا میں کھیل رہے تھے۔ قریب المرگ ماں کو جب اپنا انجام دکھائی دینے لگا۔ تو اس نے اپنا لبادہ اُتار کر بچوں کو ایک ہی پالنے میں سُلا کر اُڑھا دیا۔

معصوم بچوں کو کیا خبر کہ آج اُن کی شفیق ماں نے آخری مرتبہ اُن کو ہوا کے سرد جھونکوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خود کو موت کے سرد ہاتھوں میں سونپ دیا ہے۔

باہر کالے بادل غم کے آنسو بہا رہے تھے۔ تاریک رات بے یار و مددگار کے مردہ جسم پر سپیدیٔ صبح کی سفید چادر ڈال کر رخصت ہوگئی تھی۔ اور اب سمندر کی طوفانی موجیں چٹان سے ٹکرا کر موت کے گھنٹے کی سی دل ہلانے والی صدا پیدا کر رہی تھیں۔

جھونپڑی کی بوسیدہ چھت کے سوراخوں سے پانی کی چند بوندیں ایک بوڑھے ہمدرد کی آنکھوں سے اشکِ غم کی طرح ٹپک کر مردہ قالب کے خاموش مرمریں چہرہ پر گر پڑیں۔

اور کیا غریب کی موت پر کوئی دولتمند آنسو بہاتا!

مجولیا اس حسرتناک نظارہ کی تاب نہ لاسکی۔ اُس کا دِل خوف سے دھڑکنے لگا۔ اُس نے فوراً کسی چیز کو اپنے لبادہ میں لپیٹا اور ہوا کی تیزی کے ساتھ جھونپڑی سے نکل کر اپنی کُٹیا کی طرف دوڑی اور اُسے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ گھر پہونچکر اُس نے لبادہ سمیت وہ چیز اپنے بستر میں چھپادی۔

پَو پھٹ چکی تھی۔ صبح کا اُجالا چاروں سمت پھیل گیا تھا۔ گھر میں پلنگ کے پاس ہی ایک کرسی پڑی تھی؛ مجولیا اُسی پر بے سُدھ سی ہوکر گر پڑی، اُس کا چہرہ زرد ہوکر پھیکا سا پڑ گیا۔ اور اسے حرارت سی محسوس ہونے لگی۔ خوف سے اُس کا دِل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔

لیٹے لیٹے وہ بڑبڑانے لگی۔ میں نے کیوں ایسی غلطی کی۔ وہ آئیں گے تو نہ جانے کیا کہیں۔ اب بھی بیچارے کیا کم مصیبت جھیل رہے ہیں۔ دن رات کڑی مشقت کرنے پر بھی ہمارا اور بچوں کا گذرا نہیں ہوتا۔ اور ان دو بچوں کو لاکر تو میں نے اور بھی عذاب مُول لے لیا۔ اور اُن کی فکر میں اور اضافہ کردیا۔ واقعی یہ میں نے اُن کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ کہیں اس غلطی پر وہ مجھ سے ناراض نہ ہوں؛ شاید اب وہ آہی رہے ہونگے پھر وہ سوچنے لگی کہ آخر اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؛ سب حالات معلوم ہونے پر وہ کچھ نہ کہیں گے۔

معلوم نہیں جولیا کب تک ان خیالات میں ڈوبی رہی۔

اچانک، جھونپڑی کا دروازہ کھلا بارش میں بھیگے ہوئے ہنس مکھ بچے کی طرح آفتاب جہانتاب کی چھوٹی چھوٹی سنہری کرنوں نے کہرے کا پردہ ہٹا کر اندر قدم رکھا۔

اتنے میں مچھیرا بھی بھیگے ہوئے جال کو اپنے کاندھے پر رکھے دروازہ کی چوکھٹ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ محبت کی ہنسی ہنس کر اُس نے زور سے کہا۔

جولیا۔ دیکھو تمھاری اُمیدوں کا جہاز کنارے آلگا

"اچھا تم آگئے؟ کہہ کر جولیا دوڑ کر فرط مسرت سے اپنے شوہر سے جس کو وہ اسقدر پیار کرتی تھی لپٹ گئی۔ اس کا صبر و قناعت سے لبریز دل اپنی محبوبہ کے سر کے نیچے اطمینان سے دھڑک رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اُس کا پرسکون چہرہ دہکتی ہوئی آگ کی روشنی میں کندن کی طرح دہکنے لگا۔ مچھیرے نے سنجیدگی سے کہا۔ جولیا۔ میں آتو گیا ہوں۔ مگر مقدر نے میرا ساتھ نہیں دیا۔

کیوں؟ ہوا کا رُخ کیسا تھا۔

کچھ نہ پوچھو! نہایت خراب"

اور مچھلیاں وغیرہ کچھ ملیں؟

نہ۔ مچھلیاں بھی نہیں ملیں۔ خیر نہیں نہ سہی۔ اُس کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں تمھیں پھر اپنی آغوش محبت میں دیکھ رہا ہوں۔ میں اسی میں خوش ہوں۔ دیکھو نہ۔ مچھلی وچھلی ملنا درکنار۔ الٹے جال ہی ٹوٹ کر بیکار ہو گیا۔

رات تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا میں بھوت ناچ رہے ہیں

ایک بار اس زور کا طوفان آیا کہ میں ڈر گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اور میری کشتی دم زدن میں سمندر میں جذب ہونیوالے ہیں۔ یہ تمام مصیبتیں اور اُس پر تازیانہ یہ کہ رسی بھی ٹوٹ گئی میں اس آفت کے وقت اور کیا کر سکتا تھا۔ کشتی اُسی ناخدا کے بھروسے پر چھوڑ دی جو ہر روز اُسے پار لگاتا ہے۔

جبھی تو صحیح سلامت تمھارے پاس آگیا

یہ ہوش ربا واقعات سُن کر بیچاری جولیا دم بخود رہ گئی۔ بڑی مشکل سے اُس کی زبان سے نکلا سمندر کی گرج اور لہروں کا شور و شر سُن کر تو میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ پھر گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے جولیا نے بڑی آہستگی سے کہا "ہمارے پڑوس میں وہ بیچاری جو غریب بیوہ رہتی تھی مر گئی کل جب تم یہاں سے گئے تھے۔ شائد اس کے بعد ہی وہ مر گئی۔ اور دو ننھے بچے یتیم لاوارث چھوڑ گئی۔

اُن میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکی بیچاری تو تُتلا تُتلا کر بول بھی لیتی ہے۔ لیکن لڑکا تو بہت ہی چھوٹا ہے، ابھی چل بھی نہیں سکتا۔

اُس نے یہ سب باتیں ایسے لہجہ میں بیان کیں، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی جرم کا اقبال کر رہی ہے۔

جولیا کی یہ تمام باتیں سُن کر مچھیرے نے سر کھجاتے ہوئے کہا "یہ ایک اور مشکل آپڑی۔ یہاں تو پہلے سے پانچ بچّے موجود ہیں۔ وہ دونوں آجائیں گے تو سات ہو جائیں گے۔ موسم ویسے ہی خراب رہتا ہے۔ مقدر ساتھ نہیں دیتا۔ مگر سوائے اس کے اور کیا ہوگا کہ ایک ہی وقت کھا کر گذارہ کرنا پڑے گا۔ اور چارہ ہی کیا ہے۔ وہی خالقِ دوعالم ہر ایک مشکل کو آسان کرے گا۔ جس نے ان معصوم بچّوں کی شفیق ماں کو اُن سے جدا کیا ہے، وہی اُن کی پرورش کے سامان بھی مہیا کرے گا کون جانتا ہے۔ اُس کی کیا مصلحت ہے؟ میں نہ جوتشی ہوں نہ پنڈت، جو آیندہ کی پیشگوئی کر سکوں۔

مگر خیر جو کچھ ہوگا دیکھا جائیگا۔ جولیا، اب تم جلدی سے جا کر اُن بچّوں کو اُٹھا لاؤ۔ بیچارے بھوکے ہونگے جاگ اُٹھیں گے تو اور آفت ہوگی، اجل رسیدہ ماں کے پاس انھیں خوف معلوم ہوتا ہوگا۔ ہم انھیں کسی نہ کسی طرح اپنے بچّوں کے ساتھ ہی پال پوس لیں گے۔ یہ بھی تو سوچو اگر ہمارے پانچ کی جگہ سات بچّے ہوتے تو کیا ہم اُن کی پرورش کا انتظام نہ کرتے۔ خدا قادر مطلق اور رزّاق ہے۔ وہ اُن کے لئے بھی روزی بہم پہونچائے گا۔ کیا عجب ہے کہ ہمیں مچھلیاں زیادہ تعداد میں ملنے لگیں۔ وہ غریبوں کا مددگار، دکھیوں کا حامی اور بیکسوں کا سہارا ہے۔ وہی ہماری مدد کرے گا۔ میں بھی اب زیادہ محنت کرونگا۔ غریب ہوں تو کیا ہوا، مگر دل غریب نہیں ہے۔ میں خود پانی پی کر دن کاٹ دونگا مگر اِن بچّوں کو تکلیف نہ ہونے دونگا جولیا۔ ارے تم ابھی گئیں نہیں۔ آخر کھڑی ہوئی کیا سوچ رہی ہو؟ جاتی کیوں نہیں؟ جاؤ۔

جولیا نے ہنس کر اور مسہری کا پردہ اُٹھا کر کہا "یہ دیکھو۔"

مچھیرے نے دیکھا کہ ساتوں بچّے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے آرام سے سو رہے تھے۔

دل نے سو بار کروٹیں بدلیں
تم نے جب مُسکرا کے دیکھ لیا

برق سی کوندنے لگی اک بار
کس نے پردہ اُٹھا کے دیکھ لیا

لاکھ چھپتے رہے وہ ہم سے مگر
ہم نے دل میں بُلا کے دیکھ لیا

کِس نے بسمل بنا دیا سرِ بزم
کس نے پھر مسکرا کے دیکھ لیا

تیری فیاضیوں کی حد ہو گئی
خود کو سائل بنا کے دیکھ لیا

مصطفیٰ کمال اتاترک

از مولانا محمد یعقوب خاں کلام بی اے

---

۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کا دن عموماً تمام ایشیا اور خصوصاً قلمرو ترکی کے لئے ایک منحوس دن تھا۔ اسی دن مغرب کی قہرمانی طاقتوں کو نیچا دکھانیوالا ایشیائی شیر ببر، ترکوں کو یونانی درندوں سے نجات دلانے والا ہیرو، جدید ترکی کا بانی مبانی، صاحب سیف و قلم، مالک قرطاس و علم، دنیا کے ڈکٹیٹروں کا سرتاج، ترکی کا آمر و مختار، اپنے وطن کا فدائی اور مشرق کا شیدائی، مصطفیٰ کمال پاشا غازی، اتاترک، اِس دنیائے فانی سے راہی ملک جاودانی ہوگیا۔ کمال پاشا ایک مدت سے علیل ضرور تھے اور ابھی ان کی موت قبل از وقت ہی خیال کی جائیگی۔ لیکن مشیت ایزدی میں کسی کو دخل نہیں۔

مصطفیٰ کمال ۱۸۸۱ء میں سالونیکا میں (جو اب یونان کے قبضہ میں ہے) پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی والدہ زبیدہ خانم پُرانے خیال کی مذہبی خاتون تھیں مگر اُن کے والد علی رضا بے آزاد خیال تھے۔ اُن کے ایک بڑے بھائی "مصطفیٰ" نامی تھے جن کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ اس لئے ماں باپ نے یادگار کے طور پر مرحوم کا نام بھی "مصطفیٰ" رکھدیا۔ ان کی ایک چھوٹی بہن بھی ہیں۔ جن کا نام مقبولہ خانم ہے۔

جب مصطفیٰ کمال نے ہوش سنبھالا تو انھیں دینیات کے مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ مگر چند ماہ بعد وہاں سے شمسی آفندی کے مدرسہ بھیجے گئے۔ جہاں یوروپین طرز کی تعلیم دیجاتی تھی۔ مصطفیٰ کمال کے ماں باپ قدیم و جدید ترکی کے نمایندے تھے۔ اس لئے انھیں بچپن ہی سے ان دونوں میں امتیاز کرنے کا اچھا موقعہ ملا۔ لڑکے پر باپ کا اثر پڑا اور آیندہ چل کر وہ انقلاب پسند ہوگیا۔

مصطفیٰ کمال کے والد علی رضا بے بندرگاہ پر محکمہ کسٹم میں ملازم تھے۔ تنخواہ قلیل تھی اور عموماً دیر سے ملا کرتی تھی جس سے گھر میں اکثر تنگی ترشی رہتی تھی۔ آمدنی بڑھانے کے خیال سے علی رضا بے نے اِدھر اُدھر سے کچھ قرض دام لیکر لکڑی کی ایک دکان بھی کھولی۔ جو چند روز میں چل نکلی۔ لیکن افسوس کہ ابھی مصطفیٰ کمال کی عمر نو برس ہی کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اِس ناگہانی صدمہ کی وجہ سے مصطفیٰ کمال کی والدہ دونوں بچوں کو لے کر سالونیکا سے چند میل کے فاصلہ پر موضع لزاسان میں اپنے بھائی کے یہاں چلی گئیں۔

دیہات کی زندگی بڑی محنت و جفاکشی کی زندگی ہوتی ہے۔ یہاں مصطفیٰ کمال کو اپنے زراعت پیشہ ماموں کا ہاتھ بٹانے میں بڑی محنت و جفاکشی سے کام لینا پڑتا تھا۔ ہر روز صبح کو احاطہ صاف کرنا، دن کو بھیڑ بکریاں چرانا، شام کو کھیتوں سے گھاس اور چارہ لاکر گھوڑوں اور مویشیوں کے سامنے ڈالنا پڑتا تھا۔ دو تین برس یوں ہی گزر گئے مگر اس سے مصطفیٰ کے صحت جسمانی کو بڑا فائدہ پہونچا۔ شہر سے جب وہ آئے تھے تو ایک زرد رُو اور کمزور لڑکے تھے۔ گاؤں آکر وہ سرخ و سفید اور طاقتور نوجوان ہو گئے۔ لیکن ماں کے محبت بھرے دل کو بچہ کی یہ جفاکشی گراں گذرتی تھی۔ وہ اپنے ناز و نعم کے پالے ہوئے بچہ کو کاشتکاری کی تربیت نہیں دینا چاہتی تھی بلکہ اسکی خواہش یہ تھی کہ وہ تعلیم حاصل کرکے کوئی اعلیٰ درجہ حاصل کرے۔ اس لئے انھوں نے اپنی ایک بہن کی امداد سے مصطفیٰ کو اسکول میں پڑھنے بھیجدیا۔ لیکن نوعمر مصطفیٰ ایک دن اپنے ہم جماعتوں سے لڑ پڑا۔ جس پر اُستاد نے بُری طرح پیٹا۔ اُس دن سے پھر مصطفیٰ نے کبھی اسکول کا نام ہی نہ لیا۔ بلکہ گاؤں جاکر وہ پھر کاشتکاری کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اِسی گاؤں کے رہنے والے میجر قادری بے تھے۔ جن کا لڑکا احمد ملٹری اسکول میں پڑھتا تھا۔ جب یہ لڑکا گاؤں میں واپس آیا تو مصطفیٰ کمال سے اُس کی دوستی ہو گئی۔ نوجوان احمد کی زرق برق فوجی وردی دیکھ کر مصطفیٰ کمال کے دِل میں بھی فوجی ملازمت کا شوق پیدا ہو گیا۔ اور اس نے بھی فوج میں بھرتی ہونیکی ٹھان لی اور ماں کی ممانعت کی پروا نہ کرکے سیدھا اپنے باپ کے دوست کے پاس سالونیکا پہونچا۔ جو ایک پنشنر فوجی افسر تھا۔ اور جس کی سفارش سے مصطفیٰ کو فوجی امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مِل گئی۔ چنانچہ جب یہ امتحان مصطفیٰ نے پاس کرلیا تو سالونیکا کے فوجی اسکول میں داخل ہو گیا۔

اِس اسکول میں مصطفیٰ نے اسقدر اچھا کام کیا کہ اُنکے ایک کپتان مصطفیٰ بے اُن سے بڑی محبت کرنے لگے اور دوسرے سال اُنھوں نے مصطفیٰ کو ایک جونیر کلاس کا انچارج کردیا۔ اور چونکہ اُستاد اور شاگرد دونوں کا نام مصطفیٰ تھا، اسلئے اُستاد نے شاگرد کے نام میں "کمال" کا لفظ بڑھا کر اُس کا نام "مصطفیٰ کمال" رکھدیا اس لقب سے مصطفیٰ کی اعلیٰ قابلیت کی داد دینا بھی مقصود تھا جب فوجی اسکول سے مصطفیٰ نے آخری امتحان شاندار کامیابی کے ساتھ پاس کیا تو اُستادوں نے سفارش کرکے انھیں اعلیٰ فوجی تعلیم کے لئے منتخب کیا۔ اس طرح مصطفیٰ کمال مونا ستر کے بڑے ملٹری کالج میں داخل ہو گئے۔

یہاں مصطفیٰ کمال میں خود داری کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا چنانچہ وہ زیادہ بے تکلفی کے ساتھ کسی سے نہ ملتے تھے۔ اسی کے ساتھ خوش اخلاقی کا دامن بھی کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ ہر شخص سے شگفتہ پیشانی سے ملتے۔ اور ہر چیز کا غور و خوض سے مطالعہ کرتے تھے۔ جس سے مصطفیٰ کمال کے ساتھیوں کو اُن کے مدبر ہونیکا

گمان رہا۔ بہرحال اس کالج کے امتحانات بھی مصطفیٰ کمال نے امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔ جس پر افسروں نے خوش ہو کہ اُن کو جنرل اسٹاف کے لئے منتخب کرلیا اور مزید جنگی تعلیم کے لئے قسطنطنیہ کے فوجی کالج میں بھیجدیا یہاں پہونچکر مصطفیٰ نے سیاسیات میں بھی حصہ لینا شروع کردیا۔ اور انجمن اتحاد و ترقی میں شامل ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ تعلیم میں بھی منہمک رہے۔ چنانچہ قسطنطنیہ کالج کا آخری امتحان بھی امتیاز کے ساتھ پاس کرلیا جس کے بعد وہ ۱۹۰۵ء میں فوج کے کپتان بنادئے گئے۔

اِن دنوں نوجوان ترکوں کی قومی تحریک زوروں پر تھی۔ اور مصطفیٰ کمال پہلے ہی سے انجمن اتحاد و ترقی کے ممبر ہوگئے تھے جس کے روحِ رواں انور پاشا، طلعت پاشا اور جمال پاشا تھے۔ یہ انجمن ملک میں آئینی حکومت قائم کرانا چاہتی تھی۔ اِس لئے اسکے ممبر سلطان عبدالحمید خاں کے حقوق و اختیارات محدود کرکے پارلیمنٹ قائم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ادھر خفیہ پولیس نے جوان سرگرمیوں کی نگرانی کے لئے تعینات تھی، ان لوگوں کی سازش کا حال معلوم کرلیا۔ اس سلسلہ میں مصطفیٰ کمال بھی دھرلئے گئے۔ مگر حکومت نے اُن کے معافی مانگ لینے پر انھیں اور کوئی سزا نہ دی بلکہ دمشق کی طرف جلا وطن کردیا۔ مصطفیٰ کمال اور انور پاشا کے دلوں میں اسی وقت سے فرق پڑگیا۔ اور چونکہ اُس زمانہ میں انور پاشا کی پارٹی کا زور تھا اسلئے مصطفیٰ کمال کو اپنی جان کا بھی اندیشہ ہوگیا۔

۱۹۰۸ء میں مصطفیٰ کمال سالونیکا میں اور انور پاشا برلن میں ترکی سفیر کے فوجی اتاچی تھے۔ جب قسطنطنیہ کی فوج نے سلطان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو مصطفیٰ کمال نے فوج لے کر قسطنطنیہ کی طرف کوچ کیا اور شاتلجہ میں انور پاشا بھی اُن سے مل گئے۔ غرض ان دونوں افسروں نے قسطنطنیہ پہونچکر باغی فوج کی مدد سے سلطان کو پارلیمنٹری حکومت قائم کرنے پر مجبور کیا۔ اور جب ۱۹۰۹ء میں سلطان نے پارلیمنٹری گورنمنٹ توڑدی تو ان دونوں نے سلطان کو معزول کردیا۔

۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو مصطفیٰ کمال بھی بھیس بدلکر وہاں پہونچے اور بہت دنوں تک اطالوی فوجوں سے لڑتے رہے۔ لیکن اس اثنا میں ریاستہائے بلقان نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا تو مصطفیٰ کمال کو بھی طرابلس سے واپس آنا پڑا۔ مگر اُن کے قسطنطنیہ پہونچنے تک ترک ہار چکے تھے۔ البتہ مال غنیمت کی تقسیم پر بلقانی ریاستوں میں جوتی پیزار ہورہی تھی۔ اِس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر انور پاشا فوج لے کر چڑھ دوڑے اور مصطفیٰ کمال نے بھی اُنکی امداد کی۔ جس کی بدولت ترکوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مشرقی تھریس کا علاقہ مع ایڈریانوپل ترکی کو مل گیا۔

جنگ بلقان کے بعد ترکوں کو اپنا گھر درست کرنیکی فکر ہوئی۔ اس وقت مصطفیٰ کمال پاشا کے بہت ہی گہرے دوست علی فتحی بے (جو آجکل لنڈن میں ترکی سفیر ہیں) "انجمن اتحاد و ترقی" کے [illegible]

اُنھوں نے نظم ونسق میں اصلاح کرنے کی کوشش کی تو حکومت نے ان دونوں کو مصلحتاً قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا علی فتحی نے کو ترکی کا وزیر مختار اور مصطفیٰ کمال کو اُن کا فوجی اتاچی بنا کر صوفیہ بھیجدیا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں جب یوروپی سلطنتوں کے دو جتھے ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے، تو مصطفیٰ کمال کی رائے نہ تھی کہ ٹرکی اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دے لیکن ٹرکی کے ارباب حل وعقد نے اپنی قسمت جرمنی کے ساتھ وابستہ کر دی تو مصطفیٰ کمال پاشا کو خاموش ہو کر ایک وفادار جنرل کی طرح جنگ میں مستعدی سے حصّہ لینا پڑا۔

اُس زمانہ میں انور پاشا وزیر جنگ اور ترکی سپاہ کے کمانڈر انچیف تھے۔ اور جنگی کاروائیاں جرمن جنرل لیمان فان سانڈرس کی ہدایتوں کے مطابق ہوتی تھیں۔ فوج کا ایک ٹوٹا پھوٹا ڈویژن مصطفیٰ کمال پاشا کے بھی زیر کمان تھا۔ انھوں نے نئی بھرتی کر کے تعداد پوری کی اور اسے اچھی طرح تربیت دیکر چناق لے گئے جہاں مصطفیٰ کمال پاشا نے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے جو ٹرکی کی تاریخ میں سُنہری حرفوں سے لکھے جائینگے

اس زمانہ میں فرانس و برطانیہ کی متحدہ فوج درِ دانیال کی تسخیر کی فکر میں تھی جنرل فان سانڈرس کے خیال میں اتحادی فوجیں جس مقام پر اُتاری جانے والی تھیں، وہ مصطفیٰ کمال کے نزدیک غلط تھا۔ چنانچہ جو مقام مصطفیٰ کمال نے بتایا تھا، اتحادی فوجیں اسی جگہ ساحل پر اُتریں اور چونکہ یہاں مصطفیٰ کمال پاشا پہلے ہی سے تیار تھے، اس لئے انھوں نے اتحادیوں کے ہر جوڑ کا توڑ کیا۔ اور جزیرہ نمائے گیلی پولی میں اتحادی فوج کو پے درپے ایسی شکستیں دیں کہ وہ وہاں سے بھاگ جانے پر مجبور ہو گئی۔

ان غیر متوقع فتوحات سے جرمن جنرل لیمان فان سانڈرس اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے ہیڈ کوارٹر سے صلاح لئے بغیر ہی مصطفیٰ کمال کو "جنرل" کا عہدہ دیدیا اور اس طرح مصطفیٰ کمال کو "پاشا" کا لقب مل گیا انور پاشا کو جو اس وقت کمانڈر انچیف اور وزیر جنگ تھے، مصطفیٰ کمال کا یہ عروج ناگوار ہوا۔ لیکن ع

دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست

اتاترک کی بہادری اور فتوحات کی بدولت تمام قلمرو ترکی میں اُن کا نام بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گیا۔ اور ترک قوم اور ترکی سپاہ اُن کو قسطنطنیہ کا بچانے والا کہنے لگی۔ مگر انور پاشا کی مخالفت کی وجہ سے وہ ہر قسم کے اعزاز سے محروم رہے مگر اتفاق وقت دیکھئے کہ جہاں جہاں انور پاشا خود کمان کرتے تھے۔ وہاں ترکی فوج کو پے درپے شکست ہو رہی تھی۔ جس سے مصطفیٰ کمال کو انور پاشا کی پالیسی اور اُن کے کاموں پر علانیہ نکتہ چینی کا موقعہ ملا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انور پاشا نے کمال پاشا کو ایک خطرناک آدمی سمجھکر روسی محاذ پر بھیجدیا اور پھر خبر نہ لی۔ لیکن وہاں مصطفیٰ کمال پاشا نے جاتے ہی روسیوں کو شکست دی۔ یہ پہلی شکست تھی جو ترکوں کے مقابلہ میں روسیوں کو نصیب ہوئی۔

اس وقت حجاز و شام و فلسطین میں عرب لوگ بغاوت پر آمادہ تھے اور مکہ مدینہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو جانے کا اندیشہ ہو رہا تھا۔ انور پاشا نے مصطفیٰ کمال پاشا کو حجاز کی حفاظت کے لئے بھیجنا چاہا۔ مگر کمال پاشا کی رائے یہ تھی کہ فلسطین کو بچانے کی خواہش ہو تو حجاز خالی کر دیا جائے

بصرہ کے راستے سے بھی انگریزی فوجیں عراق میں برابر بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ اس محاذ پر بھی مصطفیٰ کمال کو بھیجا گیا۔ چنانچہ اُن کے آتے ہی میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ اور مصطفیٰ کمال پاشا کی کوششوں کا بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ ترکی فوج نے برطانوی فوج کو قط العمارہ میں گھیر کر جنرل ٹاونشنڈ سے ہتھیار رکھوا لئے۔ ترکوں کو یہ فتح بھی جنرل مصطفیٰ کمال ہی کی بدولت نصیب ہوئی۔

چوتھی طرف فلسطین میں جنرل ایلنبائی کی فوجیں بڑھتی آ رہی تھیں۔ اُدھر فرانسیسی فوجوں کی یلغاریں ملک شام میں جا رہی تھیں۔ جنھیں روکنے کے لئے انور پاشا نے کچھ ترکی لشکر کی کمان دے کر فلسطین بھیجا۔ یہاں بھی اتاترک کے پہونچتے ہی رنگ بدل گیا۔ اُنھوں نے تمام ترکی فوجوں کو نہایت خوش اسلوبی کیساتھ فلسطین سے ہٹا دیا۔ اور ملک شام میں اجتماع کر کے حلب کے میدان میں فرانسیسیوں کو شکست فاش دی۔ جس کے بعد غنیم کی پیشقدمی رُک گئی۔

لیکن اب لڑتے لڑتے اور جگہ جگہ شکستیں کھاتے کھاتے ترکوں کی ہمت پست ہو گئی تھی۔ اس لئے اُنھوں نے التوائے جنگ کی درخواست کی، اور اتحادیوں نے جو شرطیں چاہیں ترکوں سے منوا لیں۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو مقام مدروس میں معاہدہ ہو گیا۔ جس کی رُو سے اتحادی فوجیں دندناتی ہوئی دردانیال سے گذر کر قسطنطنیہ پر قابض ہو گئیں اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ترکی کی تاریخ کا تاریک ترین باب ہے۔ ترکی وزیر اعظم اور انور پاشا فرار ہو گئے۔ اور جن لوگوں نے اتحادیوں کے نزدیک ترکی کو جنگ میں جھونکا تھا۔ اُن میں سے اکثر کو گرفتار کر کے مالٹا بھیجدیا گیا لیکن چونکہ مصطفیٰ کمال پاشا جرمنی کے خلاف تھے، اس لئے اُنھیں فوج میں برقرار رکھا گیا۔

اس کے بعد جب اتحادیوں کی مرضی کے موافق ترکی گورنمنٹ قائم ہوئی، تو مصطفیٰ کمال پاشا نے چاہا کہ انھیں وزیر جنگ بنا دیا جائے۔ لیکن اُن کی درخواست نامنظور کر دی گئی۔

قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے بعد برطانوی وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج کی یہ کوشش تھی کہ ترکی کا رہا سہا علاقہ اناطولیہ بھی چھین لیا جائے۔ چنانچہ اُنھوں نے یونان کو اناطولیہ پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ اور یونانی فوجیں فرانسیسی، برطانوی اور یونانی جہازوں میں سوار کر کے راتوں رات ساحل اناطولیہ پر اُتار دی گئیں۔ ترکوں کے بیقاعدہ دستوں نے اُن کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ مگر یونانی باقاعدہ فوجیں آگ لگاتیں اور اناطولیہ میں تباہی و بربادی پھیلاتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئیں۔ ترکوں کے لئے یہ زمانہ قیامت کا [illegible]

حکومت تھی۔ اس لئے ترکی کو کسی عدل وانصاف کی توقع نہ تھی۔ مگر قدرت کے کارخانے نرالے ہیں۔ عین اسی تشویش انگیز حالت اور نازک زمانہ میں اناطولیا کے مشرقی مطلع پر آفتاب اُمید کی پہلی شعاع یوں نمودار ہوئی کہ ترکوں کے بیقاعدہ دستوں نے یونانیوں کی سختی سے مزاحمت کی۔ اور اتحادی ارباب حل وعقد بلا روک اناطولیہ کو فتح کرا دینا چاہتے تھے اس لئے اُن کی پالسی یہ ہوئی کہ کسی بااثر شخص کو اناطولیہ میں تعینات کرکے ترکی دستوں کو منتشر کرا دیا جائے۔ چنانچہ مصطفیٰ کمال پاشا کو ترکی فوج کا انسپکٹر جنرل بنا کر اس ہدایت کے ساتھ اناطولیہ بھیجا گیا۔ ترکی فوجی دستوں کو منتشر اور تمام سامان جنگ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس تقرر سے اتحادیوں کی یہ بھی مصلحت تھی کہ مصطفیٰ کمال پاشا جیسے طاقتور اور ہر دلعزیز شخص کو قسطنطنیہ سے نکال دیا جائے بہرصورت مصطفیٰ کمال قسطنطنیہ سے روانہ ہو کر ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو سامسون میں ساحل اناطولیہ پر آترے

مصطفیٰ کمال پاشا کا نام اسقدر مشہور تھا اور اُن کی عزت ترکوں کے دلوں میں اسقدر جاگزیں تھی کہ اناطولیہ کے دورہ میں جہاں کہیں بھی وہ گئے لوگ جوق در جوق اُن کے مطیع ہوتے گئے۔ اس دورے کے بعد اُنھوں نے ایک کانگریس ارض روم اور دوسری سیواس میں منعقد کی جس کے بعد انقرہ میں نیشنل اسمبلی کی بُنیاد ڈالی۔ اس طرح اُنھوں نے اپنی منتشر قوم کو متحد کرکے دشمنوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

یہ وقت مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے ساتھیوں کے لئے انتہائی مصیبت کا زمانہ تھا ایک طرف یونانی فوجیں اناطولیہ کے نہتے ترکوں پر ظلم توڑ رہی تھیں۔ دوسری جانب اتحادی طاقتیں قسطنطنیہ میں بیٹھی ہوئی یونانیوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ سلطان نے مصطفیٰ کمال پاشا اور اُن کے رفیقوں کو باغی قرار دیدیا تھا۔ اور شیخ الاسلام نے بھی دباؤ میں آکر مصطفیٰ کمال پاشا کے قتل کا فتویٰ دیکر اُنکے ساتھیوں کے خلاف جہاد کا حکم لگا دیا لیکن ان دوطرفہ مشکلات کے باوجود مصطفیٰ کمال پاشا کے فولادی ارادوں میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور ان کے استقلال کو انچ بھر بھی لغزش نہ ہوئی۔ اُنھوں نے سب سے پہلے یونانیوں کو روکنے کی فکر کی جو قتل و غارت کرتے بڑھتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ اناطولیہ کے مختلف مقامات کا جنگی سامان ایک مرکز پر لاکر جمع کر دیا۔ اور ترکوں کے دستوں کا جو ادھر ادھر لڑتے پھرتے تھے باقاعدہ لشکر بنا کر اور تھوڑی سی جنگی تربیت دیکر یونانیوں کے سامنے صف آرا کر دیا۔ یونانیوں سے ترکوں کے کئی معرکے ہوئے جنمیں کمال پاشا نے ایک شاطرانہ چال یہ چلی۔ کہ وہ یونانیوں کے سامنے سے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ اور یونانیوں کو اپنے تعاقب میں لگا کر دریائے سقاریہ کے کنارہ تک لے آئے۔ یہاں ترکی فوج کا ایک حصّہ پہلے ہی سے کمینگاہوں میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ جب یونانی سپاہ مسلسل فتوحات کی خوشی میں مطمئن موقعہ پر پہونچ گئی تو پسپا ہونے والی ترکی سپاہ نے یکایک پلٹ کر یونانیوں پر حملہ کر دیا۔ اور اشارہ پاتے ہی ادھر اُدھر کی ترکی فوجیں کمینگاہوں سے

یونانیوں پر آگ برسانے لگیں۔ اِس طرح دریائے سقاریہ کے کنارہ پر بائیس ۲۲ روز مسلسل جنگ ہوتی رہی۔ جسمیں ترک عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش شریک رہیں۔ وہ مقتولوں اور زخمیوں کو میدان سے اُٹھالاتیں، مُردوں کی تجہیز و تکفین اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں۔ لڑنیوالے ترک سپاہیوں کو راشن اور پانی پہونچاتیں اپنی کمر پر لادلادکر کارتوسوں کے بکس مورچوں میں پہونچاتیں۔ اِن عورتوں کی لیڈر خالدہ ادیب خانم تھیں۔ جو بعد میں ترکی کی وزیر تعلیم مقرر ہوئیں۔ یہ جنگ اِسقدر خونریز تھی کہ اس میں مصطفیٰ کمال پاشا کا گھوڑا زخمی ہوگیا۔ اور خود اُن کی ایک پسلی بھی ٹوٹ گئی۔ مگر وہ شدید درد و کرب کے باوجود بھی میدانِ جنگ میں ڈٹے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانیوں کو جنگ سقاریہ میں ایسی شکست فاش ہوئی کہ وہ سر پر پاؤں رکھکر بھاگے۔ اور پھر اُنکے قدم اناطولیہ میں نہ جمے۔ بالآخر مصطفیٰ کمال پاشا نے یونانیوں کو سمندر میں ڈھکیل کر اپنے وطن کو دشمنوں سے پاک کر کے اپنی ہمت و شجاعت کا معجزہ دکھادیا۔

جب یونانیوں کی شکست خوردہ سپاہ کا تعاقب کرتے ہوئے مصطفیٰ کمال پاشا سمرنا پہونچے۔ اس وقت معلوم ہوا۔ کہ یونانی فوجیں راتوں رات جہازوں میں بیٹھکر یوروپ کو فرار ہوگئیں۔ اور اس وقت تھریس میں ہیں، صرف اتحادیوں کے جنگی جہاز بندرگاہ میں لنگر انداز پائے گئے۔ تھریس جاکر شکست خوردہ یونانی سپاہ نے اپنی حالت از سرِ نو دُرست کرنا شروع کی۔ اگر اسوقت پر اُن کو تھریس سے نکالا نہ جاتا تو بڑی مشکل پڑتی۔ ترکوں کے پاس فوجکشی کے لئے جہاز موجود نہیں تھے۔ اِس لئے کمال پاشا نے خشکی کے راستے سے تھریس پہونچنے کی فکر کی۔ لیکن دردانیال کے کنارہ چناق میں ترکی فوجوں کو یوروپ جانے سے روکنے کیلئے انگریزی فوج موجود تھی۔ اِس فکر و تشویش کے وقت کمال پاشا نے ایک نئی چال یہ چلی۔ کہ اپنی پیادہ فوج کو اُلٹی رائفلیں لئے ہوئے صلح جویانہ ڈھنگ سے انگریزی فوج کی بارکوں کی طرف مارچ کرنے کا حکم دیا تاکہ کسی بات سے یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ لڑنے آئے ہیں۔ ترک فوج اِس طرح آگے بڑھی تو انگریزی فوج بہت سٹ پٹائی۔ اور اُس نے صف کر کے ترکوں کو روکا۔ قریب تھا کہ دونوں فوجوں میں تصادم ہوجائے کہ اتنے میں یہ افواہ اڑائی گئی کہ ہنگامی صلح ہورہی ہے۔ اِس لئے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ فوراً کمال پاشا نے اپنی فوج کو ڈٹ کر کھڑے ہوجانے کا حکم دیا۔ انگریز دب گئے اور کمال پاشا کی تمام شرطیں منظور کرلی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتحادیوں نے یونانیوں پر تھریس خالی کرنے کے لئے زور دیا۔ اور اس طرح یوروپین ٹرکی کا علاقہ مع ایڈریانوپل ۱۹۲۲ء کے صلحنامہ کی رو سے کمال پاشا کو واپس مل گیا۔ اس کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا سیدھے سمرنا پہونچے۔ جہاں ایک دولتمند ملک التجار کی صاحبزادی لطیفہ خانم سے اُن کی شادی ہوگئی۔

اب اتحادیوں کے لئے کمال پاشا کی گورنمنٹ اور ٹرکی کی آزادی تسلیم کرنیکے سوائے اور کوئی چارہ کار نہ رہا

چنانچہ ۲۴ نومبر ۱۹۲۳ء کو لوزان میں ایک صلحنامہ ہوا جسمیں باضابطہ طور پر ترکوں کی تمام شرطیں منظور کرلی گئیں۔

قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کے بعد ہی اتحادیوں نے عبدالوحید خاں کو سلطان ترکی بنا دیا تھا۔ لیکن جب کمال پاشا کو فتح حاصل ہوئی، تو سلطان موصوف کو ایک انگریزی جنگی جہاز میں بیٹھکر فرار ہونا پڑا۔ سلطان کے ساتھ خلافت اور شیخ الاسلام صاحب بھی تشریف لے گئے۔ کیونکہ آزادی حاصل ہونے کے بعد ترک قوم سلطنت اور خلافت سے بیزار ہوگئی اور ترکی کی گرانڈ نیشنل اسمبلی نے سلطنت کو مذہب سے الگ کرنے کا فیصلہ کرکے خلافت کو توڑ دیا اور مذہب کو حکومت سے علیحدہ کر دیا۔ اور ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق عبادت گذاری کا اختیار دیدیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں ترکی میں جمہوری حکومت قائم ہوئی اور مصطفیٰ کمال پاشا اس کے سب سے پہلے پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ہر چار سال بعد مصطفیٰ کمال ہی پریسیڈنٹ منتخب ہوا کئے، حتیٰ کہ مرتے دم تک وہی پریسیڈنٹ رہے۔

اپنے پندرہ سالہ مسلسل عہد صدارت میں مصطفیٰ کمال پاشا نے مردہ ترکی کو دوبارہ زندہ کردیا۔ اور اتنی قلیل مدت میں وہ کارنامے انجام دئے جو صدیوں میں بھی نہ ہوسکتے۔ سلاطین کے زمانہ میں قسطنطنیہ دارالخلافت تھا مگر کمال پاشا نے وسط اناطولیہ میں ایک گمنام اور ویران شہر انقرہ کو دارالحکومت قرار دے کر اُسے ایک اعلیٰ درجہ کا شہر بنا دیا۔ انھوں نے ہر شعبہ زندگی میں نئی اصلاحات کیں۔ مذہبی مدرسے اور خانقاہیں توڑ دیں۔ پردہ موقوف کیا۔ یوروپین لباس کو ترکوں کا قومی لباس قرار دیا۔ ترکی زبان سے تمام عربی اور فارسی الفاظ نکال دئے اور اس کا رسم الخط لاطینی قرار دیا۔ سلطنت توڑ کر خلافت کو اڑا دیا۔ کمال پاشا کو قوم نے ترکی کا تخت و تاج پیش کیا۔ مگر انھوں نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کئی شادیوں کا رواج بھی منسوخ کیا۔ ترکی کا قانون سوئزرلینڈ کے قانون کے نمونے پر بنایا گیا۔ عمامہ اور ترکی ٹوپی پہننے کی ممانعت کردی گئی۔ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق عطا کئے گئے۔ صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے جگہ جگہ کارخانے کھولے گئے۔ کانیں لائی گئیں۔ تجارت کو فروغ دینے کے لئے موٹر کی سڑکیں اور ریلوے لائنیں تعمیر کی گئیں۔ امپیریلزم کا خاتمہ کرکے تقریباً بیس لاکھ ترکوں کو یوروپ کے سابق ترکی علاقوں سے بلاکر اناطولیہ میں آباد کیا۔ اسکندرونہ اور انطاکیہ کا علاقہ فرانس سے واپس لیا۔ غیر قوموں سے دوستانہ تعلقات قائم کئے۔ اور بہت سی اصلاحیں کیں۔ مثلاً قمری سال کے بجائے یوروپین سال اور گز کے بجائے فرانسیسی میٹر جاری کیا۔ ترکی کی سب سے پہلی مردم شماری کرائی۔ غرض کمال پاشا نے ترکوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو درست کرنے کی پوری کوشش کی۔

مصطفیٰ کمال پاشا کو نمود و نمایش اور اخباری پروپیگنڈا سے نفرت تھی۔ مرنے سے پہلے جو کچھ اُنکے پاس تھا سب اپنی قوم کو دیگئے۔ افسوس ترکی قوم اسقدر جلد اُن کی رہنمائی سے محروم ہوگئی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

———

تنقید کتب

فانوس خیال

حیدر آباد دکن میں سید جلال الدین توفیق حیدر آبادی ایک مشہور و پُرگو شاعر گذرے ہیں جن کا کلام خود اُنھیں کی زندگی میں چودہ سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ مگر اس طرف اسکا کوئی نسخہ باقی نہ تھا۔ اس لئے اُن کے صاحبزادے سید امیر الدین توصیف نے اب اُس کا دوسرا اڈیشن نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے جسمیں موصوف کا سبھی طرح کا کلام غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ، نظم اور ٹھمریاں وغیرہ جمع کردی گئی ہیں۔ غزل میں توفیق صاحب غالب اور مومن کی نازک خیالیوں کا چربہ اُتارنے کی کوشش کرتے تھے اور نعت میں محسن کاکوروی کے مقلد ہیں۔ اُنھوں نے کئی جمی تلی ٹھمریاں، دادرے، دھرپد، ترانے وغیرہ لکھے ہیں۔ جن سے لکھنؤ کے کالیجرن اور بندادین وغیرہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ٹھمریوں۔ دادروں وغیرہ میں یہ اشارہ بھی کردیا گیا ہے کہ کس راگ یا راگنی میں گانا چاہئے۔ آخر میں میلاد کی محفلوں میں پڑھنے کے لئے ایک عمدہ سلام بھی درج ہے تمام اصناف سخن کے مختلف نمونوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ توفیق صاحب کی طبیعت جدت طراز اور ندرت پرداز تھی جیسا کہ ذیل کے اقتباسات سے خود ہی واضح ہوگا۔

حسن کو جمال کی نمایش کا شوق ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ اگر دیکھنے والے نہ ہوں تو آئینہ ہی دیکھکر یہ شوق پورا کیا جاتا ہے مگر شاعر اس حالت تنہائی کو آئینہ کے عکس کی وجہ سے خلوت نہیں سمجھتا۔ چنانچہ بقول توفیقؔ

چاہیں وہ آپ ہی جب اپنا تماشہ ہونا ان سے خلوت میں بھی ممکن نہیں تنہا ہونا

سچے عاشق کے حال میں توفیق صاحب کا یہ شعر بہت ہی برجستہ ہے ؎

اشک تو جاری ہیں نالوں کی صدا ہو کہ نہ ہو قافلہ راہی منزل ہے درا ہو کہ نہ ہو

لوگ کہتے ہیں کہ ہجر میں ضبط آہ مشکل ہے، مگر توفیق اس نظریہ کے خلاف کہتے ہیں ؎

دلِ سوزاں نے کی نہ [illegible] شعلہ منت کش ہوا نہ ہوا

تپشِ قلب کو تحریک نفس سے کیا کام شعلہ زن رہتی ہے یہ آگ ہوا ہو کہ نہ ہو

اکثر مجموعہ کلام رطب و یابس سے پاک نہیں ہوتے چنانچہ فانوس خیال [illegible] سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً ؎

دل میں دفتر بھرے ہوئے تھے مگر منہ سے اک حرف بھی ادا نہ ہوا
میری مٹی نہ ہوسکی برباد تجھ سے اتنا بھی اے صبا نہ ہوا

بعض شعروں میں پرانی "لکھنویت" جھلکتی ہے مثلاً

کشتۂ ابرو کیا دکھلا کے عارض یار کا پھول کے بدلے فلک نے پھل دیا تلوار کا
سیر ہوکر کشتۂ بیداد سوئے چین سے زخم کھانے تیر کے، پانی پیا تلوار کا
دیکھنی ہیں اے رگ دل تیری رنگ آمیزیاں آج گلدستہ بنا دے نشتر صیاد کو
درجاناں پہ چھوڑ آئے ہیں میری آہ کو نالے نشانہ پر بٹھا آئے تو ہیں تیر ہوائی کو
نگاہ شوق کو بھونکا جگر میں آبلے ڈالے خدا رکھے سلامت آتش دست حنائی کو

لیکن توفیق کے کلام میں زبان کے پُرلطف چٹخارے بھی موجود ہیں۔ دو چار شعر ملاحظہ ہوں ؎

آہ جب دل سے نکالی جائے گی کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی
ہے نظر دل پر نگاہ یار کی آج تو ظالم نہ خالی جائے گی
دست نازک پھر رنگے جائیں گے آج پھر رگ برگ حنا لی جائے گی
پھر شکایت میری اُن کے سامنے جھوٹ کے سانچے میں ڈھالی جائیگی

کسی شاعر کا توارد سے بچنا مشکل ہوتا ہے چنانچہ توفیق صاحب کے بعض اشعار بھی اس سے بری نہیں ہیں۔ مثلاً مشہور مصرعہ ہے "رہے لاکھوں برس ساقی ترا آباد میخانہ" توفیق صاحب اس خیال کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

دئے جا ہم کو اے ساقی تو پیمانہ پہ پیمانہ رہے آباد ہم رندوں کے سر پر تیرا میخانہ

یہ ایک پرانا شعر ہے ؎

کل شب وصل میں تو خوب بجی تھیں گھڑیاں آج کیا مر گئے گھڑیال بجانے والے

اسی مضمون کو حضرت توفیق نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

یہ آج کیا ہوگیا الٰہی، نہیں گذرتی ہے شب جدائی تھکے سب آخر بجانیوالے گجر ہزاروں بجا بجا کر

بعض جگہ مہمل الفاظ بھی استعمال ہوگئے ہیں۔ مثلاً ہوس کو جو ایک بُری چیز ہے۔ توفیق صاحب نے اچھے معنی میں استعمال کیا ہے ؎

کھوئے گئے ہم خود بھی، دل کو بھی گنوا بیٹھے اور داغ ہوس دل سے افسوس مٹا بیٹھے
اک شمع جو روشن تھی اس کو بھی بجھا بیٹھے

دوسرے مصرعہ میں "داغ ہوس" کے مٹنے پر اظہار افسوس کرنا بالکل عجیب بات ہے۔ اس مجموعہ کی لکھائی، چھپائی، کاغذ، جلد بندی وغیرہ میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔

صبح مشرق[1]

یہ محمد صادق ضیا چینوٹوی بی۔ اے، ایل ایل بی وکیل آگرہ کے شگفتہ کلام کا مجموعہ ہے۔ جسمیں چھوٹی بڑی اکیاون نظمیں اور بہتر ۷۲ غزلیں درج ہیں جو لائق مصنف نے طالب علمی کے زمانہ میں کہی تھیں۔ ضیا صاحب اگرچہ نوعمر شاعروں میں ہیں اور اُن کی شاعری کی ابتدا صرف ۱۹۲۱ء سے ہوتی ہے۔ تاہم آپ کے کلام میں اچھی خاصی پختگی پائی جاتی ہے۔ نظموں میں مناظرِ قدرت اور جذبات قلبی کی تصویریں خوب کھینچی ہیں۔ غزلیں بھی خوب ہیں۔ دو دو غزلوں کے مطلعے ملاحظہ ہوں ؎

پرکھنا ہے جو دُنیا کو تو پہلے کر نظر پیدا　　کہ اپنی ہی نظر کرتی ہے تنقیدی اثر پیدا

دیگر

پردۂ ساز میں بھی سوز کا حامل ہونا　　شمع سے سیکھ شریکِ غمِ محفل ہونا

غرض نظموں میں دلکشی اور غزلوں میں تغزل کا کافی عنصر پایا جاتا ہے۔ لکھائی، چھپائی روشن، کاغذ عمدہ، ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۲۵۶ صفحات۔

جوئبار[2]

یہ مسٹر نعیم حسین ظفر ناظم انجمن ارباب ادب ملتان چھاؤنی کی تیس ۳۰ نظموں، سات ۷ ہندی چیزوں اور ستائیس ۲۷ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ظفر صاحب پنجاب کے نوعمر اور نوآموز شاعروں میں ہیں اور کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ فطرت نے آپ کو شاعری کا مادہ ودیعت کیا ہے۔ نظموں میں منظر نگاری کے علاوہ جذبات کی ترجمانی اور خیالات کی بلند پردازی بھی پائی جاتی ہے اور کلام میں روانی اور جذبات میں اُمنگ بھی موجود ہے۔ ترکیبیں بھی چُست ہیں۔ لیکن ابھی پختگی حاصل نہیں ہوئی۔ اُمید کہ حضرت احسان بن دانش کے فیض سے یہ کمی بھی جلد ہی پوری ہو جائے گی۔ ضخامت ۹۵ صفحات۔

باغی[3]

جب سے اُردو کی شاعری نے نیا چولہ بدلا ہے۔ اسمیں غزلوں کے مقابلہ میں نظمیں لکھنا زیادہ عام ہوتا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ قوم کو بیدار کرنے کے لئے قومی نظمیں زیادہ لکھی جاتی تھیں۔ مگر اب اس قومی جوش نے دوسرا رنگ اختیار کیا ہے یعنی اب مزدوروں اور کسانوں کی حالتِ زار دکھانے اور زمیندار و سرمایہ داروں کو خون

---

[1] قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ قصر الادب آگرہ۔ [2] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ قصر اُردو، ملتان چھاؤنی

[3] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ ایوان ادب، اُردو بازار، جامع مسجد دہلی

چوسنے والی جونکیں ثابت کرنے میں زیادہ زورِ قلم صرف کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی جاذب صاحب قریشی دہلوی بی۔اے نے بڑی حد تک یہی ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ اور اس مجموعہ کی جو ابتدائی بیس نظمیں ہیں اُن کا عام عنوان "مزدور اور سرمایہ دار" رکھا گیا ہے۔ اِن نظموں میں مزدوروں اور کسانوں سے اظہار ہمدردی اور سرمایہ داروں سے اظہار بیزاری کیا گیا ہے اور مہاتما گاندھی کو سرمایہ داروں کا ہمدرد سمجھ کر اُن پر چھینٹے بھی اُڑائے گئے ہیں۔ مثلاً ؎

غلام پھر بھی غلام ہوں گے، وطن پرستی ہی ایک دھوکا ‖ یہ ساہوکاروں کے سب ہیں ہتھکنڈے کہاں کے گاندھی کہاں کے چرخے

سرمایہ داروں کے علاوہ مقتدایانِ مذہب پر بھی نزلہ گرایا گیا ہے۔ اس قسم کی نظموں کا عنوان "مذہب اور اُس کے اجارہ دار" ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ ریاکاروں میں وہ تمام عیوب ہوتے ہیں جو جاذب صاحب نے بیان کئے ہیں۔ لیکن سبھی پیشوایانِ دین کو ایک لکڑی سے ہانکنا ٹھیک نہیں ہے۔ تیسرے حصہ میں "وطنیت وسیاسیات حاضرہ" کے متعلق نظمیں ہیں۔ جنہیں بہت کافی تنوع ہے۔ چوتھے حصہ میں قطعات ہیں۔

بعض نظموں میں ایسے الفاظ اور ترکیبیں آگئی ہیں جو متانت وسنجیدگی سے گری ہوئی ہیں۔ فاضل مصنف کے خیالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کٹر سوشلسٹ واقع ہوئے ہیں۔ بہرحال اُن کی نظمیں پرلطف اور موثر ہیں۔ حالانکہ بہت سی نظمیں ہزلیات کا رنگ بھی لئے ہوئے ہیں۔ کتابت عمدہ، طباعت روشن، کاغذ اچھا، چھوٹی تقطیع، ضخامت ۱۲۶ صفحات۔

سولہ سنگار

یہ کتاب ملک کے مشہور ادیب و افسانہ نگار مہاشہ سدرشن جی کے سولہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے، مہاشہ سدرشن کسی تعریف و تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ تمام عمر تصنیف و تالیف میں گذر رہی ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے سولہ افسانے ہیں جو اپنی اپنی جگہ سب دلچسپ و دلکش ہیں۔ لیکن ان میں (۱) سورداس، (۲) ڈو ڈاکٹر (۳) مزدور، اور (۴) ڈو دوست خاص طور پر موثر و دلچسپ ہیں زبان بھی کافی سلیس ہے، لکھائی چھپائی اوسط، کاغذ عمدہ، انگریزی وضع کی جلد چھوٹی تقطیع کے ۲۵۰ صفحات حجم۔ قیمت عہ

انتظام کتب خانہ

ملک میں لائبریریوں اور کتبخانوں کی تعداد روزمرہ بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن اُن کے انتظام وتحفظ کے طریقے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ شیخ محبوب قریشی صاحب حیدرآباد دکن نے یہ چھوٹا سا رسالہ لکھ کر ایک علمی خدمت انجام دی ہے۔ اس میں کتبخانہ کی عمارت، کتبخانہ کی آرائش، کتابوں کی حفاظت اور اُن کے رکھ رکھاؤ کے متعلق تمام ضروری معلومات درج ہیں۔ قیمت چار آنہ ۔ ملنے کا پتہ :- محبوبیہ کارخانہ جلدسازی، [illegible]

رفتارِ زمانہ

ممالکِ غیر

یورپ | چیکوسلاویکیہ کا قصہ برطانیہ کی ایما و تائید سے پاک کر دینے کے بعد ہٹلر کی دھواں دھار تقریروں کا روئے سخن اب خود برطانیہ کی طرف ہے اور وہ اپنی پُرانی نوآبادیوں کی واپسی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ برطانیہ کے برسراقتدار مدبران نے زیکوسلاویکیہ کی قربانی امن عالم کے تحفظ میں جائز قرار دی تھی، اُس وقت دوسرے ملک کے بھینٹ چڑھانے کا سوال تھا، اب خود برطانیہ سے قربانی کا مطالبہ ہے اور جو مشورہ برطانیہ نے چیکوسلاویکیہ کو امنِ عالم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کا دیا تھا وہی چیکوسلاویکیہ برطانیہ کو دے سکتا ہے۔

خود برطانیہ میں ایک پارٹی ہے جس کی رائے ہے کہ جرمن نوآبادیات جرمنی کو واپس دے دی جائیں، چنانچہ پروفیسر نارمن سائنکس نے حال میں لیورپول میں ایک تقریر کے دوران میں کہا کہ اگر یورپین جنگ کے روکنے کے لئے زیکوں سے قربانی کے لئے کہا گیا تو کوئی وجہ نہیں کہ برطانیہ اور نوآبادیاں بھی اس لحاظ سے قربانی کے لئے پیش قدمی نہ کریں۔ ہرچند مدبران برطانیہ نے رائن لینڈ میں جرمن فوجوں کے داخل ہو جانے پر فرانس کو روک تھام کر کے اور اس کے بعد تسخیر آسٹریا کے پہلے ہٹلر کے حسب منشا اعلانات کر کے اور چیکوسلاویکیہ کو ہٹلر کی نذر کر کے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی، مگر ان کارروائیوں کے باوجود اب بھی یہی فکر لاحق ہے کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور برابر یہی دھڑکا لگا ہوا ہے کہ حالات بالآخر کیا سے کیا صورت اختیار کریں۔ اسی خوف سے برطانیہ اپنی تمامتر توجہ توسیعِ اسلحہ کی طرف مبذول کر رہا ہے۔

فرانس بھی اپنے اندرونی اختلافات اور اقتصادی مشکلات سے ہنوز عہدہ برآ نہیں ہو سکا، اور جرمنی کی طرف سے کچھ اتنا خائف ہو رہا ہے کہ ہمہ تن و ہمہ وقت اپنی اندرونی کمزوریوں کے دُور کرنے کی فکر میں ہے۔ چنانچہ اس کے وزیر مالیات نے ایک اسکیم تیار کی ہے جس کی رو سے فرانسیسی سکّہ فرانک کی قیمت تبادلہ میں تخفیف کر دی جائیگی اور اس طرح فرانس کے بنک کے پاس سونے کا جو اسٹاک موجود ہے اس کی قیمت میں ساڑھے سترہ کروڑ پونڈ کا خود بخود اضافہ ہو جائیگا چنانچہ یہ سارا منافع اسلحہ و جنگ کی تیاری اور فوجی طاقت کے اضافہ میں صرف کر دیا جائیگا۔ مزدوروں کو زیادہ وقت کام کرنا پڑیگا جس کے لئے انھیں مزید اُجرت دی جائیگی، جو مزدور زیادہ وقت تک کام کرنے سے انکار کریں گے وہ فی الفور برخاست کر دئے جائیں گے اور مالکان کارخانہ جات کو آئندہ چھ مہینے تک کام نہ دینے کا حکم امتناعی جاری کر دیا جائیگا، اور

بے روزگاری کے الاؤنس سے بھی وہ محروم کردیئے جائیں گے۔ لوگوں پر نئے ٹیکس بھی عاید کئے جا رہے ہیں، پرانے ٹیکسوں میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ غرض اس وقت تمام ممالک توسیع اسلحہ کے جنون میں جنگی سامان بنانے کے کارخانے کھولتے چلے جا رہے ہیں مگر تابکے وتا بکجا" چاہے کسی ملک کے باشندے ہوں آخر کب تک ٹیکسوں کے بار کے متحمل ہو سکتے ہیں اور کہاں تک ان ٹیکسوں کے ذریعہ فوجی اخراجات میں مسلسل اضافے کی پالیسی پر عمل درآمد کیا جا سکتا ہے؟ اگر یورپ کے ممالک اسلحہ بندی کے اسی جنون میں مبتلا رہے تو جلد ہی ہر ملک کے لئے روزافزوں فوجی اخراجات کے لئے زر ونقد کے انتظام کا سوال ایک ناقابل حل مسئلہ بن جائیگا اور ہر ملک کو یہی صورت نظر آئے گی کہ کسی طرح جنگ کرکے ایسے نئے ممالک حاصل ہو جائیں جن سے اُس کے اقتصادی ذرائع میں وسعت ہو اور ملک کی مالی حالت ترقی کر سکے کیونکہ اگر جنگ نہ کی گئی تو حکومت اخراجات کی، اور رعایا بڑھتے ہوئے ٹیکسوں کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ اٹلی میں یہی صورت ظہور پذیر تھی جس کی وجہ سے اُسے پہلے ابی سینیا کے ساتھ اور پھر اسپین میں جنگ کرنا پڑی جاپان کو بھی اس صورتِ حال کے پیش نظر میدانِ جنگ میں اپنی فوجیں اُتارنا پڑیں۔ جرمنی کے سامنے بھی یہی مسئلہ درپیش ہوا کہ اگر وہ توسیع مملکت نہیں کرتا تو وہ اپنی وسیع فوج کو قائم رکھنے کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا، آسٹریا تسخیر کر لینے کے بعد اگر چیکوسلاویکیہ کا معاملہ ہٹلر کی مرضی کے مطابق طے نہ ہو جاتا تو ہٹلر کو ضرور بالضرور جنگ چھیڑنا پڑتی۔ یہ خیال کہ وہ محض دھمکیاں دیکر کامیاب ہو گیا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ وہ واقعی جنگ کے لئے آمادہ تھا۔ ان ممالک نے اگر اس امر پر عملی توجہ نہ کی کہ ایسی تدابیر پر عمل کریں جن سے سامان جنگ بنانے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے تو تھوڑے ہی ردوبدل کے بعد تمام کارخانے دوسری اشیاء کی ساخت کے کام میں لائے جا سکیں گے۔ نیز اگر یہ خیال نہ رکھا گیا کہ ان کارخانوں کے مزدوروں کو پہلے ہی سے اس لایق بنا دیا جائے کہ ان کو اس کام سے ہٹا کر دوسری چیزوں کی ساخت کے لئے لگایا جا سکے تو یقیناً (جیسا کہ گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد ہوا تھا) ایک مرتبہ پھر دنیا میں بے روزگاری ایک حادثۂ عظیم بن کر نمودار ہوگی۔ اس خطرہ سے حفاظت کی ایک مؤثر تدبیر یہ ہے کہ جس طرح توسیع اسلحہ پر کثیر رقمیں خرچ کی جا رہی ہیں اُسی طرح ہر ملک کی حکومت ایک ریزرو فنڈ بھی قائم کر دے جس میں زیادہ سے زیادہ رقم فراہم کر کے اس غرض سے داخل کر دی جائے کہ جب کبھی دوسری جنگ عظیم کے بعد یا بین الاقوامی سمجھوتہ ہو جانے پر ایسی صورت ظہور پذیر ہو کر توسیع اسلحہ کی پالیسی روک دی جائے اور جنگی سامان بنانے کے کارخانے بند کر دیئے جائیں تو مذکورہ بالا فنڈ سے رفاہ عام کے کاموں اور دیگر تعمیرات کا سلسلہ فوراً شروع ہو جائے، تاکہ اسلحہ جنگ کے کارخانوں کے نکلے ہوئے مزدور اور فوج سے علیحدہ شدہ رنگروٹ ان کاموں میں لگائے جا سکیں

ٹرکی اتاترک کمال پاشا کی موت ٹرکی جدید کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے جس سے اس کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ کسی زمانہ میں ٹرکی کو یورپ کا مرد بیمار کہا جاتا تھا، اس قالب بے جان میں نئی روح پھونک کر اور اس کے

جسم نحیف و زار میں خون صالح پیدا کر کے دوسری طاقتوں کے ہم پلّہ بنانے کا کام معجزہ سے کم نہ تھا۔ آتاترک کی موت کے بعد اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اب بھی ٹرکی جدید اُسی شاہراہ پر جس پر اُس کے بانی مبانی نے اُسے ڈالا ترقی کے ساتھ گامزن رہیگا یا اُس کے قدم پھر پیچھے ہٹنے شروع ہو جائیں گے؛ کمال پاشا کے حین حیات جب کبھی قدامت پرست طبقہ نے فتنہ و فساد برپا کرنا چاہا تو کمال پاشا نے فوراً اُس کے حوصلے پست کر دیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دبا ہوا فتنہ پھر اُٹھکر کل ملک پر غالب آتا ہے یا وہ نوجوان طبقہ جو کمال پاشا کے زیر اثر تھا اب بھی قدامت پرست طبقہ کو دبائے رکھیگا۔ اس کا جواب مستقبل ہی میں ملیگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر کمال پاشا کو قضا چند سال کی بھی مہلت دیتی تو نوجوان طبقہ کی پوزیشن اور زیادہ مستحکم ہو جاتی، اور یہ خطرہ جس کا ذکر اوپر ہوا ہے لاحق نہ رہتا۔ بہرحال یہ بات اطمینان بخش ہے کہ آتاترک کمال پاشا کے جانشین جنرل عصمت پاشا انو نو منتخب ہوئے ہیں جو عرصۂ دراز تک مرحوم آتاترک کے دست راست رہے ہیں اور ان کے ساتھ تیرہ سال تک مسلسل وزیر اعظم کے فرائض انجام دیے ہیں۔ آپ کا انتخاب ہر حیثیت سے موزوں ترین ہوا ہے۔ ہم کو اُمید ہے کہ آپ آتاترک کے پروگرام پر اُسی اسپرٹ میں عملدر آمد کرنے کے لئے ان کے بہترین جانشین ثابت ہونگے۔

فلسطین فلسطین کی تقسیم کی جو اسکیم پیل کمیشن نے تجویز کی تھی اُسے وُوڈ ہیڈ کمیشن نے فضول و ناقابل عمل قرار دے کر رد کر دیا ہے اور اب یہ تجویز پیش کی ہے کہ ایک گول میز کانفرنس کر کے عربوں اور یہودیوں کا سمجھوتہ کرا دیا جائے۔ اس کانفرنس میں دیگر عرب ریاستوں اور یہودی ایجنسی کے نمایندوں کو بھی مدعو کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ مگر عربوں کے نمایندوں کے متعلق یہ قید لگا دی گئی ہے کہ حکومت برطانیہ جن لیڈروں کو دہشت انگیزی کا ذمہ دار سمجھتی ہے انھیں اس کانفرنس میں شریک نہ ہونے دے گی۔ عربوں کو یہ شرط بہت ناگوار ہوئی ہے اور دمشق کی دفاعی کمیٹی نے بھی برطانیہ پر واضح کر دیا ہے کہ اگر عرب کی ایک انچہ زمین بھی یہودیوں کو دی گئی تو عربوں کو یہ فیصلہ قابل قبول نہ ہوگا۔ بظاہر اسباب اگر برطانیہ نے فلسطین کے معاملہ میں وہی رویہ اختیار کیا جو ووڈ ہیڈ کمیشن کی رپورٹ سے ظاہر ہو رہا ہے تو ہم کو خوف ہے کہ عرب عوام بغاوت کر دیں گے۔ ان حالات میں فلسطین کی گول میز کانفرنس کی کامیابی کی اُمید موہوم ہے۔

بہرصورت اگر کانفرنس کے ذریعہ یہودیوں اور عربوں میں مصالحت نہ ہوئی تو پھر حکومت برطانیہ جو حل مناسب سمجھے گی اس پر عمل درآمد کرائیگی۔ برطانیہ نے جو فوجیں فلسطین میں عربوں کی دہشت انگیزی فرد کرنے کے لئے بھیجی ہیں ان پر معمول سے سترہ لاکھ پونڈ زیادہ صرف ہوا ہے۔

جرمنی میں یہودیوں پر مظالم جرمنی میں جرمن نسل کو بجنسہ اپنی اصلی حالت میں قائم رکھنے کی پالیسی کوئی نئی تحریک

نہیں مگر ہٹلر نے جس سختی سے اس پر عمل درآمد کیا ہے وہ انسانی تہذیب پر ایک ایسا بدنما داغ ہے جس کی موجودگی میں اس تہذیب پر تہذیب کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ نازیوں کی فرعون مزاجی نے بیچارے یہودیوں کے عبادتخانے جلوا دیئے ان کی دوکانیں لوٹ لی گئیں، ہزاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور اُن کی ملکیت کا پانچواں حصہ ٹیکس کے نام سے ضبط کر لیا گیا۔ اب انھیں کوئی ہتھیار رکھنے کی بھی اجازت نہیں۔ یہ سب ظلم اکثر پر اس بہانہ سے ڈھایا جا رہا ہے کہ کسی یہودی نوجوان نے حال میں فرانس میں ایک اعلیٰ جرمن افسر کو ہلاک کر دیا تھا کسی فرد واحد کی غلط کاری کا بدلہ اُس کی قوم سے لینا نہ اخلاق اور نہ سیاسیات ہی کے کسی اُصول پر جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ نازیوں کا یہ خیال ہے کہ گذشتہ جنگ عظیم میں یہودیوں نے غداری کی اور حریفوں سے ملے رہے۔ بہرحال جرمنی کے وزیر نشر و اشاعت نے حال ہی میں یہ بیان شائع کیا ہے کہ یہودیوں کا مسئلہ کم سے کم وقت میں جرمن قوم کے حسب دلخواہ حل کیا جائیگا۔ اس وقت امریکہ اور انگلستان بلکہ ساری دنیا میں جرمن مظالم پر اظہار نفرت ہو رہا ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں بھی یہ سوال زور شور سے اٹھایا گیا، اور پریسیڈنٹ امریکہ نے بھی اس پر اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ ہٹلر کو یہ دونوں باتیں بہت ناگوار ہیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں انصاف پسند لوگوں کا ایسا قحط نہیں ہو گیا ہے کہ ان مظالم کی آواز بازگشت نہ سُنائی دے۔

مشرق بعید کینٹن اور ہانکاؤ فتح ہو جانے کے بعد خیال کیا جاتا تھا کہ چین اب مزید مقابلہ کی تاب نہ لا سکے گا اور جس طرح بھی ممکن ہوگا جاپان سے صلح کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ لیکن چینیوں کا حیرت انگیز استقلال یہ اُمید دلاتا ہے کہ اگر چینی ذرا اور ثابت قدم رہے اور روس یا برطانیہ نے اُن کی تھوڑی سی امداد کی تو جنگ طول پکڑے گی۔ اور بالآخر جاپان مالی مشکلات سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گا۔ اس طرح اب بھی جنگ کا پانسہ بالآخر پلٹ سکتا ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ چین کو ابھی تک کوئی فاتح ہضم نہیں کر سکا اور نئے اور پُرانے چین میں بڑا فرق ہے۔ اب یہ ملک پہلے کی طرح بیجان و غیر منتظم نہیں ہے، اور جاپان کی خونریزی نے اہل چین کے حوصلے پست کر دینے کے بجائے اُن کے جذبۂ قومیت کو اور مشتعل کر دیا ہے۔ چین کو بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ اُسے کسی دوسرے ملک سے رسد کا سامان منگانے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت اس کے پاس اسلحہ جنگ بھی اتنے کافی موجود ہیں کہ ابھی کم سے کم چند مہینوں تک تو وہ آسانی سے جنگ جاری رکھ سکتا ہے۔ لیکن اس مرتبہ شمال کی جانب پہلے کی طرح چینیوں کے حملے کامیاب نہیں ہو رہے ہیں، اور جاپانیوں نے جنوب کی طرف اپنے حملوں سے چین کو اور بھی پریشان کر دیا ہے۔ جس سے یہ خیال غیر ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ چین کو بالآخر صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

جاپان کو بھی روس کی طرف سے خطرہ ہے کہ اگر اُس نے کسی معاملہ میں فساد برپا کر دیا تو وہ مزید الجھن میں پڑ جائیگا لہٰذا اس کی بھی کوشش ہے کہ چین کو جلد سے جلد پسپا کر دے۔ اس کے ساتھ ہی جاپان کو برطانیہ اور فرانس کی،

کمزوری کا بھی پتہ چل گیا ہے کہ یہ دونوں اس وقت کسی بڑی جنگ کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ چیکوسلاویکیہ کی حالت دیکھکر اس کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اُس نے برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی اس متحدہ درخواست کو کہ انھیں یانگٹسی میں تجارتی جہاز چلانے کی اجازت دی جائے۔ یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ دریائے یانگٹسی میں تجارتی جہاز چلانے کی آزادی دینے سے جنگی جہازوں کی آمدورفت میں خلل واقع ہوگا۔

ہندوستان

برہما میں ہندوستانیوں کا مستقبل اس وقت برہما میں ہندوستانیوں کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے۔ حال کے فسادات میں جو ظلم وستم ہندوستانیوں پر ڈھائے گئے اور اب بھی جو سلوک برہمی مفسدین ہندوستانیوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں وہ کسی طرح تسلی بخش نہیں۔ فسادات کی تحقیقات کے لئے گورنر برہما نے جو تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا ہے اسمیں دو ہندوستانی دو برہمی اور ایک یوروپین شامل ہیں۔ ہندوستانی باشندگان برہما کو اس ٹریبونل سے اطمینان نہیں ہوا اس لئے انجمن اقلیتہائے برہما نے سکرٹری آف اسٹیٹ سے درخواست کی ہے کہ وہ گذشتہ فسادات کی تحقیقات کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کردیں۔ حکومت ہند کو اس معاملہ میں پوری توجہ دینی چاہیئے اور جو نقصان ہندوستانیوں کے جان ومال کا ہوا ہے اُس کی تلافی کی پوری کوشش کرنا چاہیئے۔

مرکزی اسمبلی مرکزی اسمبلی میں حکومت کی طرف سے فیڈریشن کے متعلق سوالات کے جو جوابات دئیے گئے ہیں وہ کسی طرح سے تسلی بخش نہیں کہے جاسکتے۔ چنانچہ کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ کے لیڈر اس کے متعلق تحریک التواء پیش کرنے کے لئے مشورہ کررہے ہیں۔ تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ اگر برٹش گورنمنٹ اور ریاستوں کے درمیان کوئی معاہدہ بلامشورہ برٹش انڈیا کیا گیا تو وہ اہل ملک کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔

انکم ٹیکس بل پر کانگریسی ممبر مسٹر وینکٹا چالم کی تقریر کانگریس کارکنان کے خلاف ہوئی۔ موصوف نے اس بل پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور مسٹر ستیہ مورتی ممبران سلیکٹ کمیٹی پر خواہ مخواہ یہ الزام لگایا کہ وہ دزیمالیات کے بہکانے میں آکر یہ سمجھ بیٹھے کہ صوبوں کو اس بل سے زیادہ روپیہ مل جائیگا۔

ڈیفنس سکریٹری نے گورکھوں کی بہادری کے راگ الاپتے ہوئے یہ اعلان کیا ہے کہ گو اہل ہند اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ہندوستانی فوج میں غیر ہندوستانیوں کو بھرتی کیا جائے، لیکن گورکھے ایکسو بیس [۱۲۰] برس سے ہندوستانی فوج میں بھرتی ہورہے ہیں، اس لئے گورنمنٹ اس قدیم رواج کو توڑنا مناسب نہیں سمجھتی۔ مسٹر عبدالقیوم نے اس سلسلہ میں بنگالیوں، مدراسیوں اور مرہٹہ لوگوں کو گورکھوں کی جگہ فوج میں بھرتی کرنے کی سفارش کی۔ لیکن گورنمنٹ ہند کی طرف سے مسٹر آگلوی ڈیفنس سکریٹری نے اس تجویز کو منظور نہیں کیا اور کہا کہ پچھلی جنگ عظیم میں ہر طبقے سے رنگروٹ بھرتی کئے گئے تھے۔ اس پر مسٹر پانڈے نے یہ تجویز کیا کہ گورنمنٹ کو کم ازکم اُن

پابندیوں کو منسوخ کرادینا چاہیئے جو ہندوستانیوں کے داخلۂ نیپال کے متعلق عائد ہیں۔ مسٹر ستیہ مورتی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ مبلغ دس لاکھ روپیہ سالانہ کی جو امداد نیپال کو دی جاتی ہے اُسے فوراً بند کردیا جائے مگر اس مشورہ کی بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

یو۔ پی اسمبلی اور کاشتکاری بل

صوبۂ متحدہ کی قانونی اسمبلی کے پچھلے اجلاس میں منتخب کمیٹی کے ترمیم شدہ لگان بل پر مباحثہ ہوا۔ نواب محمد یوسف صاحب نے تجویز کیا کہ پہلے ایجنڈا کی دوسری مدوں پر غور کیا جائے۔ اس کے بعد اس بل پر غور وخوض کیا جائے۔ لیکن وزیراعظم نے اس معاملے کو کھٹائی میں ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور کہا کہ نواب صاحب ممدوح کو خواہ مخواہ اس بل کے راستہ میں روڑے نہ اٹکانا چاہیئے۔ اور اسمبلی کو اس بل کا فیصلہ بلا مزید تاخیر کے کردینا چاہیئے۔ اس وقت لوگ بالخصوص غریب کاشتکار انتہائی انتظار کے ساتھ اس کی طرف اُمیدیں لگائے ہوئے ہیں۔ زمینداروں کو کافی مہلت و موقع دیا جاچکا ہے اور حکومت ایک معقول باہمی سمجھوتہ کے لئے ہر طرح سے کوشش کرچکی ہے۔ مگر آٹھ مہینے ہوگئے اور مصالحت کی کوئی صورت نہ نکلی۔ ایسی صورت میں اب اس کو مزید معرض التوا میں ڈالنا کسی طرح مناسب نہیں۔ چنانچہ وزیر مال نے اس بل پر مفصل غور کی تحریک کی۔ اور اپنی تقریر میں اُن سیاسی چالوں کو واضح کیا جن کی بنا پر سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اختلافی نوٹ لکھے گئے ہیں۔ آپ نے کہا کہ مسلم لیگ نے اس کے متعلق یہ وطیرہ اختیار کیا ہے کہ ادھر زمینداروں سے بھی ملی رہے اور اُدھر کاشتکاروں کو بھی اپنی ہمدردی جتاتی رہتی ہے۔ بقول شاعر ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

زراعتی بل کی بابت مسلم لیگ کی یہ رائے ہے کہ اس کا اور فرقوں پر اتنا اثر نہیں پڑتا ہے جتنا کہ مسلمانوں پر، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ صوبۂ متحدہ کی مسلم آبادی صرف چودہ فیصدی ہے اور دیہاتی آبادی میں صرف دس فیصدی مسلمان ہیں۔ لیگ نے دوسرا شگوفہ یہ چھیڑ رکھا ہے کہ اس بل سے کاشتکاروں کے بمقابلہ سیاہوکاروں کو زیادہ فائدہ پہونچیگا۔ حالانکہ اس بل کی رو سے اگر کسی زمیندار کی زمین فروخت بھی ہوجائے تو جو اراضی تین سال سے اس کی کاشت میں ہے وہ اسی کی ملکیت میں رہے گی۔ پہلے بجائے تین سال کے دس سال کی شرط تھی۔ وزیراعظم نے اپنی تقریر میں اس اتہام بیجا کی بھی تردید کی کہ یہ مسودۂ قانون کاشتکاروں کو فائدہ پہونچانے کیلئے نہیں بلکہ ایک محض سیاسی مقصد کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ آپ نے بتلایا کہ اس کی تمام تر غرض وغایت یہی ہے کہ کروڑوں کسانوں کا بوجھ ہلکا ہوجائے۔ موصوف نے زمینداروں سے یہ بھی اپیل کی کہ وہ کاشتکاروں کو فائدہ پہونچانے کے لئے قربانی کرنے سے دریغ نہ کریں۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ سیر کے معاملہ میں گورنمنٹ نے انصاف سے کام لیا ہے۔ کیونکہ دراصل سیر وہ اراضی ہے جو زمیندار اپنی خاص کاشت میں رکھتا ہو مگر

صوبہ کے بڑے بڑے زمینداروں کی سیر دوسروں کی کاشت میں ہے۔ اگر اس پہلو کو مدِ نظر رکھا جائے کہ سیر دراصل وہی زمین ہے جو حقیقتاً زمیندار کی کاشت میں ہو تو وزیر اعظم کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ زمینداروں کی سیر میں ایک انچ کی کمی بھی نہ ہوگی کیونکہ وہ پچاس ایکڑ تک زمین رکھ سکتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے لئے ان کی خود کاشت کی زمینیں ہیں۔ آپ نے کہا کہ اس بل پر عمل درآمد کے بعد سال بھر ہی میں کسان محسوس کرنے لگیں گے۔ کہ اُن کی حالت پچھلے سو سال سے کہیں بہتر ہو گئی ہے۔

نواب صاحب چھتاری نے اس بات پر زور دیا کہ اس بل کو سیاسی معاملہ نہ بنانا چاہیئے۔ راجہ صاحب جہانگیر آباد نے خیال ظاہر کیا کہ وزیر اعظم نے جابندارانہ رویّہ اختیار کیا ہے۔ بہرحال جب سے باہمی مصالحت سے نا اُمیدی ہو گئی ہے فریقین زیادہ صفائی سے ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے ہیں۔ زمیندار صاحبان بڑی بڑی کانفرنسیں کر رہے ہیں اور دھوم دھامی جلوس نکال رہے ہیں۔ لیکن کاشتکاروں کو رضامند کرنے اور اُنھیں خوشحال بنانے کی کوئی عملی کارروائی نہیں کر رہے ہیں۔ گورنمنٹ اسمبلی سے اس بل کو پاس کرانے پر تُلی ہوئی ہے، اور انتخابی وعدوں پر نظر کرتے ہوئے وہ اس کو جلد پاس کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ دوسری خواندگی کثرت رائے سے منظور ہو چکی ہے۔ ۲۰۔ نومبر سے پھر اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا ہے۔ چنانچہ اس سشن میں یہ مسودہ پاس ہو کر قانون بن جائے گا۔

ریاست راجکوٹ میں متوازی حکومت

راجکوٹ میں عوام اور اہلکارانِ ریاست کے درمیان مصالحت کی جو گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ ناکامیاب رہی۔ اور اب یہ قضیہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک طرف حکام ریاست جبر و تشدد پر مستعد ہو گئے ہیں۔ دوسری جانب عوام ستیہ گرہ پر تُل گئے ہیں۔ بمبئی سے جو ستیہ گرہی آئے تھے وہ گرفتار ہو چکے ہیں۔ اب اور جتھے کاٹھیاواڑ اور گجرات سے آنے والے ہیں۔ حیدر آباد دکن میں بھی زور شور سے ایجی ٹیشن شروع ہوا ہے۔ ان واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اب ریاستوں میں بھی عوام بیدار ہو چکے ہیں اور اپنے حقوق طلب کرنے کے لئے منظم طور پر جد و جہد کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں تشدد کی پالیسی کامیاب نہ ہوگی بلکہ اس سے عام جذبات اور زیادہ مشتعل ہو جائیں گے۔ بحالت موجودہ ہم کو خوف ہے کہ اگر ہمارے ریاستوں کے فرمانرواؤں نے دانشمندی اور دُور اندیشی سے کام نہ لیا اور اپنی رعایا کے جائز مطالبات کو پورا کر کے ان کی تالیف قلوب نہ کی تو اس کا انجام کچھ اچھا نہ ہوگا۔ راجکوٹ کی ریاست نے رعایا کے مطالبات نامنظور کر دئے ہیں۔ اس لئے رعایا نے بھی ریاست کے محکموں کا بائیکاٹ کرنے اور متوازی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دیکھئے اس کشمکش کا بالآخر کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

علمی خبریں اور نوٹ

"اُردو۔ہندی۔ہندستانی" کے متعلق جو بحث عرصہ سے زمانہ میں جاری ہے۔ اُسے مرحوم منشی پریم چند نے شروع کیا تھا۔ زمانہ بابت اپریل ۱۹۳۸ء میں مکرمی جگر بریلوی نے اس موضوع کے فرقہ وارانہ پہلو پر نظر ڈالی۔ جسکے جواب میں "حق پرست" صاحب کا طولانی مضمون گذشتہ اکتوبر کے پرچے میں شائع ہوا۔ اِس مضمون میں لائق مضمون نگار نے غیر معمولی صاف گوئی سے کام لے کر ایک طبقہ کے دلی خیالات و جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ چنانچہ اُس کے متعلق کئی احباب نے اپنی نجی چٹھیوں میں اظہار رائے کیا ہے۔ چند نے صاحب مضمون کی تائید کی ہے۔ لیکن اکثر احباب نے اُنکے خیالات سے سختی کے ساتھ اختلاف کیا ہے۔ یہاں پر ہم دو صاحبوں کی رائیں نقل کرتے ہیں۔ غازی پور کے ایک مسلمان دوست لکھتے ہیں کہ ۔

"معلوم نہیں کس "حق پرست" نے یہ مضمون لکھا۔ بہر حال جو بھی ہو اُسکی ذہنیت غلامانہ ہے...... اُسکا نظریہ بھی بالکل فرقہ وارانہ ہے۔ زمانہ ایک آزاد خیال پرچہ ہے جو ہندو مسلم دونوں کے مفاد کا خیال رکھتا ہے اور جسکے یہاں فرقہ پرستی حرام ہے۔ اس لئے اس مضمون اسمیں جگہ پانا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

اُسکے برعکس ہمارے دوست حضرت سہیل عظیم آبادی نے ایک خط میں مدبرانہ حیثیت سے نہایت سنجیدہ رائے زنی کی ہے جس سے ہم بھی بہت کچھ متفق ہیں۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں :۔

"آپ کو کسی حد تک معلوم ہے کہ زبان کے متعلق میرا کیا خیال ہے۔ "حق پرست" صاحب نے اپنے مضمون میں جن مصیبتوں کو بیان کیا ہے۔ اس سے میرا خیال ہے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ شرط صرف یہ ہے کہ اُس نے تاریخ پڑھی ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی صاحب انصاف ہو۔ زبان کے ساتھ معاشرتی اور تصوراتی پس منظر کا جو تجزیہ صاحب مضمون نے کیا ہے اُس کی داد نہ دینا شدید بے ایمانی ہوگی۔

لیکن ــــ مجھے ایک شدید اعتراض ہے اور وہ یہ کہ طعنے دینے سے کام نہیں چل سکتا۔ "حق پرست" صاحب نے جتنا اعلیٰ تجزیہ کیا ہے۔ اُسی قدر وہ انجام سے بے خبر رہے۔ انھیں آزادی فکر کے ساتھ آیندہ کیلئے ایک راہ بھی تلاش کرنی چاہئے ورنہ محض حالات کا تجزیہ کر کے خاموشی اختیار کرلینے کی مثال ٹھیک اُسی ناکام طبیب جیسی ہے جو مرض کی تشخیص تو کرے لیکن کوئی نسخہ تجویز نہ کر سکے۔

اب وقت اِس بات کو دہرانے کا نہیں ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ اور مسلمانوں نے ہندوؤں کیساتھ کیا سلوک اور برتاؤ کیا۔ بلکہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ دائمی اطمینان کے حصول کی راہیں تلاش کی جائیں۔"

واقعی اصل مسئلہ یہی ہے اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ زمانہ کے آیندہ کسی نمبر میں سوال کے اِس پہلو پر اظہار خیالات کیا جا سکیگا۔ مکرمی جگر بریلوی نے بھی "حق پرست" صاحب کا ایک مفصل جواب لکھا ہے جو آیندہ پرچہ میں ہدیۂ ناظرین کیا جائیگا۔ مہاتما گاندھی نے بھی حال میں اِس مسئلہ پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس سے زبان کے سوال کے متعلق کانگریس کی پوزیشن واضح ہوگئی ہے۔

اِس سال ادبیات کا "نوبل پرائز" پرل بیک نامی امریکہ کی ایک لیڈی افسانہ نگار کو ملا ہے۔ اِس مصنفہ نے عرصہ دراز تک ملک چین میں رہ کر چینیوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے افسانوں میں چینیوں کی معاشرت کا ایسا دل نشین نقشہ کھینچا ہے، جسے مشرقی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب بہت قابل قدر قرار دیتے ہیں۔

اس نمبر سے زمانہ کی زندگی کا ایک اور سال ختم ہوتا ہے۔ اِس خدمت کو جاری ہوئے چھتیس (۳۶) سال پورے ہوگئے ہیں، یہ سال بھی زمانہ کا معیار بلند رکھنے ہی کی کوشش میں صرف ہوا۔ آخر ششماہی میں ایڈیٹر زمانہ کی تندرستی خاطر خواہ نہیں رہی، لیکن زمانہ کے کام میں کوئی ہرج واقع نہیں ہونے پایا۔ اور ہمارے دوست مدہوش صاحب کی بروقت اور بیدریغ امداد سے مجوزہ پروگرام پر بلا تکلف عملدرآمد ہوتا رہا۔ چنانچہ اب رسالہ کی اشاعت کا انتظام درست ہوگیا ہے۔ آیندہ سال کے لئے ہم زمانہ کی موجودہ خصوصیات کے علاوہ چند پہلوؤں میں نمایاں اصلاح و ترقی دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کا اندازہ عنقریب ہی خود ناظرین رسالہ کو ہو جائے گا۔

لیکن ہماری یہ خواہش کہ رسالہ اپنے ادبی خادموں کا کفیل ہو ابھی تک پوری نہیں ہوئی جس سے آیندہ کے متعلق ابھی تک ایڈیٹر رسالہ کو بیفکری نصیب نہیں ہوئی۔ اب تک زمانہ کی زندگی اُسکی زندگی سے وابستہ رہی ہے، لیکن آنیوالا بڑھاپا اپنا اثر دکھانے لگا ہے۔ اِس لئے اُسکی سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ زمانہ اُس کا یا کسی شخص واحد کا دست نگر نہ رہے بلکہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور اپنے کارکنوں کی ضروریات پوری کر سکے۔ اِس کے بغیر ہم کو اس کے استحکام و استقلال کے متعلق اطمینان نہ ہوگا۔ مگر اِس اطمینان کی واحد صورت یہی ہے کہ زمانہ کے قدردان اُسکی توسیع اشاعت کی طرف متوجہ ہوکر اُسکی مالی حالت قابل اطمینان بنا دیں۔ ہم اِس کے متعلق ایک ٹرسٹ قایم کرنے کی فکر میں ہے۔ بعض احباب کی رائے ہے کہ اس کی لیمٹیڈ کمپنی بنا دیجائے تاکہ زمانہ کی خدمات میں زوال کی صورت پیدا نہ ہو۔ ہم اِس بارے میں اپنے معزز ناظرین کے مشوروں سے فائدہ اُٹھانا اور سوچ سمجھکر آگے قدم بڑھانا چاہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ہمارے علم دوست احباب اِس ناچیز ادبی خدمت میں جو اتنے دنوں سے ایثار اور خلوص کے اصولوں کے ماتحت جاری ہے ہمارا ہاتھ بٹائینگے۔ اسی اُمید پر ہم اگلے سال کے لئے زمانہ کا پروگرام تیار کر رہے ہیں۔

خریدارانِ زمانہ کی خدمت میں

ضروری اطلاع

جن صاحبوں کی خریداری جنوری نمبر سے شروع ہوتی ہے اُن کا حساب اِس نمبر سے ختم ہوگیا۔ اور اب آیندہ سال کی قیمت واجب الوصول ہوگئی، لہذا اُن صاحبان سے درخواست ہے کہ وہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۸ء تک یا اِس نمبر کے پہونچنے کے پندرہ (۱۵) دن کے اندر زمانہ کا سالانہ چندہ مبلغ پانچروپیہ (صہ) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمادیں۔ ورنہ جنوری ۱۹۳۹ء کا رسالہ سالانہ قیمت کے لئے بذریعہ قیمت طلب پیکٹ (V.P.P.) ارسال ہوگا۔

جن صاحبوں کا حساب جولائی یا دوران سال کے کسی دوسرے مہینہ سے شروع ہوتا ہے مگر کسی وجہ سے اُنکی قیمت وصول ہونے سے باقی رہ گئی ہے۔ اُن کی خدمت میں بھی التماس ہے کہ وہ براہ کرم ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۸ء تک رقم واجب الوصول بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں۔ ورنہ اُن کی خدمت میں بھی جنوری ۱۹۳۹ء کا پرچہ سالانہ چندہ کے لئے وصول طلب پارسل (V.P.P.) سے روانہ ہوگا۔

جن صاحبان کو آیندہ خریداری جاری رکھنا منظور نہ ہو۔ وہ براہ کرم اِس نمبر کے پہونچنے کے بعد فوراً ہی اطلاع دیدیں تاکہ اُن کی خدمت میں جنوری ۱۹۳۹ء کا رسالہ نہ بھیجا جائے اور وہ قیمت طلب پیکٹ کی واپسی کی زحمت سے اور دفتر زمانہ مُفت کے نقصان سے محفوظ رہے۔ باقیدار اصحاب جو آیندہ خریداری جاری نہ رکھنا چاہتے ہوں براہِ خوش معاملگی اپنے ذمہ کی بقایا ادا فرماکر اپنے عندیہ سے مطلع فرمادیں۔

جنوری سے رسالہ کی نئی جلد شروع ہوگی نئے خریداروں کو اسی نمبر سے خریداری شروع کرنا چاہیئے۔

نوٹ:- قیمت طلب پیکٹ (V.P.P.) کے لئے رجسٹری ہونا ضروری ہے۔ اِس لئے دو آنہ فیس منی آرڈر کے علاوہ تین آنہ رجسٹری فیس بھی ادا کرنا پڑتی ہے جس سے قیمت طلب پیکٹ میں پانچ آنہ کا صرفہ ہوتا ہے۔ منی آرڈر سے قیمت بھیجنے میں تین آنہ کی کفایت ہوگی۔

۲- قواعد ڈاک خانہ کی رُو سے ویلیو پے ایبل پیکٹ ایک ہفتہ سے زائد ڈاکخانہ میں امانت نہیں رہ سکتے اس لئے استدعا ہے کہ جو صاحبان منی آرڈر کے ذریعہ قیمت نہ بھیجیں۔ وہ براہِ مہربانی جنوری نمبر کا قیمت طلب پیکٹ فوراً ہی وصول فرمائیں۔ ڈاکخانہ میں پڑا نہ رہنے دیں۔

۳- منی آرڈر کے ذریعہ قیمت بھیجنے والے اصحاب کوپن میں اپنا پورا نام و پتہ مع نمبر خریداری صاف و خوشخط تحریر فرمائیں۔ تاکہ رجسٹر میں رقم مرسلہ کا صحیح اندراج ہوسکے۔

منیجر زمانہ کانپور

ممیرہ اور سچے موتیوں کا سفید سُرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر آر۔ کراپر صاحب بہادر سی۔ آر۔ ایس فیلو آف کیمسٹری لندن جسکی بابت لندن، کلکتہ، پنجاب، آگرہ میڈیکل کالج کے سندیافتہ ڈاکٹروں، نوابوں اور راجاؤں و معزز حکما، صاحبان، ڈپٹی کلکٹران و معزز یورپین انگریزوں نے بعد تجربہ لکھا ہے کہ "ممیرا اور سچے موتیوں کا سفید سُرمہ آنکھوں کی بیماری اور ترقی روشنی کیواسطے مفید ہے اور سب سے زود اثر دوا ہے"۔ ملک روس و افریقہ کے معزز ڈاکٹروں اور ہندوستان کے حکیموں اور ویدوں نے آنکھوں کی بیماری میں اور دوا کو چھوڑ کر اس سرمہ کو استعمال کیا ہے۔

ہمارے سُرمہ کا امتحان اور اسمیں کامیابی

نگاہ ناپکر سُرمہ لگائیے۔ دو ہفتہ میں روشنی بڑھ جائیگی اور جملہ نقائص دُور ہوجائیں گے۔ عینک کی ضرورت نہیں رہتی۔ دھند۔ ڈھلکا۔ آنسو بہنا۔ سوزش۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ پلکوں کے اندر سُرخی۔ گوہانی دور ہوجاتی ہے۔ کمزور نگاہ سے سوئی میں تاگا بہت جلد ڈال لیجئے۔ پربال۔ سبل۔ پھولا۔ جالا۔ ابتدائی موتیابند، ناخونہ، آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ ڈورا سا آنا بند ہوجاتا ہے۔ لکھنے پڑھنے سے آنکھوں کی تکان اور سُرخی بہت جلد صاف کرتا ہے اور امراض چشم سے محفوظ رکھتا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ دس آنے محصول ڈاک ۷؍۔ نمونہ ایکروپیہ سے کم قیمت پر نہیں ملتا۔

ملنے کا پتہ:- **مینیجر نگم کمپنی، نیا چوک، کانپور، یو۔ پی۔**

ہاف ٹون عکسی تصاویر

ملک معظم جارج پنجم۔ شہنشاہ جارج ششم مع ملکہ الزبتھ۔ سابق شاہ ایڈورڈ ہشتم، لارڈ ارون۔ لارڈ لنلتھگو، رابندر ناتھ ٹیگور، سر صاحب جی مہاراج، سر علی امام۔ سر سی۔ وی رمن۔ مسٹر سچدانند سنہا۔ سوامی دیویکانند۔ مولانا محمد علی۔ ایشور چندر ودیا ساگر۔ سوامی شردھانند۔ ٹیپو سلطان۔ شہنشاہ اکبر۔ شہنشاہ حبش۔ نادر شاہ۔ سورداس۔ عبدالرحیم خانخاناں۔ راجہ مان سنگھ۔ شیواجی۔ رام داس گرو۔ راگنی، بہاگن وغیرہ موسمی تصاویر) وقت نزع۔ غسل کی تیاری۔ شیر محمد قوال۔ لیلیٰ مجنوں۔ بیکاری، ہمدردی۔ مسیح اور کانٹوں کا تاج۔ ذبح عظیم۔ عشق و زندگی۔ بخیل۔ ہڑتالی مزدور۔ کثرت میں وحدت۔ قیمت فی تصویر تین پیسے۔

ملنے کا پتہ – زمانہ [illegible]

انتخاب حسرت۔ مولانا حسرت موہانی کے دلکش دیوانوں کا سیر حاصل انتخاب اور اس پر حضرت جلیل قدوائی کے قلم کا لکھا ہوا فاضلانہ مقدمہ۔ قیمت فی جلد عہ

حدیث حسن۔ جواں سال ادیب حضرت شمیم احمد صاحب فطرت کی دلکش و دلآویز نظموں کا مجموعہ ہے۔ کلام پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ قیمت مجلد صرف عمر

طریق دولتمندی۔ دولت کی چاہ سب کو ہے لیکن دولت کمانے کے طریقوں سے بہت سے لوگ ناواقف ہیں۔ اس کتاب میں دولت حاصل کرنے کے طریقے نہایت خوبی سے بتائے گئے ہیں۔ ہر شخص کے لئے قابل خرید ہے۔ قیمت ۸ر

ترجمہ رامائن منظوم۔ بال کانڈ کے اصلی دوہے اور چوپائیاں ہندی ترجمہ اُردو اشعار میں۔ مترجمہ منشی سورج پرشاد تصور۔ قیمت عہ

خیالات مہاتما گاندھی۔ یہ وہ لاجواب کتاب ہے جسمیں مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز نے مہاتما گاندھی کی مذہبی سماجی اور سیاسی خیالات شرح و بسط کیساتھ درج کر کے دنیا پر احسان عظیم کیا ہے قیمت حصہ اول عہ دوم عہ

سیر گل۔ یعنی مسٹر جلیل قدوائی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ، وہ کتاب جس نے مصنف کو دور حاضرہ کے اہل قلم کی صف اول میں جگہ دلائی ہے۔ آج روسی افسانوں کو [illegible]
[illegible]

بہار سخن۔ پانسو چھیاسٹھ ۵۶۶ ہندو شعراء ماضی و حال کا نفیس تذکرہ ہے۔ جسمیں مشہور شعراء کے حالات، انتخاب کلام بترتیب حروف تہجی درج کئے گئے ہیں قیمت ع

نصائح چانکیہ۔ یعنی نامور ہند چانکیہ کے مشہور و معروف نیتی کا ترجمہ از پنڈت ہمنت راؤ صاحب ناظم خزانہ سرکار عالی گورنمنٹ نظام۔ قیمت ۶ر

اُردو مضمون نویسی۔ مضمون لکھنے کے متعلق پروفیسر نانک پرشاد بی۔ اے مرحوم کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے اور ہر مضمون کا موضوع نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ قیمت صرف ۸ر

مثنوی سحر۔ یعنی شکنتلا اور دشنیت کا اُردو ترجمہ، حضرت سحر ہنگامی کے شاعرانہ کمال کا اعجاز، دوسرا ایڈیشن، جسکی مصنف نے نظرثانی کی ہے۔ قیمت ۸ر

مرقع ادب۔ حصہ اول و دوم۔ مرتبہ جناب صفدر مرزاپوری۔ اسمیں ہندوستان کے مشہور انشاپردازوں و شعرا کے وہ خطوط جمع کئے گئے ہیں، جو انھوں نے اپنے احباب وغیرہ کو لکھے ہیں۔ قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ۔

پریم بتیسی۔ یعنی اُردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند مرحوم پی۔ اے کے بہترین قصوں کا مجموعہ قیمت عہ

دنیائے نیاز۔ مولانا ابوالفضل نیاز فتحپوری کی قدیم و جدید طرز کی دلکش نظموں کا مجموعہ ہے [illegible]